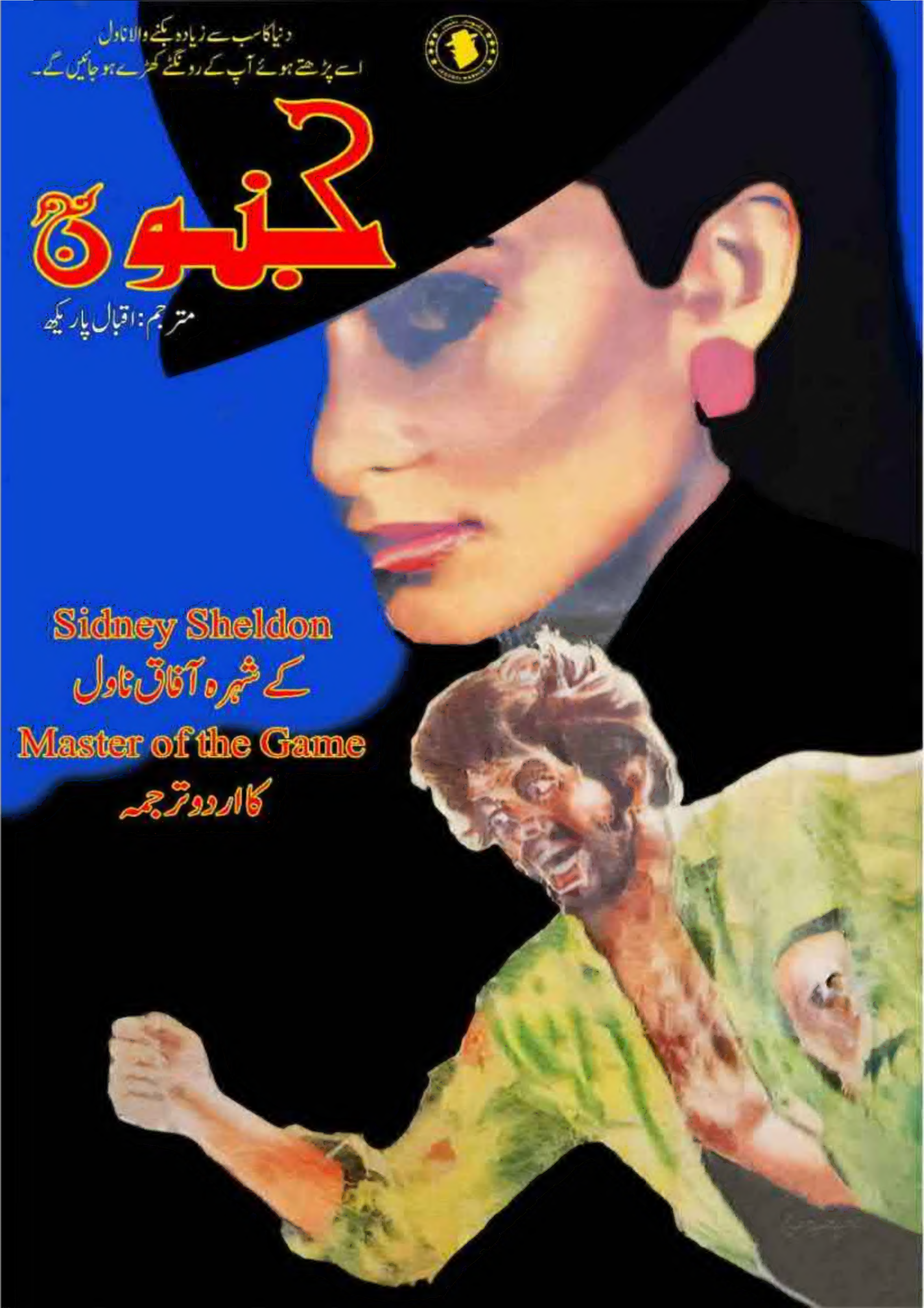

دنیا کا سب سے زیادہ بکنے والا ناول
اسے پڑھتے ہوئے آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔
جنون
مترجم: اقبال پاریکھ
Sidney Sheldon
کے شہرہ آفاق ناول
Master of the Game
کا اردو ترجمہ

بادو باراں کا طوفان ہر گزرنے والے لمحے کے ساتھ شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایسی خوفناک آوازیں بھی ایک تسلسل کے ساتھ بلند ہو رہی تھیں کہ جمی کا دل کانپ کانپ کر رہ جاتا تھا۔ ہوا اتنی شدید تھی کہ سانس بھی لینا دشوار ہو رہا تھا۔ خود جمی بھی طوفانوں کی سرزمین اسکاٹ لینڈ میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن ایسا طوفان اُس نے اپنی زندگی میں اس سے قبل نہیں دیکھا تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا لیکن گہرے سیاہ بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا تھا اور دن ہی میں جیسے رات کی تاریکی چھا گئی تھی۔ سیاہ اور تاریک آسمان میں ہر طرف بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ اس خیرہ کن چمک کے ساتھ بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گھن گرج تھی۔ اس گرج چمک کے ساتھ طوفانی بارش بھی تھی۔ آسمان کے جیسے تمام سوتے کھُل گئے تھے۔ پانی کی ایک چادر تھی جو مسلسل آسمان سے زمین پر گر رہی تھی۔ دُھواں دھار بارش کلپ نامی قصبے کی عمارتوں اور یہاں نصب بے شمار خیموں پر ضربیں لگا رہی تھی۔ ہَوا کے تھپیڑے اُنہیں لرزاں کیے دے رہے تھے۔ کچی سڑکیں کیچڑ اور گارے میں تبدیل ہو گئی تھیں۔

جمّی کو اس کی چھٹی حس نے خطرے سے آگاہ کر دیا۔ وہ تیزی کے ساتھ کچّے مکان کی آڑ سے نکل آیا۔ اگلے ہی لمحے وہ مکان گارا بن کر زمین پر بیٹھ گیا۔ جمّی نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ وہ مرتے مرتے بچا تھا۔ اُس نے دائیں بائیں دیکھا اور ایک سمت بڑھ گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ قصبہ آج اس طوفان میں صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جائے گا۔

کلپ کو قصبہ کہنا بھی قصبے کی توہین تھی۔ یہ تو خیموں اور جھگیوں پر مشتمل ایک بڑھتا پھیلتا گاؤں تھا۔ ہر طرف جدھر بھی نگاہ پڑتی بس خیمے اور جھونپڑیاں ہی نظر آتی تھیں یا پھر وہ گاڑیاں تھیں جو دریائے وال کے کنارے کنارے کھڑی تھیں۔ یہ خیمے، جھگیاں اور گاڑیاں ان لوگوں کی تھیں جو اپنے سنہرے خوابوں کی تعبیر کی تلاش میں دنیا کے گوشے گوشے سے سمٹ کر جنوبی افریقہ کے اس قصبے میں آئے تھے سب کا خواب ایک تھا، سب کی منزل مشترک تھی۔ ہیروں کی تلاش!

خواب دیکھنے والوں میں جمّی بھی شامل تھا۔ وہ اٹھارہ برس کا تھا۔ وہ مضبوط کاٹھی کا طویل قامت نوجوان تھا۔ اس کی چمکدار نیلی آنکھوں میں خواب اور طوفان دونوں ہی چھپے ہوئے تھے۔ اس کے دل میں امیر بننے کی خواہش الاؤ کی طرح بھڑک رہی تھی اور رُوح بے چین و مضطرب تھی۔

وہ آٹھ ہزار میل کا طویل تھکا دینے والا سفر کر کے یہاں پہنچا تھا۔ اس سفر کا آغاز اس کے آبائی پہاڑی گاؤں سے شروع ہوا تھا۔ وہ مختلف شہروں میں کئی کئی ماہ قیام کرتا اور محنت مزدوری سے پیسے کماتا اپنی منزلِ مقصود کو پہنچا تھا۔ اس نے یہاں تک پہنچنے کے لیے سب کچھ قربان کر دیا تھا لیکن اسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ اس نے اپنے گھر کو، اپنے والدین، بہن بھائیوں اور اپنی زمین غرض سب کو چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ اس اجنبی ملک میں غریب الوطن تھا۔ یہ سب کچھ اس نے محض ایک خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے کیا تھا۔

جمّی جانتا تھا کہ دولت کمانا آسان نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ ہیرے اسے زمین پر پڑے ہوئے نہیں مل جائیں گے۔ اس کے لیے اُسے سخت محنت کرنا ہوگی۔ وہ محنت کرنے سے خوفزدہ نہیں تھا۔ محنت تو وہ اس زمین پر بھی کرتا تھا جس پر اس کے گھر والے کاشت کرتے تھے۔ لیکن اس محنت کا پھل اتنا قلیل تھا کہ پیٹ بھر کر کھانے کو بھی بس واجبی سا ملتا تھا۔ وہ اپنے بھائیوں اور بہن میری کے ساتھ طلوعِ آفتاب کے ساتھ کام کرتا تھا اور یہ سلسلہ غروبِ آفتاب تک جاری رہتا تھا۔ وہ صرف ایک مرتبہ قریب کے ایک شہر میں میلہ دیکھنے گیا تھا۔ اس نے وہاں ایسی ایسی چیزیں دیکھی تھیں کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ وہ ان چیزوں کو اپنانا چاہتا تھا لیکن دولت کے بغیر ،چیزوں کو اپنانے کی خواہش دیوانے کا خواب ہی تھی۔ اس نے اپنے بہت سے دوستوں اور عزیز و اقارب کو غربت و افلاس کی زندگی گزارتے راسی حالت میں مرتے دیکھا تھا۔ وہ سب بھی ان چیزوں کو اپنانے کے خواب دیکھتے تھے مگر زندگی کی ایک طے شدہ ڈگر کو چھوڑنے سے رتے تھے اور دولت کمانے کے لیے کئی خطرے مول لینے پڑتے ہیں، کئی رشتے توڑنے پڑتے ہیں۔ انجانی راہوں پر چلنا پڑتا ہے۔ ان سب ، لیے بڑے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے اور جمّی ایک حوصلہ مند شخص تھا۔

جمّی کو وہ لمحہ اچھی طرح یاد تھا جب اس نے پہلی مرتبہ جنوبی افریقہ میں ہیروں کے نئے ذخیرے کی دریافت کی خبر سُنی تھی۔ اس خبر س کے جسم میں جیسے بجلی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ جنوبی افریقہ میں دنیا کا سب سے بڑا ہیرا ایک جگہ ریت پر پڑا ملا تھا۔ اس کا مطلب

یہی تھا کہ اس علاقے میں ہیرے کی کوئی بہت بڑی کان تھی، بہت بڑا ذخیرہ تھا جو خطرات سے کھیلنے اور رشتوں کی قربانی دے کر وہاں پہنچنے والوں کا منتظر تھا۔

اور پھر ایک دن جب وہ سب کے ساتھ رات کا کھانا کھا رہا تھا، اُس نے قدرے شرماتے ہوئے لیکن فخریہ انداز میں اعلان کیا، "میں ہیروں کی تلاش میں جنوبی افریقہ جا رہا ہوں۔ اگلے ہفتے میں سفر پر روانہ ہو رہا ہوں۔"

یہ کوئی معمولی اعلان نہ تھا۔ کھانے کی پرانی میل خوردہ میز کے گرد بیٹھے ہوئے اس کے خاندان کے پانچ افراد نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ "کیا کہا؟ تم ہیروں کی تلاش میں جنوبی افریقہ جا رہے ہو۔ پاگل تو نہیں ہو گئے ہو۔ یہ سب خواب و خیال کی باتیں ہیں برخوردار! یہ شیطانی باتیں ہیں جو انسان کو کام چور بناتی ہیں۔" اس کے باپ نے سرزنش کی۔

"مگر یہ تو بتاؤ کہ اس سفر کے لیے تمہارے پاس رقم کہاں سے آئے گی؟" اُس کے بڑے بھائی نے دریافت کیا۔

"ہاں بھیا۔ جنوبی افریقہ نزدیک تو نہیں ہے۔ آدھی دنیا کا سفر ہے اور تمہارے پاس رقم بھی نہیں ہے۔" اس کی بڑی بہن نے ہمدردی سے کہا۔

"اگر دولت میرے پاس ہوتی تو میں ہیروں کی تلاش میں جنوبی افریقہ جانے کے بارے میں سوچتا بھی نہیں۔ وہاں جانے والوں میں سے کسی کے پاس دولت نہیں ہے۔ سب میری طرح ہیں۔ میرے پاس دماغ ہے اور میرے جسم میں طاقت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں وہاں سے کامیاب لوٹوں گا۔" جمی نے فیصلہ کن انداز میں بتایا۔

"بھیا اپنی کا تو خیال کرو۔ وہ غریب تو تمہاری بیوی بننے کی آس لگائے بیٹھی ہے۔" بہن نے سمجھانا چاہا۔

جمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے غور سے اپنی بہن کو دیکھا۔ وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ اس سے چھ سال بڑی تھی لیکن اس عمر میں بھی بوڑھی دکھائی دیتی تھی۔ زندگی میں اسے کوئی بھی آسائش تو نہیں ملی تھی۔ "میری بہن، میں تیرے قدموں میں خوشیوں کے ڈھیر لگا دوں گا۔" جمی نے دل ہی دل میں اپنی بہن سے وعدہ کیا۔

اُس رات جمی اپنے پلنگ پر لیٹا جنوبی افریقہ کے سفر کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس کی ماں خاموشی سے دبے پاؤں اُس کے پاس آئی۔ اس نے جمی کے شانے پر ہلکی سی تھپکی دی۔ "سنو بیٹا! اگر تم نے فیصلہ ہی کر لیا ہے تو ضرور جاؤ۔ مجھے نہیں پتا کہ وہاں ہیرے ہیں یا نہیں۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ اگر وہاں ہیرے واقعی موجود ہیں تو تم ضرور انہیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گے۔" ماں نے چمڑے کی ایک پرانی سی تھیلی جمی کے حوالے کر دی۔ "اب تک میں نے جو کچھ پس انداز کیا ہے وہ سب اس تھیلی میں ہے۔ اسے لے لو۔ کسی سے اس بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو گا۔"

اور جس دن جمی ہیروں کی تلاش میں روانہ ہوا۔ اس تھیلی میں پچاس پونڈ کی رقم تھی۔

جنوبی افریقہ کا سفر جمی کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ یہاں تک پہنچنے میں جمی کو ایک برس لگا۔ ایڈنبرا میں ایک ہوٹل میں جمی نے چند دن ویٹر کی حیثیت سے کام کیا اور اس دوران اس نے پچاس پونڈ کی رقم اور جمع کر لی۔ پھر وہ لندن پہنچا۔ لندن کو دیکھ کر جمی حیران رہ گیا۔ اتنا بڑا شہر تو اس کے تصور میں بھی نہ تھا۔ پھر یہاں کی رونقیں اس کے تصور سے بھی زیادہ تھیں۔ سڑکوں پر گھوڑا گاڑیاں ہر طرف دوڑتی بھاگتی نظر آتی تھیں۔ ان گاڑیوں میں ایک سے ایک خوبصورت عورت سفر کرتی نظر آتی۔ ان کے لباس بھی بہت بھڑکیلے ہوتے اور وہ ذہن ہی ذہن میں سوچتا کہ وہ اپنی بہن کے لیے کیا کیا لباس لے کر جائے گا۔ اور لندن کی دکانیں، ان میں تو ایک سے ایک عمدہ قسم کا سامان تھا۔ ہر چیز ایسی کہ اس پر نظر جم کر رہ جائے۔ جمی نے ایک سرائے میں قیام کیا۔ ایک شلنگ فی ہفتہ کرایے پر رہنے کے لیے ایک کمرہ مل گیا۔ اس سے زیادہ سستا رہائشی بندوبست ممکن نہ تھا۔ وہ دن بھر بندرگاہ پر چکر لگاتا پھرتا۔ اُسے ایسے جہاز کی تلاش تھی جو اسے جنوبی افریقہ لے جا سکے۔ اس کے بعد جو وقت بچتا وہ لندن کی سیر میں گزارتا۔ جمی اس تھیٹر کو دیکھنے بھی گیا تھا جہاں پہلی مرتبہ بجلی لگائی گئی تھی۔ اس نے یہ بھی سنا تھا کہ ایک ایسی حیرت انگیز مشین بھی ایجاد ہو گئی ہے جس کی مدد سے ایک آدمی شہر کے ایک کونے میں بیٹھ کر دوسرے کونے میں موجود دوسرے شخص سے گفتگو کر سکتا ہے۔ اس مشین کا نام ٹیلیفون تھا۔

ان ایجادات کے باوجود برطانیہ ان دنوں سخت بحران کا شکار تھا۔ سڑکوں پر بیروزگار اور بھوکے افراد تلاش روزگار میں مارے مارے پھرتے تھے۔ آئے دن مظاہرے اور ہنگامے ہوتے رہتے تھے۔ جگہ جگہ لوگ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو جاتے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر جمی سوچتا۔ "مجھے یہاں سے نکل جانا ہے۔ میں اس غربت و افلاس سے نکلنے کے لیے ہی تو یہاں آیا تھا۔"

اور پھر ایک دن جمی کی خواہش پوری ہو ہی گئی۔ اس نے جنوبی افریقہ کے شہر کیپ ٹاؤن جانے والے ایک جہاز پر پلیٹیں دھو

والے کی حیثیت سے ملازمت کے معاہدے پر دستخط کر دیے۔

✡

بحری سفر تین دن جاری رہا۔ اس دوران جہاز دو بندرگاہوں پر کوئلہ اور پانی لینے کے لیے لنگر انداز ہوا۔ بحری سفر بہت تکلیف دہ تھا۔ جہاز نے سردی کے موسم میں اپنا سفر شروع کیا تھا۔ روانگی کے فوراً ہی بعد جمی کو اُلٹیاں شروع ہو گئی تھیں۔ اس کے باوجود وہ خوش تھا۔ کیونکہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وہ اپنے خوابوں کی سرزمین کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ جوں جوں جہاز خطِ استوا کی سمت بڑھ رہا تھا، موسم بھی تبدیل ہو رہا تھا۔ موسم گرما نے موسم سرما کی جگہ لے لی تھی۔

جہاز علی الصبح کیپ ٹاؤن کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ جمی طلوع آفتاب سے قبل ہی عرشے پر آ گیا تھا اور سحر زدہ انداز میں قریب آتی ہوئی زمین کو دیکھ رہا تھا۔

جُونہی جہاز لنگر انداز ہوا عرشے پر بھانت بھانت کے لوگ آ گئے۔ یہ مختلف ہوٹلوں اور سراؤں کے ایجنٹ تھے۔ ان میں کالے بھی تھے، پیلے بھی، تانبے کی رنگت والے بھی، سانولے بھی۔ سب کے سب جہاز سے آنے والوں کا سامان اٹھانے کے لیے اپنی خدمات پیش کر رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے جو اخبار، مٹھائیاں اور پھل لیے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ لوگ ایک دوسرے سے ایسی اجنبی زبان میں گفتگو کر رہے تھے جو اس نے پہلے کبھی نہ سُنی تھی۔

کیپ ٹاؤن عجیب شہر تھا۔ اس کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کہیں کوئی نظم یا ترتیب نہ تھی۔ یہاں ہر رنگ اور نسل کے لوگ تھے۔ سب اپنے اپنے مخصوص لباسوں میں تھے۔ بندرگاہ سے باہر آنے کے بعد جمی اس سستی سرائے کی تلاش میں تھا جس کے بارے میں جہاز کے ایک ملاح نے اسے بتایا تھا۔ جلد ہی وہ اس سرائے میں پہنچ گیا۔ اس کی مالکہ ایک ادھیڑ عمر کی موٹی سی عورت تھی۔ اُس نے جمی کا سرتاپا جائزہ لیا اور مسکرا کر مقامی زبان میں اس کا استقبال کیا۔

"میری سمجھ میں آپ کی بات نہیں آئی۔" جمی نے اُسے بتایا۔

"اوہ اچھا۔ تم انگریز ہو۔ یہاں سونے کی تلاش میں آئے ہو یا ہیروں کی تلاش میں؟"

"ہیروں کی تلاش میں۔" جمی نے بتایا۔

"تم صحیح جگہ آئے ہو۔ یہاں تم جیسے لوگوں کے آرام کا بے حد خیال رکھا جاتا ہے۔ میں ڈلما ہوں، لیکن میرے دوست مجھے ڈی ڈی کہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم بہت اچھے دوست ثابت ہوں گے۔" یہ کہہ کر وہ مسکرائی تب جمی نے دیکھا کہ اس کا ایک دانت سونے کا ہے۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ خاتون۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ مجھے شہر کا نقشہ کہاں مل سکتا ہے؟" جمی نے پوچھا۔

✡

شہر کا نقشہ حاصل کر کے جمی نکل کھڑا ہوا۔ وہ اس شہر کی سڑکوں پر گھومتا رہا۔ اس کے لیے سب سے زیادہ پریشان کن وہ کالی کالی بڑی مکھیاں تھیں جو غول در غول حملہ آور ہوتی تھیں۔ سیر سے جب وہ واپس سرائے آ کر اپنے کمرے میں گیا تو یہاں بھی مکھیاں اس کی منتظر تھیں۔ دیواروں پر، بستر پر، فرش اور میز پر، ہر جگہ یہ بڑی بڑی کالی مکھیاں موجود تھیں۔ وہ واپس سرائے کی مالکہ کے پاس گیا۔ "محترمہ! کیا آپ میرے کمرے سے مکھیاں نکالنے کا انتظام کر سکتی ہیں؟"

ڈلما نے قہقہہ لگایا، جیسے اس نے کوئی نہایت پُر لطف لطیفہ سُنایا ہو، اور جمی کی پشت پر تھپکی دیتے ہوئے کہا: "صاحبزادے، مکھیوں کی پروا نہ کرو۔ بہت جلد تم ان سے مانوس ہو جاؤ گے۔"

جمی واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

کیپ ٹاؤن میں صفائی اور ستھرائی کا نظام نہ ہونے کے برابر تھا۔ سُورج غروب ہونے کے ساتھ ہی ایک عجیب سی بدبو شہر پر چادر کی طرح پھیل گئی۔ یہ بدبو ناقابل برداشت تھی۔ لیکن جمی جانتا تھا کہ وہ اس بدبو کو بھی برداشت کرلے گا۔ کیپ ٹاؤن سے آگے روانہ ہونے کے لیے جمی کو ابھی مزید رقم کی ضرورت تھی۔ اُسے پہلے ہی کئی لوگوں نے خبردار کیا تھا۔ "ہیروں کے علاقے میں تمہیں کافی رقم کی ضرورت ہوگی۔ وہاں دولت کے بغیر گزارہ ناممکن ہے۔ وہاں تو لوگ سانس لینے کا معاوضہ بھی طلب کر لیتے ہیں۔"

کیپ ٹاؤن میں دوسرے دن ہی اسے ایک فرم میں گاڑی بان کی ملازمت مل گئی۔ تیسرے دن اسے ایک ہوٹل میں برتن

دھونے کی ملازمت مل گئی۔ اس ملازمت میں یہ فائدہ بھی تھا کہ وہ پلیٹوں میں بچی ہوئی خوراک سے پیٹ بھر سکتا تھا۔ اس طرح وہ کھانے کی رقم بھی بچا سکتا تھا۔ یہ کھانا اُسے بہت عجیب لگتا تھا۔ وہ تو اپنی ماں اور بہن کے ہاتھ کی پکی ہوئی لذیذ چیزیں کھانے کا عادی تھا لیکن اب اسے رقم جمع کرنے کے لیے لوگوں کی جھوٹی چیزیں کھانے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ وہ یہ سب کچھ برداشت کر رہا تھا۔ صرف اپنے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے۔ اس لیے کبھی اس نے دوسروں کا جھوٹا کھانے میں کراہیت محسوس نہیں کی۔ بس وہ ایک چیز سے پریشان تھا یہاں اس کا نہ کوئی دوست تھا نہ عزیز۔ یہ تنہائی جیسے اُسے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔

اور پھر اس کی چرمی تھیلی میں دو سو پونڈ کی رقم جمع ہو گئی۔ وہ اب کیپ ٹاؤن سے روانہ ہونے کے لیے تیار تھا۔ کلپ جانے کے لیے ایک برطانوی کمپنی بگھیاں چلایا کرتی تھی۔ اس کمپنی کا دفتر بندرگاہ کے قریب لکڑی کے ایک کیبن میں تھا۔ جمی صبح سات بجے وہاں پہنچا تو کیبن کے گرد لوگوں کا اتنا ہجوم تھا کہ وہ کیبن کے پاس تک نہ پہنچ سکا۔ مختلف ملکوں کے عجیب عجیب لوگ جمع تھے۔ ہر شخص اپنی اپنی زبان میں چیخ رہا تھا۔ سب کے سب ٹکٹ فروخت کرنے والے کی خوشامد میں لگے ہوئے تھے۔ جمی بھی اس ہجوم میں شامل تھا۔ لیکن وہ سب سے پیچھے تھا۔ تب ہی ایک آئرش ہجوم کو چیرتا ہوا کیبن کی طرف سے باہر آیا اور ایک سمت چل دیا۔ جمی نے لپک کر اس سے دریافت کیا صورت حال ہے۔

"صورتحال" آئرش دہاڑا۔ "تمام بگھیاں چھ ہفتے کے لیے بُک ہو چکی ہیں۔ اور صاحبزادے یہ لوگ، یہ لٹیرے کلپ کے لیے پچاس پونڈ کرایہ طلب کر رہے ہیں۔"

"پچاس پونڈ! یہ تو واقعی بہت زیادہ ہے۔ کیا اس کے علاوہ وہاں جانے کا کوئی اور طریقہ نہیں ؟"

"کیوں نہیں۔ دو طریقے اور ہیں، یا تو ڈچ ایکسپریس سے وہاں جا سکتے ہو یا پھر پیدل۔"

"یہ ڈچ ایکسپریس کیا ہے ؟" جمی نے پوچھا۔

"بیل گاڑی۔ یہ دو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے۔ اس رفتار سے جب تم کلپ پہنچو گے تو وہاں تمام ہیرے ختم ہو چکے ہوں گے۔"

جمی کو یہ بات قبول نہیں تھی کہ وہ اتنی تاخیر سے اپنی منزل پر پہنچے کہ تمام ہیرے ہی ختم ہو جائیں۔ اس کے بعد وہ کافی دیر تک سفر کے لیے کوئی متبادل ذریعہ تلاش کرتا رہا۔ دوپہر سے کچھ دیر قبل اُسے ایک ذریعہ مل ہی گیا۔ وہ یونہی مارا مارا پھر رہا تھا کہ ایک اصطبل پر اسے "ڈاک گھر" کا بورڈ آویزاں نظر آیا۔ کچھ سوچ کر وہ اصطبل میں داخل ہو گیا۔ یہاں اس نے ایک دُبلے پتلے منحنی سے آدمی کو ڈاک کے تھیلے ایک کُتا گاڑی میں بھرتے دیکھا۔

"معاف کیجئے گا، کیا آپ ڈاک لے کر کلپ بھی جاتے ہیں ؟" جمی نے سوال کیا۔

"ہاں۔ اس وقت میں وہیں کے لیے ڈاک لاد رہا ہوں" اُس منحنی شخص نے جواب دیا۔

جمی کے دل میں مسرت کی بے پایاں لہر پیدا ہوئی "کیا آپ مسافروں کو بھی لے جاتے ہیں ؟"

"ہاں کبھی کبھار" منحنی شخص نے جمی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "تمہاری عمر کیا ہے ؟"

جمی کو یہ سوال بہت عجیب سا لگا "اٹھارہ برس۔ لیکن آپ نے میری عمر کیوں پوچھی ہے ؟"

"ہم بائیس برس سے زیادہ عمر کے لوگوں کو لے کر نہیں جاتے۔ ویسے تمہاری صحت تو ٹھیک ہے نا ؟"

یہ سوال پہلے سے بھی کچھ زیادہ عجیب تھا "جی ہاں جناب !"

منحنی شخص سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا "میرا خیال ہے تم اس سفر کے لیے قطعی موزوں ہو۔ میں ایک گھنٹے میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ کرایہ بیس پونڈ ہو گا۔"

جمی کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ جلدی سے بولا "ٹھیک ہے جناب، میں اپنا سوٹ کیس لے کر ابھی آیا۔"

"سوٹ کیس نہیں چلے گا۔ تم صرف ایک ٹوتھ برش لے کر چل سکتے ہو" منحنی شخص نے کہا۔

جمی نے یہ سُن کر کُتا گاڑی کا بغور جائزہ لیا۔ یہ گاڑی چھوٹی تھی اور نہایت بھونڈے پن سے بنائی گئی تھی۔ اس کی صورت ایک کنویں کی سی تھی جس میں ڈاک کے تھیلے ٹھونسے گئے تھے۔ اس کنویں کے اوپر ایک نہایت تنگ سی جگہ تھی جس میں ایک شخص سمٹ سمٹا کر ڈرائیور کی کمر سے کمر لگا کر بیٹھ سکتا تھا۔ جمی نے قدرے مایوسی سے کہا "ٹھیک ہے جناب، میں اپنا ٹوتھ برش لے کر ابھی آتا ہوں۔"

پندرہ منٹ بعد جب جمی وہاں پہنچا تو وہ منحنی شخص گاڑی میں گھوڑا جوت رہا تھا۔ گاڑی کے پاس دو لمبے چوڑے نوجوان

کھڑے تھے۔ انہوں نے منحنی شخص کو کچھ رقم بھی دی۔ جمی نے پھرتی سے آگے بڑھ کر کہا "ایک منٹ مسٹر! تم نے مجھے لے جانے کے لیے کہا تھا۔"

"تم سب ہی چل رہے ہو بھئی۔ چلو بیٹھ جاؤ۔" منحنی ڈرائیور نے کہا۔

"یعنی ہم تینوں!" جمی نے حیرت سے دیکھا۔

"ہاں ہاں، تم تینوں۔"

جمی حیران ہی تو رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر ڈرائیور کس طرح ان تینوں کو اس چھوٹی سی گاڑی میں بیٹھنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اُس نے باقی دونوں آدمیوں سے اپنا تعارف کرایا "میرا نام جمی ہے۔"

"میں ولسن ہوں۔" سانولی رنگت کے شخص نے کہا۔

"اور مجھے ویلاش کہتے ہیں۔" سفید پگڑی والے نے کہا۔

"ہم لوگ خوش قسمت ہیں کہ یہ گاڑی مل گئی۔ اچھی بات یہ ہے کہ لوگوں کو اس کے بارے میں علم نہیں۔"

"یہ بات نہیں ہے جمی۔ لوگوں کو ان ڈاک گاڑیوں کا علم ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ لوگ اس سفر کے لیے مناسب نہیں ہیں یا پھر انہیں وہاں جانے کی اتنی جلدی نہیں ہے جتنی ہم تینوں کو ہے۔"

اس سے قبل کہ جمی پوچھتا کہ آخر اس کے کہنے کا مطلب کیا ہے۔ منحنی ڈرائیور نے کہا "چلو بیٹھ جاؤ۔ ہم روانہ ہو رہے ہیں۔"

وہ تینوں سمٹ سمٹا کر اور پھنس پھنسا کر مختصر سی جگہ میں بیٹھ گئے۔ جمی درمیان میں تھا۔ اُن تینوں کے گھٹنے مڑ کر رہ گئے تھے۔ اُن کی کمر پیچھے لکڑی کی پُشت گاہ سے چپکی ہوئی تھی۔ ان کے لیے جسم کو حرکت دینا یا ٹانگوں کو پھیلانا ناممکن تھا۔ وہاں تو سانس لینے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ کچھ بھی ہو، یہ بھی چلے گا۔ جمی نے خود کو دلاسہ دیا۔

"ہوشیار۔" ڈرائیور نے آواز لگائی اور اس کے ساتھ ہی گاڑی روانہ ہو گئی۔ کیپ ٹاؤن کی سڑکوں سے گزر کر تھوڑی ہی دیر بعد گاڑی میدان میں نکل آئی۔ آرزوؤں اور اُمنگوں کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ بیل گاڑیوں سے سفر نسبتاً آرام دہ تھا۔ کیپ ٹاؤن سے ہیروں کے علاقے کو جانے والی بگھیاں بڑی اور کشادہ تھیں۔ ان پر پردے پڑے ہوتے تھے جن کی بنا پر مسافر دھوپ سے بچے رہتے۔ ان ویگنوں کو گھوڑے یا خچر کھینچتے۔ مختلف اڈوں پر جب بگھیاں رکتیں تو مسافروں کو کھانے پینے کی چیزیں فراہم کی جاتیں۔ اس سفر میں دس دن لگتے تھے۔

ڈاک گاڑیاں مختلف تھیں۔ ان سے سفر بھی مختلف تھا۔ یہ گاڑیاں بس چلتی ہی رہتی تھیں۔ رُکتی تھیں تو صرف گھوڑے اور گاڑی بان کی تبدیلی کے لیے۔ پھر یہ ڈاک گاڑیاں پوری رفتار سے چلتی تھیں۔ گھوڑوں کو سرپٹ دوڑایا جاتا تھا۔ ناہموار کچی سڑکوں اور میدانوں میں یہ گاڑیاں ایک رفتار سے دوڑتی رہتیں۔ ان گاڑیوں میں اسپرنگ بھی نہیں ہوتے تھے جس کی وجہ سے ہر دھچکا گھوڑے کی دولتی کی طرح جسم پر لگتا۔ ہر جھٹکے پر جمی دانتوں پر دانت جما لیتا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ رات کو جب گاڑی رُکے گی تو کچھ دیر آرام کا موقع ملے گا۔ کل صبح پھر میں پوری طرح چاق و چوبند ہو جاؤں گا۔" وہ دل ہی دل میں خود کو تسلی دے رہا تھا۔

اور پھر رات آ گئی۔ گھوڑوں اور گاڑی بان کی تبدیلی کے لیے دس منٹ گاڑی نے قیام کیا اور ایک مرتبہ پھر اُن کا سفر شروع ہو گیا۔

"کھانے کے لیے ہم کب ٹھہریں گے؟" جمی نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"یہ گاڑی کہیں نہیں رُکے گی جوان۔ ہم سیدھے کلپ جائیں گے۔ وہی ہماری منزل ہے۔ یہ ڈاک گاڑی ہے بابو، ڈاک گاڑی۔"

جمی خاموش ہو گیا۔ اب تک کے سفر نے اس کے انجر پنجر ڈھیلے کر دیئے تھے۔ اس کا جوڑ جوڑ پکے ہوئے پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا اور ابھی انہیں طویل مسافت طے کرنی تھی۔

گاڑی تمام رات اسی طوفانی رفتار سے ناہموار راستوں پر چلتی رہی۔ جھٹکے لگتے رہے۔ جمی کا بدن اب ناقابلِ برداشت حد تک دُکھنے لگا تھا۔ اس کی حالت تباہ ہو گئی تھی۔ جسم کے رُوم رُوم میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ دھچکے اتنے شدید تھے کہ سونا ناممکن تھا۔ جب بھی اُس کی ذرا آنکھ لگتی، ایک زوردار دھچکا لگتا اور اس کی آنکھ کھل جاتی۔ ٹانگیں پھیلانے اور بدن کو حرکت دینے کی گنجائش نہ ہونے کے سبب اس کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ تھی۔ گھٹنوں میں شدید درد تھا۔ وہ بھوکا بھی تھا۔ اس مسلسل سفر اور جھٹکوں نے اسے کمزور کر دیا تھا۔ اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ یہ سفر پورے چھ سو میل کا تھا۔ جمی کو یقین نہیں تھا کہ اس سفر کے بعد وہ زندہ اپنی

منزلِ پر پہنچ سکے گا۔ اُس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بھی جیسے سلب ہو گئی تھیں۔
دو دن اور دو رات کے انتہائی ہولناک سفر کے بعد تو اس کی زندگی ایک مسلسل عذاب بن گئی تھی۔ اذیت اتنی شدید تھی کہ اسے لگتا تھا جیسے اس پر جان کنی کی کیفیت طاری ہو گئی ہے اور اب کسی وقت بھی اُس کی رُوح قبض ہو سکتی ہے۔ عذاب اتنا شدید تھا کہ موت کا تصوّر بھی اُسے نہایت دلفریب معلوم ہو رہا تھا۔ اس کیفیت سے گزرتے ہوئے اس کی سمجھ میں اچھی طرح آ گیا تھا کہ آخر ڈاک لے جانے والی ان گاڑیوں میں مسافروں کے لیے ان کے تندرست و توانا ہونے پر کیوں زور دیتے ہیں۔
اگلی صبح طلوع ہونے کے ساتھ ہی گاڑی کارو کے علاقے میں داخل ہوئی۔ یہ علاقہ سنگلاخ اور بنجر تھا۔ دُور دُور تک روئیدگی کا پتا نہیں تھا ایک وسیع و عریض پتھریلا میدان تھا جس پر گاڑی بس بھاگتی چلی جا رہی تھی اور سر پر بے رحم آسمان آگ برسا رہا تھا۔ تینوں مسافروں کی حالت گرمی سے تباہ ہو چکی تھی۔ ریت کے جھکڑ ان کے چہروں پر جیسے گھونسے مار رہے تھے اور بڑی بڑی موٹی سیاہ مکھیوں نے ان کی زندگی کو اور بھی عذاب ناک بنا دیا تھا۔ وہ جیتے جی جہنم میں جھونک دیئے گئے تھے۔ ان کے دل میں ہیرے حاصل کرنے کی آرزو نہ ہوتی تو ان کے حوصلے کب کے ٹوٹ چکے ہوتے۔
کبھی کبھار جمی آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا تو اسے کئی لوگ پیدل چلتے نظر آتے۔ کچھ لوگ گھوڑوں پر بھی سفر کر رہے تھے اور ان سب کے بعد وہ مسافر گاڑیاں تھیں جنہیں بیل یا گھوڑے اور خچر کھینچ رہے تھے جنہیں ہانکنے کے لیے گاڑی بان ٹخ ٹخ کی آوازیں بلند کرتے رفتار بڑھانے کے لیے چمڑے کے لمبے تسمے والے ہنٹر جانوروں پر برساتے۔
بالآخر ان لوگوں کو سنگلاخ ماحول سے نجات ملی۔ اب ہر طرف سبزہ تھا۔ درخت بلند و بالا اور سائے دار تھے۔ زمین کا رنگ بھی سُرخ تھا۔ لمبی لمبی گھاس ہوا کے جھونکوں سے لہریں لے رہی تھی۔ "میں بالآخر کلپ پہنچ ہی جاؤں گا۔ میں ضرور وہاں پہنچوں گا" جمی نے خود کو ہمت دلائی۔ امید پھر اس کے جسم میں سرایت کرنے لگی تھی۔
وہ چار دن اور چار راتیں مسلسل سفر میں رہنے کے بعد پانچویں دن کلپ کے مضافات میں داخل ہوئے۔ جمی کو معلوم نہیں تھا کہ یہاں اس کے استقبال کے لیے کیا عذاب بانہیں پھیلائے کھڑے ہیں۔ اس نے تھکی تھکی سُرخ آنکھوں سے ماحول کا جائزہ لیا۔ یہاں اس نے جو منظر دیکھا وہ ایسا تھا جو اس کے تمام تر خیالوں اور تصوّرات سے مختلف تھا۔ یہ تو خیموں کا شہر تھا۔ جدھر بھی نظر جاتی خیمے ہی خیمے نصب تھے یا پھر وہ گاڑیاں تھیں جو قصبے کی سڑکوں اور دریائے وال کے کنارے کنارے کھڑی تھیں۔ یہاں بھی بھانت بھانت کے، مختلف نسلوں، رنگوں اور ملکوں کے لوگ تھے۔ قصبے کے مرکز میں لوہے اور ٹین کی چار دیواریوں پر مشتمل دکانیں تھیں ایک طرف سڑک کے کنارے رائل ہوٹل تھا۔
جمی ڈاک گاڑی سے اُترا اور زمین پر گر گیا۔ ایک ہی انداز میں مڑے مڑے اس کی ٹانگیں بے جان سی ہو گئی تھیں۔ انہوں نے اس کا وزن برداشت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ایسا گرا کہ پھر نہ اُٹھ سکا۔ اس کا سر بُری طرح چکرا رہا تھا۔ کچھ دیر وہ وہیں پڑا رہا، اپنی ٹانگوں کو حرکت دیتا رہا۔ جب اسے ٹانگوں میں کچھ جان محسوس ہوئی تو وہ بمشکل تمام کھڑا ہوا اور لڑکھڑاتا ہوا ہوٹل کی طرف بڑھ گیا۔
یہاں اُسے جو کمرہ ملا وہ چھوٹا تھا۔ گرمی سے بُری طرح تپ رہا تھا اور ہر طرف مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں، لیکن سب سے اچھی بات یہ تھی کہ اس کمرے میں ایک چارپائی تھی۔ جمی اسی طرح پلنگ پر ڈھیر ہو گیا۔ چند ہی لمحوں میں اس کی آنکھ لگ گئی۔
اور پھر وہ اٹھارہ گھنٹے تک گہری نیند سوتا رہا۔
جب وہ بیدار ہوا تو اس کا تمام جسم اکڑا ہوا تھا اور بُری طرح دُکھ رہا تھا۔ مگر اس کی رُوح بے پایاں مسرت سے سیراب تھی اُسے خوشی تھی کہ آخرکار وہ اپنی منزل پر پہنچ ہی گیا ہے۔ یہی تو وہ مقام تھا جہاں ہیرے پائے جاتے تھے، جہاں اُس کے خواب پوشیدہ تھے۔ اس کے تمام دلدّر دُور ہونے والے تھے۔ اُسے یقین تھا کہ بہت جلد وہ یہاں سے ایک لکھ پتی کی حیثیت سے رخصت ہوگا۔
بھوک پوری شدت سے چمک اٹھی تھی۔ وہ ہوٹل سے نکل کر سڑک کے پار ایک ریستوران پہنچا۔ ریستوران میں ہر طرف اجنبی اور نت نئے چہرے موجود تھے۔ بیرے کو آرڈر دے کر اس نے ریستوران میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا ایک نظر جائزہ لیا۔ یہ سب کے سب ہیروں کی تلاش میں یہاں آئے تھے اور سب کے سب اسی موضوع پر نہایت پُرجوش انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔
"..... ہوپ ٹاؤن میں اب ہیرے باقی نہیں رہے۔ سُنا ہے اس کے شمال میں بیس میل دُور ہیروں کے نئے ذخائر دریافت ہوئے ہیں"
"..... مجھے باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جو برگ میں باقی تمام جگہوں سے زیادہ ہیرے ہیں"
"..... میں نے سُنا ہے اتنے ہیرے ہیں، اتنے ہیرے ہیں کہ کچھ کہا نہیں جا سکتا" جمی اس شہر کا نام نہیں سُن سکا تھا۔

جمّی اپنی نشست پر بیٹھا یہ باتیں سنتا رہا۔ اس کا دل خوشی سے بلیوں اُچھل رہا تھا۔ وہ اپنی منزل پر آگیا تھا۔ یہ وہ سرزمین تھی جہاں ہر طرف ہیرے ہی ہیرے تھے۔ اس گفتگو سے اس کے جسم میں ایک سنسنی سی پھیل گئی۔ اس نے کھانے کے لیے جو کچھ منگوایا تھا اسی جوش کی وجہ سے وہ اچھی طرح کھا بھی نہیں سکا اور پھر جب بل آیا تو وہ کپکپا کر رہ گیا۔ اس کے تصوّر میں بھی نہ تھا کہ اتنی معمولی اور گھٹیا خوراک اتنی مہنگی ہوگی۔ دو پونڈ تین شلنگ کوئی معمولی رقم نہ تھی لیکن اب وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ بل کی رقم ادا کرتے ہوئے اُس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اب اتنی فضول خرچی نہیں کرے گا۔ اس کے پاس بہت تھوڑی رقم تھی جسے وہ نہایت احتیاط سے خرچ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اُٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اس نے ایک آواز سُنی "ہیلو جمّی! اب بھی تم امیر بننے کا منصوبہ بنا رہے ہو؟"

یہ ولسن تھا۔ وہی نوجوان جو ڈاک گاڑی میں اس کے ساتھ آیا تھا۔ جمّی نے اس سے بڑے اعتماد سے کہا؟ ہاں، میں صرف منصوبہ نہیں بنا رہا ہوں، اُس پر عمل کرنے کا تہیّہ بھی کر چکا ہوں۔"

"تو پھر آؤ۔ وہاں چلیں جہاں ہیرے پائے جاتے ہیں۔ وال کے کنارے چلو۔"

جمّی کھڑا ہو گیا۔ "آؤ چلو۔"

وہ دونوں ریستوران سے باہر آگئے۔

یہ قصبہ پہاڑوں سے گھِری ہوئی وادی میں تھا۔ دُور دُور تک کہیں بھی سبزہ نہ تھا، ہر چیز ننگی اور اُجاڑ تھی۔ کہیں گھاس کا ایک تنکا بھی نہ تھا۔ سُرخ سُرخ دھُول کے مرغولے تھے جو ہر طرف بلند ہو رہے تھے۔ اُن کی وجہ سے سانس لینا بھی دوبھر تھا۔ دریائے وال کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ جُوں جُوں وہ دریا کے قریب ہوتے گئے ہوا خنک ہوتی گئی۔ دریا کے دونوں کناروں پر ہیرے تلاش کرنے والے سینکڑوں آدمی موجود تھے۔ کچھ لوگ ہیروں کی تلاش میں کھُدائی کر رہے تھے۔ کچھ پتھروں کو توڑ رہے تھے کہ شاید ان کے سینے سے کوئی ہیرا برآمد ہو جائے۔ کچھ لوگ لکڑی کی بوسیدہ میزوں پر پتھروں کو چھانٹ رہے تھے۔ یہ سب کے سب مختلف قسم کے آلات اور سامان سے لیس تھے۔ کسی کو اپنی ذات کا ہوش نہ تھا، نہ کسی سے غرض تھی۔ ان کے لباس خاک آلُود تھے، پھٹے ہوئے تھے لیکن ایک دیوانگی اور جنون ان سب میں مشترک تھا۔ ایسی ہی دیوانگی، ایسا ہی جنون ایک کوہکن نے سینکڑوں برس پہلے محسوس کیا تھا اور چٹانوں کو تراش کر جوئے شیر نکالی تھی۔ یہ سب کوہکن تھے۔ اور جمّی بھی تو ایک کوہکن تھا۔ فرق اتنا تھا کہ اس کی شیریں کوئی گوشت و پوست کی حسینہ نہ تھی، اس کی شیریں تو اس کے وہ خواب تھے جو اس نے امیر بننے کے لیے دیکھے تھے۔

وہ دونوں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے دریا کے کنارے پہنچے۔ یہاں انہوں نے ایک بوڑھے اور ایک لڑکے کو ایک بہت بڑے پتھر کو ہٹانے کی کوشش میں مصروف دیکھا۔ پتھر بہت بھاری تھا اور وہ دونوں اسے اپنی جگہ سے کھسکانے میں اپنی پوری طاقت صرف کر رہے تھے۔ وہ پسینے میں شرابور ہو رہے تھے۔ ان کی سانس دھونکنی کی مانند چل رہی تھی۔

جمّی کے چہرے پر ایک مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ان دونوں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک اور جماعت ایک گاڑی میں مٹی بھر رہی تھی۔ اس مٹی کو وہ چھاننا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید اس ریت اور مٹی میں انہیں ہیرے مل جائیں گے۔ ان سے کچھ فاصلے پر ایک اور جماعت تھی۔ دو آدمیوں نے ایک بڑی سی چھلنی تھام رکھی تھی جس میں مٹی اور ریت بھری ہوئی تھی۔ وہ دونوں اس چھلنی کو زور زور سے ہلا رہے تھے اور تیسرا ساتھی دریا سے بالٹی میں پانی لا کر اس چھلنی میں ڈال رہا تھا جس کے ساتھ مٹی چھلنی سے بہتی جا رہی تھی۔ اس عمل کے بعد جو رنگین پتھر چھلنی میں باقی رہ جاتے انہیں ایک میز پر ڈال دیا جاتا۔ اس کے بعد وہ تینوں نہایت شوق اور اشتیاق سے ان پتھروں کا بغور جائزہ لیتے کہ شاید قسمت نے یاوری کی ہو اور ہیرے ان کی جھولی میں ڈال دیے ہوں۔ جمّی نے مسکراتے ہوئے کہا: "یار یہ تو بہت آسان معلوم ہوتا ہے۔"

"اس پر نہ جاؤ جمّی! اب یہاں کچھ نہیں رہا۔ یہاں جتنے بھی لوگ تم دیکھ رہے ہو، یہ سب مزاج کے اعتبار سے جواری ہیں۔ محنت کے قائل نہیں۔" ولسن نے اس انداز میں یہ بات کہی جیسے وہ کوئی نہایت راز کی بات بتا رہا ہو۔

"کیا مطلب؟" جمّی نے پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے، اس علاقے میں کتنے لوگ ہیرے تلاش کر رہے ہیں؟ یہ سب کے سب امیر بننے کے خواہش مند ہیں۔ ان کی تعداد بیس ہزار ہے۔ اب تم ہی بتاؤ ایسی صورت میں یہاں کیا باقی رہا ہوگا۔ اگر یہاں کبھی ہیرے ہوں گے بھی تو اب تک ختم ہو چکے ہوں گے۔ اس کے باوجود یہ لوگ ہیں کہ سردیوں میں ٹھٹھرتے ہیں، گرمی میں جھلستے اور تپتے ہیں، برسات میں بھیگتے ہیں، ریت پھانکتے ہیں، اور سیاہ بڑی مکھیوں کو برداشت کرتے ہیں، بدبو اور تعفّن میں سانس لیتے ہیں۔ نہ دن کو چین ہوتا ہے نہ رات کو آرام وہ بستر میسّر آتا ہے۔

نہ اچھا کھانا ملتا ہے، نہ اچھا مشروب نصیب ہوتا ہے۔ یہ سب بیک وقت اتنے عذاب جھیلتے ہیں، صرف اس امید پر کہ شاید قسمت کی دیوی ان پر مہربان ہو جائے۔ یہ لوگ نئے ذخائر تلاش نہیں کرتے اور پھر معلوم ہے کیا ہوتا ہے۔ ہر ہفتے اس دریا میں لوگ ڈوب مرتے ہیں۔ بعض لوگ حادثات کا شکار بھی ہوتے ہیں لیکن بیشتر لوگ خودکشی کرتے ہیں، اس لیے کہ اس مسلسل عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنے کا یہی ایک راستہ رہ جاتا ہے۔ وہ اس جہنم سے نجات پانے کے لیے خودکشی کرتے ہیں۔ پھر بھی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ آخر یہاں کیوں قسمت آزمائی کرتے ہیں۔ یہ تو سراسر جوا ہے۔"

"یہ سب اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈ رہے ہیں میرے یار!" جمی نے کہا۔

"تمہارے کیا ارادے ہیں؟" ولسن نے پوچھا۔

"فی الحال میں اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے کے لیے ضروری سامان خریدنا چاہتا ہوں۔" جمی نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

☆

قصبے کے عین وسط میں ایک وسیع و عریض دکان تھی۔ جس پر ایک زنگ آلود بورڈ لگا ہوا تھا "جوزف جنرل اسٹور"۔ اس اسٹور کے سامنے ایک طویل مضبوط کاٹھی کا سیاہ فام شخص گاڑی سے سامان اتارنے میں مصروف تھا۔ اس کے شانے چوڑے تھے اور جسم میں مچھلیاں بجلی کی طرح تڑپتی نظر آتی تھیں۔ اس علاقے میں جمی کو اب تک ایسے خوبصورت جسم والا کوئی اور شخص نظر نہیں آیا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ اس کے انداز سے ایک وقار اور رکھ رکھاؤ ٹپکتا تھا۔ اس نے گاڑی سے رائفلوں سے بھری ہوئی ایک بھاری لکڑی کی پیٹی اٹھائی۔ وہ مڑا ہی تھا کہ زمین پر پڑے ہوئے ایک چھلکے پر پیر پڑنے سے پھسل کر لڑکھڑا گیا۔ جمی نے بڑھ کر ہاتھ سے سہارا دے کر اسے متوازن کر دیا۔ سیاہ فام نے تشکر کے لیے جمی کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور پیٹی لے کر اسٹور کے اندر چلا گیا۔

سڑک سے گزرنے والے ایک شخص نے کہا۔ "یہ بانڈا تھا۔ شوزی قبیلے کا ہے۔ مسٹر جوزف کا ملازم ہے۔ معلوم نہیں انہوں نے اسے کیوں رکھا ہوا ہے۔" اس نے نفرت سے زمین پر تھوکتے ہوئے افریقہ کے سیاہ فاموں کو نہایت غلیظ سی گالی دے کر کہا۔ "..... یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ ساری زمین ان کی ملکیت ہے اور ہم ڈاکو اور لٹیرے ہیں۔" یہ تبصرہ کر کے وہ شخص آگے بڑھ گیا۔

جمی اسٹور میں داخل ہوا۔ اندر نیم تاریکی اور خنکی تھی۔ گرم، روشن تپتی سڑک کے بعد یہ ماحول جمی کو بہت خوشگوار محسوس ہوا۔ اسٹور میں عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اسٹور طرح طرح کے سامان سے پٹا پڑا تھا۔ جمی ان چیزوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ یہاں ہر چیز تھی۔ زرعی آلات بھی تھے۔ بیئر، دودھ اور اشیائے خورد و نوش کے ڈبے بھی۔ یہاں سیمنٹ کی بوریاں بھی تھیں اور ڈائنامائٹ، بارود اور فیوز بھی۔ کراکری بھی تھی اور فرنیچر بھی۔ غرض ہر چیز اس اسٹور میں موجود تھی۔ یہ اسٹور اپنے مالک کی امارت کا مظہر تھا۔

"میں آپ کی کچھ مدد کر سکتی ہوں؟" جمی نے عقب سے ایک نرم اور مترنم آواز سنی۔

جمی نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ایک پندرہ سالہ نوجوان اور خوبصورت دوشیزہ تھی۔ "میں ہیروں کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ ضروری سامان چاہیے۔"

لڑکی نے بڑی متانت سے کہا۔ "آپ کو جو سامان چاہیے اس کی فہرست بنا دیں، میں نکلوا دوں گی۔"

بس ایک خواہش تھی جو جمی کے دل میں پیدا ہوئی کہ اس لڑکی کو متاثر کیا جائے۔ "سامان۔ بس وہی جس کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"پھر بھی، آخر کن چیزوں کی ضرورت ہے آپ کو؟" لڑکی بھی شاید اسے پریشان کرنے پر تل گئی تھی۔

"میرا مطلب ہے بیلچہ۔" جمی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"بس بیلچہ؟ کیا اس سے کام چل جائے گا؟" لڑکی کے لہجے میں شرارت تھی۔

جمی ہنسا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ میں اس معاملے میں بالکل نیا ہوں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ مجھے کس کس چیز کی ضرورت ہے۔"

لڑکی بھی جواباً ہنسی۔ "سامان کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ ہیروں کی تلاش میں کس مقام کی طرف جانا چاہتے ہیں مسٹر....."

لڑکی کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"میرا نام جمی ہے۔" اس نے بتایا۔

"اور میرا نام مارگریٹ ہے۔ میں اسٹور کے مالک جوزف کی بیٹی ہوں۔"

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر" جمی نے ہولے سے کہا۔
لڑکی نے پیچھے اسٹور کا جائزہ لیتے ہوئے آہستگی سے پوچھا "آپ یہاں کب آئے؟"
"کل ہی یہاں پہنچا ہوں۔ ڈاک گاڑی سے۔" جمی نے بتایا۔
"ڈاک گاڑی سے! آپ کو کسی نے بتایا نہیں کہ یہ بہت خطرناک سفر ہے۔ کئی لوگ مر چکے ہیں۔" لڑکی نے غصّے سے کہا۔
جمی مسکرا کے بولا "اس میں کسی کا قصور نہیں۔ ویسے بھی میں یہاں زندہ سلامت موجود ہوں۔"
"ولندیزی ہوتے تو کب کے مر چکے ہوتے۔"
"اس کا مطلب ہے تم ولندیزی ہو؟ میرا تعلق اسکاٹ لینڈ سے ہے۔"
"تم نہ بتاتے جب بھی میں نے اندازہ لگا لیا تھا۔" لڑکی نے ایک مرتبہ پھر اسٹور کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھوں میں انجانا سا خوف تھا۔ "جمی یہاں ہیرے ضرور پائے جاتے ہیں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تم احتیاط سے کام لو۔ اگر تم واقعی امیر ہونا چاہتے ہو تو کوشش کرو کہ کسی کی مدد اور شرکت کے بغیر اپنے طور پر ہیروں کا علاقہ تلاش کرو۔ ورنہ تمہاری سب کوششیں رائیگاں جائیں گی۔ یہاں لوگ دولت مند بننے کے خیال سے آتے ہیں۔ دوسروں کے لیے کام کرتے ہیں اور غریب کے غریب رہتے ہیں۔ پھر یہاں سازشیں بھی بہت ہیں ہر شخص دوسرے کے مال پر نظر رکھتا ہے۔ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔" لڑکی نے بڑے خلوص سے اُسے سمجھایا۔
"تو پھر تم ہی میری کچھ مدد کرو۔" جمی نے کہا۔
"اس سلسلے میں میرے والد ہی تمہاری کچھ مدد کر سکتے ہیں۔ وہ آدھ گھنٹے میں فارغ ہو جائیں گے۔" لڑکی نے بتایا۔
"ٹھیک ہے، میں تھوڑی دیر بعد یہاں آؤں گا۔" جمی نے کہا اور باہر نکل آیا۔
جمی یونہی سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا تھا کہ ایک جگہ اس کی نظر بورڈ پر پڑی۔ یہ حمام تھا۔ یہاں ٹھنڈے اور گرم پانی سے نہانے کا انتظام تھا۔ جمی حمام میں گھس گیا۔ چند پیسے بچانے کی خاطر اس نے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور باہر آ گیا۔ اب اس کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ غسل کے بعد وہ خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ وہ ایک چھوٹے اور سستے ریستوران میں گھس گیا۔ یہاں بھی ہر وقت دولت مند بننے کے خواب دیکھ کر آنے والوں کا ہجوم تھا۔ سب کا موضوعِ گفتگو ایک ہی تھا۔ جمی کھانا کھاتا رہا اور ان کی باتیں سنتا رہا۔
"....سُنا ہے کولز میں کسی شخص کو اکیس قیراط وزنی ہیرا ملا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں اور بھی ہیرے ہیں۔"
"....میٹز میں بھی ہیروں کے نئے ذخائر دریافت ہوئے ہیں۔ میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔"
"....تم تو بے وقوف ہو۔ بڑے بڑے ہیرے تو دریائے اورنج میں پائے جاتے ہیں۔"
اچانک جمی کی توجہ بارٹینڈر کی طرف مبذول ہو گئی جو بڑے رازدارانہ انداز میں ایک شخص سے باتیں کر رہا تھا۔ "....میں یہاں ملازمت اس لیے کر رہا ہوں کہ کچھ رقم میرے پاس جمع ہو جائے تو اورنج دریا کی طرف نکل جاؤں۔" بارٹینڈر نے میز کی سطح کو ایک میلے کپڑے سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن تمہیں میرا مشورہ یہی ہے کہ جا کر جوزف سے ملو۔ یہاں ان کا سب سے بڑا جنرل اسٹور ہے۔ وہ اس قصبے کے نصف کا مالک ہے۔ بہت امیر آدمی ہے وہ۔"
"جوزف کا اسٹور میں نے دیکھ رکھا ہے، لیکن اس سے مل کر مجھے کیا فائدہ ہوگا؟"
"اگر تم اسے پسند آ گئے۔ اگر وہ تم پر مہربان ہو گیا تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔ ہیروں کی تلاش میں تمہارا ساتھ دے گا۔"
"کیا واقعی؟ ایسا ہو جائے تو میں اسے اپنی خوش بختی سمجھوں گا۔"
"ہاں۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی لوگوں کی مدد کر چکا ہے۔ تم محنت کرو گے اور وہ سرمایہ لگائے گا۔ جو ہیرے ملیں گے۔ وہ تم دونوں آدھے آدھے بانٹ لینا۔ وہ تمہیں یہ بھی بتائے گا کہ کہاں پر ہیرے مل سکتے ہیں۔ اُس کے ساتھ کام کرنے میں ہی تو فائدہ ہے۔" بارٹینڈر نے رازدارانہ انداز میں اُسے بتایا۔
جمی کے خیالات بہت تیزی سے اِدھر اُدھر بھٹکنے لگے۔ اس کے پاس اب صرف ایک سو بیس پونڈ کی قلیل رقم بچی تھی۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ وہ اس رقم سے تمام ضروری سامان خرید لے گا لیکن یہاں تو ہر چیز کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ اگر ایسی صورت میں اسے کسی امیر شخص کی حمایت حاصل ہو جائے تو وہ اپنے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کر سکتا تھا۔ یہ سوچ کر جمی اٹھا۔ کھانے کا بل ادا کیا اور باہر آ گیا۔ اس کا رُخ جوزف کے اسٹور کی طرف تھا۔
جمی اسٹور میں داخل ہوا تو جوزف کاؤنٹر کے پیچھے موجود تھا۔ وہ ایک پیٹی سے رائفلیں نکال کر رکھ رہا تھا۔

"مسٹر جوزف!" جمّی نے قریب پہنچ کر کہا۔
"کیا بات ہے؟" وہ رائفل میز پر رکھ کر غرایا۔
"میرا نام جمّی ہے۔ میں ہزاروں میل دُور سے یہاں آیا ہوں، ہیروں کی تلاش میں۔"
"اچھا، پھر۔" اُس کے لہجے میں تضحیک کا عنصر نمایاں تھا
"میں نے سُنا ہے کہ آپ مجھ جیسے لوگوں کی مدد کیا کرتے ہیں۔" جمّی نے کہا۔
"اُف میرے خدا! آخر یہ کہانیاں کون گھڑتا رہتا ہے۔ میں نے چند ایک افراد کی مدد ضرور کی ہے لیکن....."
"سُنیے جناب! میں نے ایک سو بیس پونڈ اب بھی بچا کر رکھے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ اس رقم سے میں ضروری سامان خرید لوں گا لیکن یہاں تو ہر چیز بے پناہ مہنگی ہے جناب، میں ایک بیلچہ لے کر بھی ہیروں کی تلاش میں نکل سکتا ہوں، اور یقیناً ایسا ہی کروں گا۔ لیکن میرا خیال تھا کہ اگر آپ جیسے کسی شخص سے مجھے ایک خچّر اور مناسب سامان مل جائے تو میری کامیابی کے امکانات بہت روشن ہو جائیں گے۔"
جوزف نے اپنی سیاہ آنکھوں سے بغور اُس کا جائزہ لیا اور نرمی سے بولا۔ "آخر تمہیں یہ یقین کیوں کر ہے کہ تم ضرور ہیرے تلاش کر لوگے۔"
"دیکھیے جناب، میں نصف دنیا کا سفر کر کے یہاں پہنچا ہوں۔ میں نے تہیّہ کر رکھا ہے کہ یہاں سے دولتمند بنے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔ اگر اس علاقے میں ہیرے پائے جاتے ہیں تو میں یقیناً ہیروں کو حاصل کر کے رہوں گا۔ اگر آپ نے میری مدد کی تو پھر ہم دونوں ہی فائدے میں رہیں گے۔"
جوزف نے اپنی عقابی نظروں سے ایک مرتبہ پھر جمّی کی شخصیت کو پرکھا۔ "ہوں.. تو تم یہاں تک بیل گاڑی سے آئے ہو۔"
"نہیں۔ میں ڈاک گاڑی سے یہاں پہنچا ہوں۔"
اُس نے ایک مرتبہ پھر جمّی کو دیکھا۔ اس مرتبہ ان آنکھوں میں جمّی کے لیے تحسین کے جذبات تھے۔
"ٹھیک ہے، ہم اس معاملے پر مزید بات چیت کریں گے۔" جوزف نے فیصلہ سنا دیا۔
شام کو کھانے پر اُن دونوں میں اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ یہ ملاقات جوزف کے گھر میں ہوئی جو اسٹور کے عقب میں تھا۔ گھر کیا ایک بڑا سا کمرہ تھا۔ جو کچن بھی تھا، کھانے کا کمرہ بھی اور بیٹھک بھی۔ ایک طرف پردے پڑے ہوئے تھے جن کے پیچھے دو چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں ایک میز پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ یہ میز بھی کیا تھی، دو خالی پیٹیوں پر تختے رکھے ہوئے تھے۔ جمّی خوب اچھی طرح اندازہ لگا چکا تھا کہ جوزف نہایت کنجوس اور خسیس آدمی ہے۔ اس کا شاید یہی اصول تھا کہ چمڑی جائے تو جائے دمڑی نہ جائے۔ اُس کی بیٹی دبے قدموں اِدھر اُدھر آجا رہی تھی۔ وہ کھانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ کبھی کبھار وہ اپنے باپ کو بھی دیکھ لیتی۔ لیکن اُس نے ایک مرتبہ بھی جمّی کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ بہت خوفزدہ اور سہمی ہوئی تھی، مگر کیوں؟ یہ سوال جمّی کے ذہن میں بار بار کچوکے لگا رہا تھا۔
کھانے سے فارغ ہو کر اُن کی گفتگو کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ جوزف کہہ رہا تھا۔ "ہیروں کی تلاش میں یہاں آنے والے لوگ بے وقوف اور احمق ہیں۔ ہیرے اس علاقے میں نہیں ملتے۔ برسوں آدمی محنت کرتا رہے، اپنی کمر توڑتا رہے لیکن اُسے کچھ ہاتھ نہیں لگ سکتا۔"
"مگر....."
"اگر مگر کچھ نہیں صاحبزادے، میری بات غور سے سُنو۔" جوزف نے بگڑ کر کہا۔ "یہاں سے شمال میں جریقہ قبیلہ آباد ہے۔ اس قبیلے کے لوگوں نے ہیرے کی کان دریافت کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہاں ہیرے وافر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اس قبیلے کے لوگ اکثر میرے پاس ہیرے لے کر آتے ہیں اور ان کے بدلے سامان لے جاتے ہیں۔" یہ کہتے کہتے اس کی آواز سرگوشیوں میں تبدیل ہو گئی "میں جانتا ہوں کہ ہیروں کا وہ ذخیرہ کہاں ہے۔"
"اگر یہی بات ہے تو پھر آپ خود ان کی تلاش میں کیوں نہیں جاتے؟" جمّی نے سوال کیا۔
جوزف نے غور سے جمّی کو دیکھا اور بولا۔ "میں اپنا یہ اسٹور چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ میں یہاں سے گیا تو لوگ اسے لُوٹ لیں گے۔ میں ایک ایسے شخص کی تلاش میں ہوں جو ایماندار ہو، جس پر میں اعتماد کر سکوں اور جو وہاں سے میرے لیے ہیرے تلاش کر کے لائے۔ جب بھی مجھے ایسا آدمی ملا، میں اسے تمام ضروری سامان فراہم کر دُوں گا۔ میں اتنے ہیرے لے کر لوٹوں گا کہ آپ تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔"

جوزف نے فوراً ہی کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بس خاموشی کے ساتھ گہری سیاہ آنکھوں سے اُسے گھورتا رہا۔ اس کی یہ خاموشی جمی کے لیے بڑی تکلیف دہ تھی۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے جواب کے انتظار میں اُسے صدیاں بیت گئی ہوں۔

"ٹھیک ہے۔ صبح معاہدہ ہو جائے گا۔" جوزف نے آخر کار جواب دیا۔

اس رات جمی جب اپنے ہوٹل واپس آیا تو بہت خوش تھا۔

اگلے روز صبح جمی نے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ معاہدہ جنوبی افریقہ کی مخصوص سرکاری زبان افریکانا میں لکھا گیا تھا۔ جمی اس زبان سے ناواقف تھا۔

"میں تمھیں اس معاہدے کی شرائط بھی بتا دوں۔" جوزف نے نرم لہجے میں کہا۔ "اس میں کہا گیا ہے کہ ہم دونوں اس معاہدے میں برابر کے شریک ہیں۔ میں سرمایہ لگاؤں گا اور تم محنت کرو گے۔ جو ہیرے بھی تم تلاش کر کے لاؤ گے۔ وہ ہم آدھے آدھے بانٹ لیں گے۔"

جمی نے ایک نظر معاہدے کو دیکھا جو اجنبی اور نامانوس زبان میں لکھا ہوا تھا۔ عبارت کے درمیان صرف ایک جگہ دو پونڈ کی رقم انگریزی ہندسوں میں لکھی تھی۔ جمی نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ جو دو پونڈ لکھے ہوئے ہیں، ان کا مطلب کیا ہے جناب؟"

"اس کا مطلب ہے کہ ملنے والے ہیروں میں سے نصف کے علاوہ تمھیں ہر ہفتے مزید دو پونڈ بھی اُس محنت کے عوض ملیں گے جو تم کرو گے۔ اگرچہ مجھے معلوم ہے کہ جس علاقے میں تم جا رہے ہو، وہاں ہیرے پٹے پڑے ہیں۔ پھر بھی ہو سکتا ہے کہ تم ہیرے نہ تلاش کر پاؤ۔ تو صاحبزادے، ایسی صورت میں تمھیں اپنی محنت کا کچھ نہ کچھ پھل تو مل ہی جائے گا۔" اس نے جمی کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

جوزف اس کی توقع سے زیادہ ہی مہربان اور انصاف پسند ثابت ہوا تھا۔ "شکریہ جناب! بہت بہت شکریہ!"

"شکریے کی کوئی بات نہیں۔" جوزف نے پھر اُس کی کمر تھپتھپائی۔ "آؤ اب تمھارے لیے ضروری سامان کا بھی انتخاب کر لیا جائے۔"

دو گھنٹے کے اندر وہ تمام سامان نکال لیا گیا جو جمی کو لے کر جانا تھا۔ اس سامان میں ایک چھوٹا سا خیمہ، ایک بستر، کھانا پکانے کا سامان، دو چھلنیاں، مٹی دھونے کا پانا، دو بیلچے، تین بالٹیاں اور کپڑوں کا ایک جوڑا شامل تھا۔

ان کے علاوہ ایک گینتی، لالٹین، تیل، ماچس کی ڈبیاں، صابن، خشک کھانے کے ڈبے، خشک پھل، شکر، کافی اور نمک بھی تھا۔ غرض ضرورت کی ہر چیز نکال لی گئی تھی۔ سیاہ فام نوکر بانڈا نے پشت پر باندھے جانے والے تھیلوں میں تمام سامان بھر دیا۔ اس دوران میں اس نے نہ تو جمی کی طرف دیکھا، نہ اُس سے ایک لفظ کہا۔ شاید یہ شخص انگریزی نہیں جانتا۔ جمی نے سوچا۔

"تمھارا خچر باہر کھڑا ہے۔ بانڈا اس پر سامان لاد دے گا۔" جوزف نے مسکرا کے کہا۔

"بہت بہت شکریہ جناب! میں۔۔۔"

جوزف نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اس سامان کے ایک سو بیس پونڈ بنتے ہیں۔ رقم میرے حوالے کر دو۔"

جمی نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ "جی کیا فرمایا آپ نے! آپ کو شاید یاد نہیں رہا۔ معاہدے کے مطابق تو سامان آپ کو فراہم کرنا ہے۔"

یہ سنتے ہی جوزف کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ درشتی سے بولا۔ "کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ تم کیا مجھے بے وقوف سمجھتے ہو کہ میں یہ تمام سامان اور ایک نہایت عمدہ خچر تمھیں دے کر تمھیں اپنا شریک بناؤں گا اور اس پر تمھیں دو پونڈ فی ہفتہ بھی دوں گا۔ اگر تم اس چکر میں ہو کہ بغیر کچھ کیے دولت مند بن جاؤ تو پھر کوئی اور در دیکھو۔" یہ کہہ کر جوزف نے ایک تھیلے سے سامان نکالنا شروع کر دیا۔

جمی پریشان ہو گیا۔ "نہیں نہیں جناب! میری بات کا بُرا نہ مانیے۔ ٹھیک ہے، میرے پاس اتنی رقم موجود ہے۔" یہ کہہ کر جمی نے چرمی تھیلی سے تمام رقم نکال کر اس کے سامنے کاؤنٹر پر ڈال دی۔

جوزف کچھ دیر کے لیے جھجکا، پھر بولا۔ "چلو ٹھیک ہے۔ شاید تم کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہ قصبہ دھوکے بازوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس لیے مجھے احتیاط کرنا ہی پڑتی ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب!" جمی نے متشکرانہ لہجے میں کہا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ اچھا ہی ہوا کہ جوزف فوراً ہی راضی ہو گیا۔ ورنہ اس کی مدد کے بغیر وہ کبھی ہیرے تلاش نہیں کر سکتا تھا۔

جوزف نے اس کے بعد جیب سے، ہاتھ کا بنا ہوا ایک نقشہ نکال کر جمی کو دیا اور سرگوشی میں بولا۔ "اس نقشہ میں وہ جگہ دکھائی گئی ہے جہاں تمھیں ہیرے مل سکتے ہیں۔ دریائے وال کے شمالی حصے میں ماگیر کے مقام پر تمھیں ہیرے تلاش کرنا ہوں گے۔"

جمی نے نقشہ لے لیا۔ اس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ "ماگیر یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"یہاں ہم فاصلے کو وقت کے حساب سے ناپتے ہیں۔" جوزف نے کہا۔ "خچر پر تم وہاں چار یا پانچ دن میں پہنچ جاؤ گے۔ وہاں سے واپسی پر تمہیں زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں۔ کیونکہ تمہارے ساتھ ہیروں کا بوجھ بھی ہوگا۔"

"ٹھیک ہے جناب!" جمی نے جواب دیا۔

اور پھر ہر طرح لیس ہو کر جمی وہاں سے روانہ ہوا تو وہ صرف ایک سیاح نہیں تھا۔ وہ ان ہزاروں افراد میں سے ایک تھا جو ہیروں کی تلاش میں یہاں آئے تھے۔

رات کو جمی نے ایک چشمے کے قریب پڑاؤ کیا لیکن اُسے اچھی طرح نیند نہ آسکی۔ اجنبی ملک، اجنبی ماحول، ہر طرف سے عجیب و غریب آوازیں آرہی تھیں۔ پھر پریشان کُن خواب تھے۔ بار بار اُس کی آنکھ کُھل جاتی رات کے پچھلے پہر اُسے گہری نیند آئی۔ اتنی گہری نیند کہ خوفناک خوابوں کے باوجود اس کی آنکھ نہ کھل سکی۔

صبح جمی بیدار ہوا تو اس کا خچر مر چکا تھا۔

جمی کو یقین نہ آیا کہ قدرت اس کے ساتھ ایسا سنگین مذاق بھی کر سکتی ہے۔ خچر کے جسم پر زخم کا ایک نشان بھی نہ تھا کہ اسے یہی صبر آجاتا کہ رات کو کسی جانور نے اس پر حملہ کیا ہوگا۔ خچر تو شاید رات کو سوتے میں ہی مر گیا تھا۔ اس نے صورتِ حال پر غور کیا۔

واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ پیدل ہی قسمت آزمائی کرے گا۔ اچانک جمی نے آسمان میں پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنی۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ بہت سے گدھ آسمان میں منڈلا رہے تھے۔ ان بڑے بڑے سیاہ مردہ خور پرندوں کو دیکھ کر اس کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے جلدی جلدی اپنے سامان کو ازسرِنو ترتیب کیا۔ یہ ساری چیزیں لے کر جانا اب ناممکن تھا۔ وہ اب صرف اتنی چیزیں لے کر آگے جا سکتا تھا جن کا بوجھ اٹھا کر وہ چل سکتا تھا۔

پانچ منٹ بعد جب اس نے پلٹ کر اپنے پڑاؤ کو دیکھا تو وہاں سیاہ گدھ مردہ خچر کا جسم نوچنے میں مصروف تھے۔ جمی نے رفتار تیز کر دی۔ یہ منظر بڑا بھیانک تھا۔

یہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ اس مہینے میں جنوبی افریقہ میں موسم گرما شباب پر ہوتا ہے۔ آسمان میں بھڑکتا سورج زمین پر آگ برسا رہا تھا۔ جمی اپنے پڑاؤ سے بہت تیز قدمی سے چلا تھا لیکن پھر جوں جوں وقت گزرتا رہا۔ سیکنڈ منٹ میں، منٹ گھنٹوں میں اور گھنٹے دنوں میں تبدیل ہوتے گئے اس کی رفتار بھی سست ہوتی چلی گئی۔ اس کے دل پر نامعلوم بوجھ بڑھتا چلا گیا۔ جہاں تک نظر جاتی بس اونچی نیچی ناہموار چٹانوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ جہاں کہیں پانی کا کوئی چشمہ نظر پڑتا جمی وہاں قیام کر لیتا۔ رات ہوتی تو زمین پر پڑ رہتا۔ تھکن اس کے ہر ہر مسام میں بیٹھ گئی تھی۔ لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ جاتی مگر سکون اور چین کی نیند اُسے میسّر نہ آتی۔ خوفناک خوابوں سے چونک کر وہ اٹھ جاتا یا پھر جانوروں کی بھیانک آوازیں اُسے نیند سے جگا دیتیں۔

دو ہفتے کے سفر کے بعد جمی اس اجاڑ اور بے آب و گیاہ میدانی سلسلے کو پار کر سکا۔ اس دوران کئی مرتبہ ایسے لمحے بھی آئے جب اس نے سفر ترک کر کے خودکشی کا ارادہ کیا تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ اس جہنمی سفر کو وہ زندہ سلامت طے کر لے گا۔ اب وہ چل نہیں رہا تھا بلکہ اپنے وجود کو گھسیٹ رہا تھا۔ اس کے قدموں میں استقامت نہ تھی۔ وہ لڑکھڑاتا۔ گرتا پڑتا بس آگے ہی بڑھ رہا تھا۔ پھر ایک دن اس نے بہت فاصلے پر چار انسانی شبیہیں دیکھیں۔ یہ چاروں اس کی طرف آ رہے تھے۔ "میں شاید دیوانہ ہونے والا ہوں۔ شاید میں مرنے والا ہوں شاید میں مرنے والا ہوں۔ شاید . . . ." اسے یقین نہیں تھا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے وہ حقیقت ہے۔ اس کی ذہنی کیفیت بہت عجیب ہو رہی تھی۔ وہ لوگ قریب آتے چلے گئے تو جمی کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ یہ تصوّر ہی بہت دل خوش کن تھا کہ یہاں۔ اس جگہ انسانی زندگی موجود ہے۔ اس نے شاید برسوں بلکہ صدیوں بعد انسانوں کو دیکھا تھا۔ یہ چاروں بھی ہیروں کی تلاش سے نامراد لوٹ رہے تھے۔ وہ بے حد تھکے ہوئے، شکست خوردہ اور ناکام تھے۔

"ہیلو!" جمی نے کہا۔

انہوں نے جواب میں سر ہلائے "اے صاحبزادے! کدھر جا رہے ہو۔ وہاں کچھ نہیں رکھا۔ تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔" وہ چاروں یہ مشورہ دیتے ہوئے اس کے پاس سے گزر گئے۔

جمی نے سر کو جھٹک دیا۔ وہ جیسے اس مشورے کو ذہن سے جھٹک دینا چاہتا تھا۔ وہ بس آگے ہی آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ سورج سے برسنے والی آگ اور سیاہ مکھیاں ناقابلِ برداشت تھیں لیکن ان سے کوئی مفر بھی نہ تھا۔ اب وہ جس علاقے سے گزر رہا تھا وہ خار دار جھاڑیوں سے پٹا پڑا تھا۔ لیکن ہاتھیوں نے ان کی شاخوں سے تمام پتیاں نوچ کھائی تھیں۔ وہ چلتا رہا۔ چمکیلی دھوپ میں اب اس کے لیے آنکھیں کھولنا

بھی مشکل تھا۔ دھوپ نے اس کے جسم کو جھلس کر رکھ دیا تھا۔ اب ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے رنگین سے دھبے رقصاں رہتے۔ ذہن پر ایک دھندسی چھائی رہتی۔ ہر آتی جاتی سانس ایک آزار تھا۔ یوں لگتا جیسے اس کے پھیپھڑے پھٹ کر رہ جائیں گے۔ اس کے قدم من من بھر کے ہو گئے تھے۔ اُسے اپنا وجود گھسیٹنا دوبھر ہو رہا تھا۔ ایک روز سہ پہر کے وقت وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا۔ سہ پہر کا جھکتا سورج چمک رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب اُسے ہوش آیا تو یہ چمکتا ہوا گرم سورج اسے ایک بہت بڑا چمکدار ہیرا معلوم ہوا جو پگھل پگھل کر اس کی آنکھوں سے اس کے وجود میں اتر رہا تھا، اور اپنے ساتھ ساتھ جیسے اس کے وجود کو بھی پگھلائے دے رہا تھا۔ چند لمحے وہ اس کیفیت میں مبتلا رہا اور پھر جیسے اس کا تمام وجود تحلیل ہو گیا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی جب اُسے پھر ہوش آیا۔ صحرا کی خنکی سے اُس کا جسم بری طرح کپکپا رہا تھا۔ اس نے بمشکل تمام ایک ڈبہ کھول کر خشک پھل کھائے اور پانی پی کر اپنے جسم میں ہلکی سی توانائی محسوس کی۔ وہ جانتا تھا کہ رات کے وقت خنک لمحات میں اسے اپنے سفر کا کچھ نہ کچھ حصہ طے کرنا ہے لیکن اس کے جسم نے ساتھ دینا منظور نہ کیا۔ وہ تو بس یہ چاہتا تھا کہ بس ازل تک یہیں، اسی جگہ، اسی خنک ماحول میں لیٹا رہے اور یہ خنک رات کبھی نہ ختم ہو۔ وہ کچھ دیر اور سونا چاہتا تھا لیکن اس کے اندر سے ابھرنے والی ایک آواز بہت تیزی سے بہت شدت سے اُسے بتا رہی تھی۔ "جمی" اگر تو سو گیا۔ اگر تو نہ اٹھا تو پھر تو کبھی بیدار نہ ہو سکے گا۔ اگر تو سو گیا تو اگلے روز یہاں سے گزرنے والے تیری لاش دیکھیں گے، تو بھی ان سینکڑوں افراد کی طرح مر جائے گا جو ہیروں کی تلاش میں یہاں تک آتے تھے اور نامراد مر گئے تھے۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" جمی نے فیصلہ کن لہجے میں گویا اپنے وجود سے ابھرنے والی اس پکار کو جواب دیا اور ایک مرتبہ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے لیے اب اپنے تھیلے کو اٹھانا بھی دوبھر تھا۔ وہ بس اس تھیلے کو گھسیٹتا ہوا، لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ پھر اُسے یاد نہیں رہا کہ وہ کتنی مرتبہ لڑکھڑا کر گرا، کتنی مرتبہ اٹھا۔ لیکن وہ بس آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔

اور ایک دن جب وہ بے حد تھک گیا تھا اس نے طلوع ہوتے ہوئے سورج کو دیکھ کر آسمان کی طرف منہ کر کے چیخ کر کہا "اے خدا! اے خدا! سُن لے، میں جمی ہوں ۔۔۔ میں یہ سفر مکمل کر کے رہوں گا۔ میں زندہ رہوں گا۔ میں زندہ رہوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے پھر آگے بڑھنا شروع کر دیا۔

دو دن بعد جمی لڑکھڑاتا ہوا ماگیر کے گاؤں میں داخل ہوا۔ دھوپ نے اس کی جلد کو جھلس کر رکھ دیا تھا۔ اس کا جسم کئی جگہ سے چٹخ گیا تھا اور ان زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سوج کر بند ہو گئی تھیں۔ منزل پر پہنچنے کا تصور بڑا سکون بخش تھا۔ وہ ایک سڑک کے وسط میں لڑکھڑا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ گرتے وقت اسے یوں لگا کہ اگر اس کے جسم پر کپڑے نہ ہوتے تو وہ بکھر کر رہ جاتا۔ لوگوں نے ازراہِ ہمدردی جب اس کی کمر سے بندھے ہوئے تھیلے کو کھولنا چاہا تو وہ دیوانوں کی طرح ان سے جھگڑنے لگا۔ "نہیں، نہیں ۔۔ بھاگ جاؤ، یہ ہیرے میرے ہیں۔ میرے ہیرے ہیں۔ بھاگ جاؤ۔"

تین دن بعد اُسے ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک چھوٹے سے کمرے میں لیٹا پایا۔ اس کے تمام جسم پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس کے پاس ہی ادھیڑ عمر کی ایک عورت بیٹھی تھی۔

"مم ۔۔۔ میں ۔۔۔" وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکا۔

"پریشان نہ ہو۔ تم سخت بیمار تھے۔" یہ کہہ کر عورت نے اس کا سر ہاتھ کے سہارے سے اٹھایا اور پانی کا گلاس اس کے منہ سے لگا دیا۔

جمی نے پانی پینے کے بعد عورت سے پوچھا۔ "میں کہاں ہوں؟"

"تم ماگیر میں ہو۔" اس عورت نے جواب دیا۔ "میں ایلس ہوں۔ یہ میرا بورڈنگ ہاؤس ہے۔ فکر نہ کرو تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ تمہیں بس آرام کی ضرورت ہے۔ بس اب لیٹ جاؤ۔"

تب جمی کو یاد آیا کہ اس کے بے ہوش ہونے سے قبل کچھ لوگوں نے اس کا تھیلا چھین لینا چاہا تھا۔ "میرا سامان کہاں ہے؟"

"فکر نہ کرو بیٹا۔" اس عورت نے جواب دیا۔ "تمہارا سامان محفوظ ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے کمرے میں ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔

ایلس ایک بہت نیک دل عورت تھی۔ صرف جمی کے لیے ہی نہیں، بلکہ ماگیر کی نصف آبادی کے لیے وہ ایک رحمت تھی۔ اس گاؤں میں آنے والے لوگ سب ہی ہیرے تلاش کر کے امیر بننے کے خواب دیکھ کر آتے تھے۔ ایلس ان کے کھانے کا اہتمام کرتی۔ انہیں دلاسہ دیتی، ان کی حوصلہ افزائی کرتی۔ ایلس ایک انگریز عورت تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ اس کا شوہر بھی ہیروں کی تلاش میں یہاں آنے کے بعد بخار میں مبتلا ہو کر مر گیا تھا۔ شوہر کی موت کے بعد ایلس نے یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس گاؤں میں آنے والے مختلف ممالک

کے لوگ اس کے لیے بچوں کی مانند تھے۔ وہ ان سے ماں کی طرح پیار کرتی تھی کیونکہ خود اس کے کوئی اولاد نہیں تھی۔

ایلس نے جمی کو مزید چار دن بستر سے نہ اٹھنے دیا۔ وہ اپنے ہاتھ سے اُسے کھانا کھلاتی، اس کے جسم پر بندھی ہوئی پٹیاں تبدیل کرتی۔ پانچویں دن اس نے جمی کو پلنگ سے اٹھنے کی اجازت دے دی۔

"ماں جی!" جمی نے نہایت جذباتی لہجے میں ایلس سے کہا تھا "میں آپ کا بے حد شکرگزار ہوں۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ آپ کی میرے دل میں کتنی عزت ہے۔ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ لیکن یقین کرو کہ جب میں واپس آؤں گا تو آپ کو ایک بڑا سا ہیرا ضرور دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ جمی کا وعدہ ہے۔"

ایلس کے چہرے پر مادرانہ محبت سے شرابور مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے جمی کو دیکھا۔ بیماری سے وہ بہت نحیف اور کمزور ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس خوف اور دہشت کی پرچھائیاں تھیں جن ہولناک صعوبتوں سے وہ گزرا تھا اس کے باوجود یہ نوجوان عزم و ہمت کا پیکر تھا۔ اسے اپنے مقصد کے حصول میں کامیابی پر یقین تھا۔ "یہ لڑکا، باقی تمام لوگوں سے مختلف ہے۔" ایلس نے سوچا۔

دھلے ہوئے کپڑے بدل کر جمی ماگیر کی سیر کے لیے نکل گیا۔ یہ بھی ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ یہاں بھی ہر طرف خیمے نصب تھے، گاڑیاں تھیں اور سڑکیں کچی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے کیبن تھے جن میں دکانیں تھیں اور ہر طرف بھانت بھانت کے لوگ تھے۔ ایک ہوٹل میں بہت شور ہو رہا تھا۔ جمی اندر پہنچا۔ بہت سے لوگوں کے درمیان سرخ قمیص پہنے ہوئے ایک شخص سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے؟" جمی نے ایک دراز قد شخص سے پوچھا۔

"آج یہ شخص بہت امیر ہے۔ اس نے ہیروں کا ذخیرہ تلاش کیا ہے۔ اب یہ شخص سب کو دعوت دے گا۔"

"کیا مطلب؟"

"آج اس وقت اس ہوٹل میں جتنے بھی لوگ ہیں سب اس کے مہمان ہیں۔"

جمی ان لوگوں سے گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ وہ سب مصنوعی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ دل ہی دل میں اس شخص سے بغض اور حسد رکھتے تھے۔ اتنے بہت سے لوگوں میں صرف وہی تھا جس پر قسمت مہربان ہوئی تھی۔

"لگتا ہے تم بھی ہیروں کی تلاش میں آئے ہو۔ ہیروں کی تلاش میں، کیوں ہے نا یہی بات؟" دراز قد شخص نے نہایت حقارت سے کہا۔ "لیکن صاحبزادے یہاں تمہارا آنا فضول ہی ثابت ہوا ہے۔ اب یہاں کچھ نہیں رہا ہے۔ یہ علاقہ بنجر اور اجاڑ ہے۔"

اور پھر ان لوگوں نے دوسرے بسے علاقوں کا تذکرہ شروع کر دیا جہاں ہیروں کے لیے اب بھی قسمت آزمائی کی جا سکتی تھی۔ ہیروں کی تلاش میں آنے والے ہر شخص کی بس ایک ہی کہانی تھی۔ ناکامی اور نامرادی کی کہانی۔ یہ ٹھیک تھا کہ شدید محنت کے بعد انہیں چند ایک چھوٹے چھوٹے ہیرے مل جاتے تھے لیکن اتنے نہیں تھے کہ آدمی امیر ہو جاتا۔ غربت ختم ہو جاتی۔ وہ خواب پورے ہو جاتے جنہیں شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے وہ اتنے طویل سفر کے بعد یہاں پہنچے تھے اور جن کے لیے انہوں نے بے اندازہ محنت کی تھی۔ پھر یہ کہانیاں ایسی تھیں جن کی بنا پر جمی کے دل میں امید کے دیئے کی لو بھڑکتی رہی۔ ماگیر ملے جلے جذبات اور تاثرات کے حامل لوگوں کا گاؤں تھا۔ وہ جو مایوس ہو گئے تھے، یہاں سے واپسی کی تیاریاں کر رہے تھے اور وہ جو پُرامید تھے، یہاں پہنچ رہے تھے۔

جمی جانتا تھا کہ وہ مایوس ہو جانے والے لوگوں میں شامل نہیں ہے۔

تھوڑی دیر بعد جمی اس سرخ قمیص والے شخص کے پاس جا پہنچا۔ وہ اس وقت شراب کے نشے میں دھت تھا۔ جمی نے اسے جوزف کا دیا ہوا نقشہ دکھایا۔ اس شخص نے نقشے پر ایک نظر ڈال کر نقشہ جمی کو واپس کر دیا "بیکار ہے صاحبزادے۔ اس تمام علاقے کو لوگوں نے کھنگال ڈالا ہے۔ اب یہاں کچھ نہیں رکھا۔ میں تمہاری جگہ ہوتا تو کہیں اور جا کر قسمت آزمائی کرتا۔"

جمی کو اس شخص کی باتوں پر یقین نہ آیا۔ وہ تو جوزف کے نقشے کی وجہ سے ہی یہاں آیا تھا۔

"میرے خیال میں تو کولز میں اب بھی ہیرے ملنے کے زیادہ امکانات ہیں۔"

ایک اور شخص نے کسی اور جگہ کا نام لیا۔ اور پھر ہر شخص اُسے مشورے دینے لگا۔ جمی وہاں سے اٹھ گیا۔

✿

یہ باتیں بہت حوصلہ شکن تھیں۔ جمی اس صورت حال پر غور کرتا رہا۔ رات بھر اُسے نیند نہ آئی۔ آخر اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ جوزف کے نقشے کو بھول جائے گا۔ سب لوگوں کے مشورے کے برخلاف جمی نے مشرق کی سمت جانے کا فیصلہ کیا وہ دریا کے موڑ کے ساتھ ساتھ اپنی قسمت آزمائی کے لیے مشرق کی طرف جانا چاہتا تھا۔

صبح اس نے ایلیس سے اجازت لی اور اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

تین دن اور دو رات کے سفر کے بعد جمی آخر ایک ایسے علاقے میں پہنچا جہاں اس کے خیال کے مطابق ہیرے مل سکتے تھے۔ جمی نے یہاں اپنا چھوٹا سا خیمہ نصب کیا یہاں دریا کے دونوں کناروں پر بڑے بڑے پتھر پڑے تھے۔ جمی نے درختوں کی موٹی موٹی شاخوں کو لیور کے طور پر استعمال کر کے ان بڑی بڑی چٹانوں کو کھسکا کر ان کے نیچے کی زمین کو کھودنا شروع کیا۔ وہ صبح سے شام تک اسی کام میں مصروف رہا۔ وہ یہاں پیلی مٹی یا نیلی مٹی کی تلاش میں تھا۔ یہ مٹی اس بات کی علامت ہوتی کہ آخر کار اس نے ہیروں کی ذخیرہ گاہ تلاش کر لی ہے۔ جمی ایک ہفتے تک یہاں کھدائی میں مصروف رہا لیکن اس کی یہ تلاش اور یہ تمام محنت رائگاں ہی گئی۔ ایک ہفتے کے بعد وہ یہاں سے روانہ ہو گیا۔ اب اس کا رُخ شمال کی طرف تھا۔ جہاں کہیں اسے ہیرے ملنے کے امکانات نظر آتے، وہ کھدائی میں مصروف ہو جاتا۔ ناکام ہو کر آگے بڑھ جاتا۔ دن بھر وہ کھدائی میں مصروف رہتا اور رات کو تھک کر سو جاتا۔

دوسرے ہفتے کے بعد وہ دریا کے کنارے کنارے مزید شمال کی جانب بڑھ گیا۔ اب وہ پارڈ کی چھوٹی سی بستی سے آگے شمال کی جانب بڑھ رہا تھا۔

ایک دن سورج غروب ہونے سے قبل جمی نے دریا کے کنارے ایک مقام پر خیمہ نصب کیا۔ وہ آج صرف آرام کرنا چاہتا تھا۔ دریا کے ٹھنڈے پانی سے منہ دھو کر وہ خیمے کے باہر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ وہ بہت اداس تھا۔ اس کی تمام محنت اور تلاش اب تک بے سود رہی تھی۔ دریا کے کنارے پھیلی ہوئی ریت میں اس نے یونہی انگلیاں گاڑ کر اپنا نام لکھ دیا۔

اچانک اس کی انگلیاں ایک بڑے پتھر سے ٹکرائیں۔ جمی نے اس پتھر کو ریت سے نکال لیا۔ چند لمحے اس کا جائزہ لیا اور ایک طرف پھینک دیا۔ اس قسم کے بے کار، بے حقیقت، بے قیمت ہزاروں پتھر اس نے گزشتہ دو ہفتوں میں کئی مرتبہ دیکھے تھے۔ اچانک جمی اس پتھر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک مرتبہ پھر اس پتھر کو اٹھا کر اس کا جائزہ لیا۔ اس کا پتھر کی طرف متوجہ ہونا بے سبب نہیں تھا ایک تو یہ ان پتھروں سے بڑا تھا جو اب تک اسے ملے تھے۔ دوسرے اس کی شباہت مختلف تھی۔ اس نے پتھر پر جمی ہوئی مٹی کو اپنی پتلون پر رگڑ کر صاف کیا اور غور سے اس کا جائزہ لیا۔

یہ پتھر ہیرا ہی معلوم ہوتا تھا۔ مرغی کے انڈے سے بڑا۔ جمی کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ جلدی سے خیمے میں گیا اور لالٹین اٹھا کر اس جگہ لے آیا۔ اس کو واقعی ہیرا مل گیا تھا۔ پھر اس نے لالٹین کی روشنی میں آس پاس کی زمین دیوانوں کی طرح کھودنا شروع کر دی۔ اس تلاش میں اُسے چار اور ہیرے ملے۔ یہ سب ہیرے تھے لیکن اتنے بڑے نہیں جتنا پہلا تھا۔ پھر بھی یہ ہیرے خاصے بڑے تھے اور جمی کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

صبح وہ سورج طلوع ہونے سے قبل پھر کھدائی میں مصروف ہو گیا۔ دوپہر تک جمی نے یہاں سے چھ اور ہیرے تلاش کر لیے ایک ہفتے تک جمی، ہیروں کے لیے زمین کی کھدائی میں مصروف رہا۔ ان تمام ہیروں کو رات کے وقت ایک ایسی محفوظ جگہ چھپا دیتا جہاں کسی گزرنے والے کی نظر پڑنے کا احتمال نہ تھا۔ اُسے روزانہ ہی نئے ہیرے مل رہے تھے۔ اس کی دولت دن بہ دن بڑھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی خوشی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اگرچہ ہیروں کے اس ذخیرے میں سے صرف نصف اس کے تھے لیکن پھر بھی یہ اتنے ہیرے تھے جو اُسے امیر بنانے، اس کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے کافی تھے۔

پورے ہفتے کی محنت کے بعد جمی نے اپنے نقشے پر اس جگہ کی نشاندہی کی۔ اس تمام علاقے کی مخصوص کھونٹوں سے حد بندی کی۔ چھپائے ہوئے ہیروں کے ذخیرے کو نکال کر اسے تھیلے میں بھرا اور ماگیر روانہ ہو گیا۔

اس چھوٹی سی عمارت پر چھوٹا سا بورڈ لگا تھا "ڈائمنڈ کیپر"۔

جمی عمارت میں داخل ہو کر آفس میں پہنچا۔ اس کے دِل میں عجیب عجیب خیالات تھے۔ ایک خدشہ تھا جو اسے پریشان کیے ہوئے تھا۔ اس نے ایسی کئی کہانیاں سنی تھیں کہ بہت سے لوگ جو ہیرے تلاش کر کے لائے تھے وہ بے قیمت پتھر ثابت ہوئے تھے۔ اُس کو ڈر تھا کہ کہیں اس کے ساتھ بھی ایسا ہی نہ ہوا ہو۔

چھوٹے سے دفتر میں جوہری بیٹھا ہوا تھا۔ "فرمائیے کیا کام ہے؟" اس نے کہا۔

جمی نے گہرا سانس لے کر کہا "جی ہاں جناب۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان ہیروں کی قیمت کا اندازہ لگا کر بتائیں۔"

یہ کہہ کر جمی نے تھیلے سے ہیرے نکال نکال کر جوہری کے سامنے رکھنے شروع کر دیے۔ یہ کل ستائیس ہیرے تھے۔ جوہری ان

ہیروں کو حیرت اور تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ جوہری نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہیروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں یہ ہیرے کہاں سے ملے؟"

"یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ یہ اصلی ہیرے ہی ہیں نا؟" جمی نے کہا۔

جوہری نے پہلے سب سے بڑا پتھر اٹھایا اور غور سے اس کا معائنہ کیا۔ "ارے باپ رے! میں نے آج تک اس سے بڑا ہیرا نہیں دیکھا۔ آخر... آخر تمہیں یہ ہیرا کہاں سے ملا؟" جوہری نے حیرت سے کہا۔

"پندرہ منٹ بعد مجھ سے شراب خانے میں ملنا۔ میں تمہیں بتا دوں گا۔"

جمی نے تمام ہیرے سمیٹ کر تھیلے میں رکھے اور باہر آ گیا۔ وہ اب رجسٹریشن آفس کی طرف جا رہا تھا۔

رجسٹریشن آفس پہنچ کر اس نے متعلقہ افسر سے کہا۔ "میں جوزف اور جمی کے نام پر ایک مشترکہ کلیم رجسٹر کرانا چاہتا ہوں۔"

جمی اس دفتر میں ایک قلاش لڑکے کی حیثیت سے داخل ہوا تھا اور اب ایک کروڑ پتی کی حیثیت سے باہر آیا تھا۔ شراب خانے میں جوہری، جمی کا منتظر تھا۔ جوہری شاید اب تک کئی لوگوں کو یہ خبر سنا چکا تھا اس لیے جب جمی شراب خانے میں داخل ہوا تو لوگ احتراماً خاموش ہو گئے۔ ہر شخص کا چہرہ ایک سوال بنا ہوا تھا۔ جمی سیدھا اس کے پاس پہنچا۔

"اس وقت یہاں جتنے بھی لوگ ہیں سب کو میری طرف سے پلاؤ۔ میں اپنی کامیابی کا جشن منا رہا ہوں۔"

جشن سے فارغ ہو کر جب جمی ایلس کے پاس پہنچا تو وہ کچن میں چائے پی رہی تھی۔

"اوہ جمی! خدا کا شکر ہے کہ تم صحیح سلامت واپس آ گئے۔" ایلس نے نہایت گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔ "آؤ چائے پیو۔"

جمی نے جیب سے ایک بڑا سا ہیرا نکال کر ایلس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا۔ میں وہ وعدہ پورا کر رہا ہوں۔"

ایلس دیر تک اس ہیرے کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کا شوہر بھی تو ہیروں کی تلاش میں ہی یہاں آیا تھا۔

"نہیں جمی، نہیں۔ مجھے ہیرے کی ضرورت نہیں۔" وہ سسکتی ہوئی بولی اور جمی واپسی کی تیاری کرنے لگا۔

چند دن بعد جمی کلپ واپس پہنچ گیا۔ اس کی واپسی نہایت آرام دہ تھی۔ اس عرصے میں قصبے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ تبدیلی اگر ہوئی تھی تو جمی میں ہوئی تھی۔ جمی نے اپنی گاڑی جوزف کے اسٹور کے سامنے روکی۔ وہ نہایت فخریہ انداز میں سر اٹھائے اور سینہ تانے اسٹور کی طرف بڑھا۔ اسٹور کے دروازے میں طویل قامت سیاہ فام بانڈا کھڑا تھا۔

"ہیلو۔ میں واپس آ گیا ہوں۔" اس نے سیاہ فام سے جواب کی توقع کے بغیر کہا اور اندر چلا گیا۔

اس وقت جوزف کسی گاہک سے مصروف گفتگو تھا۔ اس نے مسکرا کر جمی کو دیکھا۔ جمی سمجھ گیا کہ اس کی کامیابی کی اطلاع جوزف کو مل گئی ہے۔ ہیروں کے نئے ذخائر کی خبر اس براعظم میں بہت تیزی سے پھیلتی تھی۔

گاہک سے فارغ ہو کر اس نے جمی کو اشارہ کر کے کہا۔ "ادھر آؤ بیٹے۔" یہ کہہ کر وہ پچھلے حصے کی طرف بڑھ گیا۔

جمی اس کے پیچھے اندر پہنچا۔ جوزف کی بیٹی کھانا تیار کر رہی تھی۔ "ہیلو مارگریٹ!" جمی نے اسے مخاطب کیا۔

مارگریٹ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"میں نے بہت اچھی خبر سنی ہے۔" جوزف نے کہا اور ایک میز پر بیٹھ گیا۔

"جی ہاں جناب۔" جمی نے نہایت فخریہ انداز میں کہا اور جیب سے چرمی تھیلی نکال کر تمام ہیرے میز پر الٹ دیے۔ جوزف نے سحر زدہ انداز میں تمام ہیروں کو دیکھا۔ ایک ایک کر کے اس نے ہیروں کو پرکھنا شروع کیا۔ پھر تمام ہیروں کو ایک تھیلی میں بھر کر کونے میں رکھی ہوئی تجوری میں رکھ کر انہیں بند کر دیا۔

"تم نے کمال ہی کر دیا جمی!" جوزف نے نہایت اطمینان سے کہا۔

"شکریہ جناب! یہ تو محض ابتدا ہے۔ وہاں ہزاروں کی تعداد میں ہیرے موجود ہیں۔" جمی نے جواب دیا۔

"تم نے کلیم تو رجسٹر کرا دیا ہے۔" جوزف نے پوچھا۔

"جی ہاں جناب۔" یہ کہہ کر جمی نے رسید اس کی طرف بڑھا دی۔ "کلیم ہم دونوں کے ناموں پر رجسٹر ہوا ہے۔"

جوزف کچھ دیر رسید کو غور سے دیکھتا رہا۔ "اس پر تو تم بونس کے بھی حق دار ہو۔ تم یہیں ٹھہرو۔ اور مارگریٹ تم میرے ساتھ آؤ۔" وہ اسٹور میں چلا گیا۔ مارگریٹ اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ وہ بہت خوفزدہ تھی۔

چند منٹ بعد جوزف واپس آیا۔ "لو بھئی یہ رہا تمہارا معاوضہ۔" اس نے میز پر پچاس پونڈ کی رقم رکھ دی۔

"وہ اس کا کیا مطلب ہے جناب" جمی نے حیرت سے کہا۔
"یہ تمہاری محنت کا صلہ ہے" اس کے لہجے میں مکاری تھی۔
"میں سمجھ نہیں سکا۔"
"تم چوبیس ہفتے بعد واپس آئے ہو۔ فی ہفتے دو پاؤنڈ کے حساب سے تمہاری اجرت ۴۸ پاؤنڈ بنتی ہے، میں دو پونڈ مزید تمہیں بونس کے طور پر دے رہا ہوں۔"
جمی ہنسا "مجھے بونس کی ضرورت نہیں۔ میرے لیے میرے حصے کے ہیرے ہی کافی ہیں۔"
"تمہارے حصے کے ہیرے؟ کیا مطلب؟" جوزف نے حیرت کا اظہار کیا۔
"جی ہاں جناب، ہم دونوں برابر کے شریک ہیں۔ پچاس فی صد میرا حصہ بھی تو ہے ہیروں میں۔"
"تم ہیروں میں برابر کے شریک ہو؟" جوزف دھاڑا "یہ احمقانہ خیال تمہارے ذہن میں کیسے آیا؟"
"کیا مطلب؟ کیا ہم نے معاہدہ نہیں کیا تھا؟"
"ہاں، مگر تم نے وہ معاہدہ پڑھا تھا؟"
"نہیں جناب! وہ معاہدہ افریکانہ زبان میں تھا۔ مگر آپ نے خود ہی بتایا تھا کہ ہم برابر کے شریک ہیں۔" جمی نے حیرت سے جواب دیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جوزف نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔
"تم پاگل ہو گئے ہو۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے تم جیسے کل کے چھوکرے کو پارٹنر بنانے کی۔ تم میرے لیے کام کر رہے تھے۔ اس کے لیے میں نے تمہیں ضروری سامان فراہم کیا اور تمہیں اپنے لیے ہیرے تلاش کرنے بھیج دیا۔"
غصے سے جمی کا خون کھول اٹھا "جھوٹ مت بولو جوزف۔ تم نے مجھے کچھ نہیں دیا۔ سامان کے لیے میں نے خود تمہیں ایک سو بیس پونڈ دیے تھے۔"
جوزف نے چڑتے ہوئے کہا "میرے پاس فضول بکواس کے لیے وقت نہیں ہے۔ کان کھول کے سن لو۔ زیادہ شور مچانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم چاہو تو میں تمہیں پانچ پونڈ مزید دے سکتا ہوں۔ اسے بھی میری مہربانی سمجھو ورنہ معاہدے کی رو سے تم محض ۴۸ پونڈ کے حق دار ہو، کیا سمجھے؟"
"بکواس مت کرو کمینے!" جمی نے چلا کر کہا "بات یوں ختم نہیں ہو سکتی۔ میں اپنا نصف حصہ لے کر رہوں گا۔ میں نے کلیم بھی ہم دونوں کے نام پر رجسٹر کرایا ہے۔"
"اس کا مطلب ہے کہ تم نے میرے ساتھ دھوکہ دہی کی کوشش کی ہے۔ اس جرم میں تو میں تمہیں گرفتار بھی کرا سکتا ہوں۔ چلو، اپنی اجرت اٹھاؤ اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔" جوزف نے غصے سے کپکپاتے ہوئے کہا۔
"میں تمہیں بخشوں گا نہیں خبیث بڈھے! میں عدالت میں تمہیں کھینچ لاؤں گا۔" جمی شدید غصے میں آ گیا تھا۔
"تمہارے پاس وکیل کو دینے کے لیے پیسے بھی ہیں؟ ویسے میں تمہیں بتا دوں کہ یہاں تمام وکیل میرے ملازم ہیں۔"
جمی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک یہ سب کیا ہو گیا۔ اس نے یہ ہیرے حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ مشکلات نہ جھیلی تھیں، وہ موت کے دھانے پر جا پہنچا تھا۔
"میں تمہیں یوں آسانی سے نہیں چھوڑوں گا کمینے۔ میں جمی ہوں۔ میں یہاں اس لیے نہیں آیا تھا کہ تم جیسے لچے اور اٹھائی گیرے میرے حق سے مجھے محروم کر دیں۔ میں یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔ میں یہاں ہر شخص کو تمہاری اس ذلیل حرکت کے بارے میں بتا دوں گا۔ میں تم سے اپنا حصہ لے کر رہوں گا۔"
"جمی! کل کے چھوکرے۔ یہاں سے دفع ہو جاؤ اور اپنے دماغ کا علاج کراؤ۔ میرا خیال ہے تمہارا دماغ چل گیا ہے۔"
جمی کھڑا ہو گیا۔ اس نے فریبی بوڑھے کے سینے کو انگلی سے تھپتھپاتے ہوئے کہا "میں تمہیں ایسا سبق دوں گا کہ بری طرح پچھتاؤ گے ذلیل! یاد رکھنا میری بات بہت پچھتاؤ گے اس حرکت پر۔" یہ کہہ کر اس نے پچاس پونڈ کے نوٹ جوزف کے منہ پر مار دیے۔ "یہ رقم میری طرف سے بھیک کے طور پر رکھ لو۔"
جمی اسٹور سے نکل کر اس سیلون میں پہنچا جہاں ایک بار ٹینڈر اور ایک اجنبی شخص کی باتیں سن کر اس نے جوزف سے ملنے کا

فیصلہ کیا تھا۔ وہ بوڑھا ایک ڈاکو تھا اور جمی نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اسے کو اس حرکت اور فریب کی سزا دے کر رہے گا۔ اُس خبیث نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس کے پاس تو وکیل کرنے کے لیے رقم بھی نہیں تھی۔ اس کا واحد ہتھیار وہ سچائی تھی جس سے وہ آگاہ تھا۔ پھر وہ اس شہر میں اجنبی تھا اور جوزف یہاں کا ایک ممتاز اور باعزت شہری تھا۔

بار ٹینڈر اسمٹ نے بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا "ہیلو مسٹر جمی! واپسی مبارک ہو۔ کیا پینا چاہیں گے؟"

"وھسکی۔"

جمی نے وہیں کھڑے کھڑے تین چار پیگ پی ڈالے۔ وہ سخت غصے میں تھا۔ اس نے اسمٹ سے کہا "تمہیں معلوم ہے وہ خبیث بڈھا بہت بڑا دھوکے باز اور مجرم ہے۔ وہ میرے ہیرے ہڑپ کرنا چاہتا ہے۔"

اسمٹ نے ہمدردی سے جمی کو دیکھا اور تاسف سے سر ہلا کے بولا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب! یہ سُن کر مجھے سخت دکھ ہوا۔"

"اس ذلیل شخص کو پتہ نہیں کہ اس کا پالا کس سے پڑا ہے۔ میرا نام جمی ہے۔ میں اس چور کو ایسی سزا دوں گا کہ دنیا دیکھے گی۔"

"جناب! ذرا احتیاط سے بات کیجیے۔ وہ ظالم اس علاقے کا بہت اہم اور بااثر آدمی ہے۔" اسمٹ نے کہا "اگر آپ اس سے بدلہ لینا چاہتے ہیں تو آپ کو بہت احتیاط سے کام کرنا ہو گا۔ آپ کو مدد کی ضرورت ہو گی۔ اتفاق سے میں ایک شخص کو جانتا ہوں۔ وہ بھی اس سے سخت نفرت کرتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی کہ کہیں کوئی ان کی باتیں سن تو نہیں رہا ہے اور پھر اس نے سرگوشی میں کہا "اس سڑک کے آخری سرے پر ایک پرانا کھلیان ہے۔ میں تمام انتظام کیے لیتا ہوں۔ تم رات کو دس بجے وہاں پہنچ جانا۔"

"شکریہ" جمی نے اس کا ہاتھ دبا کے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

جمی وہاں سے نکل آیا۔

وہ تمام دن شہر میں گھومتا رہا۔ وہ سخت غصے میں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر فریبی بوڑھے سے کیونکر بدلہ لے۔ اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ وہ اس کی تمام محنت پر یوں قبضہ کر کے بیٹھ جائے گا۔ اس کے ذہن میں بس ایک ہی لفظ بار بار بازگشت کر رہا تھا "انتقام! انتقام! انتقام!"

ٹھیک دس بجے جمی کھلیان پر پہنچ گیا تھا۔

یہ جگہ قصبے سے الگ تھلگ تھی۔ احاطے کے وسط میں ایک عمارت کھڑی تھی جو ٹین سے بنائی گئی تھی۔ جمی نے اس عمارت تک پہنچنے سے قبل احتیاط سے دائیں بائیں دیکھا تھا۔ وہ بہت چوکنا تھا، اسے یقین تھا کہ اس کے تعاقب میں یہاں کوئی نہیں آیا تھا۔

جمی عمارت میں داخل ہو گیا اور آہستہ سے "ہیلو" کہا۔ جواب میں کسی نے کچھ نہ کہا۔ جمی آہستگی سے اور اندر بڑھ گیا۔ وہ چند قدم ہی بڑھا ہو گا کہ اس نے اپنے عقب میں سرسراہٹ سی محسوس کی۔ وہ پلٹنا ہی چاہتا تھا کہ لوہے کی سلاخ اس کے شانے پر پڑی۔ ضرب بہت شدید تھی۔ وہ زمین پر گر گیا اور پھر اس پر ضربیں ہی پڑتی رہیں۔ وہ بالکل بے دم ہو گیا تھا۔ اچانک اسے بھاری ہاتھوں نے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اٹھا لیا۔ وہ بالکل بے بس تھا۔ نہ معلوم کتنے لوگ تھے جو اس کے جسم پر مکے اور لاتیں مار رہے تھے۔ اور پھر جب تکلیف اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی تو وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے گئے۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے جوزف کے سیاہ فام ملازم بانڈا کی جھلک دیکھی۔ اس کے ہوش میں آتے ہی ایک مرتبہ پھر اس کی پٹائی شروع ہو گئی اور پھر اس کی ٹانگ پر زوردار ضرب پڑی۔ اس کی ٹانگ کی ہڈی کے چٹخنے کی آواز ابھری۔ وہ ایک مرتبہ پھر بے ہوش ہو گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کا تمام جسم جیسے آگ میں جل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جیسے کوئی ریگ مال رگڑ رہا تھا۔ اس نے احتجاجاً ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس نے آنکھیں کھولنا چاہیں لیکن اس کی آنکھیں سوج کر بند ہو گئی تھیں، جسم کے ہر ہر حصے سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے اندھوں کی طرح ادھر ادھر ہاتھ چلائے اور اس کے ہاتھ ریت پر پڑے۔ تب اُسے خیال آیا کہ اس کا زخمی چہرہ تو اس وقت تپتی ریت پر رکھا ہوا ہے۔ آہستہ آہستہ اس نے بدقت تمام اپنے جسم کی تمام تر توانائی سمیٹی اور اٹھ بیٹھا۔ سوجی ہوئی بند آنکھوں کو کھول کر اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کے چاروں طرف غیر واضح سائے اور دھبے چکرا رہے تھے۔ اس کے جسم پر سوائے نیکر کے کچھ نہیں تھا اور جوزف کے آدمی اسے وسیع و عریض صحرا میں چھوڑ گئے تھے۔ مرنے کے لیے۔ جمی نے دکھتے ہوئے ذہن سے سوچا۔ اس نے جوزف سے بدلہ لینے کا فیصلہ کیا تھا، جس نے اس کے جواب میں یہ سزا دی تھی "میں جوزف اور اس کے گرگوں کو سزا دے کر رہوں گا۔ میں اس طرح مرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔" جمی نے دل ہی دل میں کہا۔ اس نے اٹھنا چاہا لیکن اس

کے مُنہ سے کراہ نکل گئی۔ اس کی دائیں ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ وہ چل نہیں سکتا تھا۔ ہاں وہ چل نہیں سکتا تھا لیکن گھسٹ تو سکتا تھا۔

جمی کو نہیں معلوم تھا کہ اس وقت وہ کہاں ہے تاہم اتنا وہ جانتا تھا کہ جوزف نے اُسے اس اجاڑ وسیع و عریض میدان میں ایسی جگہ پھنکوایا ہوگا جہاں کوئی راہ گیر بھی بھولے سے نہیں گزرے گا۔ جہاں اس کی لاش بھی کوئی نہیں دیکھ سکے گا البتہ گدھ اس کی لاش نوچ نوچ کر اطمینان سے کھا سکیں گے۔ اس نے اپنے ارد گرد بہت سے پنجر پڑے دیکھے تھے۔ گدھ ان کا گوشت کھا چکے تھے۔ اس نے آسمان میں گدھوں کو منڈلاتے دیکھا جو اپنے منہ سے دہشت انگیز آوازیں نکال رہے تھے اور شاید اپنے ساتھیوں کو ضیافت پر مدعو کر رہے تھے خوف سے اس نے جھرجھری لی اور اپنے بدن کو گھسیٹنا شروع کر دیا۔ اس کے جسم کے ہر ہر حصے سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ہر ہر حرکت کے ساتھ تکلیف کا احساس شدید تر ہوتا جا رہا تھا سب سے زیادہ تکلیف اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ میں ہو رہی تھی اس کے باوجود وہ اپنے وجود کو گھسیٹتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ گدھوں سے بچنے کا یہی طریقہ ہے۔ جس وقت بھی اس کے جسم نے حرکت بند کی، مردہ خور گدھ اس پر ٹوٹ پڑیں گے جو بڑی بے چینی سے اس کے اوپر آسمان میں چکرا رہے تھے۔ وہ اس کے بے دم ہو جانے کے منتظر تھے۔

جمی اپنے وجود کو گرم ریت پر گھسیٹتا رہا۔ وہ اس وقت زندہ رہنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ وہ اپنے جسم کو مردہ خور گدھوں کی ضیافت کا سامان بنانے پر آمادہ نہیں تھا۔ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا، جوزف سے انتقام لینے کے لیے۔ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے۔ زندہ رہنے کی یہ خواہش اس کے جسم میں اٹھنے والی درد کی ٹیسوں سے بھی زیادہ شدید تھی۔

وہ گھسٹتا رہا۔ اس کا اندازہ تھا کہ اس طرح وہ ایک میل سے زیادہ کا فاصلہ طے کر چکا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف دس گز آگے بڑھا تھا کیونکہ اس کا جسم ایک دائرے میں ہی حرکت کرتا رہا تھا۔ لیکن اُسے اس کا احساس نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، اور وہ کچھ دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ بس جوزف کے بارے میں سوچے جا رہا تھا جس کی وجہ سے اس کے دل میں نفرت کا الاؤ اور شدت سے بھڑکتا جا رہا تھا، یہ دہکتا ہوا الاؤ اس کو زندہ رہنے کا حوصلہ عطا کر رہا تھا۔ مگر کب تک؟ آخر ایک وقت آیا جب اس کے لیے تکلیف ناقابلِ برداشت ہو گئی وہ بے ہوش ہو گیا۔ اور پھر وہ نہایت شدید ناقابلِ برداشت تکلیف کی وجہ سے بیدار ہو گیا۔ تکلیف اتنی شدید تھی کہ شاید وہ بے ہوشی کے عالم میں بھی چیخ رہا تھا یہی وجہ تھی کہ جب وہ ہوش میں آیا تب بھی وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ کوئی اس کی ٹانگ میں کچھ کے لگا رہا تھا۔ چند لمحوں بعد جمی یہ سمجھنے کے قابل ہوا کہ وہ کہاں ہے اور کس حالت میں ہے۔ اس نے ایک سوجی ہوئی آنکھ بمشکل تمام کھول کر دیکھا۔ ایک بڑا سا سیاہ گدھ اپنی مڑی ہوئی سخت چونچ سے اس کی ٹانگ سے گوشت نوچ رہا تھا۔ بڑا بھیانک گدھ تھا وہ۔ اس کی آنکھوں میں موت کی چمک تھی۔ اس کی گردن کے گرد چھوٹے چھوٹے بالوں کا ایک ہار تھا۔ جمی نے اس گدھ کے جسم سے اٹھتی ہوئی بدبو اپنی ناک میں گھستے محسوس کی۔ گدھ اس کی ایک ٹانگ پر بیٹھا دوسری ٹانگ کا گوشت نوچنے، ادھیڑنے اور کاٹنے میں مصروف تھا۔ اس نے چیخنا چاہا لیکن حلق سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔ تمام قوت مجتمع کر کے اس نے اپنے جسم کو جھٹکا دیا۔ اسے اپنی ٹانگ سے خون کا فوارہ پھوٹتا محسوس ہوا۔ اس کے چاروں طرف گدھ جمع ہو چکے تھے۔ جمی کا جسم ان کے لیے دعوت کا سامان بنا ہوا تھا وہ سب کے سب آہستہ آہستہ اس کی طرف کھسک رہے تھے۔ موت ان گدھوں کی شکل میں اس کی سمت رینگ رہی تھی۔

جمی جانتا تھا کہ اب کے وہ بے ہوش ہوا تو پھر کبھی بیدار نہ ہو سکے گا۔ گدھ اس کے جسم کو ادھیڑ کر رکھ دیں گے اور وہ اس ریگستان میں انتہائی اذیت ناک موت سے ہمکنار ہو جائے گا۔ وہ جانتا تھا کہ جس لمحے اس کے جسم نے حرکت بند کی گدھ اس پر ٹوٹ پڑیں گے۔ موت کو اس طرح اپنے ارد گرد منڈلاتے دیکھ کر اس میں زندہ رہنے کی خواہش شدید ہو گئی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے وجود کو ریت پر گھسیٹنا شروع کر دیا۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں بس اپنے جسم کو حرکت دیتا رہا۔ اس کے کانوں میں گدھوں کے پھڑپھڑانے کی آوازیں پڑ رہی تھیں۔ گدھ اس پر منڈلا رہے تھے۔ ہمت اور طاقت جواب دیتی جا رہی تھی۔ اس کے لیے اب اپنے وجود کو حرکت دینا ناممکن ہو رہا تھا۔ خون کے بہہ جانے سے توانائی مسلسل ضائع ہو رہی تھی۔ آخر وہ تھک گیا۔ اس کی توانائی ختم ہو گئی۔ اس کا جسم شل ہو گیا۔ اب اس کے لیے مزید حرکت کرنا ناممکن تھا۔ وہ بے سدھ ہو کر ریت پر ساکت ہو گیا۔

بڑے بڑے گدھ اس کے جسم کے چاروں طرف جمع ہو گئے۔

✿

سنیچر کا دن کیپ ٹاؤن میں ہفتے وار بازار کا دن ہوتا تھا۔

یہ بھی سنیچر کا دن تھا۔ کیپ ٹاؤن میں بڑی چہل پہل تھی۔ ہر طرف لوگوں کا ہجوم تھا۔ ان میں دکاندار بھی تھے اور خریدار بھی تھے دوست یار بھی تھے اور محبت بھرے دل بھی جو اس موقع کو دیدارِ یار کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ سڑکیں بھانت بھانت کے لوگوں سے

پٹی پڑی تھیں۔ ان میں ہر قوم اور ملک، ہر نسل اور رنگ کے لوگ تھے۔ ان میں فرانسیسی بھی تھے اور بوئر بھی۔ بوئر یعنی ہالینڈ کے وہ باشندے جو افریقہ میں آباد ہوئے یا جو ولندیزی ماں باپ سے افریقہ میں پیدا ہوئے۔ بازار میں ہر ضرورت کی چیز برائے فروخت موجود تھی۔

بانڈا نہایت آہستگی سے قدم اٹھاتا ہوا اس بھیڑ بھڑکے سے گزر رہا تھا۔ وہ بہت محتاط تھا کہ کہیں کسی سفید فام کے چہرے پر اس کی نظر نہ پڑ جائے۔ یہ بہت سنگین جرم تھا۔ اس کی سزا بھی بہت خطرناک تھی۔ سڑکوں پر سیاہ فام اور رنگ دار نسلوں کے لوگوں کی اکثریت تھی لیکن یہاں سفید فام اقلیت کا راج تھا۔ وہ ہر طرح سے مالک تھے، بانڈا ان سفید چمڑی والے لوگوں سے نفرت کرتا تھا۔ یہ زمین اس کی تھی اور یہ سفید فام اجنبی تھے۔ باہر سے آئے تھے اور اس کے دیس کے مالک بن بیٹھے تھے۔ یہاں بسنے والی اصل آبادی کو غلام بنا لیا تھا۔

جنوبی افریقہ میں بہت سے قبیلے آباد تھے۔ باسوتو، زولو، بیشو، مقابلی۔ یہ سب اس علاقے کے باشندے تھے۔ یہ سب بانٹو تھے۔ جس کے معنی عوام کے تھے۔ ان تمام قبائل میں بانڈا کا قبیلہ بارو سردار قبیلہ تھا۔ بانڈا کی دادی اکثر اسے پرانے زمانے کی کہانیاں سناتی تھی۔ اس زمانے کی کہانیاں جب جنوبی افریقہ پر سیاہ فاموں کی عظیم الشان سلطنت قائم تھی۔ لیکن اب وہ اپنے ہی ملک میں اپنے ہی دیس میں غیر ملکیوں کے غلام بن چکے تھے۔ مٹھی بھر سفید بھیڑیوں نے ان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا تھا۔

بانڈا کو بس اتنا معلوم تھا کہ وہ ایک سردار کا بیٹا تھا۔ اور اسی بنا پر اس کا فرض تھا کہ وہ اپنے لوگوں کے مصائب کو کم کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرتا رہے، جدوجہد جاری رکھے تاکہ ایک مرتبہ پھر جنوبی افریقہ پر یہاں کے اصل لوگوں کی حکومت قائم ہو سکے۔ اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن پھر جنوبی افریقہ پر سیاہ فاموں کی حکومت ہو گی لیکن اس کے لیے مسلسل جدوجہد کرنا ہو گی۔ سفید فاموں کو اس علاقے سے نکالنا ہو گا۔

بانڈا اب مشرق کی سمت کیپ ٹاؤن کے مضافات کی طرف جا رہا تھا۔ سیاہ فاموں کو شہر میں رہنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ غلام تھے پھر بھلا وہ کیسے آقاؤں کے ساتھ رہ سکتے تھے۔ ان کے لیے شہر کے باہر چھوٹا سا علاقہ مخصوص تھا۔ یہی سیاہ فاموں کی بستی تھی۔ یہ بستی کیا تھی جھونپڑیوں پر مشتمل چھوٹا سا گاؤں تھا۔ بانڈا نے احتیاط سے مڑ کر دیکھا کہ کہیں کوئی اس کا تعاقب تو نہیں کر رہا تھا۔ مطمئن ہو کر وہ ایک جھونپڑی کے سامنے رکا۔ دروازے پر دو مرتبہ مخصوص انداز میں دستک دی اور اندر داخل ہو گیا۔ اندر ایک کونے میں کرسی پر ایک دبلی پتلی عورت بیٹھی کوئی کپڑا سینے میں مصروف تھی۔ بانڈا نے سر کے اشارے سے اس کو کچھ کہا اور دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا۔

وہ ایک چارپائی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور اس شخص کو دیکھنے لگا جو چارپائی پر لیٹا تھا۔

چھ ہفتے قبل جمی کو ہوش آیا تھا تو اس نے خود کو ایک عجیب سے مکان میں ایک چارپائی پر لیٹا ہوا پایا تھا اور پھر اسے یاد آیا کہ اس سے قبل وہ ایک ریگستان میں پڑا تھا اور گدھ اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھانے کے لیے اس پر منڈلا رہے تھے۔

پھر بانڈا کمرے میں داخل ہوا تو جمی کو یقین ہو گیا کہ وہ اسے جان سے مارنے کے لیے ہی آیا ہے۔ شاید جوزف کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ زندہ ہے اسی لیے اس نے اپنے سیاہ فام ملازم کو اس کا کام تمام کرنے پر مامور کیا تھا۔

"تمہارا آقا خود مجھے مارنے کے لیے کیوں نہیں آیا؟" جمی نے نفرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"میرا کوئی آقا نہیں ہے مسٹر!" بانڈا کے لہجے میں بھی نفرت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

"جوزف تمہارا آقا ہے۔ کیا اس نے تمہیں یہاں نہیں بھیجا ہے؟" جمی نے سوال کیا۔

"نہیں۔ اسے اگر معلوم بھی ہو گیا کہ تم زندہ ہو تو وہ ہم دونوں کو جان سے مار دے گا۔" بانڈا نے جواب دیا۔

یہ جواب جمی کے لیے ناقابل فہم تھا۔ وہ جھلا کر بولا "میں کہاں ہوں؟ مجھے بتاؤ میں کہاں ہوں؟"

"کیپ ٹاؤن میں۔"

"ناممکن، میں یہاں کیسے آیا؟"

"میں تمہیں یہاں لے کر آیا ہوں۔"

جمی دیر تک لمبے تڑنگے سیاہ فام کی آنکھوں میں دیکھتا رہا "کیوں، کس لیے؟"

"اس لیے کہ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں انتقام لینا چاہتا ہوں۔" بانڈا نے جواب دیا۔

"کیا ۔۔۔ ؟ کیا کہا تم نے؟"

بانڈا نے قریب آ کر کہا "میں اپنے لیے انتقام لینا نہیں چاہتا۔ مجھے اپنی کوئی پروا نہیں۔ میں جوزف سے انتقام لینا چاہتا ہوں

اس نے میری بہن کو بے عزت کیا تھا۔ میری بہن اس کے بچے کو جنم دیتے ہوئے مر گئی تھی۔ میری بہن کی عمر صرف گیارہ برس تھی۔"

"اُف میرے خدا!" جمی کپکپا کر رہ گیا۔

"جس دن سے وہ مری ہے، میں ایک ایسے سفید فام کی تلاش میں تھا جو اس سلسلے میں میری مدد کر سکے۔ اس رات جب کھلیان میں تم پر حملہ ہوا تو میں بھی جوزف کے ساتھ موجود تھا۔ ہم نے تمہیں ریگستان میں لے جا کر پھینک دیا تھا۔ جوزف نے مجھے حکم دیا تھا کہ تمہیں جان سے مار دوں۔ میں نے دوسروں سے یہی کہا تھا کہ تم مر چکے ہو۔ اس کے بعد میں جتنی جلدی ہو سکا تمہارے پاس پہنچا تھا۔ اس کے باوجود مجھے خاصی دیر ہو گئی تھی۔"

جمی پھر کپکپا کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ موت کے منہ میں پہنچ ہی گیا تھا۔ وہ اب بھی مردہ خور گدھوں کے جسم سے اٹھنے والی بدبو محسوس کر سکتا تھا۔

بانڈا نے پھر کہنا شروع کیا "گدھوں نے تمہارا جسم نوچنا شروع کر دیا تھا۔ میں تمہیں وہاں سے گاڑی میں ڈال کر اپنے لوگوں کے پاس لے گیا۔ ہمارے ایک طبیب نے تمہارے زخموں کا علاج کیا۔ تمہاری ٹوٹی ہوئی ہڈی جوڑی۔"

"اس کے بعد کیا ہوا؟" اس کے خاموش ہوتے ہی جمی نے دریافت کیا۔

"بس پھر ایک دن میرے کچھ عزیز اپنی بیل گاڑی سے کیپ ٹاؤن روانہ ہوئے۔ ہم تمہیں بھی اپنے ساتھ یہاں لے آئے۔ اس تمام عرصے میں تم بے ہوش رہے۔ ہر مرتبہ مجھے یہی ڈر ہوتا کہ شاید اب تم کبھی نہیں جاگو گے۔"

جمی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ یہ وہ شخص تھا جس نے اُسے جان سے مارنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس شخص پر اندھوں کی طرح اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ پھر بھی یہ عجیب بات تھی کہ اسی شخص نے اس کی جان بھی بچائی تھی۔ کتنا عجیب تھا یہ شخص۔ وہ بھی اس فریبی بوڑھے سے انتقام لینا چاہتا تھا اور اس کے لیے وہ جمی کو ذریعہ بنانا چاہتا تھا۔ یہ ایسی بات تھی جو اُسے بانڈا پر اعتماد کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ خود بھی جوزف سے انتقام لینا چاہتا تھا۔

"ٹھیک ہے! میں کوئی ایسا طریقہ نکالوں گا کہ ہم دونوں اس سے انتقام لے سکیں۔" جمی نے کہا۔

پہلی مرتبہ بانڈا کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری اور وہ پُرجوش لہجے میں بولا "کیا تم اسے مار دو گے؟"

"نہیں، وہ زندہ رہے گا لیکن اس کی زندگی جہنم بن جائے گی۔ میں اسے ہر ہر لمحے اذیت میں مبتلا کر دوں گا۔"

✿

اس دن جمی بستر سے کھڑا ہوا تو اس کا سر چکرا کر رہ گیا۔ وہ بے حد کمزور تھا۔ اس کی ٹانگ پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ وہ اب بھی لنگڑا کر چلتا تھا۔ بانڈا نے اُسے سہارا دینے کی کوشش کی تو اس نے کہا "نہیں میں بغیر سہارے کے چلنا چاہتا ہوں۔" اور پھر وہ کمرے میں ٹہلتا رہا اور بانڈا اس کو غور سے دیکھتا رہا۔

"کوئی آئینہ ہو تو لاؤ، میں اپنا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔" جمی نے کہا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا چہرہ بدنما اور بھدا ہو گیا ہو گا۔

بانڈا نے آئینہ لا کر دیا تو اس نے اپنا چہرہ دیکھا۔ یہ ایک اجنبی چہرہ تھا۔ اس کے بال سفید ہو گئے تھے۔ کئی دن سے شیو نہ کرنے کی وجہ سے اس کے چہرے پر داڑھی بڑھ گئی تھی۔ داڑھی کے بھی تمام بال سفید ہو گئے تھے۔ اس کی ناک ٹوٹ گئی تھی، وہ ایک طرف ذرا سی ڈھلک گئی تھی۔ اس کا چہرہ اس کی عمر سے بیس برس زیادہ کا معلوم ہوتا تھا۔ گال دھنس گئے تھے اور جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ تھوڑی پر گہرے زخم کا نشان تھا۔ سب سے زیادہ تبدیلی اس کی آنکھوں میں آئی تھی۔ ان آنکھوں میں ایک کہانی مرقوم تھی۔ یہ وہ آنکھیں تھیں جن میں بے پناہ نفرتیں کروٹ لیتی نظر آتی تھیں، جو بے حد حساس بھی معلوم ہوتی تھیں۔

جمی نے آئینہ رکھ دیا اور کہا "میں ذرا سیر کے لیے باہر جا رہا ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے جناب! یہ ناممکن ہے۔"

"کیوں؟ میرے باہر جانے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"بہت فرق پڑتا ہے جناب۔ سفید اور سیاہ چمڑی میں بڑا فرق ہے، خون کا رنگ ایک ہے مگر اسے کون دیکھتا ہے۔ یہ اس دیس کا قانون ہے۔ سفید چمڑی والے لوگ اس بستی میں نہیں آتے۔ بالکل اسی طرح جیسے سیاہ فاموں کو سفید فاموں کے مخصوص علاقوں میں داخلے کی اجازت نہیں۔ میرے ہمسایوں کو بھی نہیں معلوم کہ تم یہاں ہو۔ ہم تمہیں رات کے اندھیرے میں یہاں لائے تھے۔"

"پھر میں یہاں سے نکلوں گا کیسے؟"

"میں تمہیں آج رات یہاں سے نکال دوں گا۔" اس کے سیاہ فام ہمدرد نے جواب دیا۔

تب پہلی مرتبہ جمی کو احساس ہوا کہ اس کے لیے بانڈا نے کتنے زبردست خطرات مول لیے ہیں۔ "مگر بانڈا! میرے پاس نہ تو رقم ہے، نہ رہنے کا ٹھکانہ۔ مجھے ملازمت چاہیے۔"

"میں نے یہاں بندرگاہ پر ملازمت کر لی ہے۔ وہاں ہر وقت لوگوں کی ضرورت رہتی ہے۔ تمہیں بھی وہاں ملازمت مل جائے گی۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے کچھ رقم نکال کر جمی کو دی۔ "یہ لو۔"

جمی نے رقم لے کر کہا۔ "میں یہ رقم واپس کر دوں گا۔"

"تم مجھے میری بہن واپس دلا دینا۔" بانڈا نے کہا۔ "میں اس کی موت کا، اس کی بے عزتی کا انتقام لینا چاہتا ہوں۔" اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔

نصف شب کے بعد اسے جھونپڑے سے نکال لیا گیا۔ جمی نے باہر آ کر بستی کا جائزہ لیا۔ ہر طرف گھاس پھوس اور لوہے اور ٹین کے جھونپڑے بنے ہوئے تھے۔ بارش کی وجہ سے ہر طرف کیچڑ ہو رہی تھی۔ اسے حیرت ہوئی کہ بانڈا جیسا شخص آخر اس ماحول میں کس طرح زندگی گزارتا ہو گا۔

"کیا یہاں کوئی..." جمی نے کہنا چاہا۔

بانڈا نے اس کی بات کاٹ دی۔ "باتیں نہ کرو۔ میرے پڑوسی بہت ٹوہ میں رہتے ہیں۔"

وہ دونوں ایک سمت روانہ ہو گئے۔ تکلیف کے باوجود جمی تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ ایک جگہ آ کر بانڈا نے کہا۔ "سیدھے چلے جاؤ۔ تم شہر میں پہنچ جاؤ گے۔ میں کل بندرگاہ پر تم سے ملاقات کروں گا۔"

وہ شہر کی طرف روانہ ہو گیا اور دیوقامت سیاہ فام پلٹ کر اپنے جھونپڑے کی طرف چل دیا۔

جمی نے رات اسی چھوٹے سے ہوٹل میں گزاری جس میں وہ پہلے بھی ٹھہرا تھا۔ ہوٹل کی تیز طرار مالکہ ولما اپنی مخصوص ڈیسک پر موجود تھی۔

"میں ایک کمرہ لینا چاہتا ہوں۔" جمی نے اس سے کہا۔

"ضرور جناب۔" وہ مسکرائی۔ "مجھے ولما کہتے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔" جمی نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے، کیا کسی نے تمہیں بتایا تھا؟" اس نے دریافت کیا۔

"محترمہ! کیا آپ کو یاد نہیں۔ پچھلے سال ہی تو میں نے یہاں قیام کیا تھا۔" جمی نے جواب دیا۔

ادھیڑ عمر عورت نے جمی کے شکستہ چہرے کو غور سے دیکھا اور بولی۔ "مجھے بناؤ نہیں۔ میری یادداشت بہت اچھی ہے۔ جو چہرہ ایک مرتبہ میری نظروں سے گزر جائے میں اسے کبھی نہیں بھولتی۔ خیر چھوڑو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"مارٹن۔" جمی نے جواب دیا۔

اگلی صبح جمی روزگار کی تلاش میں بندرگاہ پہنچا۔ بانڈا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اسے کسی حیل و حجت کے بغیر ملازمت مل گئی جہازوں پر مال چڑھانے اور مال اتارنے کا کام۔ نو شلنگ روزانہ اجرت طے پائی۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں سیاہ فاموں کو چھ شلنگ روزانہ اجرت ملتی ہے۔ اس نے بانڈا کو بھی بندرگاہ پر کام کرتے دیکھا۔ موقع ملتے ہی وہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ "میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہاں نہیں۔ گوداموں کے آخر میں ایک گودام ہے جو ان دنوں خالی پڑا ہے۔ شفٹ ختم ہونے پر میں تم کو وہیں ملوں گا۔"

شفٹ ختم ہوئی تو جمی پہلی فرصت میں اس گودام میں پہنچا۔ بانڈا اس کا منتظر تھا۔

"مجھے جوزف کے بارے میں بتاؤ۔" جمی نے کہا۔

"اس کے بارے میں کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟"

"سب کچھ، ایک ایک بات۔" جمی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"وہ ہالینڈ سے یہاں آیا تھا۔ جو باتیں میں نے سنی ہیں، ان کے مطابق اس کی بیوی بہت بدصورت تھی لیکن تھی بہت امیر۔ اس کے مرنے کے بعد ساری دولت اپنے قبضے میں لے کر جوزف کیپ چلا گیا۔ جہاں اس نے اپنا اسٹور کھولا اور پھر ہیروں کی تلاش میں آنے والوں کو دھوکے اور فریب سے لوٹ کر امیر تر ہوتا چلا گیا۔"

"اس کے علاوہ بھی وہ کئی طریقوں سے لوٹتا ہے۔ جو لوگ کوئی نیا ذخیرہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، وہ جوزف کے پاس جاتے ہیں تاکہ وہ انہیں کچھ رقم دے دے اور وہ اپنا کلیم رجسٹر کرانے کے لیے ضروری کارروائی کر سکیں۔ اور جوزف انہیں جھانسا دیتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ حقائق سے آگاہ ہوں۔ وہ نئے ذخائر کو اپنے نام رجسٹر کرا لیتا ہے" بانڈا نے بتایا۔

"کیا کبھی کسی نے عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا؟"

"بھلا اس سے کیا فائدہ۔ ٹاؤن کلرک، جوزف کا ملازم ہے۔ قانون یہ ہے کہ اگر کسی ذخیرے پر کوئی شخص اس کی دریافت کے ۴۵ دن کے اندر کلیم داخل کر کے اسے اپنے نام رجسٹر نہ کرا لے تو پھر کوئی بھی اس کا کلیم کر سکتا ہے۔ ٹاؤن کلرک ہر نئے ذخیرے کی دریافت کی اطلاع جوزف کو دے دیتا ہے اور وہ اس پر قابض ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کئی اور ہتھکنڈے بھی استعمال کرتا ہے۔ شراب خانے کا نوکلاسمٹ بھی اس کا تنخواہ دار ملازم ہے۔ وہ لوگوں کو سبز باغ دکھا کر جوزف کے پاس بھیجتا ہے اور پھر اس پر وہی گزرتی ہے جو تم پر گزری ہے۔" بانڈا یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"اس کے علاوہ اور کچھ؟" جمی نے پوچھا۔

"اس کے علاوہ یہ کہ وہ ایک مذہبی جنونی ہے۔"

"اس کی بیٹی کے بارے میں کیا خیال ہے۔ کیا وہ بھی اس دھوکے بازی میں شریک ہے؟"

"میرا خیال ہے نہیں۔ وہ اپنے باپ سے بہت ڈرتی ہے۔ اگر وہ کسی مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی لے تو وہ دونوں کو جان سے مار ڈالے گا۔ وہ بڈھا بہت ہی خطرناک آدمی ہے۔"

"اچھا اب میں چلتا ہوں۔ کل پھر یہیں ملاقات ہو گی۔" یہ کہہ کر جمی وہاں سے نکل آیا۔

کیپ ٹاؤن میں پہلی مرتبہ جمی نے سفید فاموں کی غیر انسانی حرکتوں کا مشاہدہ کیا تھا۔ جنوبی افریقہ کے سفید فام خود کو نہ صرف علاقے کا حکمران سمجھتے تھے بلکہ انہوں نے سیاہ فاموں کو ذلیل کرنے کا ہر ہر انتظام کیا تھا۔ سیاہ فاموں کو انسان نہیں سمجھا جاتا تھا۔ وہ صرف غلام تھے، سفید فاموں کے لیے کام کرتے تھے۔ انہیں شہر میں رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کی بستیاں شہر سے باہر تھیں، ان بستیوں میں انہیں کوئی سہولت فراہم نہیں کی جاتی تھی۔

ایک دن جمی نے اس بارے میں بانڈا سے دریافت کیا" آخر تم لوگ یہ ذلت کیوں کر برداشت کرتے ہو؟"

"بھوکا شیر اپنے ناخن پنجوں میں چھپائے رکھتا ہے جمی! ہم یہ سب ایک دن بدل کر رکھ دیں گے۔ سفید فام، ہم لوگوں کو اس لیے برداشت کرتے ہیں کہ انہیں ہماری جسمانی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کچھ ہی عرصے کی بات ہے، ہم ان لوگوں کو مجبور کر دیں گے کہ وہ ہماری ذہنی قوت کو بھی تسلیم کریں۔ ٹھیک ہے یہ سفید فام ہمیں روز بروز مجبور کرتے جا رہے ہیں، ہمیں دن بدن ایک کونے میں ہانکتے جا رہے ہیں، اس کے باوجود وہ ہم سے خوفزدہ بھی ہیں۔ ہر نئی حرکت کے بعد وہ ہم سے زیادہ خوفزدہ ہو جاتے ہیں کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ ایک دن یقیناً ایسا آئے گا جب ہم اس کا انتقام لینے پر تل جائیں گے۔ یہ سفید فام اس دن سے خوف زدہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ یوم حساب آئے گا تو ان کا کیا حشر ہو گا۔" دیوقامت سیاہ فام نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

تمہیں یقین ہے کہ وہ دن ضرور آئے گا۔" جمی نے پوچھا۔

"ہاں ہمیں یقین ہے۔ اتنا ہی یقین ہے جتنا اس بات پر کہ سورج صبح طلوع ہوتا ہے اور شام کو غروب ہو جاتا ہے۔ ہم اس سرزمین کے اصل باشندے ہیں، یقیناً ایک دن اپنے وطن میں آزاد اور خود مختار ہوں گے۔ تم نے جباؤ کا نام سنا ہے؟"

"نہیں۔ جباؤ کون ہے؟"

"جلد ہی یہ نام بھی تم سن لو گے، بہت جلد۔ بانڈا نے دھیمی آواز میں کہا اور پھر خیالوں میں کھو گیا۔

خالی گودام میں جمی اور بانڈا کی روزانہ ملاقاتیں جاری رہیں۔ جمی روز بروز اس گرانڈیل حبشی کی صلاحیتوں کا معترف ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اس کی عزت بھی کرتا تھا اور اسے پسند بھی کرتا تھا۔ حالانکہ یہی وہ شخص تھا جس نے اسے مارنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ دوسری طرف وہ تھا جواب، جمی پر بھروسا اور اعتماد کرتا تھا حالانکہ جمی کی چمڑی بھی سفید تھی۔ اور گوری چمڑی والے جنوبی افریقہ میں سیاہ فاموں کے دشمن تھے۔ یہ بانڈا تعلیم یافتہ بھی تھا جو اس ملک میں بہت عجیب بات تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ اس نے اپنی دادی سے تعلیم حاصل کی تھی جو ایک بوئر اسکول کے استاد کے ہاں ملازم تھی اور خاصی پڑھ لکھ گئی تھی۔

ایسی ہی ایک ملاقات کے دوران جمی نے صحرائے نامب کا نام سنا۔ اس دن بانڈا اس کے لیے اپنی ماں کا بنایا ہوا کھانا لایا تھا۔ مقامی

طرز کا کھانا بہت لذیذ تھا۔ کھانے کے بعد جمی نے پوچھا تھا "جوزف سے تمہاری ملاقات کہاں ہوئی تھی ؟"

"ان دنوں میں صحرائے نامب میں ہیروں کے ساحل پر کام کرتا تھا۔ جوزف اور اس کے دو ساتھی ہیروں سے بھرے ہوئے اس ساحل کے مالک تھے۔ جوزف نے ایک شخص کو اپنے مخصوص ہتھکنڈوں سے شکار کیا تھا اور اس طرف ہیروں کے نئے ذخیرے کا قبضہ لینے آیا تھا۔"

"اگر وہ خبیث اتنا ہی امیر ہے تو اب بھی اپنے اسٹور میں کیوں کام کرتا ہے ؟" جمی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"وہ اسٹور تو اس کا اصل جال ہے۔ وہیں تو وہ نئے لوگوں کو اپنے جال میں پھانستا ہے، انہیں شکار کرتا ہے۔ اور یوں اس کی دولت میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔"

جمی خاموش ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ خود کتنی آسانی سے اس بوڑھے کے جال میں پھنس گیا تھا۔ ایک نوجوان لڑکا ہونے کے ناطے وہ اس پر اعتماد کرنے لگا تھا اور یہی اعتماد اُسے لے ڈوبا تھا۔ پھر اس کمینے کی بیٹی مارگریٹ بھی تو تھی جس نے کتنے مزے سے کہا تھا کہ ہو سکتا ہے اس معاملے میں میرے ڈیڈی تمہاری مدد کر سکیں۔" مارگریٹ حسین تھی، وہ جمی کو گڑیا سی لگی تھی۔

"خیر تو تم مجھے بتاؤ کہ تم جوزف کے پاس کیسے ملازم ہوئے ؟" جمی نے پوچھا۔

"جس دن وہ اس ساحل پر آیا اُس کی بیٹی بھی اس کے ہمراہ تھی جس کی عمر اس وقت گیارہ برس رہی ہو گی۔ وہ شاید بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی کہ کھیلتی ہوئی پانی کی طرف چلی گئی۔ ایک تیز طوفانی لہر نے اسے اپنے نرغے میں لے لیا۔ وہ ڈوبنے لگی تو میں نے پانی میں چھلانگ لگا دی اور اسے بچا کر کنارے پر لے آیا۔ اس وقت میں نوجوان تھا۔ میں اس کی بیٹی کو بچا لایا تھا لیکن جوزف مجھے جان سے مار ڈالنے پر تل گیا۔"

"کیوں ؟" جمی نے حیرت سے کہا۔ "تم نے تو اس پر احسان کیا تھا پھر وہ تمہیں کیوں جان سے مارنا چاہتا تھا ؟"

"اس لیے کہ میں نے اس کی بیٹی کے جسم کو چھوا تھا۔ وہ مجھے اس لیے نہیں قتل کرنا چاہتا تھا کہ میں سیاہ فام تھا بلکہ اس لیے میرے خون کا پیاسا ہو رہا تھا کہ میں لڑکا تھا۔ وہ یہ برداشت ہی نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص اس کی بیٹی کو ہاتھ بھی لگائے۔ میں اُس دن جوزف کے ہاتھوں قتل ہو ہی جاتا کہ کسی نے اس کو یاد دلایا کہ میں نے اس کی بیٹی کی جان بچائی ہے۔ اس شخص نے بڑی مشکل سے جوزف کو ٹھنڈا کیا اور یوں میری جان بخشی ہوئی۔ اس کے بعد وہ مجھے اپنے خادم کی حیثیت سے کلپ لے آیا۔" بانڈا خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "اس کے دو ماہ بعد میری بہن مجھ سے ملنے آئی۔ وہ اس خبیث کی بیٹی کی ہم عمر تھی۔" وہ ایک مرتبہ پھر خاموش ہو گیا۔ لگتا تھا جیسے وہ اندر ہی اندر غصے سے بل کھا رہا ہو اور اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو۔

جمی اس کی کیفیت کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اسے تکتا رہا۔

آخر اس نے خاموشی توڑی۔ "کاش میں نامب کے ریگستان سے کلپ نہ آیا ہوتا۔ وہ بہت آسان کام تھا۔ ہم ساحل کے ساتھ ساتھ چاروں ہاتھ پیروں کے بل کھسکتے تھے اور ہیرے اٹھا اٹھا کر جمع کرتے رہتے تھے۔ یہ ہیرے ہم ٹین کے ڈبوں میں رکھتے جاتے تھے۔"

"ایک منٹ! تمہارے کہنے کا مطلب کیا ہے ؟ کیا قیمتی ہیرے وہاں ریت کے اوپر بکھرے پڑے ہیں ؟" جمی نے پوچھا۔

"ہاں میں یہی کہہ رہا ہوں جمی! مگر تم اس بات کو بھول جاؤ جو تم سوچ رہے ہو۔ اس میدان کے قریب جانا ناممکن ہے۔ کوئی پرندہ بھی وہاں پر نہیں مار سکتا۔ یہ ہیرے ساحل سمندر کے ساتھ بکھرے پڑے ہیں لیکن سمندر کی طرف سے وہاں جانا ممکن نہیں۔ وہاں لہریں تیس تیس فٹ بلند ہوتی ہیں۔ اس طرف سے ساحل پر پہنچنا ناممکن ہے، اس لیے وہ لوگ ساحل کی بھی حفاظت نہیں کرتے۔ بہت سے لوگوں نے سمندر کی طرف سے وہاں پہنچنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ سب کے سب ناکام رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی نہ تو زندہ سلامت ساحل پر پہنچ سکا، نہ وہاں سے زندہ واپس آیا۔ ان سب کو یا تو لہروں نے موت کی نیند سلا دیا یا پھر زیر آب چٹانوں نے ان کے چیتھڑے اڑا دیئے۔"

"لیکن پھر بھی وہاں جانے کا کوئی نہ کوئی راستہ تو ضرور ہو گا ؟"

"نہیں، اُدھر جانے اور پھر واپس آنے کا کوئی محفوظ راستہ نہیں ہے۔"

"ہیروں کے میدان میں داخلے کے راستے سے متعلق کیا خیال ہے ؟" جمی نے پوچھا۔

"اس طرف پہلے تو مسلح محافظوں کے مینار ہیں۔ پھر خار دار تاروں سے تمام علاقے کو گھیر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد خار دار تاروں کی باڑھ کے اندر مسلح محافظ موجود ہیں، شکاری کتے ہیں جو انسانوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ ان لوگوں نے حفاظت کا ایک اور انتظام کیا ہے۔ یہ بالکل نیا طریقہ ہے۔ انہوں نے نئے قسم کے دھماکہ خیز مادے کو حفاظت کے لیے استعمال کیا ہے۔ اسے بارودی سرنگیں کہا جاتا ہے۔ یہ بارودی سرنگیں پورے میدان میں بچھا دی گئی ہیں۔ اگر ان پر پیر پڑ جائے تو یہ بارودی سرنگیں پھٹ جاتی ہیں

جاگتا انسان گوشت کے لوتھڑے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے پاس سرنگوں کا نقشہ ہو۔"

"ہیروں کا یہ میدان کتنا بڑا ہے؟" جمی نے پوچھا۔

"تقریباً ۴۵ میل لمبا ہے یہ میدان۔"

۴۵ میل لمبا ریگستان جس میں ہر طرف ریت پر ہیرے بکھرے پڑے ہیں، جمی نے سوچا اور اس کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"اُف میرے خدایا۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو بانڈا۔ کیا واقعی سمندر کے کنارے اس میدان میں ہیرے بکھرے پڑے ہیں؟"

"ہاں جمی! میں سچ کہہ رہا ہوں۔ جو شخص بھی سنتا ہے حیرت سے پاگل ہو جاتا ہے۔ مگر میں نے ان لوگوں کا حشر بھی دیکھا ہے جنہوں نے اس علاقے میں داخل ہونے کی کوشش کی ہے۔ میں نے ان کے جسموں کے ٹکڑے اٹھائے ہیں۔ میں نے ان لاشوں کو بھی دیکھا ہے جنہیں ساحل کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی تیز دھار والی نکیلی آبی چٹانوں نے کاٹ کر قتلے قتلے کر دیا تھا۔ میں نے ان لوگوں کو قیمہ قیمہ ہوتے بھی دیکھا ہے جو غلطی سے بارودی سرنگوں کا شکار ہوئے تھے۔ میں نے شکاری کتوں کو زندہ انسانوں پر لپکتے، انہیں بھنبھوڑتے اور ان کے نرخرے چباتے دیکھا ہے۔ اسے بھول جاؤ جمی۔ میں وہاں رہ چکا ہوں۔ اوّل تو وہاں جانے کا کوئی راستہ ہی نہیں ہے اور اگر آدمی اندر داخل ہو بھی جائے تو زندہ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔"

✿

تمام رات جمی کو نیند نہیں آئی۔ ریت پر بکھرے ہوئے ہیروں کا تصور ہی ایسا تھا کہ اس کی نیند اڑ کر رہ گئی تھی۔ وہ اس ریگستان میں داخل ہونا چاہتا تھا اسی لیے بار بار اس کے ذہن میں آبی چٹانوں، بھوکے، خونخوار آدم خور کتوں، محافظوں اور بارودی سرنگوں کا تصور ابھرتا۔ جمی خطرات سے ڈرنے والا نہیں تھا، ان سے کھیلنے والا اور انہیں مسخر کرنے والا تھا۔ وہ ڈرتا تھا تو صرف اس بات سے کہ کہیں وہ جوزف سے انتقام لیے بغیر ہی نہ مر جائے۔

اگلے پیر کے روز جمی نے کتابوں کی دکان سے اس علاقے کا نقشہ خریدا جس میں صحرائے نامب واقع تھا۔ نقشے میں ہیروں کے علاقے کو ممنوعہ قرار دیا گیا تھا۔ جمی نے اس تفصیلی نقشے کا بار بار جائزہ لیا۔ دیو قامت حبشی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس علاقے میں داخل ہونے کا بظاہر کوئی راستہ نہیں تھا۔ جمی سوچتا رہا، سوچتا رہا۔ نہ معلوم اسے یقین کیوں تھا کہ اس علاقے میں پہنچنا ناممکنات میں سے نہیں ہے۔

اگلے دن اس نے بانڈا سے کہا۔ "تم کہہ رہے تھے کہ صحرائے نامب میں بچھائی جانے والی بارودی سرنگوں کا کوئی نقشہ بھی ہے۔"

بانڈا نے حیرت سے جمی کو دیکھا۔ "تو تم اب بھی وہاں جانے کا ارادہ سے باز نہیں آئے۔ خیر، میں نے ٹھیک ہی بتایا تھا بارودی سرنگوں کا نقشہ اس علاقے کے سپروائزروں کے پاس ہے۔ یہی سپروائزر مزدوروں کو لے کر میدان میں جاتے ہیں۔ تمام مزدور ایک قطار میں سپروائزروں کی ہدایت پر چلتے ہیں۔ ایک دن میرے چچا میرے آگے آگے چل رہے تھے۔ اچانک وہ پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرے اور ایک بارودی سرنگ پر ڈھیر ہو گئے۔ بس ایک دھماکہ ہوا اور ہر طرف ان کے جسم کے ٹکڑے بکھر گئے۔"

جمی نے خوف سے جھرجھری لی۔

"اس کے علاوہ سمندری کہر بھی ایک مسئلہ ہے۔" بانڈا کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔ "سمندری دھند کیا ہے؟ اس سے صرف وہی شخص واقف ہو سکتا ہے جس نے کچھ دن صحرائے نامب میں گزارے ہوں۔ یہ سمندری دھند، سمندر پر تیرتی ہوئی آتی ہے، پورے صحرا کو اپنی آغوش میں لے کر پہاڑوں تک پھیل جاتی ہے۔ ہر چیز کو اپنی چادر میں چھپا لیتی ہے۔ ہر چیز کو نگل لیتی ہے۔ اس سمندری کہر میں پھنس جانے کے بعد کوئی بھی شخص آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کرتا۔ اس وقت بارودی سرنگوں کے نقشے بھی کسی کام نہیں آتے کیونکہ آدمی کچھ دیکھ ہی نہیں سکتا۔ آدمی کو یہی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ جا کدھر رہا ہے۔ جب یہ کہر چھا جاتی ہے تو ہر شخص بس اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتا ہے اور اس کہر کے چھٹنے کا انتظار کرتا رہتا ہے۔"

"اور یہ کہر کتنے عرصے چھائی رہتی ہے؟" جمی نے پوچھا۔

"کبھی چند گھنٹے، کبھی چند دن۔" بانڈا نے جواب دیا۔

"تم نے ان بارودی سرنگوں کا نقشہ کبھی دیکھا ہے؟"

"نہیں۔ وہ لوگ ان نقشوں کو بہت حفاظت سے رکھتے ہیں۔ مگر میں ایک مرتبہ پھر تمہیں یاد دلا رہا ہوں کہ وہاں تک پہنچنا اور زندہ واپس آنا ناممکن ہے۔ اس کے بارے میں سوچنا بھی دیوانے کا خواب ہے۔ اس میدان میں کام کرنے والے مزدوروں میں سے ایک دو، کبھی کبھار ایک آدھ ہیرا چرانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کو پھانسی چڑھانے کے لیے وہاں ایک درخت مخصوص ہے۔ اس

طرح وہ لوگ دوسرے مزدوروں کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ ہیرے چرانا کوئی معمولی جرم نہیں ہے۔"

گویا صحرائے نامب میں داخل ہونا ایک ناممکن بات تھی اور اگر وہ کسی طرح داخل ہو بھی جاتا تو وہاں سے نکلنا ناممکن تھا۔ اس کے باوجود جمی کے ذہن نے کام کرنا نہیں چھوڑا۔ وہ اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔

اور پھر اس مسئلے کا ایک حل جمی کے ذہن میں آ ہی گیا۔ یہ خیال اسے بے کل کر گیا۔ وہ اب جلد از جلد اس پر گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ اگلے دن اس نے چھوٹتے ہی بانڈا سے پوچھا "مجھے یہ بتاؤ کہ صحرائے نامب کے ساحل پر پہنچنے کی کوشش کرنے والے لوگوں نے کس قسم کی کشتیاں استعمال کی تھیں۔"

"وہ ہر قسم کی کشتیاں انہوں نے استعمال کی ہیں۔ بڑی بھی، چھوٹی بھی، درمیانی بھی، ہلکی اور بھاری بھی۔ جتنے عرصے میں نے وہاں کام کیا، تقریباً ایک درجن افراد نے وہاں پہنچنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن آبی چٹانوں نے ان کی کشتیوں کے اور خود ان کے پرخچے اڑا دیئے۔"

"کیا ان میں سے کسی نے لکڑی کے لٹھوں کا بیڑا بنا کر بھی وہاں پہنچنے کی کوشش کی ہے؟"

"بیڑے سے، کیا مطلب؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"پہلے میرے سوال کا جواب دو۔"

"نہیں میرا خیال ہے کہ کسی نے بھی اس طرح وہاں پہنچنے کی کوشش نہیں کی۔" بانڈا نے جواب دیا۔

"وہ مارا۔" جمی پرجوش لہجے میں بولا۔

"آخر ہوا کیا؟" بانڈا نے حیرت سے کہا۔

"نہیں سمجھے؟ بات یہ ہے میرے دوست کہ وہ لوگ ساحل پر اس لیے نہیں پہنچ سکے کہ ان کی کشتیوں کے پیندوں کو آبی چٹانوں نے ادھیڑ کر اور کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ لیکن لکڑی کے لٹھوں کا بیڑا پانی کی سطح پر ہوتا ہوا ان آبی چٹانوں پر سے تیرتا ہوا گزر جائے گا اور اسی طرح وہ ساحل سے واپس سمندر میں بھی آ سکتا ہے۔"

دراز قد حبشی نے حیرت سے اسے دیکھا اور کچھ سوچ کے بولا "ہاں جمی تم نے ایک نیا راستہ تلاش کر لیا ہے۔"

✿

ابتدا میں یہ سب کچھ محض ایک کھیل تھا۔ وہ ایک ناقابلِ حل معمّے کو حل کر رہے تھے لیکن پھر جوں جوں وہ سر جوڑ کے اس مسئلے پر زیادہ سنجیدگی سے تبادلۂ خیال کرتے رہے، ان کی گفتگو سے ایک منصوبہ مرتب ہوتا رہا۔ ایک لائحۂ عمل تیار ہوتا رہا۔ بانڈا کا کہنا تھا کہ اس میدان میں ہیرے بس ریت پر ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں۔ اس لیے انہیں کسی قسم کا سامان لے کر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ضرورت تھی تو صرف اس بات کی کہ وہ اپنا بیڑا تیار کریں، اس پر بادبان لگائیں اور روانہ ہو جائیں۔ انہوں نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ یہ بحری سفر انہیں اس ممنوعہ ساحل سے چالیس میل جنوب سے شروع کرنا چاہیئے۔ سفر کا آغاز رات کو ہو تا کہ کوئی انہیں روانہ ہوتے نہ دیکھ سکے۔ ساحل کی طرف ان لوگوں نے بارودی سرنگیں بچھانے کی ضرورت محسوس کی نہیں تھی۔ پھر جو محافظ تھے وہ صرف اندرونی علاقوں میں گشت کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دونوں رات کے وقت ساحل پر پہنچ کر ہیرے جمع کرتے اور سورج طلوع ہونے سے پہلے وہاں سے واپس چلے آتے۔

بانڈا کو جمی کے منصوبے کی کامیابی پر شبہات تھے۔ وہ برملا ان شبہات کا اظہار بھی کرتا لیکن دوسری طرف جمی کے دلائل بھی بہت مستحکم تھے۔ ان دلائل کے سامنے اس کے تمام اعتراضات بے جان ہو جاتے۔ وہ جمی کے منصوبے میں نئی نئی خامیاں تلاش کرتا لیکن اس کے جوابات ان خامیوں کو بے حقیقت ثابت کر دیتے۔ جمی کے منصوبے کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی سادگی تھی۔ دوسری خوبی یہ تھی کہ اس پر عمل کرنے کے لیے انہیں لمبی چوڑی رقم کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ضرورت تھی تو صرف حوصلے، جرأت اور عزم کی!

اگلے ہفتے انھوں نے گودی کی ملازمت چھوڑ دی اور ایک بیل گاڑی سے پورٹ لاتھ روانہ ہو گئے۔ یہ جگہ ہیروں کے ممنوعہ میدان سے چالیس میل جنوب میں تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یہاں چند جھونپڑے کچے مکانات اور دو چار اسٹور تھے۔ سمندر کے ساحل پر سفید چمکیلی ریت بچھی تھی۔ یہاں آبی چٹانیں نہیں تھیں اور سمندر کی موجیں بھی ساحل کو بہت پریم سے بوسہ دے کر پلٹ جاتی تھیں۔ یہ ساحل کسی بیڑے کو سمندر میں اتارنے کے لئے نہایت مناسب تھا۔

یہاں کوئی ہوٹل نہیں تھا تاہم مارکیٹ میں ایک چھوٹا سا کمرہ جمی کو قیام گاہ کے لئے مل گیا اور بانڈا نے سیاہ فاموں کے علاقے میں اپنے لئے قیام کا بندوبست کر لیا۔ وہ دونوں یہاں آ تو گئے تھے لیکن اب مسئلہ ایک ایسی خفیہ جگہ تلاش کرنا تھا جہاں وہ دونوں چھپ کر بیڑا تیار کر سکیں۔ رازداری ہی ان کی کامیابی کا وسیلہ تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ حکام کو ان کے ارادوں کا ذرا سا بھی علم ہو۔ انہیں ایسی جگہ مل گئی

سے خاصے فاصلے پر ایک گودام کی بوسیدہ عمارت موجود تھی جو اِن دنوں زیر استعمال نہ تھی۔ لگتا تھا لوگوں نے کافی عرصے قبل اسے ترک کر دیا تھا۔ دونوں نے اس کا گھوم پھر کر جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ جگہ ان کے کام کے لئے نہایت مناسب ہے۔

اور پھر وہ اپنے کام میں لگ گئے۔ مارکیٹ سے انہوں نے تیل کی نقل و حمل میں استعمال ہونے والے لکڑی کے چار خالی پیپے اور چار خالی پیٹیاں چرائیں۔ پیپوں کو انہوں نے اپنے بیڑے کی بنیاد بنایا۔ ان کے اوپر چار پیٹیاں جڑیں۔ یہاں لکڑی کے تختے ملنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، اس لئے انہوں نے اپنے بیڑے کی بالائی سطح بنانے کے لئے ہر وہ چیز استعمال کی جو انہیں دستیاب ہو سکی۔ وہ ہر ہر گرہ نہایت احتیاط اور مضبوطی سے لگاتے رہے۔ تین دن کی محنت کے نتیجے میں وہ ایک چھوٹا سا پلیٹ فارم تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ”مگر جمی یہ تو اب بھی بیڑا معلوم نہیں ہوتا۔“ بانڈا نے تبصرہ کیا۔

”بادبان لگانے کے بعد یہ معلوم ہونے لگے گا۔“ جمی نے اطمینان سے جواب دیا۔

بادبان کے لئے بانڈا کہیں سے موٹے نیلے کپڑے کا تھان چرا کر لے آیا۔ اس وقت تک جمی بیڑے کے وسط میں ایک مستول نہایت مضبوطی سے نصب کر چکا تھا۔ انہوں نے تھان پھاڑ کر اس مستول سے بادبان باندھ دیا۔

رات دو بجے وہ پھر اسی گودام میں ملے۔ دونوں کے دل اس مہم کے تصور سے دھڑک رہے تھے۔ یہ مہم خطرناک تھی لیکن اس کی کامیابی پر ان کی آئندہ زندگی کا انحصار بھی تھا۔ اس سفر کے نتیجے میں وہ موت سے بھی ہمکنار ہو سکتے تھے اور امیر بھی ہو سکتے تھے۔ اس کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا۔

ہر طرف نیم شب کا سکوت طاری تھا۔ آسمان میں تارے چمکے ہوئے تھے۔ چاند کی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ آسمان اور ماحول بالکل شفاف اور نکھرا ہوا تھا۔ انہوں نے رات دو بجے روانگی کا فیصلہ اس لئے کیا تھا کہ گاؤں کے کسی فرد کو یہ علم نہ ہو سکے کہ وہ کس سمت میں روانہ ہوئے ہیں۔ ان کا اندازہ تھا کہ وہ اگلے روز رات کے وقت ہیروں کے علاقے کے ساحل پر پہنچ جائیں گے اور صبح سے پہلے ہی ہیرے سمیٹ کر واپس آ جائیں گے۔ انہوں نے اپنے سفر کی تمام تفصیلات پر غور کر لیا تھا۔ جمی نے بتایا تھا: ”میرا اندازہ ہے کہ سمندری رو پر بہتے ہوئے ہم سہ پہر کے وقت اپنی منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن ہم دن میں وہاں نہیں جا سکتے اس لئے ہمیں اندھیرا پھیلنے تک اس علاقے سے دور کہیں رہنا ہوگا تاکہ کسی کی نظر ہم پر نہ پڑ سکے۔“

”یہ کوئی مشکل نہیں، ہم ساحل کے قریب ہی ایک چھوٹے سے جزیرے میں چھپ سکتے ہیں۔“ بانڈا نے کہا۔

”کون سا جزیرہ؟“ جمی نے دریافت کیا۔

”اس طرف کوئی بارہ کے قریب چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں۔“ بانڈا نے کہا اور پھر ان جزیروں کے نام گنانے لگا۔

”مگر اس نقشے پر تو ایسا کوئی جزیرہ موجود نہیں؟“ جمی نے حیرت سے کہا۔

”شاید اس لئے کہ وہ جزیرے بے کار ہیں۔ انگریز ان جزیروں پر غلاظت پھینکتے ہیں کھاد بنانے کے لئے۔“

”وہاں کوئی رہتا ہے؟“ جمی نے پوچھا۔

”وہاں اتنی بدبو ہے کہ کسی کا مستقل رہنا محال ہے۔ بعض بعض جگہ تو غلاظت سو سو فٹ گہری ہے۔ حکومت وہاں سے کھاد نکلوانے اور غلاظت پھنکوانے کے لئے باغیوں اور خطرناک قیدیوں کو استعمال کرتی ہے۔ اس کام کے دوران بعض افراد مر بھی جاتے ہیں اور ان کی لاشیں وہیں چھوڑ دی جاتی ہیں۔“

”تب پھر ہم وہیں چھپیں گے۔“ جمی نے فیصلہ سنایا۔

غرض ایسی ہی تفصیلات وہ پہلے ہی طے کر چکے تھے۔ اب صرف سفر کا مرحلہ سامنے تھا۔ انہوں نے گودام کا بڑا سا دروازہ کھولا۔ دونوں نے پوری قوت سے بیڑے کو اٹھانا چاہا لیکن وہ بہت بھاری تھا۔ وہ پسینے میں نہا گئے لیکن اسے اپنی جگہ سے اٹھانے اور کھسکانے میں ناکام رہے۔

”تم یہاں ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں۔“ بانڈا یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

نصف گھنٹے بعد وہ ایک بڑا گول لکڑی کا لٹھا اٹھائے کر واپس آیا۔ ”ہم اس لٹھے کے ذریعہ اپنے بیڑے کو یہاں سے کھسکا کر لے جائیں گے۔ میں بیڑے کو ایک کونے سے اٹھاتا ہوں، تم اس لٹھے کو اس کے نیچے ڈال دینا۔“

جمی کو دیو قامت حبشی کی قوت اور طاقت پر بڑا رشک آیا۔ اس نے پوری قوت صرف کر کے بیڑے کا ایک کونہ اوپر اٹھایا اور جمی نے لٹھے کو جلدی سے اس کے نیچے کھسکا دیا۔ اور پھر ان دونوں نے پیچھے سے دھکا دیا۔ بیڑے کے ساتھ لکڑی کا گول لٹھا زمین پر کھسکتا ہوا بیڑے کو آگے بڑھا لے گیا۔ ایک مرحلہ وہ آیا جب لکڑی کا لٹھا بیڑے کے پچھلے حصے سے باہر آ گیا اور انہوں نے پھر یہ پورا عمل دہرایا۔ یہ کام بڑا محنت طلب تھا۔ جب وہ بیڑے کو لے کر ساحل تک پہنچے تو خاصا وقت گزر چکا تھا اور دونوں پسینے میں شرابور ہو چکے تھے۔ بیڑا ساحل تک پہنچانے میں ان کے اندازے سے

زیادہ ہی وقت صرف ہوا تھا۔ یہاں انہوں نے بادبان کو مستول سے باندھا۔ جمی نے ایک مرتبہ پھر تمام چیزوں کا جائزہ لیا۔ وہ بیڑے کی طرف سے مطمئن تھا لیکن اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ اب بھی کوئی اہم چیز بھول رہا ہے۔ اچانک اسے یاد آگیا کہ وہ چیز کیا تھی اور پھر اس کے منہ سے ہلکا سا قہقہہ بلند ہوا۔

"کیوں، کیا بات ہے؟" بانڈا نے دریافت کیا۔

"اس سے پہلے جب میں ہیروں کی تلاش میں نکلا تھا تو میرے ساتھ بہت سا سامان تھا لیکن آج میں صرف ایک قطب نمالے کر جا رہا ہوں اور لطف یہ ہے کہ اسے بھی اندر بھول آیا ہوں۔" جمی نے جواب دیا اور گودام کی طرف بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد انہوں نے بیڑے کو ریت سے دھکیل کر سمندر میں ڈال دیا اور اس میں سوار ہو کر اسے لمبے لمبے ڈنڈوں سے کھے کر گہرے پانی کی طرف لے جانے لگے۔ ذرا ہی دیر میں ان کا بیڑا سمندر میں کافی اندر آگیا اور تیز رو پر تیزی کے ساتھ شمال کی طرف بہنے لگا۔

صبح جس وقت گاؤں کے لوگ بیدار ہوئے۔ بیڑا ساحل سے بہت دور افق پر پہنچ کر تارا بن چکا تھا۔ جمی بہت خوش تھا۔ اس کی کوشش، اس کے منصوبے کا پہلا مرحلہ کامیاب ہو گیا تھا جب اس نے اپنی اس مسرت کا اظہار کیا تو بانڈا نے کہا "ابھی تو آغاز ہوا ہے۔ ابھی تو ہمیں اصل کام کرنا ہے۔"

جمی خاموش ہو گیا۔ وفادار حبشی ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔

ان کا بیڑا شمال کی طرف بہتا رہا۔ ان کے سر پر آسمان میں بڑے بڑے رنگین، خوشنما آبی پرندے پرواز کر رہے تھے۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ تمام ماحول روشن تھا۔ اگرچہ بیڑے پر گوشت، چاول اور پھلوں کے ڈبے موجود تھے لیکن ان کا کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ جمی نے تو اپنے خیالات کو آنے والے خطرات کی طرف بھٹکنے نہیں دیا تھا لیکن بانڈا کا ذہن انہی کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اس کی وجہ تھی۔ وہ ہیروں کے ریگستان میں کام کر چکا تھا۔ وہاں اس نے محافظوں اور خونخوار کتوں کو دیکھا تھا، بارودی سرنگوں سے لوگوں کے چیتھڑے اڑتے دیکھے تھے۔ ماضی کے یہ تمام واقعات ایک ایک کر کے اسے یاد آ رہے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ یہ اس نے کیا حماقت کی ہے کہ ان خطروں کے باوجود وہ اس ہولناک سفر پر نکل آیا ہے۔ اس نے جمی کو غور سے دیکھا اور دل ہی دل میں کہا۔ "یہ شخص بہت ہی احمق ہے۔ اگر میں مر گیا تو میں اپنی بہن کے لئے مروں گا لیکن یہ شخص کیوں اپنی جان گنوانے پر تلا ہوا ہے؟"

دوپہر کے وقت سیاہ شارک مچھلیاں تیرتی ہوئی نہ معلوم کدھر سے آئیں اور انہوں نے بیڑے کو گھیر لیا۔

"یہ شارک مچھلیاں گوشت خور ہیں؟" بانڈا نے چلا کر کہا۔

جمی نے ان خطرناک مچھلیوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا "ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟"

"میں کچھ نہیں بتا سکتا جناب یہ میرا پہلا تجربہ ہے۔"

اور پھر ایک مچھلی نے اپنی کمر پر ابھرے ہوئے کانٹوں سے بنے ہوئے تلوار جیسے کھپرے سے بیڑے کو دھکا دیا۔ بیڑا ایک طرف ڈھلک کر الٹتے الٹتے بچا۔ دونوں نے مستول کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ جمی نے لکڑی کے ایک ڈنڈے سے مچھلی کے منہ پر مارا اسی اثناء میں دوسری شارک مچھلی حملہ کر چکی تھی۔ حبشی نے دوسرا موٹا ڈنڈا اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ اگلے لمحے میں مچھلی کا منہ بند ہوا اور لکڑی کا موٹا ڈنڈا دو حصوں میں ٹوٹ گیا۔ شارک مچھلیوں نے اب بیڑے کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ وہ بیڑے کے گرد چکرا رہی تھیں۔ بیڑے کو اپنی کمر سے زور زور کی ٹکریں مار رہی تھیں۔ ہر ٹکر کے ساتھ ان کا چھوٹا سا بیڑا ایک طرف بہت تیزی سے ڈھلک جاتا۔ شارک مچھلیوں کی ٹکریں اب تیز ہو گئی تھیں اور کسی وقت بھی ان کا بیڑا الٹ سکتا تھا۔

"ہمیں ان کا کچھ نہ کچھ انتظام کرنا ہوگا، ورنہ یہ ہمارے بیڑے کو الٹ دیں گی۔" جمی نے پریشان ہو کر کہا۔

"لیکن ہم ان سے چھٹکارا کیسے حاصل کریں گے؟" بانڈا نے پوچھا۔

"مجھے گوشت کا ڈبہ دو۔" جمی نے تیزی سے کہا

"کیا مذاق کر رہے ہو۔ گوشت کے ایک ٹین سے ان کا کیا بھلا ہوگا؟"

اسی وقت بیڑے کو پھر ایک زوردار ٹکر لگی۔ بیڑا پھر الٹتے الٹتے بچا۔ جمی نے چلا کر کہا "جلدی کرو یار! مجھے گوشت کا ٹین دو۔"

بانڈا نے ایک ٹین اس کی طرف بڑھا دیا۔ شارک مچھلیاں شاید پاگل ہو گئی تھیں۔ وہ اب تیزی سے بار بار بیڑے کو ٹکریں مار رہی تھیں اور بیڑا بری طرح ہچکولے لے رہا تھا۔ جمی نے کچھ سوچا اور بولا۔ "اپنا چاقو نکال کر اس ٹین کا ڈھکنا آدھا کھول دو۔"

محسوس کیا۔

"مستول کو کس کر پکڑ لو۔" جمی نے کہا۔

خود جمی نے ایک ہاتھ سے مستول پکڑا اور آگے کی طرف جھک کر دوسرا ہاتھ پھیلا دیا۔ اسی وقت ایک شارک مچھلی اپنا بڑا سا منہ کھولے بیڑے کی طرف بڑھی۔ اس کے منہ کے اندر اس کے سفید نکیلے دانت نہایت خوفناک طریقے سے چمک رہے تھے۔ جمی نے اس مچھلی کی آنکھوں کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے کٹے ہوئے ٹین کے تیز دھار والے کنارے سے اس شارک مچھلی کی آنکھوں پر پوری قوت سے ضرب لگائی ٹین اس کی آنکھ میں گہرا گھاؤ لگاتا ہوا گزر گیا۔ شدید تکلیف سے شارک مچھلی نے اپنے جسم کو اوپر اٹھا دیا۔ بیڑا ایک طرف ڈھلک گیا۔ ان کے آس پاس پانی خون سے سرخ ہو گیا۔ خون پھیلتے ہی تمام دوسری شارک مچھلیوں میں ہلچل مچ گئی۔ وہ بیڑے کو بھول کر اپنی ہی زخمی ساتھی پر حملہ آور ہو گئیں۔ شارک مچھلیاں اپنی زخمی ساتھی کو چیرنے پھاڑنے میں مصروف تھیں۔

بیڑا آگے بڑھتا رہا۔

بانڈا نے گہرا سانس لے کر کہا "ایک دن جب میں اپنے پوتے پوتیوں کو یہ واقعہ سناؤں گا تو ان میں سے شاید ہی کوئی اس پر یقین کرے۔"

جمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ اس کے منہ سے ایک قہقہہ ابھرا پھر بانڈا بھی ہنسی میں شامل ہو گیا۔ وہ دونوں دیوانوں کی طرح ہنستے رہے یہاں تک کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

سہ پہر کے وقت جمی نے جیبی گھڑی نکال کر دیکھی "ہم آدھی رات کے قریب ہیروں کے ساحل پر پہنچیں گے۔ سورج صبح سوا چھ بجے نکلے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم چار گھنٹے ہیرے جمع کر سکتے ہیں اور دو گھنٹے کے اندر وہاں سے اپنے بیڑے سے سمندر میں بہت دور نکل سکتے ہیں کیا خیال ہے، اس چار گھنٹے میں ہم کافی ہیرے جمع کر لیں گے؟"

"اس عرصے میں ہم اتنے ہیرے اکٹھے کر سکتے ہیں کہ ان سے حاصل ہونے والی رقم سے ایک سو آدمی اپنی پوری زندگی نہایت عیش و عشرت سے بسر کر سکتے ہیں۔" بانڈا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

ہوا اور سمندری رو کے سہارے وہ آگے بڑھتے رہے۔ سورج ڈھلنے سے پہلے انہیں سامنے ایک جزیرہ نظر آیا۔ یہ جزیرہ دو سو گز کے قطر کا تھا۔ جوں جوں وہ اس جزیرے کے قریب ہوتے گئے، غلاظت کی بدبو گہری ہوتی گئی۔ ساتھ ہی ان کی آنکھوں میں مرچیں سی لگیں اور پانی بہنے لگا۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں کسی شخص کا رہنا محال تھا۔ بدبو نہایت شدید تھی لیکن انہیں یہاں رات کی تاریکی پھیلنے تک چھپے رہنا تھا۔ انہوں نے اپنا بیڑا اس جزیرے کے ساحل پر لگا دیا۔ بانڈا نے بیڑے کو ایک بڑے سے پتھر سے باندھ دیا۔ پھر وہ دونوں وہاں سے جزیرے میں اندر کی طرف بڑھے۔ تمام جزیرہ جیسے مختلف قسم کے پرندوں کی جنت تھی۔ لاکھوں پرندے یہاں موجود تھے جو اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے اور ایک عجیب سی موسیقی فضا میں بکھری ہوئی تھی۔ وہ بیس پچیس قدم ہی بڑھے ہوں گے کہ کھاد کی دلدل میں پھنس گئے۔

"ہم واپس ساحل پر ہی چلتے ہیں۔" جمی نے کہا۔

بانڈا کوئی جواب دیے بغیر اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ واپس ہوئے ہی تھے کہ زمین پر بیٹھے ہوئے پرندوں کا غول اڑ کر فضا میں بلند ہو گیا۔ ان کے پرواز کرتے ہی انہیں سامنے پھیلی ہوئی زمین صاف نظر آنے لگی۔ وہاں تین انسانی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ لاشیں وہاں کتنے عرصے سے پڑی ہوئی تھیں۔ امونیا گیس کی وجہ سے وہ لاشیں ابھی تک پوری طرح محفوظ تھیں۔ البتہ ان کے بال سرخ ہو گئے تھے۔

چند منٹ بعد وہ بیڑے پر پہنچ گئے تھے۔ ساحل سے تھوڑی دور لے جا کر انہوں نے بیڑے کو لنگر انداز کر دیا۔ بادبان اتار لیا۔ "ہم یہاں نصف شب تک ٹھہریں گے۔" جمی نے فیصلہ سنایا۔

وہ دونوں خاموش بیڑے پر بیٹھے رہے۔ دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق تھے۔ دونوں اپنے اپنے طور پر آنے والے واقعات سے نمٹنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ سورج اب ڈھل گیا تھا۔ ڈوبتے سورج نے افق پر لالی مل دی تھی اور پھر یہ لالی سرمئی رنگ میں تبدیل ہو گئی تھوڑی دیر بعد تمام ماحول کو سیاہی نے نگل لیا۔

انہوں نے مزید دو گھنٹے وہیں انتظار کیا۔ اس کے بعد جمی اور بانڈا نے پھر بادبان لہرا دیا اور ان کا بیڑا مشرق کی طرف رواں دواں ہو گیا آسمان پر بادلوں کے درمیان چاند چمک اٹھا تھا اور اس نے ہر طرف اپنی زرد روشنی بکھیر دی تھی۔ رفتہ رفتہ بیڑے کی رفتار تیز ہو گئی۔ ہوا تیز ہو گئی تھی اور وہ بادبان کو جیسے پھاڑ دینے پر تلی ہوئی تھی۔

چاند کی مدھم روشنی میں اب وہ مشرق کی طرف ساحل کی سیاہ لکیر دیکھ سکتے تھے۔ ہوا اور تیز ہوئی جس کے ساتھ ہی بیڑے کی رفتار بھی

بڑھ گئی تھی۔ ساحل ابھی خاصہ دور تھا لیکن وہ اب بھی ساحل سے ابھرنے والے شور کو سن سکتے تھے اور بے پناہ طاقت ور، شدید سمندری طوفانی موجوں کو ساحل سے ٹکراتے دیکھ سکتے تھے۔ یہاں لہریں سفید جھاگ بناتی شور مچاتی ٹکرا رہی تھیں اور ہر طرف ایک سفید دھند سی پھیلا رہی تھیں۔

جنوبی امریکہ سے جنوبی افریقہ تک ہزاروں میل پر پھیلے ہوئے وسیع و عریض سمندر پر مچلتی لہریں مغرب سے مشرق کی طرف دیوانہ وار بڑھ کر پوری قوت، پوری طاقت سے آبی چٹانوں پر ٹوٹتی، انھیں روندتی، انھیں اپنے زور سے توڑنے کی کوشش کرتی ساحل سے جا ٹکراتیں اس ٹکراؤ سے ایک شور پیدا ہو رہا تھا۔ یہ ایک طوفان تھا جنوں خیز طوفان۔ اس منظر کو دور سے دیکھ کر ہی دل ہول اٹھتا تھا اور جمی سوچ رہا تھا کہ قریب جا کر ان کی کیا حالت ہوگی۔

"تمہیں یقین ہے باندا کہ ساحل کی طرف کوئی محافظ نہیں ہوتا۔" اس نے باندا سے دریافت کیا۔

باندا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے صرف ہاتھ سے آبی چٹانوں کی طرف اشارہ کیا۔

جمی جانتا تھا کہ باندا کس خطرے کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ آبی چٹانیں، جو سمندر کی سطح سے ابھری ہوئی بھی تھیں اور سطح آب سے نیچے بھی تھیں۔ قدرت کا ایسا خطرناک جال تھیں جس سے زیادہ خطرناک جال بنانا انسان کے بس میں نہ تھا۔ یہ چٹانیں اس سمت سے ساحل کی حفاظت کرتی تھیں۔ ہاں یہ چٹانیں بھی خونخوار محافظوں میں شامل تھیں جو ہمیشہ مستعدی سے حفاظت کا کام انجام دیتی تھیں۔ یہ کبھی نہیں تھکتی تھیں۔ کبھی خوابیدہ نہیں ہوتی تھیں۔ ہر وقت چوکس اور بیدار رہتی تھیں۔ یہ چٹانیں خونخوار بھی تھیں اور شکاری بھی۔ ہمیشہ ہر وقت اپنے شکار کی منتظر!

جمی ان خطرناک آبی چٹانوں کے بارے میں سوچتا رہا، پھر اس نے دل ہی دل میں جیسے ان آبی چٹانوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "فکر نہ کرو، ہم تمہیں شکست دے کر تمہارے خونخوار دام سے گزر کر ساحل پر گزر کر رہیں گے۔۔۔ تم پر سے تیر جائیں گے۔ تمہارے نکیلے دھار والے دانت ہماری راہ نہیں روک سکیں گے۔"

جمی کو یقین تھا کہ جو بیڑا انھیں یہاں تک لے آیا ہے وہ انھیں ساحل تک بھی لے جائے گا۔ بیڑے کی رفتار اب تیز ہو گئی تھی۔ ہوا کی شدت اور موجوں کی روانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ساحل بہت طوفانی رفتار سے ان کے قریب آتا جا رہا تھا۔ بیڑا اب اس رفتار سے بہہ رہا تھا کہ انھیں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی جگہ ساکت ہوں اور ساحل ان کی طرف بڑھ رہا ہو۔ موجیں شدید بلند اور دیوانگی اختیار کر چکی تھیں۔ باندا نے مستول کو سختی سے تھام رکھا تھا۔

"ہم بہت تیزی سے ساحل کی طرف جا رہے ہیں۔" باندا نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ کچھ اور قریب پہنچ کر ہم بادبان اتار دیں گے۔" جمی نے جواب دیا۔ "اس طرح ہماری رفتار کم ہو جائے گی اور ہم آبی چٹانوں پر سے بہتے ہوئے گزر جائیں گے۔"

ہوا اور موجوں کی روانی میں مزید تیزی آگئی۔ موجیں طوفانی انداز اختیار کر کے اب بلند بھی ہونے لگی تھیں اور ان کا بیڑا ایک تنکے کی مانند اس رفتار میں بہہ رہا تھا۔ جمی نے اندازہ لگایا کہ اب ان کا بیڑا بادبان کے بغیر صرف موجوں کے زور سے ساحل پر جا سکتا ہے تو اس نے جلدی سے بادبان اتار دیا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ ہوا اور موجوں کی رفتار اب یکساں ہو چکی تھی۔ بیڑا اب مکمل طور پر طوفانی ہوا اور موجوں کے رحم و کرم پر تھا۔ موجوں پر وہ تنکوں کی مانند اس طرح لہرا رہا تھا جس طرح آسمان میں کٹی پتنگ۔ انہوں نے مستول کو سختی سے تھام رکھا تھا یہی واحد چیز تھی جس کے سہارے وہ بیڑے پر جمے رہ سکتے تھے۔ جمی یہ تو جانتا تھا کہ ساحل پر پہنچنا آسان نہ ہوگا لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہاں پر لہروں کی شدت اتنی ہوگی۔

اب ان کے سامنے بے شمار آبی چٹانیں تھیں۔ لہریں ان چٹانوں کے درمیان لوٹتی سر پٹکتی، دیوانہ وار جھاگ اڑاتی، شور مچاتی ساحل کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ شور اتنا شدید تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ان کے منصوبے کی کامیابی کا انحصار اس پر تھا کہ ان کا بیڑا سمندری موجوں پر تیرتا ہوا ساحل پر پہنچ جاتا لیکن یہاں موجوں کے بلند ہونے کے درمیان ایک لمحہ ایسا بھی آتا تھا جب موجیں بلند ہو کر نیچے آتیں اور سمندری چٹانوں پر ضربیں لگاتیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ لہر ابھرتی ہوئی ان چٹانوں پر سے گزر کر ساحل پر پہنچ جاتی۔ کاش ایسی ہی کسی موج سے وہ ساحل پر پہنچ سکیں، جمی نے دل ہی دل میں آرزو کی۔

ایک شور کے ساتھ، نہایت برق رفتاری سے بیڑا پانی پر بہتا ہوا ساحل کے سامنے بکھری ہوئی چٹانوں کی طرف بڑھنے لگا جیسے سانپ کی مانند لوٹتا ہوا پانی کی کروٹ لیتا ہوا بلند ہوا۔ لہر نے بلند ہو کر بیڑے کو ہوا میں جیسے اچھال دیا اور پھر اسی لہر کے ساتھ نیچے ہوتا ہوا

آبی چٹانوں کی طرف بڑھا۔

"بیڑے کو مضبوطی سے پکڑے رہو۔" جمی چیخا۔

بیڑا لہر کے ساتھ نیچے ہوتا ہوا لہرایا کے کر کئی نوکیلی آبی چٹانوں کی طرف بڑھا۔ جمی نے آنکھیں بند کر لیں۔ اگلے لمحے بیڑا ان چٹانوں کی طرف بڑھا۔ جمی نے آنکھیں بند کر لیں۔ اگلے لمحے بیڑا ان چٹانوں سے ٹکرانے والا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ ایسا ہوتا دم توڑ کر نیچے جانے والی لہر کے نیچے سے پانی کی ایک اور طوفانی لہر لوٹتی ہوئی آگے بڑھی اور ان چٹانوں کو ڈھانپ لیا۔ دم توڑتی ہوئی لہر کے لیے پانی کی یہ چادر ایک پالنا بن گئی۔ بیڑا سیدھا ان چٹانوں سے ٹکرانے سے بچ گیا۔ لیکن بیڑے کا ایک پہیا ان چٹانوں سے ٹکرا کر بیڑے سے الگ ہو گیا۔ بیڑے نے زوردار ہچکولہ لیا، اس کے ساتھ ہی دوسرا پہیا بھی ٹوٹ کر علیحدہ ہو چکا تھا۔ پھر دو پہیے اور بیڑے سے ٹوٹ کر الگ ہو گئے۔ ہوا، موجیں، اور آبی چٹانیں اب اس بیڑے سے کسی کھلونے کی مانند کھیل رہی تھیں۔ کبھی اسے دائیں پھینکتی کبھی ---- بائیں۔ اور اس کے باوجود ---- جمی بالکل بے بس تھا۔ وہ اس دیو پیکر لہر کے رحم و کرم پر تھا۔ اس کا جسم دوہرا ہو گیا۔ پھیپھڑے جیسے پھٹنے لگے۔ سر میں چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔ وہ شاید ڈوب رہا تھا۔

اگلے لمحے لہر نے اس کے جسم کو ساحل کی ریت پر پٹخ دیا۔ جمی بے سدھ ریت پر لیٹا گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔ آخری چند لمحوں نے اس کے جسم سے تمام توانائی نچوڑ لی تھی۔ اس کے تمام اعضاء بے جان سے ہو گئے تھے۔ لباس کے چیتھڑے اڑ گئے تھے۔ کچھ دیر اسی طرح لیٹے رہنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ اٹھا۔ اب اسے بانڈا کی تلاش تھی۔ معلوم کرنا تھا کہ اس کا کیا حشر ہوا۔

بانڈا اس سے کوئی دس گز کے فاصلے پر بیٹھا ابکائیاں لے رہا تھا۔ جمی لڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ "تم ٹھیک تو ہو؟"

بانڈا نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ "میں تیرنا نہیں جانتا، پھر نہ معلوم کیسے یہاں آ گیا۔"

جمی نے سہارا دے کر بانڈا کو کھڑا کیا۔ وہ جھرجھری لے کر کھڑا ہو گیا اور پوچھا۔ "آخر ہوا کیا؟"

جمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دونوں اب پلٹ کر پھر سمندر کی آبی چٹانوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے بیڑے کا کہیں کوئی پتہ نہ تھا۔ سمندر کی موجوں اور چٹانوں نے اس کے پرخچے اڑا دیے تھے۔

وہ ہیروں کے ریگزار میں آ پہنچے تھے۔ اور یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ ان کے پیچھے سمندر تھا۔ طوفانی، خطرناک اور خونی سمندر اور سامنے، پہاڑوں کے دامن تک ریگستان پھیلا ہوا تھا۔ سمندر کی طرف سے واپسی ناممکن تھی۔ اگر وہ یہاں سے نکل سکتے تھے تو صرف نامب صحرا کی طرف سے نکل سکتے تھے۔ لیکن ادھر خونخوار کتے تھے، خون کے پیاسے محافظ تھے۔ اور بارودی سرنگیں بچھی ہوئی تھیں۔

"ہم صحرا سے گزر کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔" جمی نے جیسے فیصلہ سنا دیا۔

بانڈا نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ "محافظ ہمیں دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔ یا پھر ہمیں پھانسی پر لٹکا دیں گے۔ اگر ہم ان محافظوں اور خونی کتوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو بارودی سرنگیں ہیں۔ یہاں سے ہمارا نکلنا ممکن نہیں۔ یہ علاقہ ہمارے لیے قبرستان ہے۔" اس کے لہجے سے خوف ذرا بھی ہویدا نہیں تھا۔ وہ جیسے اپنی قسمت پر راضی اور شاکر تھا۔

جمی نے اپنے دراز قد سیاہ فام ساتھی کو دیکھا اور اپنے دل میں اس کے لیے گہری ہمدردی محسوس کی۔ بانڈا کو یہاں لانے میں اسی کا ہاتھ تھا۔ اور وہ بھی کتنا عجیب آدمی تھا کہ اس نے کسی مرحلے پر بھی تو مخالفت نہیں کی تھی۔ اور اب بھی جب کہ اسے معلوم تھا کہ یہاں سے نکلنے کا کوئی امکان نہیں۔ اس کے ہونٹوں پر شکایت کا ایک حرف بھی تو نہیں آیا تھا۔

جمی نے گھڑی دیکھی جو اب بھی اس کی جیب میں محفوظ تھی اور چل رہی تھی۔ دو بج رہے تھے۔ گویا ابھی سورج نکلنے میں چار گھنٹے باقی تھے۔ "یہاں پہنچنے کے بعد ہمت چھوڑ دینا سراسر حماقت ہے۔" جمی نے دل ہی دل میں کہا۔

"چلو یار اپنا کام کریں۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔" جمی نے اس سے کہا۔

"کیسا کام؟" بانڈا نے حیرت سے کہا۔ "کیا تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو۔ یہاں جان پر بنی ہوئی ہے اور تمہیں کام کی سوجھی ہے۔"

"ہم یہاں ہیرے لینے آئے تھے۔ یہی تو کام ہے اور کیا کرنا ہے ہمیں۔" جمی پر اعتماد لہجے میں بولا۔

بانڈا نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جمی کو یوں دیکھا جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔ "کیسی بات کر رہے ہو جمی؟"

"تم کہتے ہو کہ یہاں کے محافظ ہمیں دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔ وہ ہمیں ہیروں سمیت بھی گولی مار سکتے ہیں اور اس صورت میں بھی کہ ہمارے پاس ہیرے نہ ہوں۔ سمجھو کہ ہم کرشماتی طور پر یہاں پہنچ گئے ہیں تو پھر کیا ایسا کرشمہ نہیں ہو سکتا کہ ہم یہاں سے نکل جائیں۔ اور اگر ہم یہاں سے نکل گئے تو میں نہیں چاہتا کہ ہم خالی ہاتھ ہوں۔"

"تم دیوانے ہو گئے ہو جمی!" بانڈا نے ہولے سے تبصرہ کیا۔
"دیوانے ہم دونوں ہیں۔اسی لیے تو یہاں موجود ہیں۔" جمی نے اسے یاد دلایا۔
"ٹھیک ہے جیسا تم کہتے ہو ویسا ہی کرتا ہوں۔" بانڈا نے جواب دیا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ یہ سب بے سود ہے۔
اگلے لمحے جمی نے اپنی قمیص اتار ڈالی وہ سمجھ گیا کہ جمی نے ایسا کیوں کیا ہے۔اس نے بھی اپنی قمیص اتار دی۔
"اب مجھے بتاؤ کہ جن ہیروں کے بارے میں تم نے بتایا تھا وہ کہاں ملیں گے؟"
"ہیرے یہاں ہر جگہ موجود ہیں جس طرح محافظ اور کتے یہاں موجود رہتے ہیں۔" بانڈا نے جواب دیا۔
"ان کی فکر بعد میں کریں گے۔یہ بتاؤ وہ ساحل کی طرف کب آتے ہیں۔؟"
"صبح روشنی ہونے کے بعد۔"
"کیا کوئی ایسی جگہ ہے جہاں وہ نہ آتے ہوں، جہاں ہم ان کی نظروں سے چھپ سکیں؟"
"محافظ، کتوں کے ساتھ ساحل پر ہر جگہ جاتے ہیں۔اور یہاں ایسی کوئی جگہ بھی نہیں جہاں کوئی تنکا بھی چھپایا جا سکے۔" بانڈا نے ایک گہری سانس لے کر جواب دیا۔
"تو ٹھیک ہے، آؤ چلیں۔" جمی نے اس کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔
چند قدم چل کر بانڈا بیٹھ گیا۔اور ننھے بچوں کی طرح ریت پر گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے ریت میں انگلیاں گاڑتا ہوا بڑھنے لگا۔
پھر جمی بھی ریت پر اس کے انداز میں بیٹھ گیا اور ریت سے ہیرے تلاش کرنے شروع کر دیئے۔اسے پہلے دو ہیرے جو ملے وہ چھوٹے تھے۔تیسرا ہیرا بڑا تھا۔اور اس کا وزن ۱۵ قیراط سے زیادہ رہا ہوگا۔وہ چند لمحے اس ہیرے کو دیکھتا رہا۔کیسی عجیب اور ناقابلِ یقین بات تھی یہ۔ایک بڑی دولت یوں ریت میں پڑی ہوئی تھی اور اس کا مالک جوزف تھا۔یا اس کے دو شریک کار!
جمی نے پھر ہیروں کی تلاش شروع کر دی۔
اگلے تین گھنٹوں میں دونوں نے چالیس سے زیادہ ہیرے تلاش کر لیے تھے۔ان کا وزن دو قیراط سے کر ۳۰ قیراط تک تھا۔مشرق کی سمت سے صبح کی روشنی ہویدا ہونے لگی تھی۔جمی نے اسی وقت یہاں سے واپسی کا منصوبہ بنایا تھا۔اگر ان کا بیڑا تباہ نہ ہوتا تو وہ اس میں سوار ہو کر یہاں سے نکل جاتے۔لیکن اب تو اس کے بارے میں سوچنا بھی بے سود تھا۔
"اب صبح ہونے والی ہے اس سے قبل ہی ہمیں جتنے زیادہ ہیرے ہو سکتے ہیں تلاش کر لینے چاہئیں۔" جمی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔
"جیسی تمہاری مرضی، لیکن ہمیں یہ دولت خرچ کرنے کا موقعہ نہیں مل سکے گا۔مگر شاید تم بہت امیر ہو کر مرنا چاہتے ہو۔"
"مرنا تو میں قطعی نہیں چاہتا۔میں اس سے پہلے جوزف سے انتقام لینا چاہتا ہوں۔" جمی نے جواب دیا اور مزید ایک ہیرا ریت سے نکال کر اپنے ذخیرے میں رکھ لیا۔
وہ دونوں پھر اپنے کام میں جت گئے۔ہیرے تلاش کرتے رہے۔لگتا تھا جیسے ان پر دیوانگی کا غلبہ ہو گیا ہو۔ان کا ذخیرہ بڑھتا رہا۔اب ان کے پاس ساٹھ سے زیادہ ہیرے ہو گئے تھے۔یہ تمام ہیرے ان کی پھٹی ہوئی قمیصوں میں جمع تھے۔
"تم چاہتے ہو کہ یہ ہیرے میں لے کر چلوں؟" بانڈا نے پوچھا۔
"نہیں..... ہم دونوں....." جمی کہتے کہتے رک گیا۔وہ سمجھ گیا تھا کہ بانڈا نے یہ سوال کیوں کیا تھا۔جس شخص کے پاس ہیرے برآمد ہوتے۔اسے نہایت اذیت ناک انداز میں آہستہ آہستہ موت کے گھاٹ اتارا جاتا تھا۔
"تم فکر نہ کرو یار۔" جمی نے کہا۔"یہ تمام ہیرے میں لے کر چلوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے ہیرے لیے اور اپنی قمیص میں ڈال کر پوٹلی سی بنا دی۔ اب وہ ان ہیروں کو باآسانی اٹھا سکتے تھے۔
مشرقی افق اب خاصا روشن ہو گیا تھا۔ابھرتے سورج کی روشنی بڑھتی جا رہی تھی۔
اب کیا ہوگا؟ اب انہیں کیا کرنا چاہیے؟ یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب انہیں تلاش کرنا تھا۔موت ہر طرف گھات میں تھی وہ یہاں کھڑے رہتے جب بھی موت ان کی طرف بڑھ آتی۔وہ یہاں سے صحرا کی طرف بڑھتے تب بھی موت ان کا مقدر تھی۔جمی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کچھ سوچتا رہا۔پھر دھیمی آواز میں بولا،"آؤ چلیں۔"
وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے آگے بڑھنے لگے۔
"بارودی سرنگوں کا علاقہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟" جمی نے پوچھا

"یہاں سے کوئی سو گز پرے" بانڈا نے جواب دیا۔ اسی وقت دور کہیں کتّے کے بھونکنے کی آواز ابھری۔ "لیکن اب بارودی سرنگوں کے بجائے ہمیں ان کتوں کی طرف سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ کتّے اسی طرف آرہے ہیں۔ صبح کی شفٹ کا وقت ہوگیا ہے۔"

"وہ لوگ یہاں تک کتنی دیر میں پہنچ سکتے ہیں؟"

"دس پندرہ منٹ کے اندر۔ یہاں سے خاردار تاروں تک زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔"

سورج مشرقی افق سے ابھر آیا تھا۔ تمام منظر ان کے سامنے واضح تھا۔ ہر طرف ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے ابھرے ہوئے تھے۔ ان کے چھپنے کے لیے وہاں کوئی جگہ نہ تھی۔ جمی نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا "ایک شفٹ میں کتنے محافظ ہوتے ہیں؟"

"تقریباً دس۔ ہنگامی حالات میں محافظوں کی تعداد بڑھا بھی دی جاتی ہے۔"

"مگر اتنے بڑے ساحل کے لیے دس محافظ تو بہت کم ہیں۔" جمی نے کہا۔

"ایک محافظ بھی بہت کافی ہے۔ ان کے پاس بندوقیں ہیں، کتّے ہیں، پھر وہ اندھے بھی نہیں ہیں اور نہ ہم نے سلیمانی ٹوپیاں پہن رکھی ہیں کہ ان کو نظر نہ آسکیں۔"

کتوں کے بھونکنے کی آواز اب زیادہ واضح ہوگئی تھی۔ جمی نے کہا "مجھے افسوس ہے دوست! مجھے تمہیں یہاں نہیں لانا چاہیے تھا۔"

"میں اپنی مرضی سے یہاں آیا ہوں۔ تم مجھے نہیں لائے۔" بانڈا نے دوٹوک انداز میں کہا۔

جمی سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اس کے ذہن میں کیا ہے۔ اس کی مظلوم بہن کی محبت اسے یہاں لائی تھی۔

کتوں کے بھونکنے کی آوازیں زیادہ صاف سنائی دینے لگی تھیں۔ اب وہ ایک ٹیلے کے پاس پہنچ گئے تھے "کیا خیال ہے۔ ہم خود کو ریت میں نہ چھپالیں؟" جمی نے پوچھا۔

"لوگوں نے ایسی کوششیں بھی کرکے دیکھ لی ہیں۔ ایسی صورت میں بھی کتے ہمیں تلاش کرکے ہمارے ٹکڑے کر ڈالیں گے۔ میں ایسی اذیت ناک اور ذلت آمیز موت نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ میری موت جلدی سے آجائے۔ میں آن واحد میں ملکِ عدم پہنچنا چاہتا ہوں۔ میں کوشش کروں گا کہ وہ مجھے دیکھ لیں اور پھر میں دوڑ لگا دونگا۔ وہ مجھے گولی ماردیں گے۔ میں اپنے آپ کو کتوں کے حوالے کرنا نہیں چاہتا۔ مرنا ہی ہے تو کیوں نہ عزت اور آبرو سے مرا جائے۔"

"میں تو اپنی زندگی بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔" جمی نے کہا "میں اتنی آسانی سے شکار ہونا پسند نہیں کرتا۔"

اب انہیں کچھ دوسری انسانی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں "چلتے رہو۔ سوّر کے بچو!" ایک آواز بلند ہوئی۔ "ایک قطار میں میرے پیچھے چلتے رہو۔ تمام رات آرام کرچکے ہو، اب تھوڑا سا کام بھی کرلو۔"

جمی اپنے دوست کو حوصلہ دینے کے لئے نہایت دلیرانہ گفتگو کررہا تھا۔ اس کے باوجود قریب آتی ہوئی آوازوں کو سن کر اس نے پیچھے چلنا شروع کردیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ شاید سمندر میں ڈوب جانے سے ان کی موت کی اذیت کم ہوگی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ساحل کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی نکیلی چٹانوں کو دیکھا جن پر لہریں آآکر ٹکرا رہی تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے لہروں کے پیچھے کوئی اور بھی چیز دیکھی، جو اس کے لئے ناقابلِ فہم تھی۔ اس نے دیو قامت سیاہ فام کو اس جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ دیکھو، وہ کیا ہے بانڈا؟"

سمندر پر کافی فاصلے پر ایک سرمئی سی دیوار ابھر آئی تھی۔ جو طاقتور پوربی ہوا کے ساتھ تیزی سے ساحل کی طرف بڑھ رہی تھی "یہ سمندری دھند ہے۔ یہ دھند ہفتے میں دو تین مرتبہ آتی ہے۔" دراز قد حبشی نے بتایا۔ "میں غالباً اس کے بارے میں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔"

اس دوران میں دھند ایک بڑی سی گہری سرمئی چادر کی مانند اور آگے بڑھ آئی تھی۔ اس چادر کے پیچھے کا تمام منظر نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا۔ دوسری طرف محافظوں کی آوازیں بھی اور قریب آگئی تھیں "افوہ یہ کم بخت دھند پھر آگئی۔ کام پھر رک جائے گا اور باس بہت بگڑے گا۔ ستیاناس ہو اس دھند کا۔ سارا موڈ غارت کردیا!"

"شاید قسمت ہمیں ایک موقعہ دینا چاہتی ہے۔" جمی نے سرگوشی میں کہا۔

"کیسا موقعہ؟" بانڈا نے کہا۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ کیا اب بھی تم اپنی زندگی کے بارے پُرامید ہو؟"

"بالکل۔ میں نے مایوس ہونا نہیں سیکھا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم یہاں کبھی نہ پہنچ پاتے۔"

"اس دھند کی وجہ سے وہ لوگ ہمیں دیکھ نہیں سکیں گے۔ اور یوں ہم ان کی نظروں میں آئے بغیر یہاں سے نکل سکتے ہیں۔"

"دھند پر بھروسہ نہ کرو میرے دوست یہ کسی وقت بھی چھٹ سکتی ہے اور جب یہ دھند چھٹے گی۔ اس وقت بھی ہم یہیں پر ہوں گے۔ اگر محافظ اس دھند کی وجہ سے حرکت نہیں کر سکتے تو ہم بھی اپنی جگہ کھڑے رہنے پر مجبور ہوں گے۔ اس دھند میں آگے بڑھنے کا مطلب یہی ہوگا کہ ہم بارودی سرنگوں سے اپنے چیتھڑے اڑوالیں گے، مگر... مگر شاید تم کسی کرشمے کے منتظر ہو؟"

"ہاں، میں کسی کرشمے کا ہی منتظر ہوں۔" جمی نے ٹھوس اور مستحکم لہجے میں کہا۔

آسمان تیزی سے تاریک ہو رہا تھا۔ دھند بہت تیزی سے اور قریب آگئی تھی۔ جلد ہی یہ دھند ساحل کو بھی نگلنے والی تھی بڑا عجیب منظر تھا وہ بھی۔ دھند منظر کی ہر تفصیل کو نگلتی ہوئی، خوفناک انداز میں آگے بڑھ رہی تھی۔ اور جمی کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ دھند ان کے بچاؤ کا سبب بنے گی۔ خدا نے دو مظلوم انسانوں کے لیے یہ غیبی مدد بھیجی تھی۔

اچانک ایک تیز آواز فضا میں تیر گئی۔ وہ سر سے پاؤں تک کپکپا کر رہ گئے: "اے! تم دونوں یہاں کیا کر رہے ہو؟"

جمی اور بانڈا نے پلٹ کر دیکھا۔ ریت کے ایک ٹیلے پر کوئی سو گز دور ایک محافظ رائفل لیے کھڑا تھا۔ جمی نے پلٹ کر ساحل کی طرف دیکھا دھند تیزی سے بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ وہ خوش قسمت تھے یا تیرہ بخت۔ اس کا فیصلہ دھند ہی کر سکتی تھی۔

"اے، تم دونوں ادھر آؤ!" محافظ نے رائفل تان کر کہا۔ "کون ہو تم؟ کہاں سے آئے ہو؟"

جمی نے دونوں ہاتھ بلند کر کے کہا "میرے پیر میں موچ آگئی ہے، میں چل نہیں سکتا۔"

"جہاں ہو، وہیں کھڑے رہو، میں آ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر محافظ نے رائفل نیچے کر دی اور ان کی طرف بڑھنے لگا۔ جمی نے پلٹ کر دیکھا دھند ساحل پر پہنچ چکی تھی اور اب تیزی سے آگے آ رہی تھی۔ ان کی موت اور زندگی کا فیصلہ ہوا ہی چاہتا تھا۔

"بانڈا! بھاگو" یہ کہہ کر جمی مڑا اور دیوانہ وار ساحل کی طرف بھاگ لیا۔ بانڈا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ اس طرح دوڑ رہے تھے جیسے کئی خونخوار شیر ان کے تعاقب میں ہوں۔ دھند اس بے رحم سرزمین پر ان کی واحد محافظ تھی... وہ اس طرف پوری قوت سے دوڑ رہے تھے۔

"رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا" محافظ نے چیخ کر کہا۔

لیکن وہ دونوں نہ رکے، اگلے ہی لمحے انہوں نے گولی چلنے کی آواز سنی۔ ان سے چند قدم آگے ریت کا ایک چھوٹا سا مرغولہ اٹھا وہ دیوانہ وار بھاگتے رہے، وہ جلد از جلد دھند کی چادر میں پہنچ چکے تھے۔ جمی کو یوں لگا جیسے وہ دھنکی ہوئی روئی میں دفن ہو کر رہ گیا ہے۔ دھند میں آنے کے بعد اب ان کے لیے کچھ دیکھنا ناممکن تھا۔ دھند کی مہربان چادر نے انہیں اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ ان کا تعاقب کرنے والی آوازیں اب بہت دور معلوم ہوتی تھیں۔ یہ آوازیں اس دھند سے ٹکرا کر پلٹ رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے ہر طرف سے آوازیں ابھر رہی ہوں۔

"کروگر، میں سربیٹ بول رہا ہوں۔ میری آواز سن رہے ہو نا؟"

"ہاں بربیٹ! میں تمہاری آواز سن رہا ہوں۔"

"وہ دو آدمی ہیں۔" پہلی آواز ابھری۔ "ان میں ایک سفید فام ہے اور دوسرا سیاہ فام۔ وہ دونوں ساحل کی طرف بھاگے ہیں۔ اپنے آدمی چاروں طرف پھیلا دو۔ جونہی وہ نظر آئیں گولی مار کر ہلاک کر دو۔"

"میرا ہاتھ پکڑے رہو۔" جمی نے اپنے سیاہ فام رفیق سے کہا۔

"آخر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" بانڈا نے قدرے جھلاہٹ سے پوچھا۔

"ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔" جمی نے یہ کہہ کر اپنا قطب نما نکالا۔ وہ اسے اپنی آنکھوں کے قریب لے آیا۔ بمشکل تمام وہ قطب نما پر درج حروف پڑھ سکا اور پھر اس نے اپنا رخ مشرق کی طرف کر لیا پھر وہ سرگوشی میں بولا "ہمیں اس طرف بڑھنا ہے۔"

"ایک منٹ انتظار کرو جمی! ہم اس طرح نہیں چل سکتے۔ کسی بارودی سرنگ پر پیر پڑ گیا تو پرخچے اڑ جائیں گے۔"

"تم نے بتایا تھا کہ بارودی سرنگیں ساحل سے سو گز کے فاصلے کے بعد شروع ہوتی ہیں۔" جمی نے اسے یاد دلایا۔ اور پھر وہ دونوں آگے بڑھنے لگے۔ ان کا رخ صحرا کی طرف تھا۔ اس دھند میں وہ اندھوں کی طرح آگے جا رہے تھے لڑکھڑاتے ہوئے۔ دو چار جگہ وہ ٹھوکر کھا کر گرے۔ لیکن پھر اٹھ کر آگے بڑھنے لگے۔ جمی آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اپنے قدم بھی گنتا جا رہا تھا تاکہ اسے فاصلے کا اندازہ رہے۔ ساتھ ہی وہ چند قدم چلنے کے بعد قطب نما نکال کر سمت دیکھتا۔ جب اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ کم و بیش سو گز کا فاصلہ طے کر چکے ہیں تو وہ ٹھہر گیا۔

"میرا خیال ہے کہ یہاں سے بارودی سرنگوں کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔" جمی نے اپنی رائے ظاہر کی۔

"پھر؟ اب کیا خیال ہے؟" بانڈا کچھ نہ جان سکا کہ جمی نے یہ بات کیوں کہی ہے۔

"سکون سے اچھی طرح سوچ کر بتاؤ کہ علاقے میں بارودی سرنگیں کس انداز میں بچھائی گئی ہیں۔ جو بات بھی تمہیں معلوم ہو بتا دو۔"

"ارے باپ رے!" بانڈا نے حیرت سے کہا "دوست۔ آج تک کوئی بھی ... نقشے کے بغیر اس علاقے سے نہیں گزرا ہے۔ محافظ بھی نقشے کے بغیر اس علاقے میں سے گزرنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ بارودی سرنگیں ہر طرف بکھری ہوئی ہیں۔ یہ سرنگیں ریت میں کوئی چھ انچ گہری دفن ہیں۔ ہمیں یہاں اس دھند کے چھٹنے تک انتظار کرنا ہوگا۔"

جمی اس وقت دھند میں گونجنے والی دوسری آوازیں سن رہا تھا۔ محافظ اپنی حفاظت کے خیال سے ایک دوسرے کو پکار رہے تھے "کروگر ... بریٹ ... کروگر ... بریٹ۔"

آوازیں ابھرتی رہیں۔ جمی کا ذہن تیزی سے اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ اسی جگہ رہے تو دھند چھٹتے ہی انہیں گولی مار دی جائے گی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر انہوں نے بارودی سرنگوں کے علاقے سے گزرنا چاہا تو کسی بھی لمحے ان کے چیتھڑے اڑ جائیں گے۔

"سنو یار! کیا تم نے کبھی ان بارودی سرنگوں کو دیکھا ہے؟"

"ہاں میں ان بارودی سرنگوں کو بچھانے میں مدد کرتا رہا ہوں۔" بانڈا نے جواب دیا۔

"یہ بارودی سرنگیں پھٹتی کیسے ہیں؟"

"آدمی کے وزن سے۔ اسی پاؤنڈ سے زیادہ وزن کا ہر دباؤ ان کو پھاڑ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتوں کی دوڑ بھاگ سے یہ سرنگیں نہیں پھٹتیں۔ انہیں اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ انسان کے جسم کا دباؤ پڑتے ہی پن ہٹ جاتی ہے اور بارودی سرنگ ایک زوردار دھماکے سے پھٹ پڑتی ہے۔"

جمی نے گہرا سانس لیا "میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے، ہوسکتا ہے یہ ترکیب کامیاب ہو جائے اور ممکن ہے کہ ناکام بھی ہو اور ہم ایک دھماکے سے اڑ جائیں۔ بولو، کیا تم میرے ساتھ جان کی بازی کا جوا لگا سکتے ہو؟"

"مگر تم نے سوچا کیا ہے؟ ویسے تو جان کی بازی لگی ہی ہوئی ہے بلکہ میرا خیال ہے، ہم یہ بازی تقریباً ہار چکے ہیں۔"

"ہم سینے اور پیٹ کے بل کھسک کر بارودی سرنگوں کا علاقہ پار کریں گے۔ اس طرح ہمارے جسموں کا بوجھ ریت پر تقسیم ہو جائے گا۔" جمی نے بتایا۔

دیو قامت سیاہ فام نے کوئی جواب نہ دیا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" جمی نے پوچھا۔

"سوچ رہا ہوں کہ اس ہولناک مہم پر نکلنا ہی کتنا بڑا پاگل پن تھا۔"

"مجھے بتاؤ تم میرا ساتھ دینا چاہتے ہو؟" جمی نے پوچھا۔

"میرے لیے اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔" بانڈا نے ایک سرد آہ بھر کے کہا "موت ہمارا مقدر ہے تو پھر کیوں نہ جان بچانے کی جدوجہد کرتے ہوئے مرا جائے۔"

"تو پھر آؤ۔ بیکار بیٹھے رہنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ دھند کا کوئی بھروسہ نہیں، پتہ نہیں کب چھٹ جائے۔"

اور پھر جمی ریت پر پیٹ کے بل لیٹ گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی بانڈا بھی گہری سانس لے کر ریت پر اسی طرح لیٹ گیا اور پھر دونوں پیٹ کے بل کھسکتے ہوئے بارودی سرنگوں سے پٹے ہوئے علاقے کی طرف بڑھنے لگے۔ جمی نے کہا "آگے بڑھتے ہوئے اپنے ہاتھوں یا پیروں کا بوجھ ریت پر نہ ڈالنا۔ اپنے پورے بدن کو آگے کھسکانا۔"

وہ دونوں گہری سرمئی دھند میں تھے۔ اس دھند کے پار کچھ دیکھنا ناممکن تھا۔ اس لیے یہ امکان بھی تھا کہ کسی بھی لمحے وہ کسی محافظ یا کسی کتے کے سامنے آ سکتے تھے۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ دونوں زندہ رہنا چاہتے تھے۔ ان کے آگے بڑھنے کی رفتار بہت سست تھی۔ دونوں کے جسموں پر قمیصیں نہیں تھیں۔ ریت کی رگڑ سے ان کے جسم چھلے جا رہے تھے۔ جمی اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ وہ اس وقت سخت خطرات میں گھرا ہوا ہے۔ اگر وہ صحیح سلامت اس صحرا کو پار بھی کر گئے تب بھی ان کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ خاردار تاروں کی باڑھ اور داخلے کے راستے پر نگرانی کا ٹاور اور وہاں متعین مسلح محافظ تھے۔ پھر یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ یہ دھند کس وقت چھٹے گی۔ یہ دھند

تین دن بھی چھائی رہ سکتی تھی اور کسی لمحے بھی چھٹ سکتی تھی۔

دونوں اسی انداز میں کھسکتے رہے۔ انہیں وقت کا بھی احساس نہ رہا۔

بہت فاصلے سے اب بھی انہیں آوازیں سنائی دے رہی تھیں "کروگر... بریٹ... کروگر... بریٹ!"

تھوڑی دیر کھسکنے کے بعد جمی ٹھہر کر قطب نما دیکھ کر اندازہ لگاتا کہ وہ صحیح سمت میں جا رہے ہیں یا نہیں اور پھر وہ کھسکنے لگتے۔ کبھی کبھی ان کا دل چاہتا کہ وہ تیزی سے آگے بڑھیں لیکن اس کے لیے انہیں زمین پر زیادہ دباؤ ڈالنے کی ضرورت تھی جس کے نتیجے میں کوئی بارودی سرنگ ان کے لیے موت کا پیغام بھی بن سکتی تھی۔ کبھی کبھار گھٹی گھٹی سی آوازیں ان کے کانوں میں پڑتیں لیکن ان کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ آوازیں کس سمت سے آ رہی ہیں۔ یہ آوازیں تو ہر طرف سے آتی محسوس ہوتی تھیں۔

وہ دونوں اپنے وجود کو اسی مخصوص انداز میں گھسیٹ رہے تھے کہ اچانک جمی پر حملہ ہوا۔ تاریک چادر سے ایک شکاری کتا جمی پر حملہ آور ہوا تھا۔ جمی اس افتاد کے لیے تیار نہ تھا۔ شکاری کتے نے اپنے دانت اس کے بازو میں اتار دیے تھے۔ جمی نے ہیروں کی پوٹلی پھینک کر کتے کا جبڑا کھولنے کی کوشش کی۔ لیکن ایک ہاتھ سے یہ ناممکن تھا۔ خون اس کے بازو سے بہنے لگا تھا۔ کتے کی غراہٹ بڑی خوفناک تھی۔ وہ جمی کے بازو کا گوشت اپنے تیز دانتوں سے کاٹ لینا چاہتا تھا۔ قریب تھا کہ ایسا ہی ہوتا کہ جمی نے ایک زوردار دھپ کی آواز سنی۔ اور پھر دھپ دھپ کی آوازیں ابھرتی ہی رہیں۔ کتے کا بھیجا پھٹ گیا۔ بانڈا نے ہیروں کی بھاری پوٹلی سے ضربیں مار مار کر کتے کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔

"تم تو ٹھیک ہو نا جمی؟" بانڈا کی آواز ابھری۔

"ہاں۔ میں ٹھیک ہوں۔ بس یوں سمجھو، موت سے بال بال بچا ہوں۔" جمی نے کراہتے ہوئے کہا۔

بانڈا نے اپنی پتلون سے لمبی سی دھجی اتاری اور اس کے زخمی بازو کو سختی سے باندھتے ہوئے بولا "ہمیں آگے بڑھنا ہے۔ یہاں سے نکل جانا ہے۔ کوئی اور کتا بھی ادھر آ سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" جمی نے جواب دیا اور بازو میں اٹھنے والی درد کی شدید ٹیسوں کا خیال کیے بغیر پھر آگے بڑھنے لگا۔

جمی کو اب کسی بات کا خیال نہیں تھا۔ وہ بس خودکار انداز میں اپنے وجود کو گھسیٹ رہا تھا۔ بانڈا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ انہیں نہ وقت کا احساس تھا نہ فاصلے کا۔ وہ دونوں تو زندگی کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ اور پھر تھکن ان پر غالب آتی چلی گئی۔ ان کے آگے بڑھنے کی رفتار اور بھی سست ہو گئی۔ وہ موت سے بچنے کے لیے رینگ رہے تھے اور موت کی طرف بھی رینگ رہے تھے۔

اور پھر ایک وہ وقت بھی آیا جب ان کے لیے اپنے اعضا کو حرکت دینا بھی ممکن نہ رہا۔ وہ بے حد تھک گئے تھے۔

پھر وہ سو گئے۔

جب جمی کی آنکھ کھلی تو اس نے ماحول کو بدلا ہوا پایا۔ وہ ریت پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کا تمام جسم درد سے پھوڑا بنا ہوا تھا۔ بانڈا اس سے چھ فٹ کے فاصلے پر سو رہا تھا۔ بس ماحول میں یہی تبدیلی تھی۔ وہ بانڈا کو دیکھ سکتا تھا۔ دھند چھٹ رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ چھٹتی ہوئی دھند سے اُسے آس پاس کے ماحول کا ہیولہ نظر آ رہا تھا وہ ساحل سے کھسکتے ہوئے گیٹ کے قریب آ گئے تھے سامنے اُسے واچ ٹاور نظر آ رہا تھا اور اس کے دونوں طرف خاردار تاروں کی اونچی سی باڑھ تھی۔ گیٹ کے پاس ہی پچاس ساٹھ سیاہ فام مزدوروں کی قطار تھی۔ وہ شاید ہیروں کی تلاش ختم کر کے باہر جا رہے تھے۔ دوسری شفٹ کے مزدور آ رہے تھے۔

جمی گھٹنوں کے بل کھسکتا ہوا بانڈا کے پاس پہنچا اور اُسے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور چاروں طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔

"اف خدایا۔ تو ہم یہاں تک آ پہنچے تھے۔"

"ہاں۔ لاؤ ہیروں کی پوٹلی مجھے دے دو۔"

بانڈا نے پوٹلی اسے دیتے ہوئے کہا "مگر تم..."

"میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔" جمی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"گیٹ پر کھڑے ہوئے مسلح محافظ ہمیں پہچان لیں گے کہ ہم ان کے مزدوروں میں سے نہیں ہیں۔" بانڈا نے کہا۔

"میں بھی جانتا ہوں اور میں اسی سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔"

دونوں سیدھے محافظوں کی طرف بڑھ گئے۔ جمی آگے آگے تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ کام پر آنے اور کام ختم کر کے جانے والے مزدوروں کی قطاروں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ دونوں شفٹوں کے مزدور آپس میں مختلف جملوں کا تبادلہ کر رہے تھے۔ وہ

دھندے پر تبصرے کر رہے تھے۔

یانڈا جمی کے پیچھے پیچھے گیٹ پر پہنچ گیا۔ گیٹ کے اندر دو نہایت موٹے تازے، کرخت اور کریہہ چہروں والے محافظ کھڑے تھے۔ وہ باہر آنے والے مزدوروں کو ایک ایک کر کے قریب ہی بنی ہوئی ٹین کی ایک جھونپڑی کی طرف دھکیل دیتے۔ اس جھونپڑی میں کپڑے اتار کے ان کی تلاشی لی جاتی کہ کہیں ان میں سے کسی نے کوئی ہیرا تو نہیں چرایا۔

جمی مزدوروں کی لائن سے گزرتا ہوا ایک محافظ کے پاس گیا اور خوشامدانہ لہجے میں بولا "معاف کیجیے جناب! ہم دونوں یہاں مزدوری کی تلاش میں آئے ہیں۔ آپ بتا سکتے ہیں کہ اس سلسلے میں کس سے ملنا چاہیے؟"

یانڈا اس کی اس جرأت پر حیران رہ گیا۔

محافظ نے پلٹ کر جمی کو شعلہ بار نظروں سے دیکھا اور چلّا کر بولا "تم... تم آخر اس باڑھ کے اندر کیا کر رہے ہو۔ یہاں آئے کیسے؟"

"ہم یہاں مزدوری کے لیے آئے ہیں جناب۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ یہاں ایک محافظ اور ایک مزدور کی جگہ خالی ہے۔ یہ میرا ملازم ہے" یہ مزدوری کر سکتا ہے۔ میں نے سوچا کہ یہاں آ کر خود صاحب سے ملاقات کروں۔"

محافظ نے ان دونوں کو نفرت سے دیکھا۔ ان کے جسموں پر چیتھڑے جھول رہے تھے وہ حقارت سے بولا "بھاگ جاؤ یہاں سے۔"

"جناب ہم یہاں سے جانے کے لیے نہیں آئے۔ ہم ملازمت کی تلاش میں آئے ہیں۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ...." جمی نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ممنوعہ علاقہ ہے گدھے۔ یہ بورڈ نہیں پڑھ سکتے۔ چلو یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ بھاگو یہاں سے تم دونوں" پھر اس نے باڑھ کے باہر کھڑی ہوئی ایک گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ اس گاڑی میں کام ختم کر کے باہر آنے والے مزدور سوار ہو رہے تھے "اس گاڑی سے پورٹ ناتھ چلے جاؤ۔ وہاں کمپنی کا دفتر ہے۔ ملازمت چاہتے ہو تو وہاں جا کر کوشش کرو۔"

"او ہ شکریہ جناب" جمی نے جواب دیتے ہوئے یانڈا کو اشارہ کیا اور وہ دونوں گیٹ سے باہر آ گئے۔

محافظ نے شعلہ بار نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا "احمق، پاجی، الّو، پتہ نہیں کہاں سے منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔"

دس منٹ بعد وہ دونوں اس گاڑی سے پورٹ ناتھ کی طرف جا رہے تھے۔ ان کے پاس دس لاکھ پونڈ مالیت کے ہیرے تھے۔

٭

نہایت شاندار گاڑی تھی جو کلپ کی مرکزی سڑک پر بڑے کروفر سے داخل ہوئی، اسے دو نہایت خوبصورت اور توانا گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ گھوڑوں کی باگیں ایک دبلے پتلے اور چاق و چوبند شخص کے ہاتھوں میں تھیں۔ اس کے سر کے بال، داڑھی اور مونچھیں بالکل سفید تھیں۔ اس کے جسم پر نہایت قیمتی اور عمدہ سلا ہوا سوٹ تھا۔ ٹائی کی پن پر ایک بڑا سا ہیرا جگمگا رہا تھا۔ سر پر خوبصورت ہیٹ تھا۔ چھوٹی انگلی میں پڑی ہوئی انگوٹھی پر بھی ایک قیمتی ہیرا جگمگا رہا تھا۔ اس شہر والوں کے لیے وہ اجنبی تھا لیکن یہ شہر اس نووارد کے لیے اجنبی نہ تھا۔

ایک سال پہلے جب جمی یہاں سے گیا تھا اس وقت سے اب تک بارہ مہینوں میں یہ قصبہ خاصہ تبدیل ہو گیا تھا۔ یہ خیموں کی بستی کی بجائے ایک بڑھتے پھیلتے شہر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ یہ ۱۸۸۴ء کی بات ہے۔ ریلوے لائن کیپ ٹاؤن سے ہوپ ٹاؤن تک بچھا دی گئی تھی۔ ہوپ ٹاؤن سے قصبے تک برانچ لائن بچھا دی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے یہاں آنے والے لوگوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ قصبے میں اب بھیڑ بھاڑ بھی بہت تھی۔ لوگ بھی مختلف سے معلوم ہو رہے تھے۔ اب بھی یہاں ہیروں کی تلاش میں لوگ آیا کرتے تھے لیکن ان کے ساتھ ہی اب یہاں مرفع الحال تاجر بھی تھے جو نہایت سلیقے کے لباس میں اِدھر اُدھر آتے جاتے نظر آتے تھے۔ یہ شہر واقعی بہت تبدیل ہو گیا تھا۔

جمی اپنی گاڑی کو بھگاتا رہا۔ گاڑی تین نو تعمیر شراب خانوں، چند رقص گاہوں کے سامنے سے گزرتی چلی گئی۔ پھر وہ ہوٹل گرینڈ کے سامنے سے گزرا۔ یہ ہوٹل بھی نیا نیا تعمیر ہوا تھا۔

جمی نے اپنی بگھی ایک بینک کے سامنے روک دی۔ باگیں ایک مقامی بچے کو تھما کر وہ بڑے شاہانہ انداز میں چلتا ہوا بینک میں داخل ہو گیا۔

بینک منیجر کے پاس پہنچ کر جمی نے بہت بلند آواز میں کہا "جناب میں آپ کے بینک میں ایک لاکھ پونڈ جمع کرانا چاہتا ہوں۔"

توقع کے مطابق جلد ہی یہ بات ہر طرف پھیل گئی۔ جب وہ بینک سے نکل کر اسمٹ کے شراب خانے میں داخل ہوا تو وہ لوگوں کی توجہ بن چکا تھا۔ جمی اس جگہ سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس کا اندرونی ماحول قطعی تبدیل نہیں ہوا تھا۔ ہر طرف بھانت بھانت کے لوگ بیٹھے

ہوئے تھے۔ جمی نہایت بے پروائی سے چلتا ہوا سیدھا کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ شراب خانے میں بیٹھے ہوئے ہر فرد کی نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔

اسمٹ آج بھی پہلے کی طرح اپنی ڈیوٹی پر موجود تھا۔ "فرمائیے جناب، کیا پینا پسند کریں گے؟" اسمٹ نے مصنوعی کاروباری مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے بولا۔ وہ جمی کو قطعی طور پر پہچان نہیں پایا تھا۔ یہی تو وہ خبیث تھا جس نے اسے شکار کے طور پر جوزف کے پاس بھیجا تھا اور پھر اس کی موت کا سامان بھی کیا تھا۔ جمی نے اسے مشروب کا آرڈر دیا اور گردوپیش کا جائزہ لینے لگا۔ اسے وہ دن یاد آ گیا جب وہ جوزف کے ہاتھوں لٹنے کے بعد مایوس اور دل گرفتہ یہاں پہنچا تھا۔ اس روز مارے غصے کے اس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ اس نے اسمٹ کے سامنے بوڑھے جوزف کا حشر نشر کرنے کا اعلان کیا تھا اور اس وفادار کتے نے فوراً ہی اپنے مالک کو اس کے عزائم سے آگاہ کر دیا۔ اس منحوس نے اسے موت کے گھاٹ اتارنے کا انتظام بھی کیا تھا۔

"یہاں ٹھہریں گے یا آگے جا رہے ہیں؟" اسمٹ نے مطلوبہ مشروب جمی کے سامنے رکھ کر پوچھا۔

"فی الحال تو میرا یہیں ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔ میں نے سنا ہے کہ یہ شہر سرمایہ کاری کرنے والوں کے لیے ایک جنت ہے۔"

اسمٹ کی آنکھوں میں حریصانہ چمک عود کر آئی، وہ میلا کپڑا کاؤنٹر پر رکھ کے بولا۔ "آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ اس سے زیادہ بہتر جگہ سرمایہ کاری کے لیے اس وقت دنیا میں کہیں اور نہیں۔ اور پھر اگر کسی شخص کے ایک لاکھ۔۔۔ میرا مطلب ہے اگر کسی کے پاس دولت ہو تو پھر وہ یہاں بڑی کامیابیاں حاصل کر سکتا ہے۔ اور سچی بات تو یہ ہے جناب کہ اس سلسلے میں، میں بھی آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔"

"واقعی، وہ کیسے؟" جمی نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

اسمٹ نے آگے جھک کر رازدارانہ لہجے میں اور سرگوشی میں کہا۔ "جناب میں ایک شخص سے خوب واقف ہوں جس کے ہاتھ میں اس شہر کی باگ ڈور ہے۔ وہ کونسل کا چیئرمین اور شہری کمیٹی کا سربراہ ہے۔ وہ اس علاقے کا نہایت بااثر اور اہم شخص ہے۔ اس کا نام جوزف ہے۔"

جمی نے مشروب کی چسکی لے کر کہا۔ "میں نے یہ نام پہلے کبھی نہیں سنا۔ ذرا ان صاحب کا تعارف کرا دو۔"

"اس شہر میں سب سے بڑا اسٹور اسی کا ہے جناب۔ وہ سرمایہ کاری میں آپ کی بہت مدد کر سکتا ہے۔ آپ اس سے ملاقات کر کے فائدے میں رہیں گے جناب!"

جمی نے ایک اور چسکی لے کر کہا۔ "اسے یہاں بلا لو۔"

اسمٹ نے جمی کی انگلی اور ٹائی پن میں جگمگاتے ہیروں کو دیکھا اور بولا۔ "بہت بہتر جناب، آپ کا نام؟"

"مجھے مارٹن کہتے ہیں۔"

"بہت بہتر جناب! مجھے یقین ہے کہ مسٹر جوزف آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔" یہ کہہ کر اس نے جمی کے گلاس میں مزید مشروب انڈیلا۔ "آپ جب تک یہ پئیں۔ میں ابھی ان کو بلا کر لاتا ہوں۔"

جمی مشروب کی چسکیاں لینے لگا۔ وہ پوری طرح اس بات سے باخبر تھا کہ یہاں بیٹھا ہوا ہر شخص اسی کو دیکھ رہا ہے۔ وہ اس شہر میں شاندار انداز میں آیا تھا۔ لوگ یہاں امیر بننے کے لیے آتے تھے۔ ان میں سے کچھ واقعی دولت مند بن کر لوٹتے تھے لیکن وہ شاید پہلا شخص تھا جو اتنی دولت کے ساتھ اس علاقے میں آیا تھا۔ یہ اس شہر کے لیے نئی بات تھی۔ ایسا انوکھا شخص اس شہر میں اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔

پندرہ منٹ بعد اسمٹ جوزف کے ساتھ واپس آیا۔ جوزف سفید بالوں، سفید داڑھی اور سفید مونچھوں والے شخص کی طرف بڑھا اور پُرجوش انداز میں ہاتھ ملا کر کہا۔ "ہیلو مسٹر مارٹن! مجھے جوزف کہتے ہیں۔"

جمی غور سے جوزف کو دیکھتا رہا۔ وہ بھی اس کے اصل روپ کو پہچان نہیں سکا۔ ظاہر ہے وہ پہچان بھی کیسے سکتا تھا۔ جمی بالکل ہی بدل گیا تھا۔ اب وہ اٹھارہ برس کا ناتجربہ کار، دبلا پتلا لڑکا نہیں تھا۔ اپنی اصل عمر سے کہیں بڑا سنجیدہ اور تجربہ کار دولت مند شخص دکھائی دیتا تھا۔

اسمٹ نے انہیں کونے میں پڑی ہوئی ایک میز پر لے جا کر بٹھا دیا۔

کرسیاں سنبھالتے ہی جوزف نے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ آپ اس علاقے میں کوئی کاروبار کرنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں اگر ممکن ہوا تو۔ پہلے تو میں یہاں گھوم پھر کے حالات کا جائزہ لوں گا۔"

"اس سلسلے میں میری خدمات حاضر ہیں۔ آپ کو یہاں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ یہاں بہت بڑے بڑے ٹھگ اور دھوکے باز پڑے ہوئے ہیں۔" جوزف نے بہی خواہ کا روپ دھار کر کہا۔

"مجھے یقین ہے۔" جمی نے جوزف کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ویسے بھی جہاں دولت کی ریل پیل ہو وہاں فریب تو ہوتا ہی ہے"
یہ سب کتنا نقلی تھا۔ وہ یہاں بیٹھا نہایت انہماک سے اور نرمی کے ساتھ اس شخص سے مصروف گفتگو تھا جس نے نہ صرف اس کی دولت ہتھیالی تھی بلکہ اُسے قتل کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ وہ گزشتہ ایک برس سے انتقام کی آگ میں سلگ رہا تھا۔ وہ صرف اس شخص سے انتقام لینے کے لیے زندہ تھا اور اب اس کے لیے پوری تیاری کر کے یہاں آیا تھا۔
"جناب عالی! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کتنی رقم کاروبار میں لگانا چاہتے ہیں؟"
"ابتدائی طور پر ایک لاکھ پونڈ لگاؤں گا۔" جمی نے بے پروائی سے کہا۔ یہ سن کر جوزف نے ندیدوں کی طرح ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "اگر میں مطمئن ہو گیا تو تین چار لاکھ پونڈ مزید لگا سکتا ہوں۔"
"بہت خوب! پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ آپ یہاں نہایت کامیاب رہیں گے۔ بشرطیکہ آپ کو کوئی صحیح مشورہ دینے والا ہو۔ آپ نے یہ طے کیا ہے کہ آپ کس کاروبار میں پیسہ لگانا چاہتے ہیں؟" جوزف کی حالت اُس کتے کی سی تھی جو تین دن کا پیاسا ہو اور جس نے تھوڑی ہی دور دریا بہتا دیکھ لیا ہو۔
"پہلے میں یہاں جائزہ لینا چاہتا ہوں کہ کن کن شعبوں میں سرمایہ کاری کی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد ہی میں کوئی فیصلہ کر سکتا ہوں۔" جمی نے بتایا۔
"آپ کا اندازِ فکر بہت درست ہے جناب! آج رات کا کھانا آپ میرے ساتھ تناول فرمائیں۔ اس موقع پر ہم مزید تبادلۂ خیال کریں گے۔ میری بیٹی بہت اچھے کھانے پکاتی ہے۔ آپ کی میزبانی میرے لیے اعزاز ہوگی۔"
"بہت بہت شکریہ مسٹر جوزف۔ میں ضرور آؤں گا۔" جمی نے جواب دیا اور خاموشی سے مشروب پینے لگا۔ وہ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ جوزف اس موٹی اسامی کو لوٹنے کے منصوبے باندھ رہا تھا اور جمی اپنی کامیاب مہم کے بعد کے واقعات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔
ہیروں کے صحرا سے کیپ ٹاؤن کی واپسی کا سفر بہت اچھا تھا۔ جمی اور بانڈا پہلے ایک دیہات پہنچے تھے جہاں ایک ڈاکٹر سے جمی نے اپنے زخمی بازو کا علاج کرایا تھا۔
کیپ ٹاؤن میں جمی نے رائل ہوٹل میں قیام کیا۔ یہاں جمی نے اپنی شخصیت ہی تبدیل کر لی تھی۔ تب پہلی مرتبہ اُسے احساس ہوا تھا کہ دولت انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ پیسہ آتے ہی اس میں دنیا جہاں کا اعتماد آ گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بے حد مضبوط اور طاقتور محسوس کر رہا تھا۔
جمی کو اس سفر کی ایک ایک تفصیل یاد تھی۔ اور ان تفصیلات میں سب سے اہم بات بانڈا کا کردار تھا۔ اس کا دوست اس کا ہم سفر! اس کا رفیق سیاہ فام جس نے اس کے لیے بہت بڑی قربانی دی تھی۔
جب وہ واپس کیپ ٹاؤن پہنچے تھے تو جمی نے اس سے بہت اصرار کیا تھا کہ وہ اسی کے ساتھ ٹھہرے۔ لیکن بانڈا نے ہر مرتبہ مسکرا کر اُسے ایک ہی جواب دیا تھا۔ "نہیں دوست۔ تمہارے ساتھ رہ کر میری زندگی بالکل اپاہجوں کی سی ہو جائے گی۔ میں کہیں جا کر اپنے لیے ہل کا کچھ سامان پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنی محنت مشقت کی عادت کو خراب کرنا نہیں چاہتا۔"
"اب تم کیا کرو گے؟" اس نے پوچھا تھا۔
"میں تھوڑی سی زمین خریدنا چاہتا ہوں اور شادی کرنا چاہتا ہوں۔" بانڈا نے اپنا پروگرام بتایا۔
"تو پھر آؤ، کسی جوہری کے پاس چلتے ہیں تاکہ تمہیں ہیروں کا حصہ دے دیا جائے۔"
"نہیں، مجھے ہیروں کی ضرورت نہیں۔" بانڈا نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "میں مایا جال میں پھنسنا نہیں چاہتا۔"
جمی نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا کہہ رہے ہو! ان میں سے نصف ہیرے تمہارے ہیں۔ تم لکھ پتی ہو بانڈا لکھ پتی!"
"نہیں میرے دوست! میرا رنگ دیکھ رہے ہو۔ اس رنگ کے ساتھ اگر میں دولت مند ہو گیا تو میری زندگی جہنم بنا دی جائیگی"
"تم کچھ ہیرے چھپا لینا۔ دولت سے تمہارے سارے دلدّر دور ہو جائیں گے۔ اور تم ہمیشہ آرام سے زندگی گزار سکو گے۔"
"نہیں بھئی۔ مجھے زیادہ دولت نہیں چاہیے۔ میں بس اتنی رقم چاہتا ہوں کہ کچھ زمین خرید لوں اور دو بیل مجھے مل جائیں تاکہ ان کی مدد سے شادی کر سکوں۔ یہ تمام چیزیں حاصل کرنے کے لیے بس دو تین ہیروں کی ضرورت ہوگی۔ باقی سب ہیرے تمہارے

ہیں۔"
"یہ ناممکن ہے۔ تم اپنا حصّہ آخر مجھے کیوں دینا چاہتے ہو؟"
"اس لیے کہ تم جوزف کو میرے حوالے کر سکو۔" بانڈا نے سرد لہجے میں کہا۔
جمی دیر تک بانڈا کو گھورتا رہا۔ پھر لاپروائی کے انداز میں شانے اچکا کر بولا "تم بے فکر رہو دوست، میں اس خبیث شخص کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔"
"اچھا تو پھر خدا حافظ!" وہ کھڑا ہو گیا۔
دونوں نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ بانڈا نے مسکرا کے کہا۔ "ہم دونوں پھر ملیں گے۔ اگلی ملاقات میں کوئی نہایت سنسنی خیز مہم کا منصوبہ تیار کر کے رکھنا تاکہ ہم پھر کوئی کارنامہ کر سکیں۔" بانڈا نے اس کے شانے پر ہلکی سی تھپکی دی اور تین چھوٹے ہیرے لے کر روانہ ہو گیا۔
اب وہ جوزف سے انتقام لینے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔
جمی کو یاد آیا کہ قصبے تک کا سفر پہلے کے کتا گاڑی کے سفر سے ہزار گنا بہتر ثابت ہوا تھا۔ اس نے شاندار اور انتہائی آرام دہ بگھی میں سفر کیا تھا۔ مگر سارے راستے اسے گھبراہٹ اور بے چینی محسوس ہوتی رہی تھی۔
جوزف نے جمی کو چونکا دیا۔ دونوں نے رسمی الوداعی کلمات کہے اور شراب خانے سے باہر آ گئے۔
اُس شام جب جمی، جوزف کے اسٹور پہنچا تو نفرت کے جذبات سے بے حد مغلوب ہو رہا تھا۔ ایک برس پہلے اس اسٹور میں اُس پر جو کچھ بیتی تھی۔ وہ تمام باتیں اُس کے ذہن پر نقش تھیں۔ جوزف نے جس طرح اُسے دھوکا دیا تھا۔ اس کی محنت کو جس طرح ضائع کیا تھا۔ اسے اپنے حق سے جس انداز میں محروم کیا تھا۔ وہ سب کچھ اُسے یاد تھا۔ اس کے سینے میں آگ دہک رہی تھی اور وہ اپنے پورے وجود میں اس کی تپش محسوس کر رہا تھا۔
جمی چند لمحے یونہی کھڑا رہا۔ وہ اپنے جذبات کو اس مرحلے پر بے لگام ہوتے نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ جوزف سے بھرپور اور مکمل انتقام لینے کا تہیہ کر چکا تھا جس کے لیے صبر و تحمل اور وقت کی ضرورت تھی۔ انتظار کی ضرورت تھی۔
چند لمحے بعد اُس نے دروازے پر دستک دی
جوزف شاید اسی کا منتظر تھا۔ چند ہی لمحے بعد دروازہ کھلا۔ جمی کو دیکھ کر اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ گرم جوشی سے بولا۔ "آئیے، خوش آمدید!" جوزف جیسے اس کے لیے بچھا جا رہا تھا۔
"شکریہ! جناب ... معاف کیجیے میں آپ کا نام بھول گیا۔" جمی نے لاجواب اداکاری کا مظاہرہ کیا۔
"مجھے جوزف کہتے ہیں۔ آئیے تشریف لائیے کھانا تیار ہے۔ بیٹی جلدی سے کھانا لگا دو۔" اُس نے اپنی بیٹی کو زور سے آواز دی۔
جمی ایک کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ یہاں ایک برس کے عرصے میں سوائے تین کرسیوں کے کچھ بھی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ مارگریٹ چولہے کے پاس کھڑی فرائنگ پان میں کچھ تل رہی تھی۔ اس کی پشت اُن کی طرف تھی۔
"مارگریٹ بیٹی! یہ ہیں ہمارے معزز مہمان، مسٹر مارٹن۔ بہت خوش اخلاق خوش اطوار اور شریف آدمی ہیں۔ یہاں کاروبار کے سلسلے میں تشریف لائے ہیں۔"
مارگریٹ نے پلٹ کر جمی کو دیکھا "کہیئے کیا حال چال ہیں۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں بھی شناسائی کی ہلکی سی جھلک نہیں تھی۔ وہ بھی اس بدلے ہوئے جمی کو پہچاننے میں ناکام رہی تھی۔
"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" جمی نے جواب دیا۔ "سنا ہے آپ کھانا بہت اچھا پکاتی ہیں؟"
مارگریٹ خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی۔ اسی وقت اسٹور میں کسی گاہک نے گھنٹی بجائی۔ "معاف کیجیے۔ جناب میں ابھی آیا۔ آپ اطمینان سے بیٹھیں۔" یہ کہہ کر جوزف تیزی سے باہر نکل گیا۔
مارگریٹ نے میز پر کھانا لگانا شروع کر دیا۔ جمی قریب ہی کھڑا اسے بغور دیکھتا رہا۔ اس کا جائزہ لیتا رہا۔ ایک برس میں وہ بہت بدل گئی تھی۔ اس کی نسوانیت اور شباب پورے عروج پر تھے۔ وہ کلی سے پھول بن گئی تھی۔ اس کے جسمانی خطوط نمایاں ہو کر اس کی شخصیت کو ایک نیا نکھار دے گئے تھے۔
"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" جمی نے کہا

"مجھے امید ہے جناب! آپ کو بھی یہ کھانا پسند آئے گا۔" مارگریٹ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ بری طرح شرما رہی تھی۔
"آج میں بہت دنوں کے بعد گھر میں پکا ہوا کھانا کھاؤں گا۔ ویسے خوشبو تو بہت اچھی ہے۔" یہ کہہ کر جمی نے اس کے ہاتھ سے ایک ڈش لے کر اسے میز پر رکھ دیا۔ وہ جمی کے اس طرزِ عمل سے بھونچکا رہ گئی۔ پلیٹ اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے رہ گئی۔ اس نے تو آج تک ایسی بات نہ دیکھی تھی نہ سنی تھی کہ کوئی مرد عورت کا ہاتھ بھی بٹا سکتا ہے۔ اُس نے اپنی حیران حیران آنکھوں سے جمی کو دیکھا۔ ٹوٹی ہوئی ناک اور گال پر ایک طویل زخم کے نشان نے اس چہرے کو بگاڑ دیا تھا۔ جو بصورتِ دیگر بہت خوبصورت ہوتا۔ اس کی آنکھیں سرمئی تھیں اور ان میں ذہانت کی لپک تھی۔ ان میں ایک ایسی چمک تھی جو بہت کم آنکھوں میں ہوتی ہے۔ اس کے سفید بالوں سے لگتا تھا کہ وہ جوان نہیں ہے۔ اس کی عمر ڈھل رہی ہے۔ اس کے باوجود اس کی شخصیت میں نوجوانوں کی سی آب تھی۔ وہ طویل قامت اور مضبوط اعضاء کا مالک تھا۔ مارگریٹ اُسے دیکھتی رہی۔ جمی اُسے دیکھتا رہا۔
اور پھر وہ چونک گئی۔ جمی کی آنکھوں میں ایک ایسا جارحانہ پیغام تھا جسے محسوس کر کے وہ شرما گئی۔ گھبرا گئی اور پلٹ کر باورچی خانے کی طرف بھاگی۔ وہ ان آنکھوں کے انداز پر شرم سے دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ وہ جمی کی شخصیت کے سحر میں کھو گئی تھی۔
اُسی وقت جوزف لپکتا ہوا واپس آیا اور مسکرا کر دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولا: "میں نے اسٹور بند کر دیا ہے۔ آیئے اب کھانا ہو جائے۔"

جمی کو میز کے ایک کونے پر بٹھایا گیا۔ دونوں باپ بیٹی آمنے سامنے بیٹھ گئے۔
کھانے کے دوران باتیں بھی ہوتی رہیں۔ "کیا اِس طرف آنے کا آپ کا یہ پہلا اتفاق ہے؟" جوزف نے معلوم کیا۔
"جی ہاں۔ میں پہلی مرتبہ یہاں آیا ہوں۔" جمی نے لقمہ جلدی سے نگل کر کہا۔
"آپ اپنی بیگم کو ساتھ نہیں لائے؟"
"ابھی تک مجھے کوئی ایسی لڑکی نہیں ملی جسے میں بیوی بنا سکتا۔" جمی نے مسکرا کر جواب دیا۔ "تلاش جاری ہے۔ دیکھئے کب ملتی ہے۔"
"وہ کوئی احمق عورت ہی ہوگی جو اس سے شادی سے انکار کرے گی۔" مارگریٹ نے اُسے دیکھتے ہوئے سوچا اور اپنے خیالات پر دل ہی دل میں شرما کر رہ گئی۔
"اس علاقے میں آپ جیسے لوگوں کے لیے بڑے مواقع ہیں۔" جوزف نے بتایا۔
"میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے یہ مواقع ضرور بتائیں۔" جمی نے کہا اور مارگریٹ کو گہری نظروں سے دیکھا۔ وہ شرما گئی۔
"معاف کیجیے مسٹر ملسن۔ برا نہ مانیے گا۔ کیا آپ بتائیں گے کہ یہ دولت آپ کو کہاں سے ملی؟"
مارگریٹ کو اپنے والد کا یہ سوال بہت ناگوار گزرا۔ بھلا کوئی کسی اجنبی سے پہلی ملاقات میں ایسے سوال کرتا ہے۔ لیکن یہ اجنبی بھی تو عجیب تھا۔ اُس نے قطعی برا نہ مانا۔ مسکرا کے آہستگی سے بولا: "مجھے یہ دولت اپنے والد سے ورثے میں ملی ہے۔"
"بہر حال میرا اندازہ ہے کہ آپ کو کاروبار کا وسیع تجربہ ہے۔"
"آپ کا اندازہ غلط ہے۔ میں بالکل اناڑی ہوں اور میں اس سلسلے میں رہنمائی چاہتا ہوں۔" جمی نے جواب دیا۔
یہ سن کر کہ جمی بالکل ناتجربہ کار ہے۔ جوزف کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "بس قسمت کی بات ہے کہ ہماری ملاقات ہو گئی۔ یہاں میرے ایسے لوگوں سے تعلقات ہیں جو آپ کے لیے بہت سودمند ثابت ہو سکتے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ چند مہینوں میں آپ کی رقم دوگنی ہو جائے گی۔" یہ کہہ کر اس نے جمی کا شانہ تھپتھپایا۔ "یقین کریں جناب۔ آج کا دن ہم دونوں کے لیے بہت اہم ہے۔ یہ دن ہماری زندگیوں کا اہم موڑ ثابت ہوگا۔"

جمی معنی خیز انداز میں مسکرا کے بولا: "مجھے بھی یقین ہے کہ یہ دن یادگار ثابت ہوگا۔"
"سنا ہے کہ یہ علاقہ بہت خوبصورت ہے۔ آپ برا نہ مانیں تو اپنی صاحبزادی کو اجازت دیں کہ وہ مجھے یہاں کی سیر کرا دے۔"
مارگریٹ کو اپنے دل کی دھڑکن بند ہوتی محسوس ہوئی۔ نووارد نے کس بے تکلفی اور بیباکی سے کیسی غضب کی بات کہہ دی تھی۔ اُسے قدم برابر بھی شرم اور ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی تھی۔
"جی۔ میں نہیں کہہ سکتا مگر۔۔۔" جوزف خاموش ہو گیا۔ ایسا آج تک نہیں ہوا تھا۔
جوزف کا یہ ایک طے شدہ اصول تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو کسی مرد کے ساتھ تنہا نہیں رہنے دیتا تھا۔ پھر بھی اس موٹی آسامی کے معاملے میں اُس نے سوچا کہ یہ اصول توڑنے میں کوئی حرج نہیں۔ جمی بہت موٹی مرغی تھا۔ وہ آسانی سے اُسے ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔

اور یہ سب باتیں سوچ کر اس نے اپنا جملہ مکمل کر دیا ''.....مگر میرا خیال ہے کہ کچھ دیر کے لیے میں مارگریٹ کو اسٹور سے چھٹی دے سکتا ہوں۔ بیٹی! تم مسٹر مارٹن کو اس علاقے کی سیر کرا دوگی۔ یہ ہمارے معزز مہمان ہیں۔ ان کی خدمت کرنا ہمارا فرض ہے۔''

''اگر آپ یہی چاہتے ہیں تو میں کیا کہہ سکتی ہوں!'' مارگریٹ نے آہستگی سے جواب دیا۔ اس نے اپنی آواز کی کپکپاہٹ پر بمشکل قابو پایا تھا۔

''تو پھر طے ہو گیا۔ کل صبح دس بجے میں حاضر ہوں گا۔'' جمی نے کہا۔

اس خوش قامت، خوش پوش مہمان کے جانے کے بعد مارگریٹ نے ایک سحر زدہ کیفیت میں میز صاف کی اور تمام برتن اٹھا کر دھو دیئے۔ وہ دعوت پر آئے ہوئے مہمان کے بارے میں سوچتی رہی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کسی مرد سے اتنی متاثر ہوئی تھی۔ اسٹور میں کام کرتے ہوئے سیکڑوں افراد سے اس کا سابقہ پڑا تھا۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی مارگریٹ کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے مارگریٹ سے کوئی خاص بات بھی نہیں کی تھی۔ شاید اس لیے کہ اسے اپنی بولتی ہوئی داستان طراز آنکھوں پر بہت بھروسہ تھا۔

اور اس کے کان میں اپنے والد کا مخصوص جملہ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اترتا محسوس ہوا ''بیٹی، ہر مرد کے اندر ایک شیطان چھپا ہوتا ہے۔ میں کسی مرد کو تمہاری معصومیت کو داغدار کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔'' پگھلے ہوئے سیسے کی مانند اس جملے کی بازگشت اس کے کان میں اترتی رہی۔ کیا واقعی یہ بات درست ہے۔ اُسے یاد آیا کہ اجنبی مہمان جب بھی اس کو دیکھتا تھا تو اُس کے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ جاتی تھی۔ اس کے جسم میں ایک میٹھی میٹھی سی کیف آور کیفیت دوڑ جاتی تھی۔ تو کیا، تو کیا مارٹن اس کی معصومیت کو داغدار کرنا چاہتا ہے۔ یہ تصور خوفناک بھی تھا اور نشہ آور بھی۔ اس کے روم روم میں ایک تشنہ کیفیت گھل گئی تھی۔ اس تصور سے اس کی سانسیں الجھ کر رہ جاتیں۔ کان کی لویں گرم ہو جاتیں۔

اس نے دھلی ہوئی پلیٹ کو تیسری مرتبہ خشک کر کے میز پر رکھ دیا ''کاش آج ممی زندہ ہوتیں۔'' اس نے دکھ سے سوچا۔ وہ ایسی کیفیت سے گزر رہی تھی کہ اس وقت اُسے کسی ہمدم، کسی رازدار سہیلی کی ضرورت تھی۔ اگر اس کی ماں زندہ ہوتی تو وہ اپنی بیٹی کا مسئلہ سمجھ جاتی۔ مارگریٹ کو اپنے باپ سے محبت تھی۔ لیکن کبھی کبھی اُسے اپنے باپ سے نفرت بھی محسوس ہوتی — یہ احساس شدید ہو جاتا کہ وہ اُس کی بیٹی سے زیادہ اس کی قیدی ہے۔ وہ اپنی بیٹی کے قریب کسی مرد کو پھٹکنے نہ دیتا تھا جس کی بنا پر مارگریٹ اکثر سوچا کرتی کہ شاید اس کی شادی کبھی نہ ہو سکے گی۔ ''ہاں میری شادی میرے باپ کی زندگی میں ناممکن ہے۔''

یہ بہت باغیانہ خیالات تھے۔ ایسا سوچنا بھی گناہ تھا۔ وہ اپنے خیالات سے گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ اسٹور میں چلی گئی جہاں جوزف حساب کتاب میں مصروف تھا۔ اُس نے دھیمی آواز میں کہا ''شب بخیر ابو۔''

جوزف نے سنہری فریم کا چشمہ اتار کر آنکھیں ملیں۔ پھر اُس نے اپنی بیٹی کو شب بخیر کہنے کے لیے ہاتھ پھیلا کر اسے گلے لگانا چاہا اور وہ نہ معلوم کیوں پیچھے ہٹ گئی۔

وہ واپس آ گئی۔ اس نے دیوار میں لگے ہوئے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ وہ اپنے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں تھی۔ وہ کسی بھی لحاظ سے خوبصورت نہ تھی۔ بس واجبی سے خدوخال کی معمولی لڑکی تھی وہ! البتہ اس کا جسم نسوانی پیکر کا ایک بھرپور نمونہ تھا۔ پھر آخر مارٹن نے اس کے وجود میں ایسی کیا چیز دیکھی تھی جو اس کی آنکھوں میں خواہشوں اور چاہتوں کی جوت جگا گئی تھی۔ وہ اُس کی آنکھوں کے مفہوم کو سمجھتی تھی۔

اور پھر وہ جذبات سے مغلوب ہوتی چلی گئی۔ یہ جذبات اس کے جسم کو کیف آور بھنور میں پھنسا گئے۔ پھر یہ جذبات جیسے اس کے جسم میں لاوا بن کر پھٹ گئے۔ اور وہ مارٹن کا نام زیر لب دہراتے ہوئے، بے سدھ اور بے جان ہو کر پلنگ پر ڈھیر ہو گئی۔

اگلے دن ٹھیک دس بجے جمی اپنی بگھی لے کر جوزف کے اسٹور پر موجود تھا۔

اور پھر وہ دونوں سیر کے لیے نکل گئے۔ یہ چھوٹا سا شہر اس عرصے میں بہت تبدیل ہو گیا تھا۔ خیموں کی جگہ پکے مکانات تعمیر ہو گئے تھے۔

''یہ تو بہت خوشحال شہر لگتا ہے۔'' جمی نے تبصرہ کیا۔ بگھی اس وقت مرکزی سڑک پر گزر رہی تھی۔

''ہر نووارد کو یہ شہر پسند آتا ہے۔'' مارگریٹ نے جواب دیا اور یہ سوچتی رہ گئی کہ آج تک اُسے یہ شہر کتنا ناپسند تھا۔...

شہر سے نکل کر وہ دریائے وال کے ساتھ پھیلے ہوئے کالکنی کے علاقے کی طرف نکل گئے تھے۔ برسات کے موسم نے اس تمام علاقے کو سرسبز اور شاداب چمن زار میں تبدیل کر دیا تھا۔ جگہ جگہ خوش رنگ پھول کھلے ہوئے تھے۔ فضا معطر تھی اور تازگی سے بوجھل تھی۔

"کیا اس علاقے میں ہیروں کی کوئی نئی کان دریافت ہوئی ہے؟" جمی نے پوچھا۔

"ہاں، چند نئی کانیں دریافت ہوئی ہیں۔ جب بھی نئی کانوں کی دریافت کی خبریں پھیلتی ہیں تو سینکڑوں افراد قسمت آزمائی کے لیے اس علاقے کا رُخ کرتے ہیں اور ان میں سے چند ایک کے سوا باقی تمام دل شکستہ، مایوس، محروم اور ناامید لوٹتے ہیں۔ الو نے سن لیا کہ میں ایسی باتیں کر رہی تھی تو وہ ناراض ہو جائیں گے۔ مسٹر مارٹن یہ کاروبار بہت غیر یقینی ہے۔"

"ہاں ہے تو سہی۔ لیکن چند لوگ تو بہرحال کامیاب رہتے ہیں۔" جمی نے جواب دیا۔

"کیا آپ یہاں کچھ عرصہ ٹھہریں گے؟"

"ہاں ارادہ تو یہی ہے۔ آگے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

مارگریٹ کا دل خوشی سے رقص کرنے لگا۔ "یہ بہت اچھی بات ہے۔" اگلے لمحے اس نے جلدی سے کہا۔ "الو بہت خوش ہوں گے۔" وہ ڈرتی تھی کہ کہیں جمی اس کے دل کا چور نہ پکڑ لے۔

وہ یونہی بگھی میں سیر کرتے رہے۔ کہیں کہیں جمی بگھی روک کر قسمت آزمائی کے لیے آنے والے ہیروں کے متلاشی افراد سے باتیں بھی کرتا۔ ان میں سے بہت سے مارگریٹ کو پہچان کر نہایت احترام سے گفتگو کرتے۔ "لگتا ہے یہاں ہر شخص تمہیں جانتا ہے۔" جمی نے کہا۔

"اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ سب لوگ الو کے اسٹور آتے ہیں۔ کالکنی کا بیشتر سامان وہی سپلائی کرتے ہیں۔"

جمی نے اس کے اس جواب پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ جمی کو تو دلچسپی یہاں کے ماحول سے تھی۔ ریلوے لائن بچھ جانے سے بہت فرق پڑا تھا۔ ان دنوں اس علاقے میں ایک نئی کمپنی بیئرز نے کام شروع کیا تھا۔ کمپنی کا نام اس کسان کے نام پر رکھا گیا تھا۔ جس کے کھیت میں پہلی مرتبہ ہیرے دریافت ہوئے تھے۔ اس کمپنی نے اپنی حریف کمپنی بارنی کو خرید لیا تھا۔ اور اب بیئرز کمپنی چھوٹے چھوٹے کلیموں کو متعلقہ لوگوں سے خرید کر تمام کاروبار کو ایک منظم شکل دے رہی تھی۔ کیمبرلی کے قریب سونے، میگنیز اور جست کے نئے ذخائر دریافت ہوئے تھے۔ جمی کو یقین تھا کہ یہ سب کچھ محض آغاز ہے۔ جنوبی افریقہ میں معدنیات کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ یہاں دوربین اور ہوشیار شخص کے لیے ترقی اور آگے بڑھنے کے بے شمار مواقع تھے۔

وہ دونوں دوپہر کو واپس پہنچے۔ جمی نے اسٹور کے سامنے بگھی روکتے ہوئے کہا۔ "آج رات آپ اور آپ کے الو کھانے پر میرے مہمان ہوں گے۔"

"میں الو سے کہہ دوں گی۔ امید ہے وہ اس دعوت کو قبول کر لیں گے۔ یہ ہماری عزت افزائی ہے جناب۔ آج کی پُرلطف اور شاندار سیر کا بے حد شکریہ۔"

مارگریٹ بھاگتی ہوئی اسٹور میں داخل ہو گئی۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

اس رات شہر کے سب سے بڑے ہوٹل کے شاندار کھانے کے ہال میں وہ تینوں ایک میز کے گرد بیٹھے تھے۔ ہال میں ہر طرف بھیڑ تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ لوگ یہاں کھانے کے اخراجات کیسے برداشت کر لیتے ہیں۔" جوزف نے کہا۔ جمی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لرز کر رہ گئی۔ اس نے کھانوں کی فہرست اٹھا کر اس کا جائزہ لیا۔

"یہ لوگ تو لٹیرے ہیں لٹیرے۔" جوزف نے تبصرہ کیا۔ "آدمی چند دن یہاں کھانا کھالے تو محتاج گھر پہنچ جائے۔"

تب جمی نے سوچا کیا ہی اچھا ہو کہ بڈھے کو محتاج خانے پہنچا دیا جائے، تب اُسے شاید احساس ہو۔ کہ اس نے سیدھے سادے لوگوں سے کیا کیا سنگین مذاق کیے ہیں۔ پھر ان لوگوں نے اپنے اپنے پسندیدہ کھانوں کا آرڈر دیا اور جمی نے خاص طور پر یہ بات نوٹ کی کہ سب سے زیادہ مہنگے کھانوں کا آرڈر جوزف نے ہی دیا تھا۔ مارگریٹ نے البتہ تکلف سے کام لیا تھا۔

"تکلف نہ کرو۔ کچھ اور بھی منگالو۔ بل کی فکر نہ کرو۔" جمی نے اسے سنایا۔

مارگریٹ شرما کر رہ گئی اور دھیمی آواز میں بولی۔ "بات یہ ہے کہ مجھے بھوک واقعی نہیں ہے۔"

جوزف اپنی بیٹی کی کیفیت تاڑ گیا۔ اس نے نظروں سے باری باری دونوں کو دیکھا اور کہا۔ "مسٹر مارٹن! میری بیٹی بہت ہی منفرد لڑکی ہے۔"

"جی ہاں، میں بھی دیکھ رہا ہوں۔"

ان الفاظ نے مارگریٹ کو خوش کر دیا۔ جمی اس کے رگ و پے میں اترتا جا رہا تھا۔ وہ اس کے الفاظ میں چھپے ہوئے مفہوم سے واقف تھی۔ وہ اس کے ایک ایک انداز کو سمجھ رہی تھی۔ وہ اُسے پسند کرتا تھا۔ اور خود وہ بھی تو جمی کو پسند کرنے لگی تھی۔

"اور کہیے، آج کی سیر کیسی رہی، کوئی خاص چیز دیکھی آپ نے؟" جوزف نے پوچھا۔

نہیں کوئی خاص چیز نہیں دیکھی۔" جمی نے سرد مہری سے جواب دیا۔

"میری بات یاد رکھیے جناب! یہ علاقہ دنیا کا امیر ترین علاقہ بننے والا ہے۔ یہاں سرمایہ لگانے والوں پر ہُن برسے گا ہُن۔ ریلوے لائن اس علاقے میں انقلاب برپا کر دے گی۔" جوزف نے آگے جھک کر کہا۔

"ابھی کیا کہا جا سکتا ہے۔ بہرحال یہ طے ہے کہ میں کسی ایسے علاقے میں اپنی رقم ڈبونا نہیں چاہتا جہاں بعد میں کتے لوٹتے نظر آئیں۔"

"ہمارا شہر ایسا نہیں ہے۔ اس علاقے میں ہیروں کی نئی کانیں دریافت ہو رہی ہیں اور اب تو سونا بھی مل گیا ہے۔"

"لیکن یہ ذخیرے کب تک چلیں گے؟" جمی نے سوال کیا۔

"اس کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ کوئی فیصلہ عجلت میں نہ کریں۔ پہلے یہاں کے مواقع کا جائزہ لیں۔ امکانات کا تجزیہ کریں۔ پھر کوئی قدم اٹھائیں تو نقصان کا احتمال نہیں رہے گا۔"

"شاید میں کچھ زیادہ ہی جلدی میں ہوں۔" جمی نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "ویسے مس کیا آپ کل بھی میرے ساتھ چل سکتی ہیں؟ میں یہ علاقہ اور دیکھنا چاہتا ہوں۔"

جوزف نے اعتراض کرنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ پھر بند کر لیا۔ اسے اچانک بینکر ٹولی کے الفاظ یاد آ گئے: "ارے جوزف کیا بتاؤں۔ وہ نہایت بے اعتنائی سے آیا۔ ایک لاکھ پونڈ جمع کرائے۔ لگتا تھا جیسے ایک لاکھ پونڈ کی اس کے نزدیک کوئی حیثیت ہی نہ ہو۔ پھر اس نے بتایا تھا کہ مزید رقم بھی وہ کھاتے میں جمع کرائے گا۔"

لالچ، حرص اور طمع نے جوزف کو مغلوب کر لیا وہ جلدی سے بولا "کیوں نہیں جناب۔ مارگریٹ آپ کے ساتھ ضرور جائے گی۔"

اگلے روز مارگریٹ نے وہ لباس پہنا جو وہ عموماً اتوار کو عبادت میں جانے کے لیے پہنا کرتی تھی۔ اس لباس میں اُسے دیکھ کر جوزف کا پارہ چڑھ گیا۔

"وہ چلا کر بولا "یہ لباس تم نے کیوں پہنا ہے۔ کیا تم یہ ظاہر کرنا چاہتی ہو کہ تم اس کی محبت میں مبتلا ہو گئی ہو۔ کیا تم اُسے لبھانا چاہتی ہو۔ چلو اتارو یہ کپڑے۔ عام کپڑے پہنو۔ تم عشق لڑانے نہیں جا رہی ہو۔ یہ کاروبار ہے لڑکی کاروبار۔ چلو اتارو یہ کپڑے۔" جوزف نے سخت لہجے میں کہا۔

"لیکن ابو۔ . . . . ."

"سنا نہیں کیا کہا میں نے۔ تم عشق لڑانے نہیں جا رہی ہو۔ چلو کپڑے بدلو۔" جوزف نے اُسے ہلکے سے ڈانٹ دیا۔

"ٹھیک ہے پاپا۔"

اس کے بیس منٹ بعد وہ جمی اور مارگریٹ کو بگھی میں جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کہیں وہ غلطی تو نہیں کر رہا ہے۔

اس مرتبہ جمی نے بگھی کا رُخ شہر کی دوسری سمت کر دیا۔ کلپ واقعی بہت تیزی سے تبدیل ہو رہا تھا۔ ہر طرف نئی عمارتیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ ترقیاتی کام دھڑا دھڑ ہو رہے تھے۔ یہ شہر بہت بڑا کاروباری مرکز بننے والا تھا۔ علاقے میں نئی نئی کانیں دریافت ہو رہی تھیں۔ یہ سلسلہ کافی عرصہ جاری رہنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہاں لوگوں کی آمد و رفت میں اضافہ ہونا تھا۔ دولت کی ریل پیل ہونی تھی۔ یہاں واقعی بہت مواقع تھے۔ جمی کو یہ احساس تھا کہ مارگریٹ بڑے انہماک سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ وہ نرم لہجے میں بولا۔ "کیوں کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔" مارگریٹ نے گھبرا کر کہا اور نظریں دوسری طرف کر لیں۔

جمی نے مارگریٹ کا جائزہ لیا۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ وہ جمی کی قربت سے آگاہ تھی، خوش تھی۔ اس کے لہجے میں جذبات کی شدت کی لرزش تھی۔ وہ ایک جوان لڑکی تھی۔ محبت کی پیاسی تھی۔

دوپہر کے وقت جمی نے بگھی کو گھنے درختوں سے ہوتے ایک سنسان علاقے کی طرف موڑ لیا اور ایک گھنے برگد کے درخت کے نیچے بگھی کو روک لیا۔ وہ ہوٹل سے دوپہر کا ہلکا پھلکا کھانا ساتھ لے کر چلا تھا۔ مارگریٹ نے سبز گھاس پر ایک چادر بچھا کر اس پر کھانا لگا دیا۔ . . اور شوخی سے بولی "یہ تو اچھی خاصی

دعوت کو ٹھکرا سکتی ہیں آپ تو۔"

"سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔ تم کوئی معمولی لڑکی نہیں ہو۔" جمی نے رسیلے لہجے میں جواب دیا۔

جمی کے ان الفاظ سے اس کی کان کی لویں سرخ ہو گئیں۔ وہ پھر کام میں مصروف ہو گئی۔

جمی نے دونوں ہاتھوں میں اس کا خوبصورت چہرہ تھام لیا اور بڑے پیار سے بولا "مارگریٹ..... میری طرف دیکھو۔"

"پلیز..." وہ کپکپاتے ہوئے بولی۔

"میری طرف دیکھو جانِ من۔ شرما کیوں رہی ہو؟"

مارگریٹ نے آہستہ آہستہ آنکھیں اوپر اٹھا کر اسے دیکھا اور اگلے لمحے جمی نے اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

وہ دونوں جیسے اس لمحے کے منتظر تھے۔ مارگریٹ کے وجود میں ایک نشہ سا گھل کر رہ گیا تھا۔

چند لمحوں بعد وہ تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی اور بولی "نہیں نہیں! ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ہم جہنم میں چلے جائیں گے۔"

"جہنم میں ہمارے دشمن جائیں گے۔ ہم تم مل کر اپنی جنت تخلیق کریں گے۔" جمی نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"میں ڈرتی ہوں۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"مجھ سے ڈرتی ہو۔ میری آنکھوں میں دیکھو۔ میری آنکھیں تمہارے اندر جھانک سکتی ہیں۔ تم بلاوجہ خوفزدہ ہو۔ کچھ نہیں ہوگا میری جان۔ تم میری ہو۔ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ تم مجھے چاہتی ہو۔ پھر ڈرنا کیسا۔ کہو میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ یہ جملہ کہتی رہو۔ تمہارا خوف ختم ہو جائے گا۔"

"میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔" وہ جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ وہ جیسے نشے کی دنیا میں ڈوبتی چلی گئی۔

پھر اسے ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ بس بادلوں میں اڑ رہی تھی۔ اس کے جسم سے چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ یہ چنگاریاں اس کے جسم کو نشیلی حدت میں... جھلسا رہی تھیں۔ سب خیالات ذہن سے محو ہو گئے تھے۔ بس ایک آگ تھی کہ بھڑک بھڑک کر سرد ہونا چاہتی تھی۔ جنم جنم کی ایک پیاس تھی جو سیرابی چاہتی تھی۔

پھر شعلوں پر شبنم گر گئی۔ وہ کچھ ہو گیا جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

اس شام جمی جوزف کے ساتھ ریستوران میں بیٹھا تھا۔ اس نے جوزف کو بتایا "تمہارا کہنا درست تھا۔ یہاں بہت وسیع امکانات ہیں۔ میری توقعات سے زیادہ۔ اس علاقے میں سرمایہ کاری کے لئے سنجیدگی سے سوچا جا سکتا ہے۔"

"میں جانتا تھا کہ آپ اسی نتیجے پر پہنچیں گے۔ جناب آپ بہت سمجھ دار آدمی ہیں۔" جوزف نے اطمینان کا گہرا سانس لے کر کہا۔

"آپ مجھے بتائیں کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟" جمی نے پوچھا۔

جوزف نے ادھر ادھر نظر ڈال کر راز دارانہ لہجے میں کہا: "آج ہی مجھے اطلاع ملی ہے کہ شمال میں ایک مقام پر ہیروں کا بہت بڑا ذخیرہ دریافت ہوا ہے۔ وہاں اب بھی دس کلیم ایسے ہیں جنہیں خریدا جا سکتا ہے۔ ہم انہیں آپس میں برابر تقسیم کر لیں گے۔ میں پانچ کلیموں کے لئے پانچ ہزار پونڈ فراہم کرنے کے لئے تیار ہوں۔ آپ بھی پانچ ہزار لگائیں۔ وہاں ہیرے بہت آسانی سے نکالے جا سکتے ہیں۔ اور بہت بڑی تعداد میں نکالے جا سکتے ہیں۔ ہم راتوں رات لاکھوں کے مالک بن سکتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟"

جمی جانتا تھا کہ اس خبیث کے ذہن میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ وہ ان پانچ کلیموں کو ہڑپ کرنا چاہتا تھا جو فائدہ بخش تھے اور اس کے حصے میں ناکارہ کلیم ڈالنا چاہتا تھا۔ پھر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ خبیث بوڑھے کی کوشش یہی ہوگی کہ وہ منافع بخش کلیم اسے مفت ہی ہاتھ لگ جائیں اور ساری رقم جمی ادا کر دے۔

وہ مصنوعی خوشی چہرے پر بکھیر کر بولا۔ "یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔ اس میں کتنے افراد ملوث ہیں؟"

"ہمیں صرف دو افراد سے بات چیت کرنا ہوگی۔"

"سوال یہ ہے کہ آخر وہ اتنی زیادہ رقم کیوں مانگ رہے ہیں؟" جمی نے معصومیت سے کہا۔

"یہ بہت ذہانت کا سوال ہے جناب!" جوزف آگے جھک کر سرگوشی میں بولا "بات یہ ہے کہ وہ لوگ اپنے ان ذخیروں کی اہمیت اور مالیت سے آگاہ ہیں۔ اگر ان کے پاس رقم ہوتی تو انہیں یہ کلیم بیچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم انہیں دس ہزار پونڈ ادا کریں گے۔ اور بیس فیصد علاقہ ان کے لئے چھوڑ دیں گے۔"

جمی خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ بڈھا بہت گھاگ ہے۔ اُس نے بیس فیصد علاقے کی بات نہایت معمولی بنا کر پیش کی تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ بڈھا ان دس کلیموں کے اصل مالکوں کو بھی دھوکہ دے کر انہیں بھی کنگال کرنا چاہتا تھا۔

"ایک بات ہے جناب! ہمیں یہ سودا جلد از جلد طے کرنا ہوگا۔ ابھی یہ بات میرے اور ان دونوں کے درمیان ہے۔ بات پھیلی تو قیمتیں چڑھ جائیں گی۔"

"ہمیں یہ موقعہ نہیں گنوانا۔" جمی نے فیصلہ سنا دیا۔
"فکر نہ کریں جناب! میں فوراً ہی معاہدے تیار کرنے کا کام شروع کرتا ہوں۔"
جمی جانتا تھا کہ حسب معمول بڈھا یہ معاہدے افریکانا زبان میں تیار کرے گا۔
"چلو یہ بات تو طے ہوئی۔" جوزف نے اطمینان سے کہا۔ "اس کے علاوہ بھی کئی اور سودے ہیں۔"

✡

جوزف کی تمام تر کوشش یہی تھی کہ وہ جمی کو خوش رکھے۔ اس لئے وہ اب ان دونوں کے باہر جانے پر اعتراض نہیں کرتا تھا۔ جمی روزانہ ہی اس کی بیٹی کو لے کر آس پاس کے علاقوں کی سیر کے لیے نکل جاتا۔ مارگریٹ دن بہ دن اس سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اس کی محبت میں مبتلا تھی۔ وہ تمام حدود کو پھلانگ چکے تھے۔ ان کے تعلقات تکلف سے پاک ہو کر بے حجابی تک بڑھ چکے تھے۔

روزانہ وہ جنگلوں میں کسی ویران گوشے میں نکل جاتے اور گھنٹوں ایک دوسرے میں کھوئے رہتے۔ مارگریٹ کے لئے ہر نیا دن ایک نیا ۔۔۔ تجربہ لے کر آتا۔ سب کچھ تھا لیکن وہ اب بھی اپنے باپ کی طرف سے خوف زدہ رہتی تھی۔ اُس کا باپ اس علاقے کا معزز ترین اور عزت دار شخص تسلیم کیا جاتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس کے باپ کو ان کے تعلقات کی بھنک بھی مل گئی تو وہ اسے ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ وہ اس معاملے میں نہایت سخت گیر آدمی تھا۔ معافی کا کوئی تصور اس کے پاس تھا ہی نہیں۔ اس کے نزدیک دنیا میں صرف دو قسم کی عورتیں تھیں۔ گھریلو نیک عورتیں اور طوائفیں۔ اور ایک نیک لڑکی ۔۔ کسی مرد کو اس وقت تک اپنے جسم کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی جب تک اس مرد سے اُس کی شادی نہ ہو جائے۔ اگر وہ ایسا کرے تو پھر اُسے طوائف کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مارگریٹ اپنے باپ کے اس فلسفے سے بہت خوف زدہ تھی۔ لیکن جمی سے جو تعلقات پیدا ہو گئے تھے ان کے بعد وہ اپنے اقدام کو درست سمجھنے لگی تھی۔ اس کے باوجود وہ پریشان تھی۔ آخر ایک دن جب وہ دریائے وال کے کنارے بگھی میں گذر رہے تھے تو مارگریٹ نے کہہ ہی دیا۔ "کیوں مارٹن! شادی کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میرے باپ سے تم کب بات کر رہے ہو؟"
"میں تیار ہوں، دل و جان سے تیار ہوں۔" جمی نے کہا۔ "بہت جلد میں تمہارے باپ سے تمہارا رشتہ طلب کروں گا۔"
اور اس جواب نے مارگریٹ کے تمام خدشات دور کر دیئے۔ وہ خوش تھی، بے حد خوش۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے مسرت آمیز لمحہ تھا۔
اتوار کو صبح جوزف نے جمی کو دعوت دی کہ وہ ان کے ہمراہ گرجا چلے۔ جمی کو بھلا اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ جب وہ گرجا پہنچے تو جوزف کا نہایت احترام کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ ہر شخص جیسے اس کی راہ میں بچھا جا رہا تھا۔ "دیکھا جناب! یہاں میری کتنی عزت ہے۔ گرجا کی تعمیر میں، میں نے بھی مدد کی ہے۔ میں گرجا کے منتظمین میں سے ایک ہوں۔ گرجا کی تعمیر میں ساٹھ فی صد رقم میری صرف ہوئی ہے۔"
جوزف، عبادت کے دوران نہایت عقیدت سے خاموش بیٹھا رہا۔ پادری کے منہ سے نکلے ہوئے ہر ہر لفظ پر وہ نہایت احترام کے ساتھ سر کو مخصوص انداز میں یوں جنبش دیتا جیسے وہ ہر ہر لفظ کو اس کے پورے مفہوم کے ساتھ سمجھ رہا ہو۔
"یہ بوڑھا بھی رنگا سیار ہے۔ اتوار کو تو یہ چولا بدل لیتا ہے اور باقی تمام دن شیطان کا چیلا بنا رہتا ہے۔" جمی نے سوچا۔
اسی روز شام کو جمی شراب خانے میں گیا۔ جہاں اسمٹ نے نہایت پُرتپاک انداز میں احترام کے ساتھ اُسے خوش آمدید کہا۔ "شام بخیر ہو جناب! فرمائیے۔ آج کیا پینا پسند کریں گے؟"
"آج رات میں کچھ نہیں پیوں گا۔ آج میں تم سے تنہائی میں عقبی کمرے میں نجی گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"
"بہتر ہے جناب! یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔" پھر اُس نے اپنے معاون سے شراب خانہ سنبھالنے کی ہدایت کی اور عقبی کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ عقبی کمرے میں ایک گول میز پڑی تھی جس کے گرد چار کرسیاں رکھی تھیں۔ اسمٹ نے گول میز پر رکھی ہوئی لالٹین روشن کر دی۔
"بیٹھ جاؤ۔" جمی نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا۔
اسمٹ بیٹھ گیا۔ اور قدرے خوفزدہ لہجے میں بولا۔ "فرمائیے جناب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"
"خدمت تو میں تمہاری کرنے آیا ہوں۔" جمی کے لہجے میں طنز تھا۔ گہری کاٹ تھی۔
"کیا فرما رہے ہیں جناب!" اسمٹ نے حیرانی سے کہا۔
"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" جمی نے جیب سے سگار نکال کر سلگایا۔ "بات یہ ہے اسمٹ کہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں زندہ رہنے دیا جائے۔ میں تمہیں کتے کی موت مارنا چاہتا تھا۔ مگر میں تمہیں سدھرنے کا موقع دینا چاہتا ہوں۔"
"جی کیا کہا آپ نے؟" اسمٹ نے حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھ نہیں پایا مسٹر مارٹن!"
"مارٹن نہیں، میرا نام جمی ہے۔ یاد آیا کچھ، جمی۔ ایک برس قبل تم نے کھلیان میں مجھے قتل کرنے کا سامان کیا تھا۔ تم نے جوزف کے لئے میری

زندگی کو ختم کرنے کا انتظام کیا تھا۔"

اسمٹ اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گیا۔ وہ جمی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کپکپاتی آواز میں بولا "میں سمجھا نہیں جناب، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"بکواس بند کرو اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اُسے غور سے سنو" جمی نے اسے سختی سے جھڑک دیا۔

اسمٹ کی حالت بری ہو رہی تھی۔ وہ اب بھی جمی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

"غور سے دیکھ لو۔ میں جمی ہی ہوں۔ تمہاری کوشش کے باوجود میں زندہ رہا۔ میں آج بھی زندہ ہوں اور تمہارے سامنے موجود ہوں۔ آج میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں باآسانی لوگوں کو پیسے دے کر انہیں اس بات پر راضی کر سکتا ہوں کہ وہ تمہارے اس گھٹیا شراب خانے کو تمہارے وجود سمیت نذر آتش کر دیں۔ سُن رہے ہو نا میری بات؟"

اسمٹ نے جمی کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں موت کی سی بے رحمی تھی۔ وہ کپکپا کر رہ گیا اور نقاہت سے بولا۔ "جی ہاں جناب سُن رہا ہوں۔"

"تم جوزف کے ملازم ہو۔ تم ان لوگوں کو جوزف کے پاس بھیجتے ہو جو ہیرے تلاش کرنے دنیا جہاں کا سفر کر کے اس ملک میں پہنچتے ہیں۔ تم ان کو اس لئے جوزف کے پاس بھیجتے ہو تاکہ وہ ان کے ساتھ چھل فریب کر کے اُن کی محنت کا پھل خود کھالے۔ مجھے بتاؤ وہ اس خدمت کے عوض تمہیں کیا رقم دیتا ہے؟"

اسمٹ خاموش رہا۔ وہ اس وقت دو طاقتوں کے درمیان پھنس کر رہ گیا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس وقت وہ کس طاقت کا حلیف بن جائے۔ "بتاؤ کتنی ہڈی ڈالتا ہے وہ تمہیں؟" جمی نے درشت لہجے میں سوال کیا۔

"دو فیصد، وہ مجھے کل رقم کا دو فی صد دے دیتا ہے۔" اسمٹ نے بادل نخواستہ جواب دیا۔

"میں تمہیں پانچ فیصد دیا کروں گا۔ آج کے بعد جو بھی ایسا شخص آئے گا۔ تم اُسے جوزف کے پاس نہیں، میرے پاس بھیجو گے۔ میں اُس کی مدد کروں گا۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ اُسے اپنا حصہ یقیناً ملے گا اور تمہیں بھی۔ ویسے یہ بتاؤ کیا وہ خبیث بڈھا واقعی تمہیں اپنی آمدنی کا دو فیصد دیا کرتا تھا؟ تم سے بڑا احمق شاید ہی میرے نظروں سے گزرا ہو۔"

"جی ہاں مسٹر مارٹن، میرا مطلب ہے مسٹر جمی۔ میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔"

جمی اٹھ کھڑا ہوا۔ اسمٹ نے گہرا سانس لیا۔ وہ اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ جمی نے میز پر دونوں ہاتھ ٹیک کر جھکتے ہوئے کہا۔ "تم یقیناً یہ سوچ رہے ہو کہ فوراً یہاں سے جوزف کے پاس جاؤ اور اُسے اس گفتگو سے آگاہ کر دو اور اس طرح دونوں طرف سے رقم کاٹ سکو۔ تم ایسا کر سکتے ہو۔ لیکن ایسی صورت میں یہ جان لو کہ رقم بنانے کی حسرت ہی رہ جائے گی۔ تم اس سے پہلے ہی جہنم واصل کر دیئے جاؤ گے۔" جمی نے سرد لہجے میں اپنی بات مکمل کی اور وہاں سے نکل آیا۔

جمی لباس تبدیل کر رہا تھا کہ اس نے دروازے پر دستک سنی۔ کوئی نہایت پریشانی کے عالم میں دستک دے رہا تھا۔ جمی نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ باہر اس کے بدترین دشمن کی اکلوتی بیٹی کھڑی تھی۔

"آؤ مارگریٹ! کیا بات ہے، بہت پریشان دکھائی دے رہی ہو۔ خیریت تو ہے؟" یہ پہلا موقع تھا کہ مارگریٹ اس کے کمرے میں آئی تھی۔ جمی نے اس کے اندر آتے ہی دروازہ بند کر دیا تھا۔ اور بڑے غور سے ڈری سہمی اور پریشان لڑکی دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت کچھ کہنے کے لئے یہاں آئی تھی۔ لیکن جمی کے سامنے آ کر اس کی زبان جیسے گنگ ہو کر رہ گئی۔ وہ تمام رات جاگتی رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے کیوں کر بتلائے۔ اتنی بڑی بات بتانے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔

"کیا بات ہے میری جان پریشان کیوں ہو؟" جمی نے بڑے پیار سے کہا۔ "مجھے بتاؤ بات کیا ہے؟"

جمی کے لہجے کی مٹھاس نے اُسے حوصلہ دیا اور وہ بولی۔ "مارٹن! میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔"

جمی کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر گزر گیا۔ مارگریٹ سہم کر رہ گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس خبر سے اس کا محبوب بدک کر اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے۔ اگلے لمحے جمی کے چہرے پر مسرّت کی لہر دوڑ گئی۔ مارگریٹ کے تمام خوف دور ہو گئے۔ جمی نے اسے مضبوطی سے تھام لیا اور پُر جوش لہجے میں بولا۔ "سچ کہہ رہی ہو تم! کیا واقعی میں باپ بننے والا ہوں؟ تم نے اپنے والد کو یہ خبر سنائی؟"

مارگریٹ گڑبڑا کر پیچھے ہٹ گئی اور ڈری ڈری آواز میں بولی۔ "نہیں نہیں .... میں اپنے باپ کو یہ بات بتانے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی۔" وہ لڑکھڑاتی ہوئی بیئرنگ کے صوفے میں دھنس گئی۔ "تم ابّو کو نہیں جانتے مارٹن! وہ، وہ میرے خون پی لیں گے۔"

جمی نے جلدی جلدی بال سنوار کر کہا۔ "آؤ میرے ساتھ، ہم انہیں سب کچھ بتا دیں گے۔"

"تمہیں یقین ہے مارٹن! سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا نا؟" سدا اسے باپ کے دباؤ میں رہنے والی یہ معصوم لڑکی انجانے وسوسوں کا شکار تھی۔

"ہاں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے سرد سے لہجے میں جواب دیا۔

جس وقت وہ دونوں اسٹور میں داخل ہوئے۔ جوزف ہیروں کے کسی متلاشی کو ضروری سامان نکال کر دے رہا تھا۔ جمی کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ "ایک منٹ جناب! اندر انتظار کریں۔ میں ابھی آتا ہوں۔" اُس نے جلدی جلدی گاہک کو فارغ کیا اور پھر جمی سے مخاطب ہوا۔ "کہئے کیا حال چال ہیں؟"

"میں بہت خوش ہوں جوزف۔ تمہاری بیٹی ماں بننے والی ہے۔" جمی کے لہجے میں بلا کی سنگینی تھی۔

جوزف کو یوں لگا جیسے کسی نے اس پر ٹھنڈے یخ پانی کی بالٹی الٹ دی ہو۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے بھاری بھر کم ہتھوڑا اس کے سر پر دے مارا ہو۔ اس کا دماغ جھنجھنا کر رہ گیا تھا۔ اس کا سر پھرکی طرح چکرا رہا تھا۔ اس نے شکستہ لہجے میں کہا "کیا .... کیا مطلب؟"

"مطلب بالکل واضح ہے۔ جوزف! وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔"

جوزف کا لہو جیسے کسی نے نچوڑ لیا تھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس نے باری باری دونوں کو دیکھا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "یہ درست نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم بکواس کر رہے ہو۔ میری بیٹی اتنا بڑا گناہ نہیں کر سکتی۔" جوزف کے ذہن میں آندھیاں اور غبارے چل رہے تھے۔ یہ تصور ہی اس کے لیے انتہائی تکلیف دہ اور ناقابلِ برداشت تھا کہ اس کی کنواری بیٹی، شادی کے بغیر ہی اپنا کنوارپن گنوا بیٹھی ہے۔ وہ ماں بننے والی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ اس شہر میں نکو بن کر رہ جاتا۔ ہر شخص اس پر انگلی اٹھاتا۔ اس کا مذاق اڑاتا۔ برسوں کی محنت اور ریاضت سے اس نے علاقے میں جو عزت بنائی تھی۔ وہ خاک میں ملنے والی تھی۔ لیکن مارٹن بہت امیر شخص تھا۔ اگر وہ مارگریٹ سے جلد ہی شادی پر راضی ہو جائے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر اس نے جمی سے کہا۔ "تو پھر تم دونوں شادی کر لو۔ فکر نہ کرو۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔"

جمی نے حیرت سے اُسے دیکھا اور بولا۔ "پاگل ہو گئے ہو بڑے میاں کیا سٹھیا گئے ہو۔ میں شادی کر لوں۔ کیا تم اپنی بیٹی کی شادی ایک ایسے احمق اور ناکارہ شخص سے کر دو گے جو بہت آسانی سے تم سے دھوکا کھا گیا تھا؟ جیسے تم نے اُس کے حق سے محروم کر دیا تھا؟"

جوزف کا سر گھوم کر رہ گیا۔ وہ گڑبڑا کر بولا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو مارٹن؟ میں نے تو تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔ جب تم پہلی بار مجھ سے ملے تو میرے لیے بالکل اجنبی تھے۔"

"میرا نام مارٹن نہیں ہے۔" وہ چیخ کر بولا۔ "میرا نام جمی ہے۔ کیا تم جمی کو بھی نہیں پہچان سکتے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی جوزف کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جمی پھر چلا کر بولا۔ "مگر شاید تم نہیں پہچان سکتے۔ پہچان بھی کیسے سکتے ہو۔ وہ لڑکا جمی اب مر چکا ہے۔ تم نے اسے مار دیا تھا نا! مگر خیر میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو دل میں کینہ رکھتے ہیں اسلئے میں نے تمہاری زیادتیوں کے باوجود تمہیں ایک تحفہ دے دیا ہے۔ یہ تحفہ تمہاری بیٹی کے جسم میں پرورش پا رہا ہے۔"

جمی نے اپنی بات ختم کی اور نہایت اطمینان سے لمبے لمبے قدم اٹھاتا باہر آ گیا۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ حیرت زدہ غم زدہ اور شکستہ تھے جو کچھ بھی ہوا ناقابلِ یقین تھا۔ جوزف کے لئے بھی اور مارگریٹ کے لیے بھی!

اس صدمے کی ابتدائی اثر سے نکل کر جوزف اپنی بیٹی کی طرف پلٹا۔ وہ شدید غصے میں سرتاپا کپکپا رہا تھا۔ "تم .... تم .... چل نکل یہاں سے دفع ہو جا یہاں سے۔ میں تیری شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔ تم میں اور ایک گھٹیا طوائف میں کوئی فرق نہیں ہے۔ میں تمہارے غلیظ وجود کو برداشت نہیں کر سکتا۔"

مارگریٹ کی تو دنیا ہی تاریک ہو گئی تھی۔ وہ ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ جو کچھ اس کے کانوں نے سنا ہے وہ درست ہے۔ وہ ٹھوس حقیقت ہے۔ جمی نے دشمن بن کے اُس سے انتقام لیا تھا، اس بات کا انتقام لیا تھا جس میں اُس کا ذرا بھی ہاتھ نہ تھا۔ اس نے جوزف کا انتقام اس کی بیٹی سے لیا تھا۔ مگر کیوں؟ اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟

شاید اس لیے کہ وہ مارگریٹ کو بھی اس برائی کا حصہ سمجھتا تھا۔ مگر .... مگر آخر وہ جمی کون تھا جس نے مارٹن کے بھیس میں انتقام لیا تھا۔ کون تھا وہ؟ آخر کون تھا جمی ....؟

"بھاگ جا یہاں سے۔" جوزف نے الٹے ہاتھ کا تھپڑ اپنی بیٹی کے رخسار پہ رسید کر کے کہا۔ "میں اب تیری شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔ نکل جا میرے گھر سے۔"

مارگریٹ کے پیر جیسے زمین نے پکڑ لیے تھے۔ اس کا دل رو رہا تھا۔ اس کے لئے سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ اس نے جو سپنوں کے محل تعمیر کئے تھے۔ آن واحد میں زمین بوس ہو گئے تھے اس کے باپ کے چہرے پر دیوانگی اور وحشت طاری ہو گئی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی اسٹور سے نکل گئی۔

جوزف وہیں کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ اس کی حالت تباہ ہو گئی تھی۔ اس نے بہت سی ایسی لڑکیوں کا حشر دیکھا تھا۔ جنہوں نے نادانی میں

اپنے اور اپنے خاندان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگوایا تھا۔ ایسی لڑکیوں کے لیے معاشرے میں کوئی جگہ نہ تھی۔ انہیں گرجا میں کھڑا کر دیا جاتا۔ ان پر سرِعام لعنت ملامت کی جاتی۔ سبھی اس پر نفرین کرتے اور پھر انہیں برادری سے خارج کر دیا جاتا تھا۔ ایسی لڑکیوں کی یہی سزا تھی۔ اس سزا پر عرصے سے عمل درآمد ہو رہا تھا۔ آخر ایسے ہو کیا گیا تھا۔ اس کی پرورش تو نہایت مذہبی انداز میں کی گئی تھی۔ آخر اس کی بیٹی نے اس کے اعتماد کو کیوں ٹھیس پہنچائی؟ اس کے ساتھ ہی اس نے تصور میں وہ مناظر دیکھے جن کا نتیجہ اس طرح سامنے آیا تھا۔ اس نے دروازے پر "اسٹور بند ہے" کا بورڈ لٹکایا اور بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا ذہن ان واقعات کا تصور کر رہا تھا جو آئندہ پیش آنے والے تھے۔ یہ بات جب علاقے میں پھیلے گی تو سب لوگ اس پر انگلی اٹھائیں گے۔ سب اس کا مذاق اڑائیں گے۔ یہ تمام باتیں اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوں گی۔ اس کے منہ پر کالک لگ جائے گا اور وہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔

"اوہ میرے خدایا! یہ کیا ہو گیا؟ کیوں تو نے مجھے یہ دن دکھایا۔ اے خدا مجھے اس دنیا سے اٹھا لے۔" وہ دعائیں مانگتا رہا۔

اسمٹ کا شراب خانہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جمی بڑے طمطراق سے چلتا ہوا شراب خانے میں داخل ہوا اور سیدھا کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں کھڑے ہو کر اس نے لوگوں کی طرف منہ کیا اور پھر اس کی آواز ابھری "حضرات! آج آپ سب میرے مہمان ہیں۔ جو چاہیں پئیں جتنی چاہیں پئیں، جام پر جام لنڈھائیں۔ سب کا بل میں ادا کروں گا۔"

ایک لمحے کے لیے تو سناٹا چھا گیا۔ پھر لوگ سرگوشیوں میں قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ "کس خوشی میں جناب! کیا کوئی نئی کان دریافت ہوئی ہے؟" اسمٹ نے دریافت کیا۔

"ایک اعتبار سے ایسا ہی ہے۔" جمی نے بلند آواز سے کہا تاکہ ہر شخص سن لے "بات یہ ہے کہ جوزف کی کنواری بیٹی ماں بننے والی ہے۔ اور جوزف چاہتا ہے کہ آپ سب حضرات اس کی خوشی منائیں۔ وہ اپنی بیٹی کے اس کارنامے کا جشن منانا چاہتا ہے۔"

"اف خدایا!" اسمٹ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

"یہ کارنامہ جمی نے انجام دیا ہے اسمٹ! اس میں کسی اور کا کوئی دخل نہیں۔" وہ فاتحانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیر کر بولا۔

اس کے ایک گھنٹے بعد ہی قصبے میں ہر شخص کو اس کی اطلاع ہو گئی۔ ہر شخص کا موضوع گفتگو یہی واقعہ تھا۔ ہر فرد کی زبان پر یہی تذکرہ تھا۔ سب لوگ جان گئے تھے کہ مارٹن دراصل جمی ہے اور اس نے اس طرح جوزف سے انتقام لیا ہے۔ جوزف آج تک ہر شخص کو بیوقوف بناتا رہا ہے۔ پہلی مرتبہ اس کا سابقہ کسی سے پڑا ہے۔ اونٹ پہاڑ کے نیچے آ گیا ہے۔ یہ وہ تبصرے تھے جو لوگ کر رہے تھے۔ اور اس کے بعد تبصروں میں فحش کلامی آ جاتی۔ وہ مارگریٹ کے بارے میں ایسے ایسے تبصرے کرتے کہ تمام اخلاقیات پسینہ پسینہ ہو جاتیں۔

اس سہ پہر جوزف اپنے اسٹور سے نکلا تو اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس کی زندگی جہنم ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ اس ارادے سے نکلا تھا کہ اپنی بیٹی کو پہلی گاڑی سے کیپ ٹاؤن بھیج دے گا تاکہ وہ اپنی گناہ کی پوٹلی لے کر وہیں زندگی گزارے اور اس علاقے میں کسی کو کانوں کان اس سیاہ کاری کی خبر نہ ہو۔ وہ سڑک پر آ گیا۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سجا رکھی تھی۔ وہ کسی کو یہ تاثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ مگر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کی رسوائی کا سامان کیا جا چکا تھا۔ اس کی عزت خاک میں ملائی جا چکی تھی۔ اس کی غیرت کا جنازہ نکال دیا گیا تھا۔ لوگ اس پر بے رحمی سے نشتر چلا رہے تھے۔

"ہیلو مسٹر جوزف۔ سنا ہے اب آپ اپنے اسٹور میں بچوں کے کپڑے بھی رکھنے والے ہیں؟"

"کیا حال ہے جناب! سنا ہے آپ جلد ہی اپنے اسٹور کی دیکھ بھال کے لیے کوئی خادمہ رکھنے والے ہیں؟"

"اوہ جوزف! کیا یہ سچ ہے کہ دریائے وال کے کنارے نئے قسم کے پرندوں کا ایک جوڑا انڈا دینے والا ہے؟"

جوزف کے لیے مزید کچھ سننا ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اپنے اسٹور واپس آ گیا۔

✡

شراب خانے میں جمی ایک میز پر بیٹھا مشروب سے شغل کر رہا تھا۔ وہ اس وقت بڑے سرور میں تھا۔ وہاں موجود ہر شخص جوزف اور اس کی بیٹی کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔ قصبے میں اس سے بڑا اسکینڈل آج تک سامنے نہ آیا تھا۔ یہ باتیں سن کر جمی نے دل میں سوچا۔ کاش اس وقت بانڈا بھی یہاں ہوتا تو وہ کتنی تسکین محسوس کرتا۔ بوڑھے خبیث نے جو کچھ بانڈا کی معصوم بہن کے ساتھ کیا تھا۔ اس نے جو ظلم جمی پر کیا تھا۔ یہ اسی کا جواب تھا لیکن یہ انتقام مکمل نہیں تھا۔ یہ تو اس انتقام کا آغاز تھا جو جمی نے اس سے لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے ذہن میں تو مارگریٹ کے وہ الفاظ آج بھی تازہ تھے جو اس نے جمی سے پہلی ملاقات کے وقت کہے تھے "ابو اس سلسلے میں تمہاری

مدد کر سکتے ہیں، وہ ہر چیز سے واقف ہیں۔" وہ بھی تو جوزف ہی کا دوسرا روپ تھا۔ جمی نے دونوں کو تباہ کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ انہیں ذلیل و خوار کر کے ہی اسے سکون مل سکتا تھا۔

اسمٹ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا جمی کے پاس پہنچا اور سرگوشی میں بولا "جناب! میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کہو، کیا بات ہے؟"

اسمٹ نے کھنکھار کر گلا صاف کیا، اور دھیمی آواز میں بولا "میں دو ایسے افراد سے واقف ہوں جنہوں نے شمال میں ہیروں کے نئے ذخائر دریافت کیے ہیں۔ ان کے پاس دس کلیم ہیں جو وہ فروخت کرنا چاہتے ہیں۔" اسمٹ نے چند لمحے جمی کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اور پھر اپنی بات مکمل کر دی "ان لوگوں کے پاس کانکنی کے ضروری آلات خریدنے کے لیے رقم نہیں ہے۔ وہ کسی پارٹنر کی تلاش میں ہیں۔ میں نے سوچا شاید آپ کو اس میں کوئی دلچسپی ہو۔"

جمی نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے کہا "ان لوگوں کے بارے میں تم نے جوزف سے بھی بات چیت کی تھی نا؟"

اسمٹ نے حیرانی سے اثبات میں سر ہلا دیا "جی ہاں جناب! لیکن اس عرصے میں میں آپ کی تجویز پر غور کرتا رہا ہوں۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں آپ ہی سے معاملت رکھوں گا۔"

جمی نے جیب سے سگار نکال کر منہ میں لگایا۔ اسمٹ نے جلدی سے ماچس جلا کر اس کا سگار جلانے میں مدد کی۔

"اپنی بات جاری رکھو۔" جمی نے کہا۔

اور اسمٹ نے مزید تفصیلات بتانی شروع کر دیں۔

☆

ابتدا میں کلپ میں جسم فروشی کا کاروبار منظم نہیں تھا۔ بیشتر طوائفیں سیاہ فام تھیں۔ قصبے میں پہلی بار سفید فام طوائفیں جو آئیں۔ وہ شراب خانے میں جز وقتی ملازمت کرتی تھیں۔ لیکن پھر جوں جوں علاقے میں ہیروں کی نئی کانیں دریافت ہوتی چلی گئیں اور قصبے کی آبادی بڑھتی گئی۔ مزید سفید فام طوائفیں یہاں آنے لگیں۔ اب مضافات میں نصف کے قریب عشرت گاہیں قائم تھیں۔ یہ عشرت گاہیں ریلوے کی تعمیر کردہ لکڑی کی جھونپڑیوں میں قائم تھیں۔ یہ جھونپڑیاں ریلوے لائن بچھاتے وقت تعمیر کی گئی تھیں جنہیں ان طوائفوں نے خرید لیا تھا۔ ان عشرت گاہوں میں مادام اگنس کی عشرت گاہ سب سے نمایاں اور باوقار تھی۔ اس کی دو منزلہ عشرت گاہ بہت معقول تھی۔ یہاں لوگ آتے اور خوشی خوشی اپنی جیبیں جھاڑ کر چلے جاتے۔ مادام اپنے گاہکوں کا بڑا خیال رکھتی۔ وہ خود بہت خوش مزاج، خوش اطوار اور پرکشش شخصیت کی مالک تھی۔ وہ لندن کے بازار حسن سے آئی تھی۔ یہاں اس نے عشرت کدہ قائم کرنے کے لیے خاصی رقم پس انداز کر لی تھی اور قصبے میں اس کا کاروبار پہلے دن سے ہی چمک اٹھا تھا۔

مادام کو مردم شناسی پر بڑا ناز تھا۔ لیکن جمی اس کے لیے ایک لاینحل معمہ تھا۔ وہ اکثر مادام کے بالا خانے پر آتا بے دریغ رقم خرچ کرتا۔ عورتوں سے نہایت معقولیت سے پیش آتا اس کے باوجود لگتا تھا کہ وہ محفل میں ذہنی طور پر موجود نہیں ہے۔ جمی کی آنکھیں مادام کے لیے خاص طور پر کشش کا باعث تھیں۔ اتھاہ گہرائیاں تھیں ان زرد زرد سی آنکھوں میں۔ عشرت کدے میں آنے والے دوسرے مردوں کے برخلاف وہ کبھی اپنے ماضی کے بارے میں گفتگو نہیں کرتا تھا۔ اس دن جب جمی وہاں پہنچا تو اس سے کئی گھنٹے قبل ہی مادام یہ خبر تمام تفصیلات کے ساتھ سن چکی تھی کہ جوزف کی بیٹی کو جمی نے کس طرح شیشے میں اتارا تھا اور اب اس کے بطن میں اس کا بچہ پرورش پا رہا تھا۔

اس دن بھی جمی نے کچھ نہ کہا۔ نہ مادام کی ہمت پڑی کہ کچھ پوچھتی۔ وہ حسب معمول آیا۔ کچھ وقت گزارا اور واپس چلا گیا۔ مادام نے اُسے ایک بے ہودہ سی گالی دی اور گہری سانس لے کر صوفے میں دھنس گئی۔

جمی وہاں سے جب اپنے ہوٹل کے کمرے میں واپس پہنچا تو مارگریٹ کو وہاں موجود پایا۔ وہ ایک کھڑکی میں کھڑی باہر جھانک رہی تھی۔ جمی کے آتے ہی وہ پلٹی اور کپکپاتی آواز میں بولی "ہیلو جمی! کیسے ہو؟"

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" جمی نے غصے سے ہیر پٹخ کر پوچھا۔

"میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"لیکن ہمیں کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"میں جانتی ہوں۔ تم یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہو۔ تمہیں ابو سے نفرت ہے۔" وہ اس کے قریب آ کر بولی "لیکن خدا کے لیے یہ تو سوچو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ تم ان کے اعمال کی سزا مجھے کیوں دے رہے ہو؟ مجھے تو اس بارے میں کچھ بھی علم نہیں تھا۔ خدا کے لئے

ہی میری بات پر یقین کرو۔ مجھ سے نفرت نہ کرو۔ مجھے یوں نہ دھتکارو۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ شدید محبت۔"
جمی نے غور سے اُسے دیکھا اور سرد لہجے میں بولا۔" یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ میرا نہیں۔"
" خدا کے لیے مجھے ایسی نظروں سے نہ دیکھو۔ آخر تم بھی تو مجھ سے محبت کرتے تھے۔" وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔
لیکن جمی اس کی کوئی بات نہیں سن رہا تھا۔ وہ تو ہیروں کی تلاش کے اس ہولناک سفر کے بارے میں سوچ رہا تھا جہاں سے اُس زندہ بچ آنا بس ایک معجزہ ہی تھا۔ اس نے موت سے جنگ کر کے ہیروں کا بہت بڑا ذخیرہ دریافت کیا تھا اور پھر اس نے تصور میں دیکھا کہ وہ جوزف کو ہیرے دے رہا ہے۔ جوزف نے وہ ہیرے کس دیدہ دلیری سے رکھ لیے تھے اور کتنی نخوت سے کہا تھا۔" تم ضرور کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہو۔ بھلا مجھے کسی کو شریک کار بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم میرے ملازم ہو۔ میں تمہیں ۲۴ گھنٹے کی مہلت دے رہا ہوں یہاں سے نکل جانے کی ....." اور پھر انہوں نے کس بری طرح اس کو زدوکوب کیا تھا۔ انہوں نے اُسے موت سے کس قدر قریب کر دیا تھا۔ اور ..... اور پھر ..... وہ گدھ جو اس کی ٹانگ کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہا تھا۔
جمی نے جیسے بہت دور سے مارگریٹ کی آواز سنی۔" تم بھول گئے کیا؟ میں تمہاری ہوں، میں تم سے محبت کرتی ہوں۔"
جمی نے سر کو جھٹک کر خود کو ماضی کی ان یادوں کے جال سے نجات دلائی اور غور سے مارگریٹ کو دیکھا۔ محبّت۔ اس کے لیے یہ لفظ اب اپنی معنویت کھو چکا تھا۔ محبّت اب اس لیے محض ایک ڈھکوسلا تھا۔ جوزف نے اسے جو سبق دیا تھا۔ اس میں صرف نفرت کو اہمیت تھی۔ وہ اب اسی نفرت کے سہارے زندہ تھا۔ یہی اس کے لیے زندہ رہنے کا بہانہ تھا۔
" تم جوزف کی بیٹی ہو، سمجھیں۔ اس نے مجھے جان سے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ چلو یہاں سے دفع ہو جاؤ۔" جمی کا لہجہ بے حد سرد تھا۔
مارگریٹ کے لیے تمام دنیا تاریک ہو گئی تھی۔ اس شہر میں اب اس کیلئے کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اُسے اپنے باپ سے محبت تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ جوزف اسے معاف کر دے۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کا باپ کٹر مذہبی رجحان رکھتا ہے اور وہ کبھی اسے معاف نہیں کرے گا۔ مگر وہ کیا کرتی۔ اسے کسی نہ کسی کے پاس تو جانا ہی تھا۔
مارگریٹ ہوٹل سے نکل کر اپنے والد کے اسٹور کی طرف بڑھ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ ہر راہ گیر اُسے گھور رہا ہے۔ آج ان نگاہوں میں احترام نہیں تھا۔ تضحیک اور ملامت تھی۔ بعض افراد معنی خیز انداز میں مسکرائے بھی تھے۔ اور وہ سر اٹھائے بس اسٹور کی طرف بڑھتی رہی۔
جب وہ اسٹور پہنچی تو وہاں کوئی نہ تھا۔ قدموں کی آواز سن کر جوزف پچھلے حصے سے اسٹور میں آیا۔
" ڈیڈی ....." وہ بلک پڑی۔
" تم ....." جوزف نے نہایت حقارت سے کہا۔ اس ایک لفظ میں شکایت بھی تھی، غصہ بھی تھا اور تذلیل بھی۔ جوزف اس کے قریب بڑھ آیا۔ اس کے منہ سے شراب کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔" تم پھر آ گئیں۔ میں چاہتا ہوں تم شہر سے نکل جاؤ۔ کہیں جا کر ڈوب مرو۔ آج رات ہی تم یہاں سے اپنا منہ کالا کر کے کہیں دفع ہو جاؤ۔ اس کے بعد پھر کبھی یہاں نہ آنا، سنا تم نے۔ یہ لو اور دفع ہو جاؤ۔" یہ کہہ اس نے جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور اپنی بیٹی کے سامنے پھینک دیئے۔
" مگر ابّو خدا لیے ....."
" سنا نہیں تم نے، نکل جاؤ یہاں سے۔ لوگ جب تمہیں اس ذلیل انسان کے گناہ کا بوجھ اٹھائے ادھر اُدھر آتے جاتے دیکھیں گے تو انہیں میری ذلت کی کہانی یاد آتی رہے گی۔ تم یہاں نہیں ہوگی تو وہ سب بھول جائیں گے۔ میں تمہیں اپنی بے عزتی کا اشتہار بنتے نہیں دیکھ سکتا۔"
وہ خاموشی سے کچھ دیر اپنے باپ کو دیکھتی رہی، پھر لڑکھڑاتے قدموں سے واپس ہو گئی۔
" ذلیل عورت یہ نوٹ تو لیتی جا۔" جوزف دہاڑا۔
لیکن وہ واپس نہ پلٹی۔
قصبے کے مضافات میں ایک سستی سرائے تھی، وہ بوجھل انداز میں اپنے وجود کو گھسیٹتی ہوئی وہاں پہنچی۔ اس کے دماغ میں اس وقت جھکڑ چل رہے تھے۔ اس نے جمی سے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ اس کی محبت اندھی تھی۔ اس محبت کی خاطر اس نے اپنی نسوانیت کو اپنے دیوتا پر قربان کر دیا تھا۔ لیکن نہ معلوم اس محبت میں کیا کمی رہ گئی تھی، اس سے کیا گناہ سرزد ہوا تھا جس کی سزا اب وہ بھگت رہی تھی سرائے پہنچ کر وہ اس کی مالکہ مسز اولسن سے ملی۔ وہ ایک موٹی سی خوش مزاج گول چہرے والی عورت تھی پچاس پچپن برس اس کی عمر رہی۔

ہو گی اُسے، اُس کا شوہر یہاں لایا تھا اور چپکے سے کہیں نکل گیا تھا اور آج تک اس کا پتہ نہیں چل سکا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو شاید اس غم کو برداشت نہ کر پاتی۔ لیکن وہ بہت حوصلہ مند خاتون تھی۔ وہ زندہ رہنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ اس شہر میں اُس نے بہت سے لوگوں کو مصیبت میں گرفتار دیکھا تھا۔ لیکن جو افتاد اس سترہ برس کی مارگریٹ پر پڑی تھی۔ شاید ایسا تجربہ کسی کو نہیں ہوا تھا۔ وہ عرصے سے قصبے کے غریب اور دکھی لوگوں کی مدد کر رہی تھیں۔ وہ ہمیشہ پریشان حال اور مصیبت زدہ لوگوں کے لیئے مہربان اور شفیق ماں کا کردار ادا کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ انھیں زیادہ ممی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ وہ جگت ممی تھیں۔

"تم مجھ سے ملنا چاہتی ہو بیٹی؟" ممی نے محبت بھرے لہجے میں کہا "کیا کام ہے؟"

"میں نے سوچا شاید آپ کو اپنے سرائے میں کسی ملازمہ کی ضرورت ہو۔" مارگریٹ نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"کیا کام کرو گی بیٹی تم؟"

"جو آپ کہیں گی۔" مارگریٹ نے مضبوط انداز میں کہا "میں ہر کام کر سکتی ہوں، صفائی کر سکتی ہوں، برتن دھو سکتی ہوں، کھانا پکا سکتی ہوں۔ بہت اچھا کھانا پکاتی ہوں میں۔ سب کام کر سکتی ہوں۔ خدا کے لیے مجھے رکھ لیں۔ آپ جو کہیں گی میں کروں گی۔" وہ بلک پڑی

ممی نے اس دل شکستہ اور کپکپاتی لڑکی کو دیکھا جسے حالات نے ایک دم بے یار و مددگار بنا دیا تھا "ٹھیک ہے بیٹی۔ میں تمہارے لیے گنجائش پیدا کر لوں گی۔"

یہ جواب سن کر مارگریٹ کے پژمردہ چہرے پر رونق سی آ گئی۔

"کب سے کام شروع کرو گی؟" ممی نے سوال کیا۔

"ابھی سے، اسی وقت سے۔"

"میں تمہیں صرف ....." وہ کہتے کہتے رک گئی۔ اُس نے مظلوم لڑکی کی اجرت کے لیے جو رقم سوچی تھی اُس میں کچھ اور اضافہ کرنے کا فیصلہ کیا اور بولی "میں صرف ایک پونڈ، دو شلنگ اور گیارہ پینس فی ماہ دے سکوں گی۔ خوراک اور رہائش اس کے علاوہ ہے۔"

"بہت بہت شکریہ ممی۔" مارگریٹ نے رقت بھری آواز میں کہا "مجھے منظور ہے۔"

جوزف اب قصبے کی سڑکوں پر بہت کم نظر آتا۔ اس کا اسٹور بھی اکثر بند رہتا۔ اس کے باوجود ہر اتوار کو بڑی باقاعدگی سے گرجا جاتا۔ وہ عبادت کے لیے وہاں نہیں جاتا تھا بلکہ اپنے خدا سے یہ پوچھنے جاتا تھا کہ اُسے یہ کس جرم، کس گناہ کی سزا دی گئی ہے۔ وہ لوگ جو پہلے ایک امیر اور با اثر شخص ہونے کے ناتے اُس کی عزت اور اس کا احترام کرتے تھے۔ اب اس سے ملنے سے کترانے لگے تھے۔ وہ اس کے پس پشت سرگوشیوں میں گفتگو کرتے، تبصرے کرتے۔ اس کے ہمسایوں نے مکان تبدیل کر لیا تھا۔ وہ اب جوزف سے ملتے ہوئے شرم محسوس کرتے تھے۔ جوزف اس شہر میں اچھوت بن کر رہ گیا تھا۔ اس کی عزت دو کوڑی کی ہو گئی تھی۔

اور اُس دن تو جوزف ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا۔ اتوار کا دن تھا۔ حسبِ معمول وہ عبادت کیلئے گرجا گیا۔ اس دن شاید پادری بھی اسے لعنت ملامت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے اپنے خطبے میں بائبل کی وہ آیات پڑھیں جن میں آوارہ اور بدچلن عورتوں اور ان کے والدین کا تذکرہ تھا اور جن میں ایسے لوگوں کی سزا بیان کی گئی تھی۔

اس دن کے بعد جوزف نے گرجا جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔

✿

جوزف کا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا۔ اور جمی کا کاروبار چمک اٹھا تھا۔ جوں جوں ہیروں کی تلاش کے لیے کھدائی گہری ہوتی جا رہی تھی کانکنی کے آلات پر اخراجات بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ لوگ جنہوں نے ہیروں کے ذخائر دریافت کیے تھے اور جن کے کلیم انھوں نے اپنے نام رجسٹر کرا رکھے تھے۔ اب ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو گہری کھدائی کے لیے مطلوبہ ضروری آلات خریدنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی عام ہو چکی تھی کہ جمی ایسے لوگوں کی مالی اعانت کے لیے تیار ہے بشرطیکہ اسے کانوں میں حصہ دار بنا لیا جائے۔ وہ ایسے لوگوں سے نہایت دیانتداری کے ساتھ معاملات کرتا اور جب بھی موقعہ ملتا کانوں کو خرید کر ان کا مالک بن جاتا۔ اس نے اپنا کافی سرمایہ مکانوں اور دکانوں کی خرید و فروخت اور سونے کی کانوں میں بھی لگایا تھا۔ معاملات اور کاروبار میں وہ انتہائی دیانتداری سے کام لیتا تھا۔ اور اس لیے اس کی شہرت ہر طرف پھیل گئی تھی۔ لوگ اس سے کاروبار کرنے کے لیے دور دور سے آنے لگے تھے۔

کلپ میں ان دنوں دو بینک کام کر رہے تھے۔ ناقص انتظام کی بنا پر جب ان میں سے ایک بینک ناکام ہو گیا۔ تو جمی نے اُسے خرید لیا۔ لیکن اس طرح کہ خریداری اس کے کارندوں نے کی اور اس کا نام کہیں نہ آیا۔ اُس پر لکشمی دیوی مہربان ہو گئی تھی۔ مٹی کو ہاتھ لگاتا تو وہ بھی

سونا بن جاتی۔ وہ اب بہت کامیاب شخص تھا اور بے انتہا دولت مند تھا۔ اتنی دولت اس نے اپنے بچپن کے تصورات میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ پھر بھی دولت مندی اس کے لیے کوئی معنی نہ رکھتی تھی۔ وہ اپنی کامیابی کو صرف جوزف کی ناکامیوں سے ناپتا تھا۔ اس کا انتقام ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں تھا۔ کبھی کبھار سڑکوں پر اُسے مارگریٹ بھی نظر آتی لیکن وہ اس پر کوئی توجہ نہ دیتا۔ وہ اس کے لیے قصۂ پارینہ بن گئی تھی۔ اُسے احساس بھی نہ تھا کہ اس طرح جب بھی آمنا سامنا ہوتا مارگریٹ پر ایک قیامت گزر جاتی۔ وہ جمی کو دیکھتی تو اس کا سانس رک جاتا۔ اس کیلئے قدم اٹھانا دوبھر ہوتا۔ وہ اپنی جگہ کھڑی بس اُسے تکتی رہتی۔ اُسے اب بھی جمی سے محبت تھی۔ تمام زیادتیوں کے باوجود اس کے دل میں اب بھی اُس کے نام سے میٹھی میٹھی کسک پیدا ہوتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جمی نے اس کے باپ کو سزا دینے کے لیے اُس کے جسم کو وسیلہ بنایا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ جب وہ اُس کے بچے کو جنم دے گی اور وہ اپنے خون کو دیکھے گا تو پلٹ کر اس کے پاس آجائے گا۔ اُس سے شادی کر لے گا۔ اپنے بیٹے کو اپنا لے گا۔ اس کے سارے گلے شکوے دور کر دے گا۔ اُس کا دامن خوشیوں سے بھر دے گا۔

مارگریٹ کے جسم میں تخلیق کی تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ وہ بہت زیادہ خوفزدہ تھی۔ اُسے کسی رازدار کی ضرورت تھی لیکن شہر کی عورتیں اس سے بات کرنے کی بھی روادار نہیں تھیں۔ ان کے مذہب نے ایسے لوگوں کو سزا دینا سکھایا تھا۔ انہیں معاف کرنا نہیں سکھایا تھا۔ وہ اس بھرے پرے شہر میں تنہا تھی۔ وہ اجنبیوں کے درمیان گھری ہوئی تھی۔ رات کو جب وہ تھک کر بستر پر لیٹتی تو بے اختیار اسے رونا آجاتا۔

جمی نے شہر کے وسط میں ایک دو منزلہ عمارت خرید لی تھی۔ یہ اس کے بڑھتے اور پھیلتے کاروباری اداروں کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ ایک دن اس کے چیف اکاؤنٹنٹ نے اس سے کہا "ہم آپ کی تمام کمپنیوں کو ایک ادارے میں ضم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے نام کی ضرورت ہوگی۔ آپ کے ذہن میں کوئی نام ہو تو بتا دیں۔"

"میں اس کے بارے میں سوچ کر ہی کچھ بتاؤں گا۔" جمی نے کہا۔ اور اپنی کمپنیوں کے مشترکہ ادارے کے نام پر غور و فکر شروع کیا۔ وہ اب بھی تنہائی میں بہت عرصہ قبل کی اُن آوازوں کی بازگشت سنا کرتا تھا جو اس نے ہیروں کے ریگستان پر چھائی ہوئی دھند میں سنی تھیں۔ اور یہ آوازیں اب بھی اس کا پیچھا کرتی تھیں۔ یہ آوازیں دو مسلح محافظوں کروگر اور بریٹ کی ہوتی تھیں۔ اس نے اپنے اکاؤنٹنٹ کو فیصلہ سنا دیا "ہم نئی کمپنی کا نام کروگر۔ بریٹ لیمٹڈ رکھیں گے۔"

سو یوں ایک نئی کمپنی وجود میں آگئی۔

ایک دن جمی کا بینک منیجر اس کے پاس آیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا "جناب میں جوزف کے قرضوں کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں۔ اس پر بہت رقم چڑھ گئی ہے۔ وہ قسطیں بھی ادا نہیں کر رہا ہے۔ کسی زمانے میں اس کو رقم دینے کا خطرہ مول لیا جا سکتا تھا۔ لیکن اب اُسے قرضہ دینے کا مطلب صرف رقم ڈبونا ہے۔ صورت حال بہت تبدیل ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں قرضوں کی وصولی کی کوشش کرنی چاہیئے۔"

"نہیں۔" جمی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "فی الحال اُس سے قرضے وصول کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

منیجر نے حیرت سے کہا۔ "جناب وہ آج مزید قرضہ لینے آیا تھا۔"

"ٹھیک ہے، اُسے قرضہ دے دو، جتنا کہے اتنا قرضہ دے دو۔"

"بہت بہتر جناب! میں اُس سے کہوں گا کہ آپ نے....."

"اس سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ خاموشی سے اُسے رقم دے دو۔" جمی نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ کر کہا۔

مارگریٹ ہر صبح پانچ بجے اٹھتی۔ ڈبل روٹیوں کو سینکتی۔ سرائے میں مقیم لوگ جب ناشتے کے لیے ہال میں جمع ہوتے تو وہ انہیں ناشتہ کراتی۔ مسافروں میں بیشتر وہ ہوتے جو ایک دن قیام کرتے اور اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتے۔ ان میں سے زیادہ تر جاہل، اکھڑ مزاج اور درشت طبیعت کے لوگ ہوتے تھے۔ بعض لوگ یہاں قیام کے دوران بالاخانوں پر بھی جاتے تھے۔ قصبے میں ایک رواج تھا۔ ایک غیر تحریری قانون تھا۔ اپنے نفس کو تسکین دینے کے لیے لوگ بالاخانوں کا رُخ کرتے تھے۔ ان لوگوں کے لیے مارگریٹ ایک چیلنج تھی۔ کیونکہ وہ نہ پاک دامن لڑکیوں کے زمرے میں آتی تھی، نہ جسم فروش لڑکیوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ مارگریٹ جب ایک مرتبہ بہک گئی ہے تو اس کا حصول کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بس اُسے بہلانے کی ضرورت ہے۔ اس لیے وہ اکثر اس سے ذومعنی انداز میں بات کرتے۔ وہ اسے مختلف انداز میں لالچ دیتے اور اُسے ایک عام طوائف بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ ان اوباش مردوں سے بڑے

صبر و تحمل سے پیش آتی تھی۔ انہیں خوبصورتی سے ٹال دیتی تھی۔ اُس کا سابقہ بھانت بھانت کے لوگوں سے پڑتا تھا۔ بعض نہایت خونخوار تھے۔ اور بعض نہایت صاف گو، کچھ شرمیلے بھی تھے۔ اور وہ ان سب سے نہایت باوقار انداز میں اس طرح پیش آتی کہ وہ اُس سے زیادہ بے تکلف ہونے کی جرأت خود میں نہیں پاتے تھے۔

ایک رات جب ممّی لیٹنے کی تیاری کر رہی تھیں، انھوں نے سرائے کے عقبی حصے میں واقع مارگریٹ کے کمرے سے اُس کی چیخیں سنیں وہ سب کچھ چھوڑ کر دیوانہ وار مارگریٹ کے کمرے کی طرف بھاگیں۔

دروازہ کھول کر وہ اندر پہنچیں۔ انہوں نے سرائے میں مقیم ایک شخص کو دیکھا۔ اس وحشی نے معصوم اور ستم رسیدہ مارگریٹ کو دبوچ رکھا تھا اور وہ زور زور سے چیخیں بلند کر رہی تھی۔

ممّی نے لوہے کی ایک سلاخ اٹھائی اور پھر اس شخص کے سر پر ضربیں لگاتی چلی گئیں۔ وہ شخص بہت مضبوط اور بھاری بھرکم تھا۔ لیکن ممّی نے اُسے سنبھلنے کا موقعہ نہ دیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ بے ہوش ہو کر فرش پر گر گیا۔ ممّی نے اس شخص کو بے ہوشی کے عالم میں سرائے سے باہر سڑک پر پھنکوا دیا اور واپس مارگریٹ کے پاس پہنچیں۔ وہ بُری طرح رو رہی تھی۔ اس کا وجود کپکپا رہا تھا۔

”تم ٹھیک تو ہو بیٹی؟“ ممّی نے شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں۔ آپ نہ آتیں تو وہ وحشی نہ جانے میرا کیا حشر کرتا۔ آپ نے مجھے بچا لیا ممّی۔ بہت بہت شکریہ۔“ اُس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

وہ واقعی اس مہربان عورت کی بہت زیادہ ممنون تھی۔ ممّی اس شہر کی واحد عورت تھیں جنہوں نے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے اُسے زندہ رہنے کا موقع دیا تھا۔ وہ نہ ہوتیں تو ممکن ہے وہ خودکشی کر لیتی۔ اس خیال سے وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ممّی ہمدردی کے جذبات سے اُسے دیکھتی رہیں۔ بے چاری، خواب دیکھنے والی لڑکی۔ اسے کیا پتا کہ جمی اس سے کبھی شادی نہیں کرے گا۔ پھر وہ مارگریٹ کو یونہی بلکتا ہوا چھوڑ کر واپس چلی گئیں۔

مارگریٹ کے شب و روز اسی طرح روتے اور اپنی حالت پر تاسف کرتے گزر رہے تھے۔ زچگی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ اس کے لیے اب اٹھنا بیٹھنا بھی دوبھر ہوتا جا رہا تھا۔ ایک رات وہ کام سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ ایک سیاہ فام لڑکے نے اُسے ایک بند لفافہ لا کر دیا اور کہا ”مجھے اس کا جواب چاہیئے۔“

مارگریٹ نے لفافہ کھول کر اس میں سے پرچہ نکالا۔ دو تین مرتبہ غور سے اس کا متن پڑھا اور پھر وہ بولی ”ٹھیک ہے، کہہ دینا میں نے دعوت قبول کر لی ہے۔“

اگلے جمعے کو ٹھیک بارہ بجے مارگریٹ مادام اگنس کے بالاخانے میں پہنچ گئی۔ دروازے پر ”کاروبار بند ہے“ کا بورڈ آویزاں تھا۔ اُس نے دروازے پر دستک دی۔ اس وقت اُسے راہ گیروں کی بھی کوئی پروا نہیں تھی، جو نہایت حیرت سے اُسے دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے۔ اُسے اب بھی یقین نہیں تھا کہ اس نے یہاں آنے کا فیصلہ غلط کیا ہے یا صحیح۔ اس کیلئے یہ فیصلہ کرنا بہت دشوار تھا۔ لیکن وہ بھی کیا کرتی۔ اس نے اپنی تنہائی سے تنگ آ کر یہ فیصلہ کیا تھا۔ مادام نے اسے جو خط لکھا تھا اس کا مضمون یہ تھا۔

ڈیر مارگریٹ!

اگرچہ میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ میں کسی کے معاملات میں مداخلت کرنا پسند کرتی ہوں۔ لیکن بات یہ ہے کہ میں اور دوسری لڑکیاں ایک عرصے سے آپ کے ساتھ پیش آنے والے ناخوشگوار واقعات پر باتیں کرتے رہے ہیں۔ سوچتے رہے ہیں۔ آپ کے ساتھ جو کچھ ہوا بہت شرمناک اور افسوسناک ہے۔ بہرحال ہم لوگ آپ کی اور آپ کے ہونے والے بچے کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کو کوئی عار نہ ہو تو ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ دوپہر کے کھانے پر شریک ہوں۔ آپ کی آمد ہمارے لیے عزت افزائی کا باعث ہوگی۔ جمعہ کو دوپہر کے وقت ہم سب آپ کے منتظر ہوں گے۔

چشم براہ
مادام اگنس

دروازہ کھلا، مادام اُسے دیکھ کر خوش ہوگئی اور بولی ”آئیے آئیے، تشریف لائیے۔“

مادام اُسے نہایت احترام کے ساتھ اندر لے گئی۔ وہ ڈرائنگ روم میں پہنچی تو حیران رہ گئی۔ یہاں [illegible]

کو نہایت خوبصورت انداز میں سجایا گیا تھا۔ رنگ برنگی جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں چمکیلے رنگا رنگ اور بڑے بڑے غبارے لٹکے ہوئے تھے۔ گتوں پر ہاتھ سے چند جملے لکھے ہوئے تھے جنہیں پڑھ کر مارگریٹ کا دل بھر آیا "خوش آمدید بے بی"۔۔۔۔" ہماری دعا ہے کہ آنے والا ننھا مہمان لڑکا ہو"۔۔۔۔"ہیپی برتھ ڈے" ڈرائنگ روم میں عالی شان صوفے پڑے تھے۔ دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ صوفوں اور میزوں پر نئے خوش رنگ کور ڈالے گئے تھے۔

ڈرائنگ روم میں مادام کے بالا خانے کی آٹھ لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان سب نے موقعہ کی مناسبت سے لباس پہن رکھے تھے۔ چہروں پر کوئی میک اپ نہ تھا۔ اس وقت وہ ایک معزز گھرانے کی خواتین کے روپ میں تھیں۔ مارگریٹ نے انہیں دیکھا وہ اس شہر کی بیشتر شادی شدہ اور معزز عورتوں سے زیادہ باوقار اور شریف معلوم ہو رہی تھیں۔

مارگریٹ نے ان تمام عورتوں کو دیکھا جنہیں لوگ طوائفیں کہتے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اُسے کیا کرنا چاہیے۔ ان میں سے بعض عورتوں سے وہ واقف تھی۔ ان کو اس نے اُن دنوں کسی نہ کسی موقع پر کوئی نہ کوئی چیز فروخت کی تھی۔ جب وہ اپنے والد کے اسٹور پر کام کرتی تھی۔ ان کی عمریں مختلف تھیں۔ جسم اور قد کے اعتبار سے وہ مختلف تھیں۔ لیکن ان تمام میں ایک بات مشترک تھی۔ وہ سب نہایت خیال رکھنے والی عورتیں تھیں۔ وہ سب خود کو بے حد خوش نصیب سمجھ رہی تھیں کہ مارگریٹ نے ان کی دعوت قبول کر لی تھی۔ احساس مندی کے جذبات سے بوجھل وہ اس کے لیے بچھی جا رہی تھیں۔ وہ ہر ہر لفظ نہایت احتیاط سے ادا کر رہی تھیں۔ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھتی تھیں کہ کہیں کوئی بات اس مظلوم لڑکی کی طبیعت پر گراں نہ گزرے۔ انہیں اچھی طرح احساس تھا کہ لوگ خواہ کچھ ہی باتیں کیوں نہ بنائیں، اس لڑکی کا موازنہ ان کی اپنی ذات اور برے کردار سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ ان کی طرح آبرو باختہ اور بے حیا نہیں تھی۔ کچھ دیر گفتگو کے بعد کھانا لگا۔ انہوں نے پر تکلف اہتمام کیا تھا۔ وہ ان کے سلوک اور خلوص سے متاثر تھی۔ یہ وہ مکان تھا جس میں جمی بھی آیا جایا کرتا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ آخر جمی ان عورتوں میں سے کس کو پسند کرتا ہے؟ باتیں ہوتی رہیں۔ اس کی میزبان موسم کے بارے میں اور شہر کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔ جنوبی افریقہ کے مستقبل پر تبادلہ خیال ہو رہا تھا۔ وہ دنیا کے حالات سے آگاہ تھیں کیونکہ ان کے پاس دنیا جہاں کے لوگ آتے تھے۔

کھانا ختم ہوا تو مادام اٹھ کھڑی ہوئی اور مارگریٹ سے بولی "ادھر تشریف لائیے"۔

مارگریٹ ان سب کے ساتھ ایک کمرے میں آ گئی۔ یہ کمرہ ایک درجن کے قریب تحائف سے بھرا ہوا تھا۔ تمام تحفے خوبصورتی کے ساتھ رنگین کاغذوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ تحائف پر دعائیہ کلمات لکھے ہوئے تھے۔ سبھی نے آنے والے مہمان کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا۔ مارگریٹ کو یقین نہیں آیا کہ اس کی نگاہیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں۔ وہ حقیقت ہے۔

"مم۔۔۔۔ میں آپ سب کی بے حد شکر گزار ہوں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کہوں، کیا کروں؟"

"انہیں کھول کر دیکھو" مادام نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا

وہ سب خوبصورت اور حسین تحفے تھے۔ ان کی خوبصورتی اور حسن میں ان کے خلوص نے اضافہ کر کے انہیں اور بھی بیش قیمت بنا دیا تھا۔ تمام تحفے آنے والے مہمان کے لیے تھے۔ مارگریٹ کے لیے یہ سب خلافِ توقع تھا۔ شدید جذبات سے وہ بلک پڑی سرانده درگاہ اور نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھی جانے والی عورتوں نے اُسے گلے لگایا تھا۔ انہوں نے علاقے کے معززین کی طرح آنکھیں بند کر کے تحقیق کیے بنا اُسے قابلِ نفرت نہیں سمجھا تھا۔

مادام نے محبت سے مارگریٹ کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور کمرے میں موجود باقی لڑکیوں کو وہاں سے چلے جانے کے لیے اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی وہ سب خاموشی سے باہر چلی گئیں۔ مادام نے سہارا دے کر اُسے ایک صوفے پر بٹھا دیا اور محبت سے تھپکتی رہی۔ کچھ دیر بعد اس کی سسکیاں تھم گئیں اور وہ رومال سے آنکھیں پونچھ کے بولی۔ "مم۔۔۔۔ میں شرمندہ ہوں، پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا"

"میں تمہارا غم جانتی ہوں! میرے بالا خانے پر لوگ بے شمار مسائل لے کر آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ اور میں تو اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ بالآخر ایسا وقت آتا ہے جب تمام مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اور تمہارا بچہ دونوں نہایت اچھی زندگی گزاریں گے۔ اگر تم نے صبر و تحمل سے کام لیا تو جیت تمہاری ہو گی"

مادام سراپا محبت اور خلوص تھیں۔ یہ خلوص اُن کے الفاظ سے زیادہ ان کے لہجے سے نمایاں تھا "میں آپ کی نہایت شکر گزار ہوں مادام۔ آپ لوگوں نے میرے ساتھ جس محبت کا اظہار کیا ہے، اسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گی" مارگریٹ نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

"اس میں شکریے کی کیا بات ہے۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ آج ہم سب لوگ کتنے خوش ہیں۔ ہم لوگوں کو ایسے پُر مسرت مواقع کم ہی

ملتے ہیں۔"

"میں آپ سب کی واقعی بہت ممنون ہوں۔ یہ میری زندگی کا سب سے حسین دن تھا۔" مارگریٹ نے مسکرا کے کہا "آپ سب نے میرا حوصلہ بڑھایا ہے۔ میرے ذہن پر چھائی ہوئی دھند ہٹائی ہے اور میں آپ سب کو مایوس نہیں کروں گی۔ میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر کے رہوں گی۔"

"عزت افزائی تو ہماری ہوئی ہے کہ آپ نے ہماری دعوت قبول کی اور یہاں تشریف لائیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے تو اس شہر کی تمام عورتوں کی شرافت اور عزت ایک طرف اور تم ایک طرف۔ تم... میرا مطلب ہے آپ ان سب سے کہیں زیادہ نیک اور شریف اور صاحب عزت ہیں۔ تم... میرا مطلب ہے آپ۔"

"مجھے تم ہی کہہ کر مخاطب کریں مادام۔ آپ مجھ سے عمر میں بڑی ہیں۔ آپ کا دل وسیع ہے۔"

مادام نے اُسے گلے سے لپٹا لیا اور کپکپاتی آواز میں بولی "میری بیٹی، یہ جو اس شہر کی شریف اور عزت دار عورتیں بنی پھرتی ہیں۔ سب گھٹیا ہیں۔ کتوں سے بدتر ہیں۔ جس طرح وہ تم سے پیش آتی ہیں، جی چاہتا ہے ایک ایک کو قتل کر دوں اور وہ جمی، معاف کرنا بیٹی، وہ نرا احمق اور پاجی ہے۔ یہ سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اگر اس دنیا میں مرد نہ ہوتے۔ اگر یہ دنیا ان کے قابلِ نفرین وجود سے پاک ہوتی تو یہ جنت ہوتی جنت۔"

مارگریٹ اب اپنے آپ پر قابو پا چکی تھی۔ اس نے اٹھ کر مادام کا ہاتھ تھام لیا اور بولی "میں یہ دن کبھی فراموش نہیں کرسکوں گی جب میرا بیٹا بڑا ہوگا تو میں اُسے اس دن کی ایک ایک بات بتاؤں گی۔"

"کیا واقعی؟" مادام نے حیرت سے کہا۔

"ہاں میں سچ کہہ رہی ہوں۔"

مادام اُسے دروازے تک چھوڑنے آئیں۔ "میں تمام تحفے گاڑی سے تمہارے ہاں بھجوا دوں گی۔ اچھا خدا حافظ"

"بہت بہت شکریہ مادام۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

مادام دروازے میں کھڑی دیر تک اُسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو مادام نے بلند آواز میں کہا "چلو لڑکیو! کام شروع کرو۔"

ایک گھنٹے بعد دروازے سے "بند ہے" کا بورڈ اتار دیا گیا۔ مادام کے بالاخانے پر معمول کے مطابق کاروبار شروع ہوگیا۔

٭

جمی نے صورت حال کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اب اُسے اپنا آخری وار کر دینا چاہیے۔

جوزف کا بال بال قرضے میں جکڑ گیا تھا۔ وہ پوری طرح پنجرے میں پھنس چکا تھا اور اب پنجرے کا دروازہ بند کرنے کا موقع تھا۔ گزشتہ چھ ماہ کے دوران جمی نے جوزف کے تمام ساتھیوں کے کاروبار خاموشی سے خرید لیے تھے۔ لیکن وہ تو جوزف کو ہیروں کے اس میدان سے محروم کرنے پر تلا ہوا تھا جو صحرائے نامب کہلاتا تھا اور اب اس کا موقعہ آچکا تھا۔

جوزف کی حالت اب اتنی ناگفتہ بہ ہوگئی تھی کہ شہر میں کوئی بھی شخص ایک پائی بھی اُسے قرض دینے کا روادار نہ تھا۔ صرف وہی ایک بینک جوزف کو قرض دیتا تھا جس کا مالک درپردہ جمی تھا۔ اس نے بینک منیجر کو سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ جس وقت اور جتنی رقم قرض مانگے اسے بلاچوں وچرا دے دی جائے۔

جوزف کا جنرل اسٹور اب تقریباً بند ہی ہوگیا تھا۔ وہ صبح سے رات گئے تک بس شراب پیتا رہتا۔ سہ پہر کو کبھی کبھار وہ مادام کے بالاخانے پر چلا جاتا اور رات وہیں گزارتا۔ ایک دن مارگریٹ مسّ کی سرائے کے لیے گوشت لینے قصائی کی دکان پر کھڑی تھی کہ اپنے باپ کو مادام کے بالاخانے سے باہر آتے دیکھا۔ وہ بمشکل ہی اپنے باپ کو پہچان سکی تھی۔ اس کا لباس شکن آلود تھا۔ بال الجھے ہوئے اور چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "اوہ خدایا مجھے معاف کر دے۔ اپنے باپ کو اس حالت تک پہنچانے کی ذمہ دار میں ہی ہوں۔ میرے گناہ کی سزا انہیں مل رہی ہے۔ خدایا ان پر رحم فرما"

جوزف کی ذہنی کیفیت عجیب تھی۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہوگئی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر... اس کے ساتھ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ نہ معلوم کیوں اس کی زندگی تباہ کی جارہی ہے۔ نہ جانے کیوں خدا نے اسے ایسی کڑی آزمائش میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اُسے اب بھی یقین تھا کہ بالآخر وہ اپنے نادیدہ دشمنوں پر فتح حاصل کر لے گا [illegible]

تھی۔ اس نے اپنا اسٹور گروی رکھ دیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی ہیروں کی چھ کانوں میں اس کے جو حصص تھے۔ وہ بھی رہن رکھے جا چکے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس نے اپنا گھوڑا اور گاڑی بھی رہن رکھ دیا تھا۔ اب اس کے پاس جو کچھ تھا ہیروں کا میدان تھا۔ اور جس دن جوزف نے اس میدان کو بھی ضمانت کے طور پر قرض لینے کے لیے استعمال کیا جمی اس پر آخری وار لگانے کے لیے تیار ہوگا۔

اس نے بینک منیجر کو بلا کر کہا، "جوزف کے قرضے کے تمام کاغذات نکالو۔ حساب لگاؤ اور اسے چوبیس گھنٹے کا نوٹس دو کہ وہ یا تو قرضہ ادا کرے ورنہ پھر اس کی تمام جائیداد قرق کرانے کے انتظام کرو"۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب! وہ یہ تمام قرضہ اتنے کم وقفے میں ادا نہیں کر سکتا۔ شاید کبھی ادا نہیں کر سکتا"۔

"صرف چوبیس گھنٹے کا نوٹس جاری کر دو"۔ جمی نے فیصلہ سنایا۔

اس حکم کے ٹھیک ۲۴ گھنٹے بعد بینک منیجر عدالت کے ہرکارے کے ساتھ جوزف کے اسٹور پر پہنچا۔ وہ جوزف کے تمام قابل انتقال اثاثوں کی ضبطی کے احکام بھی لایا تھا۔ جمی سڑک کے دوسرے سمت اپنے دفتر کی کھڑکی سے جوزف کی بے دخلی کا منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ شخص جس نے تمام ہیرے چھین کر ایک دن اسی اسٹور سے اُسے بے رحمی سے نکالا تھا۔ آج آنکھیں جھپکاتا ہوا اپنے ہی اسٹور سے خالی ہاتھ نکلا تھا۔ اور اس طرح کہ اب وہ کبھی وہاں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اسٹور کے باہر وہ چلچلاتی دھوپ میں کھڑا بے یار و مددگار کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ کہاں جائے، کدھر جائے، کس کے پاس جائے۔ وہ بالکل کنگال ہو گیا تھا۔ جمی کا انتقام مکمل ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود اُسے وہ قلبی مسرت اور سکون حاصل نہیں ہو رہا تھا جو ہونا چاہیے تھا وہ اندر سے خود کو بالکل کھوکھلا سا محسوس کر رہا تھا۔ مگر وہ کیا کرتا۔ آج جس شخص کو اس نے تباہ کیا تھا، اسی نے سب سے پہلے اُسے تباہ کیا تھا۔

اُس رات جب جمی مادام کے بالاخانے پر گیا تو مادام نے بتایا "کچھ سنا تم نے جمی؟

جوزف نے ایک گھنٹہ پہلے خودکشی کر لی ہے۔ اس نے پستول سے گولی چلا کر اپنا بھیجا پھاڑ لیا"۔

جوزف کی تدفین میں، تدفین کرنے والے عملے کے علاوہ صرف دو افراد شریک تھے۔ ایک جمی اور دوسری مارگریٹ۔ مارگریٹ نے اپنے تبدیل پذیر جسم کو چھپانے کے لیے ڈھیلا ڈھالا سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ وہ زرد اور بیمار دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر غم کے تاثرات مزید گہرے ہو گئے تھے۔ جمی خاموش اور چپ چاپ قبر کی دوسری طرف کھڑا تھا۔ وہ تدفین میں شریک بھی تھا۔ لیکن اس سے قطعی لاتعلق بھی۔ جوزف کا تابوت قبر میں اتار دیا گیا تھا۔ اس پر گرنے والی مٹی اور پتھروں سے عجیب سی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ مارگریٹ کو یوں لگ رہا تھا۔ جیسے تابوت سے یہی آوازیں ابھر رہی ہوں "طوائف، طوائف، طوائف"۔

مارگریٹ نے قبر کی دوسری طرف مقابل کھڑے ہوئے جمی کو دیکھا۔ ایک لمحے کو ان کی آنکھیں آپس میں ملیں۔ جمی کی نگاہوں میں شناسائی کی ہلکی سی رمق بھی نہیں تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ اس کے لیے قطعی اجنبی ہو۔ اس لمحے اُسے جمی سے شدید نفرت محسوس ہوئی: "تم بے حس، بے مروت ایسے کھڑے ہو جیسے مجھ سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ تم بھی اتنے ہی گناہ گار ہو جتنی میں ہوں، ہم دونوں نے ابو کو قتل کیا ہے۔ خدا کے نزدیک میں اور تم۔ میاں اور بیوی ہیں۔ ہم ایک برائی میں برابر کے شریک ہیں"۔ مارگریٹ نے دل ہی دل میں یہ باتیں کہیں۔ زبان سے یہ الفاظ کہنے کی ہمت اُس میں نہ تھی۔ اُس نے قبر میں دیکھا۔ تدفین کرنے والے مزدور اب قبر میں تابوت پر پھاؤڑوں سے مٹی ڈال رہے تھے۔

"خدا تمہیں سکون بخشے ابو"۔ مارگریٹ نے دعا کی۔

جب اُس نے سر اٹھایا تو جمی وہاں سے جا چکا تھا۔

چند دن بعد مارگریٹ نے ایک بچے کو جنم دیا۔ اُس نے بچے کا نام اس کے باپ پر جمی ہی رکھ دیا۔ اُسے معلوم تھا کہ بچے کی پیدائش کی خبر جمی کو ضرور پہنچے گی۔ وہ اس فریب میں مبتلا تھی کہ جمی اپنے بچے کو دیکھنے کے لیے ضرور آئے گا۔ لیکن یہ اُس کی بھول تھی۔ کئی ہفتے گزر گئے۔ نہ جمی اپنے بیٹے کو دیکھنے آیا نہ اس کے لیے کوئی تحفہ بھیجا۔ لگتا تھا۔ جیسے اُس کا بچے سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ آخر تنگ آکر اُس نے خود ہی ایک پیغامبر کو جمی کے پاس بھیجا۔ پیغامبر تیس منٹ بعد واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ جمی نے اپنے بیٹے سے قطعی لاتعلقی کا اظہار کیا ہے۔

یہ جواب سن کر مارگریٹ سناٹے میں رہ گئی۔ اتنا شدید صدمہ تھا کہ اس کے آنسو بھی نہ نکل پائے۔ وہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ دن ڈھل گیا۔ رات بیت گئی لیکن وہ کمرے سے نہ نکلی۔ ممی نے لاکھ سمجھایا لیکن اُس نے باہر آنے سے انکار کر دیا۔

"تیرے ابا پریشان ہیں جمی!" اُس نے اپنے بیٹے کو سمجھایا۔ "وہ سمجھتے ہیں کہ تیری ماں نے ان سے کوئی برائی کی ہے۔ لیکن تم تو ان کے بیٹے ہو جب وہ تمہیں دیکھیں گے تو تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ تم ان کے گھر میں رہو گے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا"۔ یہ کہہ کر اس نے بچے کو

گلے سے لگالیا اور پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی ۔

شام کو پھر ممّی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو مارگریٹ نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ اس وقت وہ بہت پر سکون تھی ۔اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ عجیب کیفیت تھی اس کی۔ ممّی نے پیار بھرے لہجے میں کہا " کیا بات ہے بیٹی، طبیعت تو ٹھیک ہے ؟"

" میں بالکل ٹھیک ہوں ممّی ۔" وہ بچے کو تحفے میں ملنے والے کپڑے پہنا رہی تھی ۔اس نے کہا " آج میں جمی کو سیر کرانے نکلوں گی ۔"

اس نے بچے کو تحفے میں ملنے والی گاڑی میں لٹایا اور باہر نکل آئی ۔ وہ گاڑی لیے سڑکوں پر گھومتی رہی ۔ عورتیں اسے دیکھ کر کترا کر نکل جاتیں البتہ بعض مرد بچے کو دیکھ کر مسکرا اٹھتے ۔ مارگریٹ دیر تک سڑکوں پر پھرتی رہی لیکن وہ شخص نہ ملا جس کی اُسے تلاش تھی ۔

پھر یہ اس کا معمول ہو گیا۔ وہ صبح و شام، بچے کو بہترین کپڑے پہنا کر اُسے گاڑی میں لٹاتی اور قصبے کی سڑکوں پر نکل جاتی ۔ یوں ایک ہفتہ گزر گیا۔ کہیں بھی اس کا جمی سے سامنا نہ ہوا تو اُسے یقین آ گیا کہ جمی جان بوجھ کر اُس سے کترا رہا ہے ۔

تب مارگریٹ نے فیصلہ کیا ٹھیک ہے اگر باپ اپنے بیٹے سے ملنے نہیں آتا تو خود بیٹا، اپنے باپ سے ملنے جائے گا ۔

اگلی صبح اُس نے ممّی کو بتایا " میں ذرا باہر جا رہی ہوں ۔ اس شہر سے باہر، ایک ہفتے بعد میری واپسی ہوگی ۔"

" مگر بیٹی بچہ بہت چھوٹا ہے ۔ وہ سفر نہیں کر سکتا ۔"

" بچہ اسی شہر میں رہے گا ۔"

ممّی نے حیرت سے کہا " تمہارا مطلب ہے یہاں ؟"

" یہاں آپ کی سرائے میں نہیں ممّی ۔" مارگریٹ نے جواب دیا " میں اس کے رہنے کا ایک اعلیٰ انتظام کر رہی ہوں ۔ میں اسے جس جگہ بھیجوں گی ۔ وہاں اس کا بہت خیال رکھا جائے گا ۔ اُسے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی ۔"

✲

جمی نے اپنے لیے قصبے کے قریب ایک پہاڑ پر مکان تعمیر کرایا تھا ۔ مکان بہت عالیشان تھا ۔ اس کے چاروں طرف سرسبز لان تھا جس میں خوش رنگ پھولوں کے تختے تھے ۔ مکان کے عقب میں ملازمین کے کوارٹر اور جمی کا اصطبل تھا ۔ امور خانہ داری کی نگرانی جینا کے سپرد تھی ۔ وہ ادھیڑ عمر کی بھاری بھرکم عورت تھی ۔ اس کے چھ جوان بچے تھے جو انگلستان میں رہتے تھے ۔

مارگریٹ اپنے شیر خوار بچے کو گود میں اٹھائے صبح دس بجے جمی کے مکان پر پہنچی ۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت جمی اپنے دفتر میں ہوگا ۔ جینا نے دروازہ کھولا ۔ مارگریٹ کو دیکھ کر وہ بھونچکارہ گئی ۔ اسے بھی معلوم تھا کہ مارگریٹ کون ہے اور جمی سے اس کا کیا تعلق ہے ۔

" اوہ آپ، مگر مجھے افسوس ہے، صاحب اس وقت گھر پر نہیں ہیں ۔" جینا نے پریشان ہو کر کہا ۔

مارگریٹ نے اس کی بات کاٹ دی " میں تمہارے صاحب سے ملنے نہیں آئی، ان کا بچہ لے کر آئی ہوں ۔"

" معاف کیجیے مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ۔" جینا نے جواب دیا ۔

" میں ایک ہفتے کے لیے شہر سے باہر جا رہی ہوں ۔ ایک ہفتے بعد میں بچے کو لینے واپس آؤں گی ۔" اس نے بچے کو جینا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا " اس کا نام جمی ہے ۔"

جینا گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی اور گڑبڑا کر بولی " آپ ۔۔۔۔ آپ ۔۔۔ اس بچے کو یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتیں ۔ صاحب بہت ۔۔۔۔"

مارگریٹ نے پھر اس کی بات کاٹ کر کہا " تم بچے کو لیتی ہو یا نہیں ۔ نہیں لو گی تو میں اسے دروازے پر چھوڑ کر چلی جاؤں گی ۔ اور تمہارے صاحب یہ بات قطعی پسند نہیں کریں گے ۔" یہ کہہ کر اس نے بچے کو جینا کے حوالے کیا اور وہاں سے چل دی ۔

" اے ۔۔۔ اے ۔۔۔۔ یہ کیا کر رہی ہو تم ۔ اپنا بچہ لے کر جاؤ مس ۔۔۔"

مگر اُس نے پلٹ کر نہ دیکھا ۔ جینا ہونقوں کی طرح دروازے میں کھڑی چیختی رہ گئی " اُف میرے خدا ۔ تو نے یہ کیا مصیبت میرے گلے ڈال دی ۔ صاحب تو میری زندگی حرام کر دیں گے ۔"

جینا کے اندیشے درست ہی ثابت ہوئے ۔ تمام بات سن کر جمی سخت طیش میں آ گیا اور چلا کر بولا " تم سخت احمق اور بے وقوف ہو تمہیں دروازہ بند کر دینا چاہیے تھا ۔"

" مگر صاحب، اس نے مجھے اتنی مہلت ہی نہ دی ۔ وہ تو ۔۔۔"

" میں اُس کے بچے کو اپنے گھر میں دیکھنا نہیں چاہتا، سمجھیں !" جمی نے پھر چیخ کر کہا ۔ وہ اس وقت انتہائی بپھرا ہوا تھا اور غصے میں بھرا کمرے میں ادھر ادھر ٹہل رہا تھا ۔ پھر وہ جینا کے سامنے رک کر اُسے خونخوار نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا " میں جانتا ہے اس حماقت پر تمہیں

فوراً ملازمت سے الگ کر دوں ۔"

"وہ ایک ہفتے بعد اپنے بچے کو لینے آئے گی جناب! جب تک میں ....."

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ کب واپس آئے گی ۔" جمی پھر چیختا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ "بچے کو یہاں سے لے جاؤ۔ اس سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرو۔ میں اسے کسی صورت بھی اپنے گھر میں رکھنا نہیں چاہتا ۔"

"آپ ہی بتایئے کیسے کروں میں یہ ؟" جینا نے روہانسا ہو کر کہا۔

"ڈال آؤ شہر میں کہیں بھی۔ تم کہیں بھی اسے پھینک کر آ سکتی ہو ۔ کسی بھی کوڑا گھر میں ڈال سکتی ہو ۔"

"مگر میں یہ کام کیسے کروں گی جناب ؟" جینا تقریباً رو پڑی ۔

"مجھے کیا پتہ ، یہ مصیبت تم نے ہی مول لی ہے ۔"

جینا نے اس چھوٹے سے شیر خوار بچے کو دیکھا جو اس کے بازوؤں میں چھوٹی سی بُقچی کی مانند پڑا تھا۔ جمی کی چیخ پکار سے خوابیدہ بچے کی آنکھ کھل گئی تھی اور وہ رونے لگا تھا۔ "اس شہر میں کوئی یتیم خانہ بھی نہیں ہے جناب !" یہ کہہ کر جینا نے بچے کو گود میں ہلانا شروع کر دیا لیکن بچے کی چیخیں تھیں کہ بند ہونے کی بجائے بلند ہی ہوئی جا رہی تھیں ۔ "آپ خود ہی سوچیے جناب ! یہ ننھی سی جان ہے ، کسی نہ کسی کو تو اس کی نگہداشت کرنا ہی ہو گی ۔"

جمی نے بے بسی سے اپنے بال نوچ لیے پھر قدرے نرم لہجے میں بولا "ٹھیک ہے تم خود اس مصیبت کی دیکھ بھال کرو۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ۔"

"بہت بہتر جناب !" جینا نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

"اس کو چپ کراؤ ، کم بخت حلق پھاڑ کر چیخ رہا ہے اور ایک بات اچھی طرح سمجھ لو ، اس بچے کو میری نظروں سے دور ہی رکھنا۔ میں اس منحوس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا ۔ میں اس گناہ کی پوٹلی کے گھر میں موجود ہونے کا احساس بھی نہیں چاہتا ۔ اگلے ہفتے جب اس کی ماں اسے لینے آئے تو چپ چاپ اس کے حوالے کر دینا ۔ میں اس سے ملنا پسند نہیں کرتا ۔ سمجھ گئیں ؟"

"جی ہاں جناب !" جینا نے جواب دیا اور بچے کو ہلاتی ہوئی جلدی سے وہاں سے چلی گئی ۔ ننھے جمی نے پہلے سے زیادہ زور سے رونا شروع کر دیا تھا ۔

جینا کے جانے کے بعد جمی صوفے پر بیٹھ گیا ، برانڈی اور سگار پیتے ہوئے وہ مارگریٹ کی اس حرکت پر غور کرتا رہا ۔ "میں خوب سمجھتا ہوں ۔ اس نے یہ حرکت اس لیے کی ہے کہ بچے کو دیکھ کر شاید میرا دل پگھل جائے گا اور میں اس کے پاس جا کر اس سے کہوں گا کہ مجھے اس سے محبت ہے مجھے اس بچے سے محبت ہے ۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں ۔ مگر ایسا نہیں ہو سکتا ۔ میں تمہاری یہ سازش کامیاب نہیں ہونے دوں گا ۔" وہ جیسے اپنے آپ سے تمام باتیں کرتا رہا تھا ۔ اس نے تو اس بچے پر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی ۔ وہ اس بچے اور اس کی ماں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تھا ۔ یہ دونوں اس کی زندگی کا ایک بھولا ہوا باب تھے ۔ ایک خواب تھے ۔ خواب جو حقیقت نہیں بنتے ۔ یہ بچہ کسی محبت کا نتیجہ نہیں تھا ۔ یہ تو اس شدید نفرت کی پیداوار تھا جس نے اسے جوزف سے انتقام لینے پر اکسایا تھا ۔ وہ سوچتا رہا ۔

سب کچھ تھا ۔ لیکن جمی اپنے وجود میں ایک کمی ایک کھوکھلا پن محسوس کر رہا تھا ۔ جوزف کی موت کے بعد اس کی زندگی کا جیسے کوئی مقصد نہیں رہ گیا تھا ۔ وہ دولت مند بنا چاہتا تھا اور اپنے تصور سے کہیں زیادہ دولت مند ہو چکا تھا ۔ وہ اس وقت سیکڑوں ایکڑ ایسی زمین کا مالک تھا جو معدنی دولت سے مالا مال تھی ۔ یہ زمین اس نے اس خیال سے خریدی تھی کہ شاید اس میں ہیرے کی کانیں دریافت ہو جائیں ۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہاں ہیرے کی کانیں ہی نہیں بلکہ سونا پلاٹینم اور چھ کے قریب دیگر کمیاب دھاتیں بھی برآمد ہو گئیں ۔ قصبے میں جتنی املاک تھی ان میں سے نصف سے زیادہ جمی کے بینک کے پاس رہن تھیں ۔ وہ ہزاروں ایکڑ قابل کاشت اراضی کا بھی مالک تھا ۔ یہ سب باتیں اس کے لیے باعث تسکین تھیں ۔ اس نے اپنے والدین کو لکھا تھا کہ وہ اس کے پاس آ جائیں ۔ لیکن وہ اپنا وطن چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے اس کے بھائیوں اور بہن کی شادی ہو چکی تھی ۔ جمی نے اپنے والدین کو بہت بڑی رقم بھیجی تھی ۔ یہ بات بھی اس کے لیے باعث تسکین تھی ۔ کہ وہ اپنے والدین کی خدمت کر رہا ہے ۔ لیکن اب اس کی زندگی بالکل ویران اور بنجر ہو کر رہ گئی تھی ۔ اب کوئی مہم تھی نہ زندگی میں کوئی مدوجزر تھا ۔ بس ایک سکون اور ٹھہراؤ تھا ۔

دو دن بعد وہ پھر اپنے کمرے میں بیٹھا برانڈی پی رہا تھا ۔ اور اپنی زندگی کے بارے میں غور کر رہا تھا ، وہ لگے بندھے معمولات اور بیزا

کی یکسانی سے اکتا گیا تھا۔ وہ تبدیلی چاہتا تھا۔ طوفان اور ہنگامے چاہتا تھا۔ وہ زندگی پوری گہما گہمی کے ساتھ گزرنا چاہتا تھا۔ لیکن لگتا تھا کہ یہ سب چیزیں اس سے چھین لی گئی ہیں۔ وہ اپنے انہی خیالات میں غرق برانڈی اور سگار پیتا رہا۔ رات گزرتی رہی۔

اس نے گہری سانس لی اور بوتل سے برانڈی انڈیلنی چاہی۔ لیکن بوتل ختم ہو گئی تھی۔ وہ اٹھا اور الماری سے نئی بوتل لینے چلا گیا۔

ابھی وہ الماری کا دروازہ کھول ہی رہا تھا کہ ایک بچے کی غوں غوں سنائی دی۔ جینیا اس بچے کو کچن کے پیچھے اپنے کمرے میں لے گئی تھی۔ اس نے جمی کے احکام پر من و عن عمل کیا تھا۔ گزشتہ دو دن سے نہ تو اس نے بچے کو دیکھا تھا۔ نہ اس کی آواز ہی سنی تھی۔ پھر جمی کو جینیا کی آواز سنائی دی۔ وہ بچے سے تتلا کر باتیں کر رہی تھی۔ "بہت اچھا سا بیٹا ہے نا یہ ننھا سا مہمان ہے، فرشتہ ہے نا، کیوں ہے نا، شریر کہیں کا"۔ بچے نے پھر غوں غاں کی۔ وہ جینیا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اُس نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر جھانک کر دیکھا۔

جینیا کہیں سے بچے کے لیے چھوٹا سا پالنا لے آئی تھی۔ بچہ اس میں لیٹا ہوا غوں غاں کر رہا تھا اور وہ اس پر جھکی ہوئی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ بچے نے اُس کی ایک انگلی کو سختی سے مٹھی میں جکڑ رکھا تھا۔

"جمی بیٹے! تم ہو بہت شیطان، بلکہ شیطان کے خالو۔ تم بڑے ہو کر...." اور باقی الفاظ جینیا کے منہ میں ہی رہ گئے۔ اچانک اسے احساس ہو گیا کہ جمی دروازے میں کھڑا ہے۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ "فرمائیے جناب! کوئی کام؟ کوئی چیز تو نہیں چاہیے؟"

"نہیں"۔ جمی نے پالنے کی طرف بڑھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ "میری آنکھ... اس کے شور سے کھل گئی تھی"۔ تب پہلی مرتبہ جمی نے اپنے بیٹے پر... نظر ڈالی۔ وہ اس کے خیال سے زیادہ ہی بڑا تھا۔ جمی کو دیکھ کر بچہ مسکرایا۔

"میں معافی چاہتی ہوں صاحب۔ بہت ہی پیارا سا بچہ ہے۔ اور بہت صحت مند بھی۔ اس کے ہاتھ میں اپنی انگلی دے کر دیکھیے، کتنا طاقتور ہے یہ"۔ جینیا کہتی چلی گئی۔ اسے بچے سے جمی کے نفرت کی پروا نہیں رہی تھی۔

جمی کے ملازمین کی تعداد پچاس کے قریب تھی۔ یہ ملازمین اس کے کاروبار کے مختلف شعبوں سے متعلق تھے۔ وہ جمی کی عزت کرتے تھے اور اس کی کمپنی میں کام کرنا اپنے لیے باعث عزت سمجھتے تھے۔ حال ہی میں اُس نے ایک نیا ملازم رکھا تھا۔ سولہ برس کے اس ذہین اور وجیہہ نوجوان کا نام ڈیوڈ تھا۔ اس کا باپ بھی اُس کے پاس فورمین کی حیثیت سے ملازم تھا۔ وہ اپنے بیٹے ڈیوڈ کو لے کر امریکہ سے یہاں آیا تھا۔ لاتعداد لوگوں کی طرح اس نے بھی یہ سفر ہیروں ہی کی تلاش میں اختیار کیا تھا۔ جب وہ اپنی کوششوں میں ناکام ہو گیا اور تمام رقم بھی خرچ ہو گئی تو زندہ رہنے کے لیے اس نے ملازمت تلاش کی۔ جمی نے اُسے اپنی ایک کان کے نگراں کی حیثیت سے ملازمت دے دی۔ ایک دن کسی ضرورت کے تحت اس کا بیٹا بھی کام پر گیا۔ جمی نے اُس کو دیکھا اور اس کے کام سے اتنا متاثر ہوا کہ اُسے کمپنی میں مستقل کام کی پیش کش کر دی۔ وہ بہت ذہین، سمجھدار اور قابلِ نوجوان تھا۔ اس نے جلد ہی خود کو اس اعتماد کا اہل ثابت کر دیا جو اُس پر کیا گیا تھا۔ جمی یہ بھی جانتا تھا کہ ڈیوڈ پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ راز کو راز رکھ سکتا تھا کیونکہ وہ پیٹ کا ہلکا نہ تھا۔ اس لیے جمی نے اسے اپنے نجی معاملات میں بھی اعتماد میں لینا شروع کر دیا تھا۔

"ڈیوڈ! تم ممی کی سرائے پر جاؤ، وہاں مارگریٹ نام کی ایک عورت رہتی ہے"۔

اگر ڈیوڈ مارگریٹ کی ذات سے وابستہ واقعات اور حالات سے واقف تھا تو اس نے اس کا ذرا سا بھی اشارہ نہ دیا صرف اتنا کہا۔

"بہت بہتر جناب!"

"وہاں تمہیں صرف مارگریٹ سے گفتگو کرنا ہے۔ وہ اپنے بچے کو میری خادمہ کے سپرد کر گئی ہے۔ اس سے کہنا کہ وہ اپنا بچہ یہاں سے لے جائے۔ یہ میرا حکم ہے۔ آج ہی اپنے بچے کو یہاں سے لے جائے"۔

"بہت بہتر جناب!"

آدھے گھنٹے بعد ڈیوڈ واپس آ گیا۔ جمی نے فوراً اس سے دریافت کیا "کیا رہا؟ بات ہوئی اس سے؟"

"جناب مجھے افسوس ہے میں آپ کے احکام کی تعمیل نہ کر سکا"۔

جمی جھٹکے کے ساتھ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور غصے سے بولا "کیوں؟ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا"۔

"مس مارگریٹ وہاں نہیں تھیں"۔ ڈیوڈ نے بتایا۔

"تو پھر جاؤ، اُسے تلاش کرو"۔

"دو دن پہلے وہ یہاں سے جا چکی ہیں۔ پانچ دن بعد واپس آئیں گی۔ آپ کہیں تو میں مزید معلومات کروں؟"

"نہیں کوئی ضرورت نہیں"۔ جمی نے جواب دیا۔

کن یکسانی سے اکتا گیا تھا۔ وہ تبدیلی چاہتا تھا۔ طوفان اور ہنگامے چاہتا تھا۔ وہ زندگی پوری گہما گہمی کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ لیکن لگتا تھا کہ یہ سب چیزیں اس سے چھین لی گئی ہیں۔ وہ اپنے انہی خیالات میں غرق برانڈی اور سگار پیتا رہا۔ رات گزرتی رہی۔
اس نے گہری سانس لی اور بوتل سے برانڈی انڈیلنی چاہی۔ لیکن بوتل ختم ہو گئی تھی۔ وہ اٹھا اور الماری سے نئی بوتل لینے چلا گیا۔
ابھی وہ الماری کا دروازہ کھول ہی رہا تھا کہ ایک بچّے کی غوں غوں سنائی دی۔ جینیا اس بچّے کو کچن کے پیچھے اپنے کمرے میں لے گئی تھی۔ اس نے جمی کے احکام پر من و عن عمل کیا تھا۔ گزشتہ دو دن سے نہ تو اس نے بچّے کو دیکھا تھا۔ نہ اس کی آواز ہی سنی تھی۔ پھر جمی کو جینیا کی آواز سنائی دی۔ وہ بچّے سے تتلا کر باتیں کر رہی تھی۔ "بہت اچھا سا بیٹا ہے نا۔ ننھا سا مہمان ہے، فرشتہ ہے نا، کیوں ہے نا، شریر کہیں کا؛"
بچّے نے پھر غوں غاں کی۔ وہ جینیا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اُس نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر جھانک کر دیکھا۔ جینیا کہیں سے بچّے کے لیے چھوٹا سا پالنا لے آئی تھی۔ بچّہ اس میں لیٹا ہوا غوں غاں کر رہا تھا اور وہ اس پر جھکی ہوئی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ بچّے نے اُس کی ایک انگلی کو سختی سے مٹھی میں جکڑ رکھا تھا۔
"جمی بیٹے! تم ہو بہت شیطان، بلکہ شیطان کے خالو۔ تم بڑے ہو کر..." اور باقی الفاظ جینیا کے منہ میں ہی رہ گئے۔ اچانک اسے احساس ہو گیا کہ جمی دروازے میں کھڑا ہے۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی؛ "فرمائیے جناب! کوئی کام؟ کوئی چیز تو نہیں چاہیے؟"
"نہیں" جمی نے پالنے کی طرف بڑھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ "میری آنکھ.. اس کے شور سے کھل گئی تھی؛" تب پہلی مرتبہ جمی نے اپنے بیٹے پر... نظر ڈالی۔ وہ اس کے خیال سے زیادہ ہی بڑا تھا۔ جمی کو دیکھ کر بچّہ مسکرایا۔
"میں معافی چاہتی ہوں صاحب۔ بہت ہی پیارا سا بچّہ ہے۔ اور بہت صحت مند بھی۔ اس کے ہاتھ میں اپنی انگلی دے کر دیکھیے، کتنا طاقتور ہے یہ؛" جینیا کہتی چلی گئی۔ اسے بچّے سے جمی کی نفرت کی پروا نہیں رہی تھی۔
جمی کے ملازمین کی تعداد پچاس کے قریب تھی۔ یہ ملازمین اس کے کاروبار کے مختلف شعبوں سے متعلق تھے۔ وہ جمی کی عزت کرتے تھے اور اس کی کمپنی میں کام کرنا اپنے لیے باعث عزت سمجھتے تھے۔ حال ہی میں اُس نے ایک نیا ملازم رکھا تھا۔ سولہ برس کے اس ذہین اور وجیہ نوجوان کا نام ڈیوڈ تھا۔ اس کا باپ بھی اُس کے پاس فورمین کی حیثیت سے ملازم تھا۔ وہ اپنے بیٹے ڈیوڈ کو لے کر امریکہ سے یہاں آیا تھا۔ لاتعداد لوگوں کی طرح اس نے بھی یہ سفر ہیروں ہی کی تلاش میں اختیار کیا تھا۔ جب وہ اپنی کوششوں میں ناکام ہو گیا اور تمام رقم بھی خرچ ہو گئی تو زندہ رہنے کے لیے اس نے ملازمت تلاش کی۔ جمی نے اُسے اپنی ایک کان کے نگراں کی حیثیت سے ملازمت دے دی۔ ایک دن کسی ضرورت کے تحت اس کا بیٹا بھی کام پر گیا۔ جمی نے اُس کو دیکھا اور اس کے کام سے اتنا متاثر ہوا کہ اُسے کمپنی میں مستقل کام کی پیش کش کر دی۔ وہ بہت ذہین، سمجھدار اور قابلِ نوجوان تھا۔ اس نے جلد ہی خود کو اس اعتماد کا اہل ثابت کر دیا جو اُس پر کیا گیا تھا۔ جمی یہ بھی جانتا تھا کہ ڈیوڈ پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ راز کو راز رکھ سکتا تھا کیونکہ وہ پیٹ کا ہلکا نہ تھا۔ اس لیے جمی نے اسے اپنے نجی معاملات میں بھی اعتماد میں لینا شروع کر دیا تھا۔
"ڈیوڈ! تم جمی کی سرائے پر جاؤ، وہاں مارگریٹ نام کی ایک عورت رہتی ہے؛"
اگر ڈیوڈ مارگریٹ کی ذات سے وابستہ واقعات اور حالات سے واقف تھا تو اس نے اس کا ذرا سا بھی اشارہ نہ دیا صرف اتنا کہا۔
"بہت بہتر جناب!"
"وہاں تمہیں صرف مارگریٹ سے گفتگو کرنا ہے۔ وہ اپنے بچّے کو میری خادمہ کے سپرد کر گئی ہے۔ اس سے کہنا کہ وہ اپنا بچّہ یہاں سے لے جائے۔ یہ میرا حکم ہے۔ آج ہی اپنے بچّے کو یہاں سے لے جائے؛"
"بہت بہتر جناب!"
آدھے گھنٹے بعد ڈیوڈ واپس آ گیا۔ جمی نے فوراً اس سے دریافت کیا؛ "کیا رہا؟ بات ہوئی اس سے؟"
"جناب مجھے افسوس ہے میں آپ کے احکام کی تعمیل نہ کر سکا؛"
جمی جھٹکے کے ساتھ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور غصے سے بولا؛ "کیوں؟ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا؛"
"مس مارگریٹ وہاں نہیں تھیں؛" ڈیوڈ نے بتایا۔
"تو پھر جاؤ، اُسے تلاش کرو؛"
"دو دن پہلے وہ یہاں سے جا چکی ہیں۔ پانچ دن بعد واپس آئیں گی۔ آپ کہیں تو میں مزید معلومات کروں؟"
"نہیں کوئی ضرورت نہیں؛" جمی نے جواب دیا۔

ڈیوڈ اس کے کمرے سے چلا گیا تو وہ پھر جھلاہٹ میں مبتلا ہو گیا "میں اس عورت کو وہ سبق دوں گا کہ یاد رکھے گی۔ واپس آنے دو اُسے۔ اپنے بچے کو اسے واپس لے جانا ہوگا۔ وہ اسے میرے سر نہیں منڈھ سکتی۔"

اس شام جمی کھانا کھا کر مطالعے کے کمرے میں کافی پی رہا تھا کہ جینا امور خانہ داری سے متعلق اس سے بعض مسائل پر بات کرنے آئی۔ وہ گفتگو کر رہی تھی کہ بات ادھوری چھوڑ کر اُس نے کہا "معاف کیجیے جناب! ننھا جمی رو رہا ہے۔ میں ذرا اُسے دیکھ آؤں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلی گئی۔

جمی پھر جھلاہٹ میں مبتلا ہو گیا۔ وہ غصے اور نفرت سے بڑبڑایا "بچہ، بچہ، بچہ۔ میں اس سے تنگ آگیا ہوں اور اُس کی جرأت دیکھو۔ اس نے بچے کا نام جمی رکھا ہے۔ اس عورت کے پاس غیرت نام کی کوئی شے نہیں ہے۔"

دس منٹ بعد جینا واپس آگئی۔ جمی اُسے دیکھتے ہی بپھر گیا۔ آگ بگولہ ہو کر بولا "تم یہاں اس لونڈے کی خدمت کے لیے ملازم نہیں ہو جینا! آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا۔"

"بہت بہتر جناب۔ اور کوئی خدمت؟"

"بس یہی کہنا تھا مجھے۔ اب تم جا سکتی ہو۔" جمی نے خشک لہجے میں کہا

وہ جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ جمی نے اُسے پکارا "اور سنو۔"

جینا رک گئی پھر پلٹ کر بولی "فرمایئے۔"

"تم کہہ رہی تھیں کہ وہ رو رہا ہے۔ بیمار تو نہیں ہے؟"

"جی نہیں۔ گیلا ہو گیا تھا نیپکن بدلنا تھا۔"

جمی کو ابکائی سی آگئی اور وہ برا سا منہ بنا کر بولا "بس یہی پوچھنا تھا۔"

اگر جمی کو یہ معلوم ہو جاتا کہ اس کی عدم موجودگی میں اس کے ملازم گھنٹوں اس کے اور نوزائیدہ کے بارے گفتگو کرتے رہتے ہیں تو وہ اتنا برہم ہوتا کہ وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ سب اس بات پر متفق تھے کہ ان کا آقا اس معاملے میں نہایت غلط رویہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ مگر اتنا وہ بھی جانتے تھے کہ اس مسئلے پر انہوں نے لب کشائی کی تو ان کو فوراً ملازمت سے نکال دیا جائے گا۔ جمی اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

یہ اگلے دن کی بات ہے۔ جمی دیر گئے تک ایک کاروباری اجلاس میں مصروف رہا۔ اس نے ایک نئی ریلوے لائن میں سرمایہ کاری کی تھی۔ اس ریلوے لائن کی بدولت ان کا رابطہ کیپ ٹاؤن اور دوسرے دو تین بڑے شہروں سے ہو گیا تھا۔ اس ریلوے لائن کی وجہ سے اب جمی بہت سستے داموں اپنے ہیرے اور سونا کیپ ٹاؤن منتقل کر سکتا تھا۔ یہ ابھی ابتدا تھی۔ اس کے بعد جمی کا منصوبہ تھا کہ وہ بحری جہاز خریدے گا جو اس کی معدنیات کو سمندر پار پہنچا سکتے تھے۔

نصف شب کے بعد وہ گھر پہنچا اور کپڑے بدل کر لیٹ گیا۔ ابھی اس کی آنکھ لگنے بھی نہ پائی تھی۔ وہ غنودگی میں تھا کہ اس کے کان میں بچے کے رونے کی آواز پڑی۔ جمی اٹھ بیٹھا۔ بچہ روئے جا رہا تھا۔ اگرچہ آواز بہت دھیمی تھی لیکن بہرحال اس کی خواب گاہ تک یہ آواز پہنچ رہی تھی۔ شاید بچہ اپنے پالنے سے گر گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جینا بہت گہری نیند سوتی تھی۔ جمی نہیں چاہتا تھا کہ جب تک بچہ اس کے گھر میں رہے اور اسے کوئی گزند پہنچے۔ اگر ایسا ہوتا تو لوگ اسی کو ذمے دار ٹھہراتے۔ یہ سوچ کر جمی کو پھر مارگریٹ کی اس حرکت پر غصہ آگیا۔ گاؤن پہنا، پیروں میں سلیپر ڈالے اور اپنی خواب گاہ سے نکل کر جینا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اُس نے آہٹ لی۔ کمرے سے اب کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ اُس نے آہستہ سے دروازہ کو کھولا۔ جینا کمبل میں گٹھری بنی پڑی تھی اور زوردار خراٹے لے رہی تھی۔

جمی آہستہ آہستہ پالنے کی طرف بڑھ گیا۔ بچہ چت لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ جمی نے قریب جا کر بچے کو غور سے دیکھا۔ وہ واقعی اسی کا بیٹا تھا۔ بے حد شباہت آئی تھی اس میں اپنے باپ کی۔ منہ اور ٹھوڑی تو بالکل اپنے باپ پر تھے۔ بچے نے اپنے باپ کو دیکھ کر جیسے خوشی کے اظہار میں ہاتھ پیر چلائے اور غوں غاں کرنے لگا۔ اس کے چہرے پہ ایک مسکراہٹ بھی بکھر گئی۔

"میرا بیٹا ہے نا۔ اسی لیے خاموشی سے پڑا ہے ورنہ اس عمر کے بچے تو رو رو کر ہلکان ہو جاتے ہیں۔" جمی نے سوچا۔

جمی نے کسی اندرونی جذبے کے تحت اپنی انگلی بچے کی طرف بڑھا دی جسے بچے نے دونوں ہاتھوں سے سختی کے ساتھ پکڑ لیا۔ اسی لمحے بچے کے چہرے پر ناگواری کے آثار پھیل گئے اور عجیب سی بو پھیل گئی۔

"جینا!" جمی نے آواز دی۔

جینا ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی اور دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملتے ہوئے بولی " جی جی کیا بات ہے جناب ؟"
" اس بچے کو دیکھو۔ کیا اب اس گھر میں سب کام مجھی کو کرنے ہوں گے ؟"
یہ کہہ کر وہ تیز قدم اٹھاتا کمرے سے باہر چلا گیا۔

✿

" ڈیوڈ، تم بچوں کے بارے میں کچھ جانتے ہو ؟"
" کس بارے میں جناب ؟"
" یہی کہ وہ کس قسم کے کھلونے پسند کرتے ہیں ؟"
" میرا خیال ہے جناب، شیر خوار بچے جھنجھنوں سے بہت خوش ہوتے ہیں " ڈیوڈ نے جواب دیا۔
" ایک درجن اچھے قسم کے جھنجھنے خرید لاؤ " جمی نے حکم دیا۔
" بہت بہتر جناب "

ڈیوڈ نے اس سلسلے میں کوئی اور سوال نہ کیا۔ جمی کو اس کی یہ عادت بہت پسند تھی۔ وہ غیر ضروری سوالات نہیں کرتا تھا۔ بس اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ یہ اس کی کامیابی کی دلیل تھی۔ وہ بہت ترقی کر سکتا تھا۔

اس شام جمی جب گھر آیا تو اس کی بغل میں خاکی رنگ کا ایک پیکٹ تھا۔ جینا نے چھوٹتے ہی اس سے کہا " جناب! میں معافی چاہتی ہوں۔ رات نہ معلوم کیسے میری آنکھ لگ گئی تھی۔ بچے نے شاید بہت ہی شور مچایا ہوگا جو آپ کو اپنے کمرے سے اٹھ کر آنا پڑا " اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

" کوئی بات نہیں۔ تم نے نہیں تو میں نے اس کی آواز سن لی " اس نے خاکی پیکٹ جینا کو دے کے کہا " یہ میں بچے کے لیے لایا ہوں جھنجھنے ہیں اس کے کھیلنے کے لیے۔ دن بھر پالنے میں لیٹا رہتا ہے۔ ان سے خوش رہے گا۔ بے چارہ قید ہو کر رہ گیا ہے "
" نہیں جناب! میں اسے سیر کراتی ہوں۔ باہر لے جاتی ہوں "
" کل رات مجھے ایسا لگا تھا جیسے اس کی طبیعت خراب ہو " جمی نے کہا۔
" مگر مجھے تو ایسی بات محسوس نہیں ہوئی جناب " جینا نے کہا۔
" حیرت ہے۔ مجھے اس کا رنگ پھیکا پھیکا لگ رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ اپنی ماں کے آنے سے قبل وہ میرے گھر میں بیمار ہو جائے اور اسے شکایت ہو کہ ہم نے اس کے بچے کا خیال نہیں رکھا " جمی سرد لہجے میں بولا۔
" میری کوشش یہی ہے جناب کہ مس مارگریٹ کو ان کی امانت اسی طرح واپس کر دوں جیسی وہ دے کر گئی تھیں " جینا گڑبڑا کر بولی۔

" میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ اس بچے کو یہاں لے کر آؤ۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں "
" ابھی لائی جناب! " جینا نے دروازے کی طرف لپکتے ہوئے پرجوش لہجے میں کہا۔
وہ چند ہی لمحوں بعد ننھے جمی کو گود میں اٹھا کر لے آئی۔ بچے کے ہاتھ میں ایک نیلا جھنجھنا تھا۔ وہ بچے کو جمی کی طرف بڑھا کر بولی۔
" یہ دیکھیے جناب! مجھے تو یہ بالکل ٹھیک دکھائی دیتا ہے "
" ہو سکتا ہے مجھے ہی غلط فہمی ہوئی ہو۔ لاؤ اسے مجھے دو " وہ قدرے بے تابی سے بولا۔
جینا نے بچے کو نہایت احتیاط کے ساتھ جمی کو دے دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنے بیٹے کو گود میں لیا تھا۔ ایک عجیب سا احساس اس کے رگ و پے میں دوڑ گیا۔ یہ بچہ جسے اس نے گود میں اٹھا رکھا تھا۔ اس کا اپنا خون تھا۔ اب پہلی مرتبہ اس نے سوچا کہ آخر اس کی تمام کوششوں کا مقصد کیا ہے۔ وہ جو اتنا بڑا کاروبار پھیلا رہا ہے، دنیا جہاں کی دولت سمیٹ رہا ہے۔ آخر اس کا مقصد کیا ہے — کیوں اتنی محنت ہو رہی ہے! اگر وہ اس دولت کو اپنے کاروبار کو کسی وارث کے نام منتقل نہیں کرنا چاہتا تو پھر یہ تگ و دو کیوں۔
اور اپنے خیالات کے دوران یہ بات بھی اسے معلوم ہو گئی کہ اس کی زندگی میں کس چیز کی کمی تھی۔ کیوں وہ خود کو کھوکھلا محسوس کرتا تھا۔ کیوں اسے اپنی کامیابیوں پر خوشی نہیں ہوتی تھی۔ میں بھی کیا احمق ہوں۔ نفرتوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ اس نے بچے کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ اور اس کے دل میں بیٹھی ہوئی سختی اور سخت گیری جیسے پگھلتی چلی گئی۔
" جینا! جمی کا پالنا میرے کمرے میں ڈال دینا " اس نے فیصلہ سنا دیا۔

تین دن بعد جب مارگریٹ جمی کے گھر پہنچی تو جینا نے اُسے بتایا: "صاحب اپنے آفس جا چکے ہیں مس مارگریٹ! انہوں نے کہا تھا کہ اگر آپ بچے کو لینے آئیں تو آپ کو دفتر بھیج دیا جائے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر جمی کا انتظار کرنے لگی۔ ننھے جمی کو گود میں لے کر اس کے وجود میں جیسے ٹھنڈک پڑ گئی تھی۔ ان سات دنوں میں بچہ اُسے بہت یاد آیا تھا۔ کئی مرتبہ تو اس کا جی چاہا کہ وہ واپس جائے اور اپنے بیٹے کو گلے سے لگا لے۔ لیکن ہر مرتبہ اُس نے اپنی اس خواہش پر بمشکل قابو پا لیا۔ مگر اب وہ خوش تھی۔ اس کی ترکیب کارگر ہوئی تھی۔ جمی اُس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اب سارے معاملات ٹھیک ہونے والے تھے۔ پتھر میں جونک لگ گئی تھی۔

جس لمحے جمی کمرے میں داخل ہوا وہ جذبات میں بری طرح مغلوب ہوگئی۔ وہ واقعی جمی سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی۔ اس کی رگ رگ میں اس پتھردل شخص کا پیار رچا ہوا تھا۔ جمی کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ اس نے سرد لہجے میں مارگریٹ کی خیریت دریافت کی اور تمکنت سے صوفے میں بیٹھ گیا۔

وہ مسکرا کر رہ گئی۔ جمی کو دیکھتے ہی تمام جملے اس کے ذہن میں گڈمڈ ہوگئے اور وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

"مجھے اپنا بیٹا چاہیے۔" وہ بدستور خشک لہجے میں بولا۔

"میں جانتی ہوں۔ مجھے شروع ہی سے یقین تھا کہ بچے کی محبت تمہیں پگھلا دے گی۔"

"میں چاہتا ہوں کہ اس کی پرورش نہایت عمدہ طریقے پر ہو۔ میں اُس کی بہترین پرورش کر سکتا ہوں۔ یہاں اسے ہر قسم کا آرام حاصل ہوگا اور میری کوشش یہ بھی ہوگی کہ تمہاری ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں۔"

"مم... میں سمجھ نہیں سکی۔" مارگریٹ نے کہا۔

"میں نے بتایا نا کہ مجھے اپنا بیٹا چاہیے۔ بس میں یہی کچھ چاہتا ہوں۔"

"میں سمجھی تھی کہ تم اور میں..."

"نہیں مجھے صرف اپنا بیٹا چاہیے۔" جمی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

مارگریٹ تلملا کر رہ گئی اور زہریلے لہجے میں بولی "میں تمہارا مطلب سمجھ چکی ہوں۔ لیکن میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گی۔ تم میرا بچہ مجھ سے نہیں چھین سکتے۔"

"ٹھیک ہے، ہم اس مسئلے کو یوں حل کر سکتے ہیں کہ تم یہاں اس کی آیا کی حیثیت سے رہ سکتی ہو۔ اب بتاؤ کیا کہتی ہو۔ میں اس معاملے کو سنجیدگی سے طے کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں اپنے بچے کا تشخص چاہتی ہوں۔" مارگریٹ نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "میں تمہارے اور اس کے رشتے کو قانونی بنانا چاہتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں اسے متبنّیٰ کر لوں گا۔"

"میرے بچے کو متبنّیٰ کرو گے؟ نہیں مسٹر جمی، مجھے یہ منظور نہیں۔ میں اس طرح تمہیں اپنا بچہ نہیں دے سکتی۔ مجھے دکھ ہوتا ہے تم پر عظیم جمی صاحب۔ تم اتنے بڑے آدمی ہو، اتنے دولت مند ہو لیکن تم اتنے ہی گھٹیا انسان بھی ہو۔ تم پر میں بس رحم کھا سکتی ہوں۔"

جمی کچھ بھی جواب نہ دے سکا۔ اُس نے اپنے بچے کو سینے سے لگایا اور وہاں سے چلی گئی۔ وہ دیکھتا رہا۔ مارگریٹ نے ایک مرتبہ بھی پلٹ کر اس کی طرف نہ دیکھا۔ جمی کی کیفیت ہارے ہوئے جواری کی سی ہو رہی تھی۔

مارگریٹ کا منصوبہ کارگر ثابت نہیں ہوا تھا۔ اب یہاں رہنے سے حاصل بھی کیا تھا۔ وہ اس پتھردل انسان کو تسخیر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ اب یہاں رہنا بالکل بے کار تھا۔

اگلے دن مارگریٹ نے امریکہ روانہ ہونے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

"مگر بیٹی! اس طرح فرار ہونے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔" ممی نے اُسے سمجھایا۔

"میں بھاگ نہیں رہی ہوں۔ میں کسی ایسی نئی جگہ جا کر رہنا چاہتی ہوں جہاں میں اپنے بچے کے ساتھ نئی زندگی شروع کر سکوں۔" اُس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ وہ اب جمی کے ہاتھوں اپنی مزید تذلیل برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

"تم کب روانہ ہوگی؟" ممی نے پوچھا۔

"جلد از جلد۔ میں ہر وہ ذریعہ اختیار کروں گی جس سے میں کم سے کم وقت میں اس علاقے سے نکل سکوں۔ سفر کے اخراجات کے لئے میں نے خاصی رقم پس انداز کر لی ہے۔ میں نیویارک جانا چاہتی ہوں۔"

"یہ تو بہت طویل سفر ہے بیٹی!" ممی نے فکر مندی سے کہا۔

"میں جانتی ہوں لیکن اس کے بدلے مجھے نئی زندگی تو مل جائے گی۔ مایوسی اور نامرادی سے تو نجات ملے گی۔"

جمی کو خود پر بڑا ناز تھا کیونکہ وہ شدید دباؤ میں بھی نہایت پرسکون رہتا تھا۔ کیسے ہی مسائل اُسے درپیش ہوں۔ اس نے گھبرانا تو سیکھا ہی نہ تھا۔ مشکلات پر حاوی آنا۔ ان پر قابو پانا، یہی اُس کی زندگی تھی۔ لیکن مارگریٹ نے جو زک اُسے دی تھی۔ وہ اتنی شدید تھی کہ اس کا صدمہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اب وہ ذرا ذرا سی بات پر برہم ہو جاتا۔ جو بھی سامنے آتا۔ اس کی کم بختی آجاتی بات بے بات وہ اپنے ملازمین کو لتاڑ دیتا۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہر وقت وہ چیختا ہی رہتا۔ تین راتیں جاگتے ہوئے گزر گئی تھیں۔ مارگریٹ سے اس کی جو گفتگو ہوئی تھی۔ وہ اب بھی اس کے ذہن کو پراگندہ کیے ہوئی تھی۔

وہ اس کی روح کا ناسور بن گئی تھی۔ وہ سوچتا کہ مارگریٹ بھی اپنے باپ کی طرح چالاک اور عیار ہے۔ وہ اس بچے کے سہارے اُسے شادی پر مجبور کر دینا چاہتی تھی۔ کبھی وہ سوچتا کہ اس نے مارگریٹ سے گفتگو ہی غلط انداز میں کی تھی۔ اگر وہ اُسے کچھ رقم کی پیش کش کرتا تو شاید وہ مان جاتی۔ مگر کتنی رقم؟ ایک ہزار پونڈ۔ دس ہزار پونڈ، شاید اس سے بھی زیادہ۔ وہ انتہائی لالچی اور حریص باپ کی بیٹی تھی معاملہ لاکھوں تک بھی لے جا سکتی تھی۔

تب اُس نے ڈیوڈ کو طلب کیا۔ "میں ایک نہایت نازک کام تمہیں سونپنا چاہتا ہوں۔"

"فرمایئے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تم جا کر مس مارگریٹ سے بات کرو۔ اس سے کہو کہ میں اُسے بیس ہزار پونڈ دینے کے لیے تیار ہوں۔ وہ جان جائے گی کہ اس رقم کے عوض میں اُس سے کیا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر جمی نے بیس ہزار کا چیک لکھ کر ڈیوڈ کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ اُسے دے دینا۔"

"بہت بہتر جناب۔" ڈیوڈ چلا گیا۔

پندرہ منٹ بعد ہی وہ واپس آگیا۔ اُس نے چیک جمی کو واپس کر دیا۔ مارگریٹ نے چیک کے تین ٹکڑے کر دیئے تھے۔ یہ دیکھ کر جمی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے بمشکل خود پر قابو پایا اور ڈیوڈ کو رخصت کر دیا۔

"اس کا مطلب ہے وہ حرافہ اس سے بھی زیادہ رقم چاہتی ہے۔ ٹھیک ہے میں اُسے اس سے بھی زیادہ رقم دوں گا۔ میں دیکھوں گا کہ وہ کتنے دام لگاتی ہے مگر اس مرتبہ میں خود اس سے بات کروں گا۔ میں اس معاملے کو نمٹا کر رہوں گا۔"

اس سہ پہر وہ ممی کی سرائے پہنچا اور چھوٹتے ہی بولا۔ "میں مارگریٹ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ آپ اس سے نہیں مل سکتے۔ وہ امریکہ روانہ ہو چکی ہے۔"

جمی کو یوں لگا جیسے کسی نے بڑے زور سے اس کو آسمان کی بلندیوں سے پاتال میں پھینک دیا ہو وہ چلا کر بولا۔ "یہ نہیں ہو سکتا! وہ کب روانہ ہوئی؟"

"وہ اپنے بچے کے ساتھ دوپہر کی بگھی سے ورسٹر روانہ ہوئی ہے۔"

٭

ورسٹر اسٹیشن پر، کیپ ٹاؤن جانے والی ٹرین مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ہر شخص شور مچا رہا تھا جس کی وجہ سے ماحول میں ایک بھنبھناہٹ سی پھیل گئی تھی۔ مسافروں میں ہر قوم اور ہر پیشے کے کامیاب اور ناکام لوگ موجود تھے۔ بہت سے ایسے تھے جو زندگی میں پہلی مرتبہ ٹرین میں سوار ہو رہے تھے۔ مارگریٹ کو کھڑکی کے ساتھ والی نشست ملی تھی۔ وہ جمی کو سینے سے لگائے دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھی تھی اسے اپنے آس پاس کے ماحول سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں، نئی زندگی کے بارے میں سوچ رہی تھی جس کا کوئی واضح منصوبہ تک اس کے ذہن میں نہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ دنیا کے جس کونے میں جائے گی بدنامی کا ایک داغ اس کے ساتھ رہے گا۔ وہ ایک کنواری ماں تھی۔ غیر شادی شدہ ہوتے ہوئے اس نے ایک بچے کو جنم دیا تھا۔ یہ ہر مہذب معاشرے میں سنگین جرم تھا۔ اسے اپنی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ تو بس اپنے بیٹے کو دنیا میں ایک اچھی زندگی گزارنے کے قابل بنانا چاہتی تھی۔ ننھا جمی اس کی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز تھا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو وہ کب کی خودکشی کر چکی ہوتی۔ اس ننھی سی جان نے اُسے اس بے رحم دنیا میں زندگی کا حوصلہ دیا تھا۔

اچانک اس نے گارڈ کے چیخنے کی آواز سنی۔ "سب لوگ بیٹھ جائیں۔ سب لوگ بیٹھ جائیں۔"

اس کا سفر شروع ہونے والا تھا۔ ایک ایسا سفر جس کی منزل کا تعین وہ اب تک نہیں کر سکی تھی۔
اس نے کھڑکی کے باہر دیکھا اور حیران رہ گئی۔ باہر جمی کھڑا تھا۔ "اپنی چیزیں سمیٹو۔" اس نے حکم دیا "تمہیں ٹرین سے اترنا ہے۔"
مارگریٹ کے ہونٹوں پر تضحیک کی لکیر ابھری۔ "ہونہہ یہ اب بھی سمجھتا ہے کہ مجھے خرید لے گا۔" اس نے سوچا اور پھر جمی سے تلخ لہجے میں بولی "اب تم کتنی رقم کی پیش کش لائے ہو سیٹھ؟"
جمی نے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ جو ماں کی گود میں گہری نیند سو رہا تھا۔ اس نے سر جھکا لیا اور دھیمی آواز میں بولا "میں تم سے شادی کی پیش کش لے کر آیا ہوں۔"
تین دن بعد ایک سادہ، مختصر اور نجی تقریب میں ان کی شادی ہو گئی۔ شادی کا واحد گواہ جمی کا نمک خوار اور قابلِ اعتماد ملازم ڈیوڈ تھا۔ جمی یہ شادی انتہائی مجبوری کے عالم میں کر رہا تھا لہٰذا اس نے دھوم دھڑکا نہیں کیا تھا۔
شادی کی رسوم کے دوران جمی کا ذہن مختلف خیالات اور جذبات میں الجھا ہوا تھا۔ وہ ایسا شخص تھا جس نے اپنی زندگی اور اپنی دنیا خود تعمیر کی تھی۔ وہ لوگوں سے اپنی مرضی کے مطابق کام لیتا تھا۔ لیکن اس مرتبہ ایک عورت نے اُسے اپنی مرضی اور اپنی شرائط کا مطیع بنایا تھا۔ پہلی بار اسے ہزیمت ہوئی تھی۔ اس نے اپنے برابر کھڑی ہوئی مارگریٹ کو دیکھا۔ وہ اس وقت بھی خوبصورت لگ رہی تھی۔ اُسے یاد آیا کہ یہ عورت کبھی اس سے کتنی گرم جوشی کے ساتھ پیش آتی تھی لیکن یہ سب ماضی کی باتیں تھیں۔ حال کا ان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ اس کے لیے صرف اپنے ایک دشمن سے انتقام لینے کا وسیلہ تھی۔ اس کے باوجود اس نے جمی کے وارث کو جنم دیا تھا۔
جب وہ گھر واپس آئے تو جمی نے اُسے ایک کمرہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہاری خواب گاہ ہے۔"
"ٹھیک ہے۔ میں خود بھی الگ تھلگ رہنا چاہتی ہوں۔" مارگریٹ نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔
"میں ایک اور ملازمہ رکھ کر جینا کو ننھے جمی کی دیکھ بھال پر مامور کر دوں گا۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو ڈیوڈ کو بتا دیا کرنا۔ وہ انتظام کر دے گا۔ کاروبار کے سلسلے میں میں بے حد مصروف ہوں۔ از راہِ کرم مجھ سے کم سے کم بات کرنے کی کوشش کرنا۔"
مارگریٹ جانتی تھی کہ وہ اب اُسے سزا دے گا، ستائے گا۔ اس سے خادموں جیسا سلوک کرے گا۔ لیکن اُسے ان باتوں سے کوئی غرض نہ تھی۔ اُسے تو خوشی اس بات کی تھی کہ اس کے بیٹے کو اس کا تشخص مل گیا ہے۔ تحفظ مل گیا ہے۔ اس کا باپ مل گیا ہے۔
جمی رات کے کھانے پر بھی نہیں پلٹا۔ وہ دیر تک اس کا انتظار کرتی رہی اور پھر تنہا ہی کھانا کھا لیا۔ رات بھر وہ بستر پر لیٹی کروٹیں بدلتی رہی۔ جاگتی رہی۔ وہ گھر میں ایک ایک آہٹ پر کان لگائے ہوئے تھی۔ صبح چار بجے کے قریب۔ اس کی آنکھ لگ گئی۔ سوتے وقت وہ صرف یہی سوچ رہی تھی کہ آخر مادام کی لڑکیوں میں سے اُس نے کسے پسند کیا ہے؟ کسی کو اپنی داشتہ بنایا ہے؟
مارگریٹ اور جمی کے تعلقات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی لیکن شہر کی فضا اس کے لیے بالکل ہی تبدیل ہو کر رہ گئی تھی۔ چند دن پہلے تک وہ اس شہر میں اچھوت بنی ہوئی تھی۔ اس سے کوئی شخص بات کرنا پسند نہ کرتا تھا۔ اب وہ شہر کی مرکزی سماجی شخصیت بن گئی تھی۔ اس شہر میں آباد بیشتر لوگ کسی نہ کسی طور پر اپنی زندگی جمی کی کمپنی کے سہارے گزار رہے تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے یہی سوچا کہ اگر وہ جمی کو قبول ہے تو انہیں اُسے تسلیم کرنے میں کیا عار ہو سکتا ہے۔ اب وہ سیر کے لیے باہر نکلتی تو لوگ مسکرا کر، احترام کے ساتھ اس کا استقبال کرتے۔ اس کے نام دعوت نامے آتے۔ وہ شہری کمیٹی کی سربراہ بھی بن گئی تھی۔ سماجی بہبود کی دو تین انجمنوں نے اسے اپنا سرپرست بنا دیا تھا۔ مارگریٹ اپنے بالوں کو نئے اسٹائل سے سنوارتی۔ شہر کی عورتیں بھی وہی اسٹائل اپنا لیتیں۔ اس نے اپنے لیے زرد لباس خریدا تو شہر کی خواتین میں زرد لباس مقبول ہو گیا۔ وہ پہلے ان لوگوں کی طنزیہ باتوں کے نشتر برداشت کرتی رہی تھی۔ اب ان لوگوں کی ان عنایات کو ایک باوقار سنجیدگی کے ساتھ تسلیم کرتی تھی۔
جمی گھر صرف اپنے بیٹے کو دیکھنے، اس سے کھیلنے، اُسے کھلانے کے لیے آتا۔ مارگریٹ سے اُسے کوئی تعلق نہ تھا۔ البتہ اس کے رویے میں نرمی ضرور آ گئی تھی۔ ہر روز صبح وہ ناشتے کی میز پر ایک خوش و خرم بیوی کا کردار ادا کرتی تاکہ ملازمین کو یہ نہ پتا چل سکے کہ وہ اندر سے کتنی دکھی ہے۔ کتنی ناخوش ہے۔ اس دوران بھی جمی بہت خاموش، الگ تھلگ سا اس کے سامنے میز کے دوسرے کنارے پر بیٹھا رہتا۔ اور جب وہ دفتر چلا جاتا تو مارگریٹ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ اپنی ذات کی حد تک وہ بہت ناخوش تھی۔ لیکن اپنے بیٹے کی وجہ سے وہ بہت مسرور تھی۔ وہ کامیاب بھی اور ناکام بھی۔
اس کے لیے سب سے بڑا آزار جمی سے اس کی محبت تھی۔ وہ آج بھی اُس شخص سے بے پناہ محبت کرتی تھی جس نے اس کی زندگی سے حقیقی مسرتیں چرائی تھیں۔ وہ بہار تھی، وہ خزاں تھی۔ مختلف اور متضاد احساسات کی چکی میں اس کا وجود ذرہ

ذرہ ہو کر بکھر رہا تھا: میرے خدا، میری مدد کر" جب وہ بہت اداس ہوتی تو اس کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ ادا ہوتے۔

✡

جمی تین دن کے کاروباری دورے پر ان دنوں کیپ ٹاؤن میں تھا۔ وہ رائل ہوٹل سے باہر آیا تو ایک سیاہ فام گاڑی بان نے اس سے کہا "گاڑی چاہیے جناب؟"

"نہیں۔ میں پیدل سیر کرنا چاہتا ہوں"

"باندا کا خیال تھا کہ آپ گاڑی میں سیر کریں گے"

جمی چونک گیا۔ اس نے غور سے اُس سیاہ فام کو دیکھا اور خوشی سے چلایا "باندا! میرا دوست! کہاں ہے وہ!"

"جی ہاں جناب! آپ کا دوست، بلکہ آپ کا خادم۔ باندا آپ سے ملنا چاہتا ہے"

جمی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے چابک مارا اور گاڑی چل پڑی۔ جمی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اور باندا کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ بڑا جرائت مند تھا، دوستوں کا دوست تھا۔ جمی نے گزشتہ دو برس کے دوران اسے تلاش کرنے کی بے حد کوشش کی تھی۔ لیکن اُسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ لیکن آج، اس وقت وہ اپنے اسی دوست سے ملنے جا رہا تھا۔

ڈرائیور نے گاڑی کا رُخ دریا کی سمت موڑ دیا۔ جمی سمجھ گیا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ پندرہ منٹ بعد گاڑی بندرگاہ کے نزدیک اسی گودام کے پاس رک گئی تھی جہاں اس نے باندا کے ساتھ مل کر ہیرے حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ہم بھی کیا... بے خطر لوگ تھے، احمقوں کی حد تک بے خطر۔ جمی نے سوچا اور گاڑی سے اتر کر گودام کی طرف بڑھ گیا۔

گودام میں باندا اُس کا منتظر تھا۔ وہ آج بھی ویسا ہی تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ آج اس کے جسم پر صاف ستھرا لباس تھا۔ اُس نے گلے میں ٹائی بھی باندھ رکھی تھی۔

دونوں دوست چند لمحے ایک دوسرے کو کھڑے دیکھتے رہے۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ جمی نے اس سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور بولا "تمہیں دیکھ کر خوشی ہوئی دوست۔ لگتا ہے ان دنوں آرام کی زندگی گزار رہے ہو"

"ہاں، بس خدا کا کرم ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ میں کچھ زمین خریدوں گا۔ بس میں نے ویسا ہی کیا۔ میں نے شادی بھی کر لی ہے۔ میرے دو بیٹے ہیں۔ میں گندم اگاتا ہوں اور شتر مرغ پالتا ہوں"

"شتر مرغ!" جمی نے حیرت سے کہا "شتر مرغ پالنے سے تمہیں کیا حاصل ہوتا ہے؟"

"ہاں اس کے پروں سے خاصی رقم مل جاتی ہے"

"اوہ۔ میں سمجھا۔ اپنے گھر والوں سے نہیں ملواؤ گے؟" یہ کہتے ہوئے جمی کو اپنے گھر والے یاد آ گئے جو اس سے ہزاروں میل دور تھے۔ جن سے اس کا ملنے کو بہت دل چاہتا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا "میں تم سے ملنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن تمہارا کوئی پتہ ہی نہ ملتا تھا"

"ہاں میں بہت مصروف رہا ہوں" باندا نے اُس کے قریب آ کر کہا "میں تم سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ میں تمہیں پہلے سے خبردار کر رہا ہوں۔ تمہارے لیے مشکلات پیدا ہونے والی ہیں"

"کیسی مشکلات؟" جمی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"نامب میں تم نے جس شخص کو انچارج بنایا ہے۔ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ وہاں کے مزدور اس سے نفرت کرتے ہیں۔ سپاہی ان دنوں واک آؤٹ کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو تمہارے محافظ انہیں روکیں گے اور بس پھر ہنگامے اور فساد شروع ہو جائیں گے" باندا نے رازدارانہ لہجے میں بتایا۔

اس دوران جمی غور سے اس کے چہرے کو تکتا رہا۔

وہ کہہ رہا تھا "یاد ہے۔ ایک مرتبہ میں نے تم سے ایک سیاہ فام سیاسی اور انقلابی لیڈر کا ذکر کیا تھا؟"

"ہاں۔ میں اس کے بارے میں خبریں پڑھتا رہا ہوں۔ وہ ہنگامہ آرائی پر تلا ہوا ہے" جمی نے کہا

"میں بھی اسی کا حامی ہوں" باندا نے بتایا "وہ ہمارا عظیم رہنما ہے۔ تمام کالے اس کے ایک اشارے پر اپنی جان قربان کر سکتے ہیں"

"میں سمجھ گیا۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا کروں گا۔" جمی نے وعدہ کیا۔

"میں بھی یہی چاہتا تھا جمی! مجھے خوشی ہے کہ تم بہت بااثر، امیر اور طاقت ور شخص ہو گئے ہو۔"

"شکریہ میرے دوست۔"

"اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تم ایک بچّے کے باپ بھی ہو گئے ہو۔"

جمی حیرت زدہ رہ گیا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں اپنے دوستوں کے حالات سے باخبر رہا کرتا ہوں جمی۔" بانڈا نے اپنی نشست سے کھڑے ہو کر کہا۔ "اچھا جمی، اب میں ایک میٹنگ میں جا رہا ہوں۔ میں ان لوگوں کو یقین دلا دوں گا کہ حالات درست ہو جائیں گے۔ اس ظالم شخص کی گوشمالی کر دی جائے گی۔"

"ہاں۔ میں یہ معاملہ خود دیکھوں گا۔" وہ طویل قامت حبشی کے ساتھ دروازے تک آیا۔ "اب تم سے کب ملاقات ہو گی؟"

"میں تمہارے آس پاس موجود رہوں گا۔ تم مجھ سے اتنی آسانی سے جان نہیں چھڑا سکتے۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

جمی نے واپس آتے ہی اپنے نوجوان معتمد ڈیوڈ کو طلب کیا اور اس سے براہِ راست سوال کیا۔ "کیا ہیروں کے میدان میں کچھ ہنگامہ ہے؟ مجھے وہاں گڑبڑ کی اطلاعات موصول ہوئی ہیں۔"

"جناب۔ ہمارے کارندوں کی جانب سے تو کسی گڑبڑ کی اطلاع نہیں ملی؟" ڈیوڈ نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں نے افواہیں ضرور سُنی ہیں کہ وہاں حالات بگڑتے جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان میں کوئی صداقت ہو۔"

"وہاں سام نامی ایک اکھڑ اور بد دماغ شخص سپروائزر ہے۔ معلوم کرو کہ کیا وہ مزدوروں سے بدسلوکی کرتا ہے۔ اگر واقعی وہ ایسا کر رہا ہے تو اس کو روک دو۔ میں نہیں چاہتا کہ مزدوروں میں بے چینی پھیلے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کل صبح ہی وہاں روانہ ہو جاؤ۔"

"بہت بہتر جناب! میں صبح ہی وہاں روانہ ہو جاؤں گا۔"

نامب پہنچ کر ڈیوڈ نے دو گھنٹے تک خاموشی کے ساتھ محافظوں اور مزدوروں سے گفتگو کی۔ جو کچھ اُسے معلوم ہوا۔ اسے سن کر وہ سخت طیش میں آگیا۔ جب وہ تمام معاملات سے آگاہ ہو گیا تو اس نے سپروائزر سے ملاقات کی۔

سام بہت لمبا چوڑا آدمی تھا۔ اس کا وزن تین سو پونڈ رہا ہوگا۔ قد ساڑھے چھ فٹ۔ چہرے پر درشتی۔ آنکھیں کبوتر کے خون کی طرح سرخ۔ نہایت بدصورت اور بھدا شخص تھا وہ۔ ڈیوڈ نے اس سے زیادہ بدصورت شخص اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ویسے اپنی جگہ یہ بات بھی درست تھی کہ وہ کمپنی کے بہترین سپروائزروں میں سے ایک تھا۔ جس وقت ڈیوڈ وہاں پہنچا وہ اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔

سام نے اٹھ کر ڈیوڈ سے ہاتھ ملایا اور مسکرا کے بولا۔ "آپ سے مل کر خوشی ہوئی جناب۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ مجھے اپنی آمد سے آگاہ کر دیتے۔ فرمائیے۔ کیا پئیں گے؟"

"شکریہ۔ مجھے کسی چیز کی طلب محسوس نہیں ہو رہی۔" ڈیوڈ نے جواب دیا۔ اسے یقین تھا کہ سام کو اس کی آمد کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔

"فرمائیے۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟ میرا خیال ہے کہ یہاں ہماری کارکردگی باس کی مرضی کے مطابق ہے۔" سام نے کہا۔ اس کے لہجے میں اطمینان کا عنصر غالب تھا۔

وہ دونوں اس بات سے واقف تھے کہ نامب میں ہیروں کی تلاش نہایت اچھی تھی۔ کارکردگی کے اعتبار سے وہ جگہ پہلے نمبر پر تھی۔ "بات یہ ہے جناب کہ میں اپنے مزدوروں سے پورا کام لیتا ہوں۔" سام نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن ہمیں بعض شکایات ملی ہیں کہ یہاں حالات کار ٹھیک نہیں ہیں۔"

"کس نوعیت کی شکایتیں ملی ہیں جناب؟"

"یہی کہ یہاں مزدوروں کے ساتھ سلوک اچھا نہیں کیا جاتا۔ ان پر بے پناہ تشدد کیا جاتا ہے۔"

سام یہ سنتے ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ وہ چلّا کر بولا۔ "مسٹر ڈیوڈ۔ میں جن لوگوں سے کام لیتا ہوں انہیں انسان کہنا، انسان سمجھنا انسانیت کی توہین ہے۔ آپ لوگوں کو کیا پتا۔ آپ ہیڈ کوارٹر میں بیٹھے کرسیاں توڑتے رہتے ہیں۔ سام کو تو انہیں لینا ہوتا ہے ان لوگوں سے۔ ہم جانتے ہیں ان لوگوں کی اصلیت۔ بڑے کمینہ خصلت اور ذلیل لوگ ہیں وہ۔"

مسٹر سام میری بات سنو"

"نہیں جناب پہلے آپ میری بات سنیں۔ آپ بھی جانتے ہوں گے کہ جتنے ہیرے یہاں سے نکلتے ہیں۔ کمپنی کی کسی کان سے اتنے ہیرے نہیں نکالے جاتے۔ آپ کو معلوم ہے ایسا کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے جناب کہ میں ان لوگوں سے کام لیتا ہوں۔ نہ میں خود حرام خور ہوں نہ ان کو حرام خوری کا موقع دیتا ہوں" وہ کہتا چلا گیا۔

"مسٹر سام ہم دوسری کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو ماہانہ ۹۵ شلنگ اجرت دے رہے ہیں اور آپ یہاں ان مزدوروں کو پچاس شلنگ اجرت دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ کام بھی زیادہ کرتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

"تو آپ کو اس بات کی شکایت ہے کہ میں نے کمپنی کے لیے سستے مزدور کیوں رکھے ہیں۔ ہاہاہا" وہ زور سے ہنسا۔

"باس کو یہ بات پسند نہیں۔ مزدوروں کی اجرت بڑھا دی جائے" ڈیوڈ نے کہا۔

سام نے فوراً جواب دیا "ٹھیک ہے۔ میری جیب سے کیا جاتا ہے"

"اور میں نے سنا ہے کہ یہاں مزدوروں کو ذرا ذراسی بات پر کوڑے بھی مارے جاتے ہیں؟"

"اب اگر تم لوگ ایسی شکایتوں پر کان دھرنے لگے تو لے لیا تم نے ان کالوں سے کام۔ جناب عالی، یہ سیاہ فام بہت موٹی کھال والے ہوتے ہیں۔ ان پر کتنے ہی کوڑے برساؤ کوئی اثر نہیں ہوتا" سام نے لاپروائی سے کہا

"شاید اسی وجہ سے تین مزدور کوڑے کھاتے ہوئے مر بھی گئے" ڈیوڈ نے کہا۔

"تو کیا ہوا۔ اس ملک میں مزدوروں کی کمی تو نہیں ہے"

ڈیوڈ کو یہ جواب سن کر اس شخص سے نفرت ہو گئی۔ وہ واقعی ایک بے رحم خونی درندہ تھا۔ اس نے سام کا سرتاپا جائزہ لیا اور بولا "تمہارے خیال میں کیا صحیح ہے کیا غلط۔ مجھے اس سے غرض نہیں، میں صرف یہ جانتا ہوں کہ اگر آئندہ اس قسم کی شکایات موصول ہوئیں تو تمہیں تبدیل کر دیا جائے گا" ڈیوڈ کرسی سے کھڑا ہو گیا "بہتر ہے کہ تم ان انسانوں سے انسانوں کا سا سلوک کرنا سیکھ لو۔ آئندہ سے سزاؤں کا سلسلہ فوری طور پر بند ہو جانا چاہیے۔ میں نے مزدوروں کے کوارٹر بھی دیکھے ہیں۔ بہت غلیظ ہیں وہ انہیں فوراً صاف کرانے کا انتظام کراؤ"

سام یہ ہدایات سن کر غصے میں کھول رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے خود پر قابو پا رکھا تھا "اور بھی کوئی ہدایت باقی رہ گئی ہو تو بتا دو" اس کا لہجہ بے حد سرد تھا۔

"میں تین ماہ بعد پھر یہاں آؤں گا۔ اس وقت اگر حالات کو میں نے اپنی مرضی اور ہدایات کے مطابق نہ پایا تو تم کسی اور کمپنی میں ملازمت کا انتظام کر لینا۔ اچھا خدا حافظ" ڈیوڈ نے آخری الفاظ کہے اور باہر نکل گیا۔

سام کافی دیر تک وہیں کھڑا خالی دروازے کو گھورتا رہا۔ مارے غصے کے اس کا جسم بری طرح کپکپا رہا تھا۔ ذلیل اور حقیر سیاہ فام کیڑوں کے مقابلے میں اس کی زبردست توہین کی گئی تھی۔ ان کالے شیطانوں کو اس بے ہودہ نوجوان نے انسان کہا تھا جبکہ وہ وحشی کسی اعتبار سے بھی انسان نہیں تھے۔ سیاہ فاموں سے نفرت اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ یہ نفرت اُسے وراثت میں ملی تھی اور کسی طور پر بھی دور نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے اجداد کا خیال تھا کہ جنوبی افریقہ اِن کی ملکیت ہے اور خدا نے سیاہ فام لوگوں کو اُنکی خدمت کے لیے پیدا کیا ہے۔

٭

کمپنی بڑھتی اور پھیلتی جا رہی تھی۔ کاروبار دن بہ دن وسعت اختیار کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی جمی کی مصروفیات بھی بڑھ رہی تھیں وہ زیادہ تر کاروباری دوروں پر ملک سے باہر رہنے لگا تھا۔ اس نے کینیڈا میں ایک کاغذ کا کارخانہ خریدا تھا۔ آسٹریلیا میں وہ ایک شپ یارڈ کا مالک تھا۔ جب وہ گھر پر ہوتا تو اپنا بیشتر وقت بیٹے کے ساتھ گزارتا۔ جوں جوں اس کی عمر بڑھ رہی تھی باپ سے اس مشابہت واضح ہوتی جا رہی تھی۔ بیٹے کو دیکھ کر اس کا سر فخر سے بلند ہو جاتا۔ اسے طمانیت کا احساس ہوتا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو دور دراز کے سفر پر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی ماں ہمیشہ آڑے آتی تھی۔ وہ بیٹے کی کم عمری کا رونا روتی اور اُسے مجبوراً اکیلے ہی سفر پر روانہ ہونا پڑتا۔ اس کے دلائل اتنے ٹھوس ہوتے تھے کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی بات ماننے پر مجبور ہوتا تھا۔ سو یوں وقت گزرتا رہا۔ اس کا بیٹا دو برس کا ہو گیا۔

یہ ۱۸۸۷ء کا پُر آشوب دور تھا۔ ہر چیز تبدیلی پذیر تھی۔ نت نئی تعمیرات زور شور سے ہو رہی تھیں۔

یہ دو برس اس طرح گزرے کہ مارگریٹ کو احساس تک نہ ہو سکا۔ ہفتے میں ایک مرتبہ جمی گھر پر مہمانوں کو مدعو کرتا۔ ایسے موقعوں پر وہ نہایت خوش اخلاقی سے میزبانی کے فرائض انجام دیتی۔ جمی کے مہمان اور دوستوں کے نزدیک مارگریٹ بہت ذہین خوش اخلاق اور خوش گفتار عورت تھی۔ لوگ اس سے گفتگو کر کے لطف اندوز ہوتے تھے۔ مارگریٹ یہ بھی جانتی تھی کہ ان میں سے بعض لوگ اس سے متاثر بھی تھے۔ اس کو خوبصورت بھی سمجھتے تھے لیکن ان میں سے کسی نے کبھی کوئی غیر محتاط لفظ منہ سے نہیں نکالا تھا۔ کیونکہ وہ جمی کی بیوی تھی۔ ایک کروڑپتی کی شریک حیات تھی۔ اور پھر جب آخری مہمان بھی واپس چلا جاتا تو مارگریٹ اس سے پوچھتی "پارٹی کیسی رہی؟"

"بہت عمدہ۔ انتظام اچھا تھا۔ شب خیر" اور یہ کہہ کر وہ چلا جاتا۔ اپنے بیٹے کو دیکھتا۔ دو چار جملے اس سے کہتا۔ چند منٹ بعد وہ باہر کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنتی۔ جمی گھر سے چلا جاتا۔ رات گئے واپس آنے کے لیے۔ وہ مادام کے بالاخانے کی کسی لڑکی کے ساتھ گل چھرے اڑا کر اس کے سینے پر مونگ دلتا تھا۔ اور مارگریٹ کی ہر رات اپنی زندگی کے بارے میں سوچتے ہوئے گزرتی وہ جانتی تھی کہ شہر کی عورتیں اس پر کتنا رشک کرتی ہیں۔ لیکن خود وہ کس آزار سے گزر رہی تھی۔ اُس سے کوئی واقف نہ تھا۔ اس کا شوہر اس سے کسی اجنبی کا سا سلوک کرتا تھا۔

۱۸۹۰ء تک کلپ بہت تبدیل ہو چکا تھا۔ اس شہر میں جمی کو رہتے ہوئے سات برس گزر گئے تھے۔ اس عرصے میں یہ شہر بہت ترقی کر چکا تھا۔ لوگ اب بھی دنیا بھر سے کھنچ کر یہاں آتے تھے۔ ان سب کی وہی پرانی اور ایک کہانی ہوتی۔ یہ لوگ پیدل گھوڑا گاڑیوں میں اور ٹرین میں یہاں آتے۔ ان کے جسم پر چیتھڑے جھول رہے ہوتے۔ ان لوگوں کو خوراک، سامان، سر چھپانے کی جگہ اور ابتدائی اخراجات پورے کرنے کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی۔ جمی ان سب کی مدد کرتا۔ وہ اب ایک درجن کے قریب سونے اور ہیرے کی کانوں میں حصے دار تھا۔ اس کے نام اور ساکھ کا شہرہ ہر طرف پھیل گیا تھا۔ ایک دن جمی اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ جنوبی افریقہ کی سب سے بڑی کمپنی بیئرز کا وکیل اس سے ملاقات کے لیے آیا۔

"فرمائیے۔ کیسے آنا ہوا؟" جمی نے پوچھا۔

"جناب جنوبی افریقہ میں آپ کی مالی حیثیت اور ساکھ بے مثال ہے۔ ہم بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر بیئرز کمپنی کو فروخت کر رہے ہیں اور آپ سے بہتر گاہک ہماری نظر میں اور کوئی نہیں ہے۔ ہم اپنے تمام کاروبار آپ کو فروخت کرنا چاہتے ہیں اور میں اسی سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔ کیا آپ بیئرز کمپنی خریدنے میں دلچسپی رکھتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔ میں کوئی بھی منافع بخش سودا ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔" جمی نے مسکرا کے کہا۔

"اچھی بات ہے۔ آئیے تفصیلات طے کیے لیتے ہیں۔" یہ کہہ کر بیئرز کمپنی کے نمائندے نے بھاری بھرکم بیگ سے کاغذات نکال لیے۔

ایک گھنٹے بعد بیئرز کمپنی کا نمائندہ مطمئن جمی کے دفتر سے رخصت ہوا۔ پہلی ہی ملاقات میں سودا طے ہو گیا تھا۔

جیسے جیسے جمی کا کاروبار پھیل رہا تھا۔ ڈیوڈ جمی کے لیے دن بہ دن زیادہ اہمیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ ڈیوڈ میں اسے وہی خصوصیات نظر آئی تھیں جو اس میں نوجوانی کے دنوں میں تھیں۔ وہ ایماندار تھا۔ دیانتدار تھا اور محنتی تھا، ذہین اور وفادار تھا۔ انہی خصوصیات کی بنا پر اُس نے ڈیوڈ کو اپنا سیکریٹری بنا لیا تھا۔ پھر وہ پرسنل اسسٹنٹ بنا اور آخر کار وہ کمپنی کا جنرل مینجر بن گیا۔ ڈیوڈ کے لیے جمی ایک باپ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب ڈیوڈ کے باپ پر دل کا دورہ پڑا تھا تو جمی نے ہی اُسے اسپتال میں داخل کرایا تھا۔ اس کے تمام اخراجات بھی برداشت کیے تھے۔ جب اس کا انتقال ہوا تو جمی نے ہی اس کی تدفین کے تمام اخراجات بھی اٹھائے تھے۔ ڈیوڈ پانچ برس سے کمپنی میں کام کر رہا تھا اور اس دوران وہ جمی کی صلاحیتوں کا معترف ہو گیا تھا۔ وہ جمی اور مارگریٹ کے مسائل سے بھی واقف تھا۔ ان اختلافات پر اُسے افسوس بھی تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ یہی کہہ کر خود کو تسلی دے لیتا تھا۔ میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا کام تو صرف جمی کی مدد کرنا ہے۔

جمی اب اپنے بیٹے کے ساتھ اور زیادہ وقت گزارنے لگا تھا۔ وہ اب پانچ برس کا ہو چکا تھا۔ پہلی مرتبہ جمی نے اُسے کانون کی سیر کرائی تو ایک ہفتے تک وہ صرف اسی سیر کی باتیں کرتا رہا۔ وہ بیٹے کو لے کر پکنک پر جاتا۔ رات کو وہ خیموں میں سوتے۔ صبح اٹھتے ہی وہ شکار پر نکل جاتے۔ کئی دن بعد وہ گھر واپس آتے تو ننھا جمی اپنی ماں کو پکنک کی باتیں بڑے جوش و خروش سے سناتا۔

بیٹے کی چھٹی سالگرہ پر جمی نے اُس سے کہا۔ "اگلے ہفتے ہم اپنے بیٹے کو کیپ ٹاؤن لے کر چلیں گے۔ بہت بڑا شہر ہے وہ۔"

"ممی بھی ہمارے ساتھ چلیں گی نا؟" جمی نے کہا "ممی کو شکار پسند نہیں ہے لیکن وہ شہروں کو پسند کرتی ہیں۔"
جمی نے اپنے بیٹے کے سر پر ہلکے سے چپت مارتے ہوئے کہا "تمہاری ممی کو یہاں بہت سے کام ہیں۔ بس ہم دونوں چلیں گے"
اور پھر وہ کیپ ٹاؤن روانہ ہوئے۔ یہ سفر انہوں نے جمی کی پرائیویٹ ریلوے کار سے کیا تھا۔ ۱۸۹۱ء میں ریلوے جنوبی افریقہ میں سفر اور حمل ونقل کا اہم ذریعہ بن چکی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا کرایہ سستا تھا اور پھر ان کی رفتار بھی تیز تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ان سے سفر آرام دہ بھی تھا۔ جمی نے اپنے لیے جو پرائیویٹ ریل کار بنوائی تھی وہ اکہتر فٹ لمبی تھی۔ اس میں چار کمرے تھے جن میں بارہ افراد باآسانی سفر کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ اس میں ایک سیلون بھی تھا۔ جسے آفس، ڈائننگ روم اور کانفرنس روم کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔
"ڈیڈ! باقی مسافر کہاں ہیں؟" ننھے جمی نے پوچھا۔
جمی نے مسکرا کر کہا "مسافر بس ہم دونوں ہیں۔ یہ تمہاری ٹرین ہے بیٹے۔"
ننھے جمی کے لیے یہ سفر بہت دلچسپ اور حیرت انگیز تھا۔ وہ تمام راستے کھڑکی سے باہر ہی دیکھتا رہا۔
"یہ زمین خدا کی ہے۔ اس زمین میں خدا نے بہت قیمتی قیمتی چیزیں چھپا رکھی ہیں۔ یہ دولت زمین میں چھپی ہوئی ہے۔ تاکہ انسان انہیں تلاش کرے۔ محنت کرے اور انہیں استعمال کرے۔ اب تک انسان نے جو کچھ زمین سے نکالا ہے۔ وہ صرف آغاز ہے" جمی نے اپنے ننھے بیٹے کو بتایا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا ابھی سے زمین اور محنت کی اہمیت سمجھنے لگے
کیپ ٹاؤن دیکھ کر ننھا جمی تو حیران ہی رہ گیا۔ اتنی بڑی بڑی عمارتیں۔ اتنے بہت سے لوگ۔ جمی اپنے بیٹے کو بندرگاہ لے گیا۔ جہاں جمی کی شپنگ لائن کے چھ جہازوں پر مال لادا اور اتارا جا رہا تھا۔
"یہ جہاز دیکھ رہے ہو بیٹا! یہ سب تمہارے ہیں۔"
ننھا جمی حیران رہ گیا۔ اس نے جہازوں کے بارے میں لاتعداد سوالات کیے اور جمی مسکرا کے ان کے جواب دیتا رہا۔
واپس آ کر اس نے مارگریٹ کو تمام باتیں نہایت پُرجوش انداز میں بتائیں "اسے امی۔ وہ تمام شہر ابو کا ہے۔ آپ دیکھیں گی تو حیران رہ جائیں گی۔ ابو کے بڑے بڑے کئی جہاز بھی ہیں۔"
مارگریٹ نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔
جمی کی بیشتر راتیں گھر سے باہر گزرتی تھیں اور مارگریٹ جانتی تھی کہ وہ یہ راتیں مادام کے عشرت کدے میں بسر کرتا ہے۔ مارگریٹ نے سنا تھا کہ جمی نے بالاخانے کی کسی عورت کے لیے ایک مکان خریدا ہے تاکہ وہ اس عورت کے ہاں خاموشی اور رازداری کے ساتھ جا سکے۔ اس خبر میں کتنی سچائی تھی مارگریٹ کے لیے اس کی تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ البتہ وہ اتنا جانتی تھی کہ اگر اُسے اس عورت کا پتہ چل جائے تو وہ اس کا خون پی جائے گی۔ اسے زندہ دفن کر دے گی۔
اپنے دکھوں کو کم کرنے کے لیے مارگریٹ نے شہر میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ ایک نئے گرجا کی تعمیر کے لیے اس نے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ اس نے ہیروں اور دولت کی تلاش میں آنے والے ناکام و نامراد لوگوں کے خاندانوں کی مدد کے لیے ایک فنڈ قائم کیا۔ ایک دن اس نے جمی سے کہا "آپ کو اپنی ایک ریل کار ہیروں کی تلاش میں آنے والے ناکام و نامراد لوگوں کی واپسی کے لیے وقف کر دینا چاہیے تاکہ وہ عزت و آبرو سے اپنے گھروں کو لوٹ سکیں۔"
"کیا کہہ رہی ہو۔ میں اپنی دولت اس طرح ضائع نہیں کر سکتا" جمی نے برا سا منہ بنا کر کہا "انہیں اسی طرح واپس جانا چاہیے جس طرح وہ یہاں آتے ہیں۔ میں نے ان کا ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا۔ پہلے ہی میں ان لوگوں کے لیے بہت کچھ کر رہا ہوں۔"
"لیکن جمی! یہ شکستہ دل لوگ پیدل سفر نہیں کر سکتے۔ ناکامی سے یہ مظلوم پہلے ہی دل برداشتہ ہوتے ہیں اور اس طرح واپسی کی تکلیف وہ سفر ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوتا ہے"
"ٹھیک ہے" جمی نے منہ بنا کر رضامندی ظاہر کر دی "لیکن یہ خیال ہے بہت احمقانہ۔"
"شکریہ جمی!"
جمی اُسے اپنے دفتر سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسے مارگریٹ پر فخر بھی تھا۔ اگر یہ لڑکی کسی اور مرد سے شادی کر لیتی تو بہت اچھی بیوی ثابت ہوتی مگر بدقسمتی نے اُسے اپنے باپ کے بدترین دشمن کی بیوی بنا دیا تھا۔ جمی نے اُسے آج تک دل سے اپنی شریکِ حیات تسلیم نہیں کیا تھا۔ وہ اس سے مفاہمت نہیں کر سکتا تھا۔ یہی کیا کم تھا کہ وہ عزت و آبرو سے اس کے گھر میں رہ رہی تھی۔

جس عورت کے لیئے جمی نے شہر میں علیحدہ مکان لیا تھا۔ اس کا نام لیزا تھی ۔ وہ ایک خوبصورت طوائف تھی ۔ وہ حرّافہ مادام کے کے بالا خانے کی حسین ترین عورت تھی۔ مارگریٹ نے اسے دعوت کے موقع پر دیکھا تھا۔ اور اسے اتنی خوبصورت اور نازک عورت کے طوائف ہونے پر افسوس بھی ہوا تھا۔ لیزا کے متعلق اس نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ شہر کے عیاش طبع مرد اس کے دیوانے تھے۔ اُسے مادام کے بالا خانے سے نکال کر علیحدہ مکان میں رکھنے کے لیے جمی نے بھاری رقم ادا کی تھی۔ اس کے علاوہ وہ لیزا کو خرچے کے لیے ماہانہ بھاری رقم بھی دیتا تھا۔ وہ راتوں کو چھپ کر لیزا سے ملنے جاتا تھا۔ اس نے کبھی دن میں ادھر کا رُخ نہیں کیا تھا۔ وہ رات گئے چھپ کر وہاں پہنچتا اور دن نکلنے سے پہلے گھر واپس آجاتا۔ اسے یقین تھا کہ اُسے لیزا کے پاس آتے جاتے کوئی نہیں دیکھتا۔ یہ اس کی بھول تھی۔ بہت سے لوگ اس بات سے واقف تھے۔ لیکن کسی میں لب کشائی کی جرأت نہ تھی۔ یہ جمی کا شہر تھا۔ وہ یہاں سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ کوئی اس پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔

اس رات جب وہ لیزا کے پاس گیا تو کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ دوسری طرف لیزا بھی بہت جھلائی ہوئی تھی۔ وہ یہاں مسرت اور خوشی کی تلاش میں آیا تھا۔ لیکن وہ اُسے دیکھتے ہی بھر گئی تھی۔ پیر پٹختے ہوئے اُس نے کہا "میں تنگ آگئی ہوں دن بھر اس گھر میں بند رہتے رہتے کتنی گھٹن ہے یہاں۔ میرا تو دم گھٹنے لگا ہے۔ تم نے کیا مجھے غلام سمجھ رکھا ہے۔ آخر تم مجھے اپنے ساتھ سفر پر کیوں لے کر نہیں چلتے۔ یہاں میری زندگی جہنم بن گئی ہے۔ مادام کے ہاں کم از کم چہل پہل تو تھی۔ دوسری لڑکیوں کے ساتھ دل تو لگا رہتا تھا۔ پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ میری خواہشات، میری آرزوؤں اور تمناؤں کا تو کچھ خیال کرو۔ خدا کے لئے مجھے اس جہنم کدے سے نکالو۔"

"میں بتا چکا ہوں تمہیں یہاں اسی طرح رہنا ہوگا۔ میں نے تمہاری بھرپور قیمت ادا کی ہے۔"

"میں کوئی بات نہیں سنوں گی۔" اس نے ایک گندی سی گالی بکی "تم اپنے بیٹے کو تو ہر جگہ لے جاتے ہو اور مجھے یہاں بند کر رکھا ہے۔ کیا میں تمہارے بیٹے سے گئی گزری ہوں۔"

"بکواس بند کرو!" جمی نے نہایت سرد آواز میں کہا۔ اس ذلیل طوائف کے منہ سے اپنے بیٹے کا حوالہ اسے کچھ اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ کاؤنٹر کی طرف بڑھا اور گلاس میں چوتھی مرتبہ برانڈی انڈیلی۔ لیزا کے بے ہودہ اور معاندانہ طرز عمل نے اس کی شراب کی طلب بڑھا دی تھی۔ ورنہ وہ اتنی برانڈی کبھی نہیں پیتا تھا۔

"اس کا مطلب ہے تمہارے نزدیک میری کوئی اہمیت نہیں ہے۔" لیزا کے منہ سے پھر ایک غلیظ گالی ابل پڑی۔ اُس نے سر کو جھٹکا دے کر زوردار قہقہہ لگایا اور تیسرے درجے کی کم ظرف اور گھٹیا طوائف کے سے انداز میں بولی "بڑے آئے شریف کہیں کے تم کتنے شریف ہو میں خوب جانتی ہوں۔ تمہارے بیٹے کے پس منظر سے بھی بخوبی واقف ہوں۔"

"اپنی زبان صحیح کرو۔ اب میرے بیٹے سے متعلق ایک لفظ بھی تم نے نکالا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

"میں تمہاری دھمکیوں سے مرعوب ہونے والی نہیں ہوں۔ کیا سمجھے ہو تم نے جو قیمت ادا کی ہے اس کے عوض عیش و آرام بھی حاصل کیا ہے۔ میں تمہاری زرخرید غلام یا گائے نہیں ہوں جو ایک کھونٹے سے بندھی رہوں گی۔"

جمی کے لیے یہ باتیں ناقابل برداشت ہو گئی تھیں۔ بمشکل تمام اس نے اپنے غصے کو ضبط کیا اور بولا "تم کل صبح مادام کے ہاں واپس جا سکتی ہو۔ میں اسے اطلاع کرا دوں گا کہ تم آرہی ہو۔" یہ کہہ کر جمی نے اپنا ہیٹ سنبھالا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

لیزا نے پھر جمی کو گالی دی۔ اور اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے چلائی "تم مجھ سے اس طرح پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔"

"میں تم سے پیچھا چھڑا چکا ہوں سمجھیں۔" اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔

جمی لڑکھڑاتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس کے قدم آڑے ترچھے پڑ رہے تھے۔ دماغ پر دھند سی چھا گئی تھی۔ شاید وہ پانچ گلاس سے زیادہ برانڈی پی گیا تھا۔ اُسے گھٹیا طوائف لیزا پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ لیزا کے لیے اس نے کیا کچھ نہ کیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اس پر دولت لٹاتا رہا تھا۔ اسے ہر قسم کی آسائشیں فراہم کی تھیں۔ لیکن ان کا صلہ اُس نے کیا دیا تھا۔ گالیاں طعنے۔ کوسنے۔ وہ غصے میں جھلایا ہوا گھر کی طرف بڑھتا رہا۔

گھر پہنچ کر وہ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے مارگریٹ کے بند کمرے کے سامنے سے گزرا۔ دروازے کے نیچے جھری سے اُسے روشنی دکھائی دی گویا وہ ابھی تک جاگ رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اُس کے ذہن میں وہ تمام واقعات گزر گئے۔ جب اُس نے مارگریٹ کو اپنایا تھا۔ دریا کے کنارے، جنگل میں کسی سنسان کنج میں اُسے مارگریٹ کے ساتھ تنہائی میں گزارے ہوئے لمحات یاد آتے چلے گئے۔ تمام یادیں

زندہ ہوگئیں۔ اسے خود پر اختیار نہ رہا۔ وہ بے قابو سا ہوگیا۔ اُس نے دروازہ کھولا اور خواب گاہ میں داخل ہوگیا۔

✡

صبح مارگریٹ بیدار ہوئی تو وہ بستر میں تنہا تھی۔ جمی نہ معلوم کب کا جاچکا تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔ ایک عرصے کے بعد اسے جمی کی محبت ملی تھی۔ تمام دن اس کا وجود جیسے گنگناتا رہا۔ اس نے کئی مرتبہ لباس کے بارے میں اپنا فیصلہ تبدیل کیا۔ وہ چاہتی تھی کہ آج ایسا لباس زیب تن کرے جو جمی کو پسند ہو۔ آج وہ بہترین لباس پہن کر اور سولہ سنگھار کرکے اس کے سامنے جانا چاہتی تھی۔ اُس نے باورچی کو بھی چھٹی دے دی تھی۔ وہ جمی کی پسندیدہ ڈش اپنے ہاتھ سے تیار کرنا چاہتی تھی۔ پھر شام ڈھلے اُس نے کھانے کی میز کو بھی کئی بار سجایا۔ کئی بار اُس کی ترتیب بدلی۔ وہ تمام باریکیوں اور جزئیات پر توجہ دے رہی تھی۔ اس نے میز پر شمعیں اور گلدستے سجائے۔ وہ اس رات کو ہر اعتبار سے خوشگوار بنانا چاہتی تھی۔

مارگریٹ دیر تک انتظار کرتی رہی۔ لیکن وہ حسبِ معمول گھر نہیں آیا۔ اس کا انتظار فضول ہی رہا۔ تین بجے تک وہ کتب خانے میں بیٹھی رہی اور پھر اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔ جمی اگلے دن شام کو گھر آیا تو اُس نے مارگریٹ کو دیکھ کر بے دردی سے سر کو جنبش دی اور اپنے بیٹے کے کمرے میں چلا گیا۔ جمی کے اس رویے پر وہ حیران و پریشان رہ گئی وہ ایک مرتبہ پھر غمزدہ ہوگئی تھی۔ اس کی خوشی بہت عارضی ثابت ہوئی تھی۔

جمی اب بھی اس سے بہت دور تھا۔

چند ہفتوں بعد مارگریٹ کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ لیڈی ڈاکٹر کو طلب کیا گیا اور اس نے تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد مسکرا کر کہا۔ "مسز جمی! بڑی اچھی خبر ہے۔ آپ ماں بننے والی ہیں۔"

مارگریٹ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس خبر پر وہ خوش ہو یا بے اختیار رو پڑے۔ یہ کیسی اچھی خبر تھی؟ وہ ایک اور بچے کو جنم دینے والی تھی۔ آنے والا بچہ تو اس شادی کا نتیجہ تھا جس میں محبت کو کوئی دخل نہ تھا۔ یہ شادی الفت، محبت اور خوشی سے تہی دامن تھی۔ یہ شادی تو صرف اپنی اپنی مجبوریوں کی شادی تھی۔ آنے والے بچے میں تو جمی کی خواہش کو بھی دخل نہیں تھا۔ پتہ نہیں کس جذبے کے تحت وہ ایک رات کے لیے اس کا حقیقی معنوں میں شوہر بن گیا تھا۔ اور جس کے نتیجے میں وہ دوسرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔

رات کو کھانے کے دوران اس نے جمی کو یہ خبر سنائی۔ اُس نے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا۔ خاموشی سے نیپکن واپس میز پر رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر وہ پیر پٹختا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس دن پہلی مرتبہ مارگریٹ نے جمی کے لیے نفرت کے شدید احساسات محسوس کیے اس نے بے رحمی اور بے حسی کی انتہا کر دی تھی۔ مارگریٹ اور اس کے باپ کے خلاف نفرت اب بھی اس کے دل میں موجود تھی۔

دن گزرتے رہے۔ مارگریٹ اب اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اس گھر کی ایک دل گرفتہ قیدی تھی۔ وہ کہیں نہیں جا سکتی تھی۔ جاتی بھی کہاں۔ یہاں اس کا تھا ہی کون؟ اگر وہ کبھی باہر نکلتی بھی تو اسے اپنے بیٹے کو ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس حالت میں وہ اکیلی باہر نکل کے کر بھی کیا سکتی تھی۔

ننھا جمی اب سات برس کا ہوگیا تھا۔ وہ اب اپنی ماں سے اور زیادہ قریب ہوگیا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ باپ کا سلوک اس کی ماں سے اچھا نہیں ہے۔ اس نے کبھی ان دونوں کو مسکرا کے بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ کبھی کبھار وہ اپنی ماں سے پوچھتا۔ "ممی! ابو رات بھر گھر سے باہر اکیلے کیوں رہتے ہیں؟ آپ کو ساتھ لے کر کیوں نہیں جاتے۔ وہ آپ کا خیال کیوں نہیں رکھتے؟"

اور مارگریٹ اس کا ہمیشہ ایک ہی جواب دیتی "بیٹے تمہارے ابو بہت اہم آدمی ہیں۔ وہ بہت ضروری کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ اس لیے ان کو فرصت نہیں ملتی۔ تم سے کس نے کہہ دیا کہ وہ میرا خیال نہیں رکھتے۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں بیٹے۔"

مارگریٹ جانتی تھی کہ جو مسائل اس کے اور جمی کے درمیان ہیں۔ وہ ان کا باہمی معاملہ ہے۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ ان اختلافات کا سایہ بھی ننھے جمی پر نہیں پڑنے دے گی۔

اور پھر وہ دن بھی آگیا جب مارگریٹ نے ایک خوبصورت تندرست اور توانا بچی کو جنم دیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بچی کا نام کیٹ رکھے گی۔ اُس نے یہ بھی سوچنا شروع کر دیا تھا کہ وہ اپنے دونوں بچوں کو یہاں سے کہیں لے جائے گی۔ وہ اب اپنے بچوں کو جمی سے بچانا چاہتی تھی لیکن ابھی اُس نے یہ فیصلہ نہیں کیا تھا کہ وہ کہاں جائے گی

ابھی کیٹ کی پیدائش کو ایک ہی ہفتہ ہوا تھا کہ ایک دن ڈیوڈ بہت پریشانی کے عالم میں جمی کے دفتر میں داخل ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ دروازے پر دستک دیے بغیر داخل ہوا تھا۔ جمی کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور وہ درشتی سے بولا۔ "یہ کیا بے ہودگی ہے؟"

"جناب، نامب میں فساد ہوگیا ہے۔"
جمی اپنی کرسی سے کھڑا ہوگیا اور حیرت اور صدمے کی ملی جلی کیفیت میں بولا "کیا، کہا تم نے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ابھی تو میں نے تمہیں وہاں کنٹرول کے لئے بھیجا تھا۔"
"میں سچ کہہ رہا ہوں جناب۔ وہاں کام کرنے والے ایک سیاہ فام لڑکے نے ایک ہیرا چرانے کی کوشش کی تھی۔ ہیرا چرانے کے لئے اس نے اپنی بغل کے نیچے گہرا زخم لگا کر ہیرا اس میں چھپا لیا تھا۔ سام نے دوسروں کو عبرت دلانے کے لئے سب کے سامنے اسے کوڑے لگوائے۔ اسی دوران وہ لڑکا مر گیا۔ وہ بارہ برس کا بچہ تھا۔"
جمی غصے سے بپھر گیا۔ پوری قوت سے چیخ کے بولا۔ "اف خدایا! میں نے حکم دیا تھا کہ تمام کانوں میں کوڑے مارنے کا سلسلہ قطعی بند کر دیا جائے"
"میں نے اسے تنبیہہ کردی تھی جناب!"
"اس جانور کو فوراً نکال دو۔" جمی نے غصے سے کپکپاتے ہوئے کہا "میں اس کا ناپاک وجود برداشت نہیں کر سکتا۔"
"جناب سام کا کوئی پتہ نہیں۔ سنا ہے کہ سیاہ فاموں نے اسے اغوا کر لیا ہے۔ صورت حال قابو سے باہر ہو گئی ہے جناب!"
"تم یہاں ٹھہرو ڈیوڈ۔ میں خود وہاں جا رہا ہوں۔ یہاں تمام معاملات تمہیں دیکھنا ہیں۔"
"جناب آپکا وہاں جانا مناسب نہیں۔ سام کے ہاتھوں جو لڑکا ہلاک ہوا ہے وہ باروٗ قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ قبیلہ بہت ہی منتقم مزاج ہے۔ یہ لوگ نہ کوئی چیز بھولتے ہیں نہ کسی کو معاف کرتے ہیں۔ میں......"
لیکن جمی جا چکا تھا۔
جمی طوفان کی طرح اپنی گاڑی بھگاتا ہوا نامب پہنچا تھا۔ وہ ابھی نامب سے دس میل دور تھا کہ اسے دور دھواں اٹھتا دکھائی دیا۔ وہاں تمام جھونپڑیوں کو نذر آتش کر دیا گیا تھا وہ غصے سے بڑبڑایا "پاگل ہو گئے ہیں یہ سب! انھوں نے اپنے ہی گھروں کو آگ لگادی ہے۔" اس کی گاڑی آگے بڑھتی رہی۔ اب اسے فائرنگ اور چیخ و پکار کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ وردی پوش پولیس والے سیاہ فام مزدوروں پر فائرنگ کر رہے تھے۔ وہ بچنے کے لئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ سفید فام تعداد میں سیاہ فاموں سے کہیں کم تھے۔ ایک اور دس کا فرق تھا لیکن یہ فرق اس اسلحہ کی بنا پر بے معنی ہو گیا تھا جو سفید فاموں کے پاس تھا۔ سفید فام انتہائی بے رحمی سے سیاہ فاموں پر گولیاں چلا رہے تھے۔
چیف آف پولیس برنارڈ نے جمی کو دیکھا تو وہ جلدی سے اس کے پاس آکر بولا "جناب فکر کی کوئی بات نہیں ہم ان میں سے ایک ایک کو بھون ڈالیں گے۔"
"بکواس مت کرو۔ اپنے لوگوں کو حکم دو کہ وہ فائرنگ بند کر دیں۔" جمی نے اس کے مرتبے اور عہدے کا خیال کئے بغیر چلا کے کہا۔
"کیا کہہ رہے ہیں جناب، فائرنگ بند ہوئی تو......"
"جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو۔" جمی دہاڑا۔ وہ اس وقت سخت ملول تھا۔ اسی لمحے گولیوں کی ایک باڑھ ماری گئی۔ ایک عورت تڑپتی ہوئی زمین پر گر گئی۔ "اپنے لوگوں کو فائرنگ سے روکو۔ میں یہ پاگل پن برداشت نہیں کر سکتا۔"
"جو آپکا حکم ہو جناب!" چیف نے کہا اور اپنے لوگوں کو حکم دینے لگا۔ تین منٹ بعد فائرنگ بند ہو گئی۔
زمین پر ہر طرف انسانی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ چیف نے چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "میرا مشورہ مانیں تو..."
"مجھے تمھارے مشورے کی ضرورت نہیں۔ ان لوگوں کے لیڈر کو میرے پاس لاؤ۔" جمی اب کے قدرے نرم لہجے میں بولا۔
دو سپاہی ایک نوجوان سیاہ فام کو جمی کے پاس لے کر آئے۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ خون میں نہایا ہوا تھا لیکن اس کے چہرے سے خوف و ہراس ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ وہ سینہ تانے جمی کے سامنے کھڑا تھا اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ ان سے بخوبی واقف تھا۔ یہ سیاہ فام بڑے غیور اور خود دار تھے۔
"میں جمی ہوں۔" وہ بمشکل تمام تھوک نگل کر بولا۔
نوجوان سیاہ فام نے زمین پر نفرت سے تھوک دیا اور منہ پھیر لیا۔
"جو کچھ ہوا اس میں میرا کوئی دخل نہیں، مجھے بے حد افسوس ہے اور میں اس کی تلافی کرنے کے لئے تیار ہوں۔"
"یہ بات تم ان لوگوں کی بیواؤں کو سمجھاؤ جو بے رحمی سے قتل کر دیے گئے ہیں۔"
جمی نے پلٹ کر چیف سے پوچھا۔ "سام کہاں ہے؟ میں اس سے ابھی اور اسی وقت ملنا چاہتا ہوں۔"
"ہم اسے تلاش کر رہے ہیں جناب۔" چیف نے سر جھکا کے کہا۔

جی نے دیکھا، سیاہ فام نوجوان کی آنکھوں میں مسرت کی ایک چمک لہرائی۔ جی سمجھ گیا کہ سام کا ملنا اب ناممکن ہے۔ اس نے نوجوان سے کہا "میں تین دن کے لئے کام بند کر رہا ہوں۔ تم اپنے لوگوں سے بات کرو۔ اپنی شکایتوں کی فہرست بناؤ۔ میں اس کو دیکھوں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم لوگوں سے انصاف کیا جائے گا۔ یہاں جو بھی ظلم اور زیادتیاں ہیں سب ختم کر دی جائیں گی۔"

نوجوان نے بے اعتباری سے جی کو دیکھا۔ اس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

"میں یہاں ایک اور شخص کو انچارج بناؤں گا۔ یہاں کے حالات کار بہتر بنا دیے جائیں گے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ تمھارے لوگ تین دن میں کام پر واپس آجائیں۔"

"یہ کیا کہہ رہے آپ جناب! آپ اس شخص کو چھوڑ رہے ہیں۔ اس نے میرے کئی آدمیوں کو ہلاک کیا ہے۔"

"اس کی مکمل تحقیقات کرائی جائے گی۔" جی نے جواب دیا۔

اسی وقت ایک گھوڑ سوار برق رفتاری سے ان کی طرف آیا۔ جی نے مڑ کر دیکھا۔ آنیوالا ڈیوڈ تھا۔ اس کا یوں اچانک اور خلاف توقع آنا کوئی اچھی علامت نہ تھی۔

قریب آتے ہی ڈیوڈ نے گھوڑے سے چھلانگ لگائی "جناب! آپ کا بچہ لاپتہ ہو گیا ہے۔"

جی کو یوں لگا جیسے تمام دنیا اندھیر ہو گئی ہے

٭

جی کا بیٹا غائب ہو گیا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ قصبے کی نصف آبادی جی کے بیٹے کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی تھی۔ انھوں نے تمام مضافاتی علاقوں کو چھان مارا لیکن وہ ملنا تھا نہ ملا۔

جی کی حالت بہت تباہ تھی۔ وہ بس ہر وقت اپنے بیٹے کے بارے میں سوچتا رہتا اور خود کو تسلی دینے کے لئے خود سے یہی کہتا رہتا۔ وہ بھٹک کر کہیں نکل گیا ہے۔ وہ واپس آجائیگا۔

دن بھر کی تلاش کے بعد تھک ہار کر وہ واپس آیا اور مارگریٹ کے کمرے میں پہنچا۔

"کوئی پتہ چلا؟" وہ بے تابی سے بولی

"ابھی کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ لیکن میں اسے تلاش کر لوں گا۔" اس نے کہا، اپنی بیٹی پر ایک نظر ڈالی اور کمرے سے نکل گیا۔ وہ مارگریٹ سے مزید کوئی بات نہ کہہ سکا۔ کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جینا کمرے میں آئی۔ "مادام! پریشان نہ ہوں۔ جی ہوشیار بچہ ہے۔ بڑا بھی ہے۔ وہ اپنی حفاظت بھی کرنا جانتا ہے۔" اس نے نہایت بھونڈے انداز میں تسلی دی۔

مارگریٹ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کی تو دنیا ہی لٹ گئی تھی۔

جینا نے جھک کر کیٹ کو اس کی ماں کے بازوؤں سے لے لیا اور بولی "اب آپ سو جائیں، تھکن کی زیادتی سے آپ کی طبیعت بگڑ بھی سکتی ہے۔"

اس نے بچی کو چمکارا اور پھر اسے پالنے میں لٹا دیا۔ مارگریٹ نے اپنی بچی کو دیکھا۔ وہ اب بھی معصوم انداز میں مسکرا رہی تھی۔

"لے بی بی، چلو تم بھی سو جاؤ۔ پھر تمہیں بڑی مصروف زندگی گذارنی ہے۔" جینا نے ننھی کیٹ کو جیسے سمجھانے کی کوشش کی۔ اور اس کی ماں سے بولی "میں کیٹ کو اس کے کمرے میں لے جا کر سلائے دیتی ہوں۔ آپ بھی سونے کی کوشش کریں۔"

وہ ننھی کیٹ کو پالنے میں لے کر کمرے سے نکل گئی، باہر جا کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

رات دھیرے دھیرے گزرتی ہوئی نصف سفر طے کر چکی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا طاری ہو چکا تھا۔ اس سناٹے میں ہلکا سا کھٹکا ہوا۔ بیڈ روم کی کھڑکی کھلی اور ایک شخص کھڑکی کی راہ سے کود کر اندر آگیا۔ وہ سیدھا پالنے کی طرف گیا۔ بچی پر کمبل ڈالا اور اسے گود میں لے کر اسی کھڑکی سے واپس باہر چلا گیا۔

یہ بانڈا تھا۔ وہ جس پھرتی سے آیا تھا اسی پھرتی سے۔ واپس چلا گیا تھا۔

صبح سب سے پہلے جینا کو کیٹ کی گمشدگی کا علم ہوا۔ پہلے وہ یہی سمجھی کہ شاید رات کو مارگریٹ بچی کے کمرے میں آکر اسے اپنے ساتھ لے گئی ہو گی۔ وہ مارگریٹ کے کمرے میں پہنچی۔ "بے بی کہاں ہے؟" اس نے سوال کیا۔

مارگریٹ کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی کہ کیا واقعہ گزر چکا ہے۔

ایک دن اور گزر گیا۔ جمی کو اپنے بچے کا کوئی سراغ نہ ملا۔ جمی کو لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم سے ساری توانائی نچوڑ لی گئی ہو۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے ڈیوڈ کے پاس پہنچا اور نقاہت سے بولا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟ میرے بیٹے کے ساتھ کوئی سنگین حادثہ پیش آیا ہے کیا؟" اس کی آواز میں دبی دبی سسکیاں تھیں۔

"مجھے یقین ہے جناب، وہ بالکل ٹھیک ہوگا" ڈیوڈ نے جھوٹی تسلی دی، حالانکہ اسے یقین تھا کہ اب ننھا جمی زندہ نہیں مل سکے گا۔ اس کی تلاش بے سود ہے۔

خود جمی بھی سمجھتا تھا کہ اس کا بیٹا اس سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ چکا ہے۔ ڈیوڈ نے اسے خبردار کیا تھا کہ بارو قبیلے کے لوگ بہت منتقم مزاج ہوتے ہیں۔ وہ نہ کوئی بات فراموش کرتے ہیں نہ کسی کو معاف کرتے ہیں۔ اگر بارو قبیلے کے لوگوں نے اسے اغواء کیا تھا تو پھر انھوں نے ننھے جمی کو نہایت اذیتیں دے کر ہلاک کر دیا ہوگا

جمی صبح کے وقت نہایت شکستہ تھکا ماندہ اور نڈھال گھر واپس پہنچا۔ وہ تمام دن مختلف پارٹیوں کے ساتھ قصبے کے مضافاتی علاقوں میں مارا مارا پھرتا رہا تھا لیکن اسے اپنے بیٹے کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔

جب ڈیوڈ مطالعہ کے کمرے میں پہنچا تو وہاں ڈیوڈ موجود تھا۔ جمی کو دیکھتے ہی وہ کھڑا ہو گیا۔

"جناب! آپکی بیٹی کو بھی کسی نے اغواء کر لیا ہے۔"

جمی خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے جواب میں ایک لفظ نہ کہا۔ چند لمحے بعد وہ خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا

وہ اڑتالیس گھنٹے سے نہیں سویا تھا۔ بے حد تھکا ماندہ بستر پر لیٹا تو تھوڑی دیر بعد ہی اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ گہری نیند سو گیا۔

وہ اب ایک برگد کے درخت کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ سامنے گھاس سے بھرے ہوئے میدان میں ایک شیر آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور ننھا جمی اسے ہلا رہا تھا۔ "پاپا جاگ جاؤ، شیر آرہا ہے، پاپا جاگ جاؤ، شیر آرہا ہے۔" شیر اب ان کی طرف بہت تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ ننھا جمی اب اسے اور زیادہ زور سے ہلا رہا تھا۔ "جاگو پاپا، جاگو پاپا۔"

جمی نے آنکھیں کھول دیں۔ بانڈا اس کے پلنگ کے قریب کھڑا تھا۔ جمی نے کچھ کہنا ہی چاہا تھا کہ بانڈا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"خاموش رہو ورنہ غضب ہو جائے گا۔" اس کے لہجے اور انداز میں دوستی تھی۔

جمی اٹھ بیٹھا اور اپنے سیاہ فام دوست کو بغور دیکھتے ہوئے بولا "میرا بیٹا کہاں ہے؟"

"وہ مر چکا ہے۔" بانڈا نے سر جھکا کے دھیمی آواز سے کہا۔

جمی کو یوں لگا جیسے تمام کمرہ چکرا کر رہ گیا ہو۔ اس کے سر پر کسی نے وزنی ہتھوڑا دے مارا تھا۔

"مجھے افسوس ہے جمی، مجھے دیر ہو گئی۔ میں انھیں روک نہیں سکا۔ تمہارے آدمیوں نے بارو قبیلے کے ایک نوجوان کا خون بہایا تھا۔ میرے آدمی اس کا انتقام لینا چاہتے تھے جو انھوں نے لے لیا۔ وہ کبھی کسی کو معاف نہیں کرتے۔"

"اُف میرے خدایا۔ آخر تمہارے لوگوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا" جمی نے شکستہ لہجے میں کہا۔

بانڈا کے چہرے پر گمبھیرتا تھی۔ اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "انھوں نے بچے کو صحرا میں چھوڑ دیا تھا۔ مم...... مجھے اس کی لاش ملی تھی۔ میں نے اسے دفن کر دیا تھا۔"

"نہیں بانڈا! ایسا نہ کہو۔ یہ نہیں ہو سکتا۔"

"میں شرمندہ ہوں جمی، مجھے بے حد افسوس ہے۔ میں نے اسے بچانے کی کوشش کی تھی لیکن ......"

جمی کی جان ہی نکل چکی تھی۔ "میری بیٹی کہاں ہے؟" وہ بے جان اور کھوکھلی آواز میں بولا۔

"میں اسے لے گیا تھا۔ وہ لوگ تمہاری بیٹی کو بھی مارنا چاہتے تھے۔ اس لئے میں اسے اٹھا کر لے گیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں سو رہی ہے۔ اب اسے کوئی خطرہ نہیں ہے بشرطیکہ تم اپنے تمام وعدے پورے کرو۔"

جمی نے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر نفرتوں کی لکیریں گہری ہو گئی تھیں۔ جمی نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔ "ٹھیک ہے۔ میں اپنے وعدے پورے کروں گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں اس شخص کو چاہتا ہوں جس نے میرے بچے کو قتل کیا ہے۔ میں اسے بخشوں گا نہیں۔"

"پھر تمھیں میرے پورے قبیلے کو قتل کرنا ہوگا جمی۔" بانڈا نے اطمینان سے جواب دیا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

خیال تھا کہ اس نے آنکھیں کھولیں اور یہ بھیانک خواب حقیقت بن جائے گا۔ اس کے بچے مر جائیں گے۔ بس اسی لیے وہ آنکھیں بند رکھتی اور پھر جیسے جمی اس کے ہاتھ کو تھام لیتا۔ "ممی، ممی۔ سب ٹھیک ہے۔ ہم یہاں ہیں۔ ہم محفوظ ہیں۔"

وہ تین دن سے اپنے بستر پہ نیم مردہ سی لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے لب سی لیے تھے۔ وہ نہ کسی سے بات کرنے کی روادار تھی۔ نہ کسی سے ملنے کی خواہشمند تھی۔ ڈاکٹر آتا اور چلا جاتا تھا لیکن اسے اس کا بھی کوئی احساس نہیں تھا۔

رات کافی گزر گئی تھی۔ وہ اب بھی جاگ رہی تھی کہ اچانک اُس نے اپنے بیٹے کے کمرے میں بہت زور کا دھماکہ سنا۔ وہ چونک گئی۔ ذرا دیر بعد ایک اور آواز ابھری۔ شاید جمی، ننھا جمی، اس کا بیٹا واپس آ گیا ہے۔

وہ جلدی سے اٹھی اور دوڑتی ہوئی راہداری پار کر کے اپنے بیٹے کے کمرے میں جا پہنچی۔

وہاں اُس کا بیٹا نہیں تھا۔ اس کا شوہر زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی ایک آنکھ بند تھی۔ دوسری بھیانک انداز میں کھلی ہوئی تھی اور وہ آنکھ مارگریٹ پر جمی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر مڑ سے گئے تھے۔ وہ بولنا چاہتا تھا لیکن اُس کے ہونٹوں سے آواز نہ نکل پا رہی تھی۔ بس حلق سے غراہٹیں بلند ہو رہی تھیں جیسے کوئی جانور تکلیف سے کراہ رہا ہو۔

"جمی، جمی، یہ کیا ہو گیا!" وہ چلا کر بولی "تمہیں کیا ہو گیا جمی!"

ڈاکٹر نے تفصیلی معائنے کے بعد کہا "مسز جمی! مجھے بے حد افسوس ہے۔ آپ کے شوہر پہ فالج کا سخت اثر ہوا ہے۔ ان کے زندہ رہنے کے امکانات بس پچاس فیصد ہیں اور اگر وہ زندہ بھی رہے تو بس آتی جاتی سانس کا نام زندگی ہوگا۔ وہ نہ بول سکیں گے، نہ چل پھر سکیں گے۔ میں انہیں کسی پرائیویٹ ہسپتال میں داخل کرنے کے انتظامات کرتا ہوں جہاں ان پہ مناسب توجہ دی جا سکے گی۔"

"نہیں!" مارگریٹ چیخی "یہ نہیں ہو سکتا!"

"نہیں۔ کیا مطلب؟" ڈاکٹر نے حیرت سے کہا "آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟"

"جمی اسپتال میں نہیں رہے گا۔ میں اسے اپنے پاس رکھوں گی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "میں خود اس کی تیمار داری کروں گی۔ میں اپنی جان، اپنی زندگی کے لیے دن رات ایک کر دوں گی۔"

"ٹھیک ہے تو پھر میں ایک نرس کا انتظام کیے دیتا ہوں۔"

"نہیں، مجھے نرس کی ضرورت نہیں۔ میں خود اس کی دیکھ بھال کروں گی۔"

ڈاکٹر نے سر ہلا کر کہا "مسز جمی، آپ کو علم نہیں ہے کہ جمی کی حالت کیا ہے۔ وہ اب چلنے پھرنے، ہلنے جلنے کے قابل نہیں ہے۔ وہ مکمل طور پر مفلوج ہو گئے ہیں اور ایک تجربہ کار اور ذمے دار نرس ان کی دیکھ بھال کے لیے بے حد ضروری ہے۔"

"و کچھ بھی سہی ڈاکٹر۔ جمی کی دیکھ بھال میں ہی کروں گی۔" وہ ٹھوس اور مستحکم لہجے میں بولی۔

اور ایسا ہی ہوا۔ جمی اب مکمل طور پر اُس کا ہو گیا تھا۔

فالج گرنے کے دن سے لے کر جمی ٹھیک ایک برس زندہ رہا۔ یہ مارگریٹ کی زندگی کے نہایت خوشگوار لمحے تھے۔ جمی بالکل بے بس اور لاچار تھا۔ وہ نہ بات کر سکتا تھا نہ اپنے بدن کو حرکت دے سکتا تھا۔ وہ اپنے شوہر کی تمام ضروریات پوری کرتی۔ دن رات ہر وقت وہ جمی کو اپنے پاس ہی لٹائے رکھتی۔ دن میں وہ جمی کو پہیوں والی کرسی میں تکیوں کے سہارے بٹھاتی اور اسے باغ کی سیر کراتی۔ ساتھ ہی جمی سے باتیں بھی کرتی جاتی۔ یہ باتیں یک طرفہ ہوتیں۔ اس سے گھریلو مسائل پر گفتگو کرتی۔ اُسے بتاتی کہ ننھی کیٹ اب غوں غاں کرنے لگی ہے۔ رات کو وہ جمی کو اپنے کمرے میں لے جاتی اور اپنے برابر لٹا دیتی۔

کمپنی ان دنوں ڈیوڈ چلا رہا تھا۔ کبھی کبھار وہ کاغذات لے کر گھر آتا جن پر اُس کے دستخط بہت ضروری ہوتے۔ جمی کو اس حالت میں دیکھ کر ڈیوڈ کو بڑا دکھ ہوتا اور یہ احساس شدید تر ہو جاتا کہ وہ جو کچھ بھی ہے صرف اس شخص کی وجہ سے ہے۔ وہ اپنے محسن کو بے بس اور لاچار دیکھتا تو اس کے دل پر چھریاں سی چلنے لگتی تھیں۔

"تم نے اپنے کاروبار کے لیے بہت اچھا آدمی منتخب کیا ہے جمی۔ ڈیوڈ بہت اچھا آدمی ہے۔" اس نے اون اور سلائیاں ایک طرف رکھتے ہوئے ایک دن جمی سے کہا "تمہارا کبھی کبھار اس کی صلاحیتیں مجھے وہ دور یاد دلا دیتی ہیں جب تم بھی اس کی عمر کے تھے۔ لیکن میری جان تمہاری بات کچھ اور تھی۔ تم جیسا ہوشیار اور ذہین شخص اب شاید ہی کبھی پیدا ہو۔ تم خطرات مول لینے سے بھی نہ ڈرتے تھے۔ تم بہت بے خوف اور نڈر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تم نے جتنے خواب بھی دیکھے سب کے سب سچ ہو گئے۔ تمہاری کمپنی دن بہ دن بڑھتی اور پھیلتی جا رہی ہے۔" اس نے پھر اون اور سلائیاں اٹھا لیں اور فخریہ لہجے میں بولی "اور ہماری بیٹی کیٹ۔ اس نے تو اب لوٹنا

شروع کر دیا ہے۔ آج صبح اُس نے امی کہا تھا"

اور جمی کرسی پر تکیوں کے سہارے بیٹھا، اپنی ایک کھلی آنکھ سے دور کہیں گھورتا رہتا۔ مارگریٹ کی باتیں اس کے لیے بے معنی تھیں اب وہ ہر احساس اور شعور سے عاری ہو چکا تھا۔ اس میں اور گوشت کے ایک بے جان لوتھڑے میں کوئی فرق نہیں تھا۔

"کیٹ کا دہانہ اور آنکھیں تو بالکل تم پر گئی ہیں۔ بڑی ہو کر بہت خوبصورت نکلے گی وہ۔" وہ بڑے پیار سے اسے دیکھتی ہوئی بولی۔

اور اگلے روز جب مارگریٹ نے اُسے جگانا چاہا تو جمی جاگ کر نہیں دیا۔ وہ ابدی نیند سو چکا تھا۔ مارگریٹ نے اس کے سرد جسم کو اپنے وجود کے ساتھ لپٹا لیا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اس کا دل شدتِ غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ اس کا میت اسے زندگی کی کٹھن اور دشوار راہوں پر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس کا جیون ساتھی لاکھ مجبور اور لاچار سہی۔ اس کے دل کا سہارا تھا۔ وہ اس کی تنہائیوں کا خاموش رفیق تھا۔ اس کا دم مارگریٹ کے لیے بسا غنیمت تھا۔ وہ بڑی مشکلوں اور قدرت کی ستم ظریفی کے باعث اس کا ہوا تھا اور اب یہ خاموش سہارا بھی اس سے چھن گیا تھا۔ وہ اب اس دنیا میں تنہا رہ گئی تھی۔ اس کے شوہر اور بیٹے نے اس کی رفاقت چھوڑ دی تھی۔ اب وہ تھی یا اُس کی بیٹی۔ اپنی بچی کو دیکھنے کے لیے وہ اس کے کمرے میں گئی۔ وہ اپنے پالنے میں گہری نیند سو رہی تھی۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ یتیم ہو گئی ہے۔ یہ کیٹ تھی۔ اس کی آرزوؤں اور امنگوں کا محور۔ اب وہ مارگریٹ کے لیے سب کچھ تھی۔ اُسے کیٹ کے لیے زندہ رہنا تھا

جمی کی موت کے بعد ڈیوڈ اور مارگریٹ کروگر برینٹ کمپنی کی ترقی اور ترویج کو اپنا نصب العین بنا چکے تھے۔ ڈیوڈ نے سارا کاروبار بڑی مہارت سے سنبھال رکھا تھا۔ وہ تمام بڑے فیصلے مارگریٹ سے صلاح و مشورے کے بعد ہی کرتا تھا۔

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی دنیا میں حیرت انگیز ایجادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان ایجادات نے زندگی کا ڈھچر ہی بدل کے رکھ دیا تھا۔ بھاپ اور بجلی سے چلنے والی مشینیں ہر شعبے میں کام کرنے لگی تھیں۔ فضا میں طیارے پرواز کرنے لگے تھے اور آب دوزیں سمندر کے سینے میں تیرتی پھرتی تھیں۔ دنیا کی آبادی بڑھ کر ڈیڑھ ارب ہو چکی تھی۔ یہ دور ترقی اور وسعت کا دور تھا۔ صنعتی انقلاب زوروں پر تھا۔ اگلے چھ برس مارگریٹ اور ڈیوڈ نے ہر موقع سے فائدہ اٹھایا اور کمپنی کے کاروبار کو زیادہ وسیع کر دیا۔ اس عرصے میں مارگریٹ اپنی بیٹی پر کوئی خاص توجہ نہ دے سکی۔ وہ تو کمپنی کو فروغ دینے میں مصروف تھی۔ اس وجہ سے کیٹ ایک خود رو پودے کی طرح بڑھتی رہی۔ اس میں خود سری بھی آ گئی تھی۔ وہ اپنے بارے میں خود ہی فیصلے کرتی۔ جو چاہتی کرتی۔ کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ تھا اس کی طبیعت جارحانہ ہو چکی تھی۔ وہ جس کام کا ارادہ کرتی اُسے پورا کر کے ہی چھوڑتی تھی۔

ایک دن وہ کاروباری اجلاس سے واپس آئی تو اُس نے اپنی ۱۴ سالہ بیٹی، کیٹ کو کچے میدان میں دو لڑکوں سے گھونسے بازی میں مصروف دیکھا۔ وہ بری طرح دونوں لڑکوں کی دھنائی کر رہی تھی۔ مارگریٹ کو جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ یہ لڑکی بھی آفت کی پرکالہ ہے" اس نے سوچا مجھے اس سے ڈر لگ رہا ہے۔ یہ بڑی ہو کر پتہ نہیں کیا غضب ڈھائے گی۔ مگر ایک بات طے ہے کہ اپنے باپ کی کمپنی کو دنیا کی چند بڑی کمپنیوں میں سے ایک ضرور بنا دے گی۔

یہ ۱۹۱۴ء کا تعمیر اور ترقی کا دور تھا۔ موسم گرما اپنے شباب پر تھا۔ دہکتے ہوئے سورج نے ہر شے کو جھلسا دیا تھا۔ حدت رات گئے تک برقرار رہتی تھی۔ ایسی ہی ایک گرم اور حبس رات کیٹ کمپنی کی نئی عمارت میں اپنے مخصوص کمرے میں بیٹھی کام کر رہی تھی۔ یہ عمارت جنوبی افریقہ کے دارالحکومت کے معروف ترین کاروباری علاقے میں واقع تھی۔

اچانک اس نے قریب آتی ہوئی موٹر گاڑیوں کی آواز سنی۔ کیٹ نے تمام کاغذات اٹھا کر رکھ دیئے جو وہ بڑے انہماک سے مطالعہ کر رہی تھی پھر وہ کرسی سے اٹھی اور کھڑکی کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے باہر جھانک کر دیکھا۔ پولیس کی دو کاریں اور ایک ویگن عمارت کے سامنے آ کر ٹھہر گئی تھیں۔ پولیس کاروں سے کوئی آٹھ دس پولیس والے جلدی سے اترے اور پھر انھوں نے عمارت کے دونوں راستوں پر نگرانی قائم کر لی۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھتی رہی۔ وقت خاصہ ہو گیا تھا۔ اس لیے تمام سڑکیں ویران ہو گئی تھیں۔ اس نے کھڑکی کے شیشے میں اپنا عکس دیکھا۔ وہ خوبصورت اور پرکشش شخصیت کی مالک تھی۔ اس کی آنکھوں کا رنگ اور ہونٹوں کی تراش اپنے باپ جیسی تھی اور جسمانی خدوخال اپنی ماں کے سے تھے۔ راہ چلتے لوگ اسے دیکھ کر ٹھٹھک کر رک جاتے تھے اور دور تک مڑ مڑ کے دیکھتے رہتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور وہ بلند آواز میں بولی "آجاؤ دروازہ مقفل نہیں ہے۔"

دروازہ کھلا۔ دو وردی پوش افراد داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک پولیس چیف تھا۔

"کیا بات ہے، آپ لوگ کیوں آئے ہیں؟" کیٹ نے دریافت کیا۔

"مجھے افسوس ہے کہ ناوقت آپ کے کام میں مخل ہوئے مس کیٹ! میں پولیس چیف کارمن ہوں"

"کیا بات ہے چیف؟ خیر تو ہے؟" کیٹ نے پُرسکون آواز میں پوچھا۔

"ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ایک مفرور قاتل کچھ دیر قبل اس عمارت میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔"

کیٹ نے حیرت سے کہا۔"اس عمارت میں داخل ہوتے دیکھا گیا ہے؟"

"جی ہاں۔ وہ بہت خطرناک شخص ہے، وہ مسلح بھی ہے۔"

کیٹ نے پریشان ہو کر کہا۔"پھر تو چیف آپ اُسے تلاش کر کے یہاں سے نکال دیں۔"

"ہم اسی مقصد سے حاضر ہوئے ہیں مس! آپ نے تو کوئی مشتبہ آواز یا آہٹ نہیں سنی؟"

"نہیں لیکن آپ دیکھ رہے ہیں، میں یہاں پر تنہا ہوں اور کوئی بھی شخص یہاں کہیں بھی چھپ سکتا ہے۔ یہاں کسی کے لیے بھی چھپنا مشکل نہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ تمام جگہیں نہایت احتیاط سے دیکھ ڈالیں۔ ورنہ مجھے رات بھر نیند نہیں آئے گی۔"

"آپ فکر نہ کریں مس!" یہ کہہ کر پولیس چیف نے اپنے سپاہیوں سے کہا۔"ہر طرف پھیل جاؤ۔ چپہ چپہ دیکھ ڈالو نیچے تلاشی شروع کرو اور چھت تک چلے جاؤ۔" پھر وہ کیٹ سے مخاطب ہوا۔"کیا کوئی کمرہ مقفل بھی ہے؟"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کوئی بھی کمرہ مقفل نہیں ہے۔ تاہم اگر کوئی کمرہ بند ہوا تو اُسے میں کھول دوں گی۔"

کیٹ نے پھر وہ رپورٹ اٹھالی جس کا وہ مطالعہ کر رہی تھی۔ لیکن اب اس پر انہماک سے غور کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ان آوازوں کو سن رہی تھی جو عمارت میں پولیس کی کارروائی کے سبب خاموشی میں ابھر رہی تھیں۔ پولیس دفتر کا ایک ایک کمرہ دیکھ رہی تھی۔ چپہ چپہ چھان رہی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پولیس اُسے تلاش کر لے۔ کیٹ نے سوچا اور کپکپا کر رہ گئی۔

سپاہی آہستہ آہستہ اور نہایت احتیاط سے منظم انداز میں تلاشی لے رہے تھے۔ پینتالیس منٹ بعد چیف پھر کمرے میں داخل ہوا۔ کیٹ نے غور سے چیف کو دیکھا اور سہمے ہوئے انداز میں بولی۔"مل گیا وہ خطرناک شخص؟"

"ابھی نہیں مل سکا لیکن آپ فکر نہ کریں۔ وہ ہم سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ ہم اُسے پاتال سے بھی نکال لیں گے۔"

"میں بہت پریشان ہوں چیف۔ اگر ایک مفرور قاتل اس عمارت میں موجود ہے تو میں چاہتی ہوں کہ آپ اُسے تلاش کریں۔ اُسے ڈھونڈھ نکالیں ورنہ میں ساری رات سوچتی رہوں گی۔ کپکپاتی رہوں گی۔"

"آپ بے فکر رہیں۔ ہمارے پاس جاسوس کتے بھی ہیں۔ ہم اسے بہت جلد ڈھونڈ نکالیں گے۔"

راہداری سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ چند لمحوں بعد ایک سپاہی دو بڑے بڑے کتوں کے ساتھ آیا۔ ان کتوں کی زنجیریں سپاہی نے تھام رکھی تھیں، وہ بڑے ادب سے بولا۔"جناب، کتوں نے تمام عمارت چھان لی ہے، بس یہ کمرہ باقی ہے۔"

چیف نے کیٹ سے پوچھا۔"کیا آپ گزشتہ ایک گھنٹے کے دوران اس کمرے سے نکل کر کہیں گئی تھیں؟"

"جی ہاں۔ میں پانچ منٹ کے لیے فائل روم میں گئی تھی۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ اس عرصے میں..." کیٹ نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا اور کپکپا کر رہ گئی۔"میں چاہوں گی کہ آپ اس دفتر کی بھی تلاشی لے لیں۔"

پولیس کے چیف نے کتوں کے ساتھ آنے والے سپاہی کو اشارہ کیا۔ اس نے کتوں کو چھوڑ کر کہا۔"چلو تلاش کرو۔"

اشارہ پاتے ہی کتے جیسے پاگل ہو گئے۔ وہ لپک کر ایک بند دروازے کی طرف گئے اور اس کے پاس پہنچ کر دیوانہ وار بھونکنے لگے۔

"اف میرے خدا!" کیٹ نے تقریباً چیخ کر اور پریشان ہوتے ہوئے کہا۔"تو وہ اندر موجود ہے۔"

چیف نے اپنا پستول نکالتے ہوئے کہا۔"دروازہ کھولو۔"

دو سپاہیوں نے پستول نکالے اور دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھے۔ انہوں نے لمبی سی راہداری کا دروازہ کھولا۔ راہداری خالی پڑی تھی۔ کتے راہداری سے ہو کر ایک اور دروازے کی سمت گئے اور وہاں جا کر انہوں نے بھونکنا شروع کر دیا۔ چیف نے پوچھا۔"یہ دروازہ کہاں کھلتا ہے؟"

"غسل خانے میں۔" کیٹ نے جواب دیا۔

دو سپاہیوں نے دروازے کے دائیں بائیں پوزیشن لے کر دروازہ کھول دیا۔ غسل خانے میں کوئی نہیں تھا۔ کتوں کا نگراں سپاہی

ہونقوں کی طرح غسل خانے کو دیکھ رہا تھا۔ "ان کتوں نے آج تک ایسا رویہ اختیار نہیں کیا تھا۔" وہ حیرت سے کتوں کو دیکھتے ہوئے بولا جو لمبے چوڑے غسل خانے میں پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ سپاہی نے پھر کہا: "کتوں کو اس کی بو تو محسوس ہو رہی ہے۔ لیکن آخر وہ ہے کہاں؟"

اس کے بعد دونوں کتے کیٹ کی میز کی طرف دوڑے اور اس کے چاروں طرف چکر لگا کر بھونکنے لگے۔

"شاید وہ دراز میں گھس گیا ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

پولیس چیف کے لیے بھی یہ معاملہ حیرت انگیز تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ آیا۔ وہ پشیمانی سے بولا "معاف کیجئے گا مس۔ ہم نے آپ کو بلاوجہ تکلیف دی۔" پھر وہ کتوں کے نگراں سے مخاطب ہوا "ان کتوں کو باہر لے جاؤ۔"

"آپ جا تو نہیں رہے؟" کیٹ نے پریشان ہو کر کہا۔ "پلیز اسے تلاش کریں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"مس! آپ پریشان نہ ہوں۔ یقین جانیئے آپ بالکل محفوظ ہیں۔ میرے سپاہیوں نے عمارت کا چپہ چپہ دیکھ لیا ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔ وہ مفرور قاتل اس عمارت میں نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں غلط اطلاع ملی تھی۔ میں آپ سے ایک مرتبہ پھر معافی چاہتا ہوں۔"

"بہرحال آپ نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔

پھر پولیس وہاں سے چلی گئی۔ وہ کھڑکی میں کھڑی ان کی روانگی دیکھتی رہی۔ جب پولیس کی آخری گاڑی بھی وہاں سے روانہ ہو گئی تو وہ اپنی میز کی طرف آئی۔ دراز کھول کر اس نے خون آلود جوتوں کی جوڑی نکالی۔ ان جوتوں کو لے کر وہ راہداری سے ہوتی ہوئی ایک دروازے پر پہنچی جس پر "نجی کمرہ" لکھا ہوا تھا۔ اور اس کے نیچے یہ عبارت درج تھی "صرف اجازت یافتہ افراد اندر جا سکتے ہیں۔"

وہ دروازہ کھول کر اندر پہنچ گئی۔ یہ کمرہ بالکل خالی تھا۔ البتہ اس کمرے کی ایک دیوار میں ایک بہت بڑی تجوری بنی ہوئی تھی۔ اس تجوری میں ایک آدمی سکڑ سمٹ کے داخل ہو سکتا تھا۔ وہ تجوری کمرے کی دوسری طرف ایک آہنی کمرے پر مشتمل تھی۔ اس آہنی کمرے کے برابر تجوری میں کمپنی کے تمام ہیرے برآمد تک محفوظ رکھے جاتے تھے۔ وہ تجوری کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ دو تین گہرے سانس لیے پھر دیوار میں بنی ہوئی چرخیوں اور پہیوں کو مخصوص انداز میں گھما کر اس ترتیب میں منظم کر دیا جس سے تجوری کھل سکتی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ یہ تجوری بھی وسیع آہنی کمرہ تھا۔ جس میں ہر طرف چھوٹی چھوٹی تجوریاں بنی ہوئی تھیں۔ ہر تجوری میں ہیرے بھرے ہوئے تھے۔ اور کمرے کے وسط میں فرش پر بانڈا زخموں سے چور نیم بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ کیٹ نے اس کے پاس جا کر جھک کر کہا "وہ لوگ چلے گئے ہیں۔"

بانڈا نے آنکھیں کھولیں اور بولا "کیٹ یہ بتاؤ اگر میں اس تجوری سمیت یہاں سے بھاگ جاؤں تو میں کتنا امیر ہوں گا؟"

کیٹ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے بانڈا کو سہارا دے کر کھڑا کیا۔ بازو کو کیٹ کا ہاتھ لگتے ہی اس نے تکلیف سے منہ بنایا۔ کیٹ نے اس کے زخمی بازو پر پٹی باندھ دی تھی۔ لیکن اب بھی خون اس کے زخم سے رس رہا تھا۔

کیٹ نے جوتے بانڈا کو پہنا دیئے جو اس نے پہلے اتار لیے تھے۔ محض جاسوس کتوں کو ورغلانے کے لیے۔ اسے معلوم تھا کہ پولیس بانڈا کی تلاش کے لیے اپنے جاسوس کتے بھی لے کر آئیں گے۔ وہ ان جوتوں کو پہن کر اپنے دفتر میں ادھر ادھر گھومی تھی اور پھر اس نے یہ جوتے دراز میں رکھ دیے تھے۔ اس کا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ اس نے اپنی ذہانت سے گھاگ اور تجربہ کار پولیس والوں کو بیوقوف بنا دیا تھا۔

بانڈا نے جوتے پہن لیے تو کیٹ نے کہا "آؤ، اب میرے ساتھ چلو، تمہیں یہاں سے نکالنا بھی تو ہے۔"

زخمی سیاہ فام نے بہت زور سے نفی میں سر ہلایا اور محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کے بولا "نہیں، میں خود اپنے طور پر یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں گا۔ اگر پولیس نے تمہیں میری مدد کرتے ہوئے پکڑ لیا تو تم سخت مشکلات میں گھر جاؤ گی۔"

"اس بارے میں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔" کیٹ نے مسکرا کے کہا۔

طویل قامت سیاہ فام نے آخری مرتبہ وہاں رکھی ہوئی تجوریوں پر نظر ڈالی۔ کیٹ نے مسکرا کر کہا "تم چاہو تو ان میں سے کچھ ہیرے لے سکتے ہو۔ اپنی مرضی سے پسند کر لو۔"

اس نے کیٹ کو دیکھا۔ وہ واقعی یہ پیشکش کرتے ہوئے بہت سنجیدہ تھی۔ بانڈا نے دھیمی آواز میں کہا "تمہارے ابو نے بھی ایک مرتبہ مجھے ایسی ہی پیشکش کی تھی۔ یہ بہت پرانی بات ہے۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔"

"مجھے رقم کی ضرورت نہیں۔ مجھے صرف کچھ عرصے کے لیے اس شہر سے باہر جانا ہے۔"

"لیکن یہ بتاؤ کہ آخر تم شہر سے نکلو گے کس طرح؟"

"میں اس کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لوں گا۔"

"میری بات سنو بانڈا۔" کیٹ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "پولیس نے اب تک جگہ جگہ سڑکوں پہ رکاوٹیں قائم کر دی ہوں گی۔ شہر سے باہر جانے والے ہر راستے پر نگرانی ہو رہی ہو گی۔ تم اپنے طور پر یہاں سے نہیں نکل سکتے۔ اِس کا تو خیال ہی تم ذہن سے نکال دو۔ اس وقت تمہیں میرا کہنا ماننا ہی پڑے گا۔"

"تم میرے لیے پہلے ہی بہت کچھ کر چکی ہو کیٹ۔ میں اب تم پر اس سے زیادہ بوجھ بننا نہیں چاہتا۔" اُس نے بھی فیصلہ کن انداز میں کہا وہ اس وقت پھٹی ہوئی خون آلودہ جیکٹ پہنے کھڑا تھا۔ اس شخص سے وہ بچپن میں کئی مرتبہ مل چکی تھی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ باوقار معلوم ہو رہا تھا۔

"تم آخر بات کو سمجھتے کیوں نہیں۔ اگر تم ان کے ہتھے چڑھ گئے تو وہ تمہیں جان سے مار دیں گے اور میں یہ نہیں چاہتی۔ اگر ایسا ہوا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گی۔ اس وقت میری جگہ ابو ہوتے تو یہی کچھ کرتے۔ اس لیے تم میرے ساتھ چلو۔"

کیٹ نے یہ بات غلط نہیں کہی تھی کہ پولیس نے شہر سے باہر جانے والی تمام سڑکوں پہ چوکیاں قائم کر دی ہوں گی۔ بانڈا کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ جنوبی افریقہ کی پولیس اسے ہر حال میں زندہ یا مردہ گرفتار کرنا چاہتی تھی۔ سفید فام حکومت نے اُسے اس لیے باغی قرار دے دیا تھا کہ وہ اس ملک کے اصل سیاہ فام باشندوں کے حقوق کے لیے سینہ سپر تھا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ وہ سفید فاموں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کرنے کی ہمت رکھتا تھا۔ وہ سیاہ فاموں کے حقوق کی بات کر سکتا تھا۔

"لگتا ہے کہ تم نے کوئی ٹھوس اور قابلِ عمل منصوبہ تیار کر لیا ہے۔" اُس کی آواز بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اس کا کافی خون ضائع ہو گیا تھا۔

"بس باتیں نہ کرو۔ اپنی توانائی محفوظ رکھو۔ سب باتیں مجھ پر چھوڑ دو۔" کیٹ نے نہایت اعتماد سے کہا۔ اس کے لہجے اور الفاظ میں جتنا اعتماد تھا۔ اتنا ہی وہ اندر ہی اندر ڈر رہی تھی۔ یہ اُس نے بہت بڑی ذمے داری اپنے سر لی تھی۔ بانڈا کی زندگی اب اس کے ہاتھ میں تھی۔ اگر ذرا سی غلطی سے بھی اسے کوئی گزند پہنچا تو واقعی وہ خود کو کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔ بس اُس کی یہی دُعا تھی کہ ڈیوڈ کہیں چلا نہ گیا ہو ویسے وہ اس کے بغیر بھی اس ذمے داری کو نبھانے کا حوصلہ اور عزم رکھتی تھی۔ وہ چند لمحے اپنے باپ کے پرانے دوست اور ہمدرد کو بغور دیکھتی رہی۔ پھر بولی "میں اپنی موٹر گاڑی گلی میں لا رہا ہوں۔ بس دس منٹ انتظار کرو۔ اس کے بعد باہر آ جانا۔ میں کار کا پچھلا دروازہ کھلا رکھوں گی۔ اس میں داخل ہو کر فرش پر لیٹ جانا۔ پچھلی سیٹ پر کمبل رکھا ہو گا۔ اس سے اپنے آپ کو ڈھانپ لینا۔

"نہیں کیٹ میں تمہیں کسی مصیبت میں پھنسانا نہیں چاہتا۔ اس وقت پولیس والے شہر سے باہر جانے والی ہر کار کو چیک کریں گے اگر......!

"ہم کار سے نہیں جا رہے ہیں۔ صبح آٹھ بجے ایک ٹرین کیپ ٹاؤن روانہ ہوتی ہے۔ میں نے ہدایت کر دی ہے کہ میری ریل کار اس میں لگا دی جائے۔"

"تو کیا تم مجھے اپنی ریل کار کے ذریعہ یہاں سے نکالو گی؟" بانڈا نے حیرت سے کہا۔ "تم واقعی جمی کی بیٹی ہو۔ کسی اور شخص کی بیٹی یہ جرأت مندانہ کام نہیں کر سکتی تمہارا باپ بھی ایسا ہی تھا۔ وہ بدترین حالات میں بھی حوصلہ نہیں ہارتا تھا۔ اس عظیم شخصیت نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔"

اور اس کے تیس منٹ بعد وہ ریلوے یارڈ میں داخل ہو رہی تھی۔ بانڈا کار کی پچھلی نشست کے آگے پائیدان میں دبکا ہوا تھا۔ اس پر کمبل پڑا ہوا تھا۔ شہر میں سڑکوں پر پولیس نے جو رکاوٹیں قائم کی تھیں، ان سے گزرتے ہوئے اُسے کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ وہ کوئی معمولی شخصیت نہیں تھی۔ لوگ اسے جانتے تھے۔ لیکن ریلوے یارڈ میں حفاظتی اقدامات زیادہ ہی سخت تھے۔ اس نے جونہی کار یارڈ کی طرف موڑی ایک تیز روشنی لہراتی ہوئی اس کی آنکھوں میں پڑی۔ اور کیٹ نے دیکھا کہ چھ سات پولیس والے اس کا راستہ روکے ہوئے تھے۔ ایک جانی پہچانی شخصیت اس کی طرف بڑھی۔ یہ وہی پولیس چیف تھا جس کی نگرانی میں اس کے دفتر کی تلاشی لی گئی تھی۔ اُس نے بھی کیٹ کو پہچان کر شناخت کر لیا اور مسکرا کر بولا۔ "آپ یہاں کیا کر رہی ہیں مس؟"

"میرے آفس میں جو کچھ ہوا۔ اس سے میں واقعی پریشان ہو گئی ہوں۔ میں نے سوچا ہے کہ جب تک آپ اس مفرور قاتل کو گرفتار نہ کر لیں میں اس شہر سے چلی جاؤں گی۔ آپ نے اسے پکڑ تو نہیں لیا؟"

"ابھی تک ہم اسے گرفتار نہیں کر سکے ہیں، لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ ادھر ضرور آئے گا۔ بہرحال وہ کسی راہ سے بھی شہر سے فرار ہونے کی

کوشش کرے ہم اسے ضرور پکڑ لیں گے۔ وہ ہم سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ ویسے آپ کہاں جا رہی ہیں؟"
"میری ریل کار پلیٹ فارم کے سرے پر لگا دی گئی ہے صبح کی ٹرین سے میں کیپ ٹاؤن جا رہی ہوں۔"
"آپ کہیں تو میں اپنا ایک آدمی آپ کے ساتھ کر دوں؟" چیف نے پوچھا۔
"شکریہ جناب! میں سمجھتی ہوں، اب اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کے لوگ تو یہاں موجود ہیں۔ میں بالکل مطمئن ہوں۔"
پانچ منٹ بعد وہ اور بانڈا ریل کار میں موجود تھے۔ اس میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ریل کار میں لیمپ جلا کر روشنی کی جا سکتی تھی۔ لیکن ایسا کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس نے بانڈا کو نرم اور آرام دہ بستر پر لٹا دیا اور بولی "تمہیں یہاں صبح تک لیٹے رہنا ہے۔ جب ریل کار کو ٹرین میں لگایا جائے گا تو تم باتھ روم میں چلے جانا۔"
"ٹھیک ہے کیٹ! تمہارا بہت بہت شکریہ۔"
کیٹ نے کھڑکیاں بند کر دیں اور پھر اس سے دریافت کیا "کیا کیپ ٹاؤن میں کوئی ڈاکٹر ہے جو تمہارے زخموں کا علاج کر سکے۔ یا پھر مجھے انتظام کرنا ہوگا۔ وہاں میرے کئی شناسا اور قابلِ اعتماد ڈاکٹر ہیں۔"
"تو کیا تم کیپ ٹاؤن جا رہی ہو؟" بانڈا نے حیرت سے پوچھا۔
"اور کیا۔ میں تمہیں تنہا تو نہیں جانے دوں گی۔ میں اس خطرناک صورتِ حال سے پورا پورا لطف اٹھانا چاہتی ہوں۔"
بانڈا آہستہ سے ہنسا۔ پھر وہ اس ہولناک مہم کے بارے میں سوچنے لگا جو اس نے جمی کے ساتھ سر کی تھی۔
سورج طلوع بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک انجن نے ریل کار کو کیپ ٹاؤن جانے والی ٹرین میں لگا دیا۔ ٹھیک آٹھ بجے ٹرین روانہ ہو گئی۔ کیٹ نے رات ہی ریلوے حکام کو ہدایت کر دی تھی کہ اب اسے پریشان نہ کیا جائے۔ بانڈا کے زخم سے پھر خون بہنے لگا تھا۔ کیٹ نے ایک مرتبہ پھر اس کی مرہم پٹی کی۔ وہ گزشتہ شام لڑکھڑاتا ہوا اس کے آفس میں داخل ہوا تھا۔ اس وقت اس کی حالت بہت خراب تھی۔ اس وقت سے اب تک وہ بانڈا سے بات بھی نہیں کر سکی تھی۔ اب مرہم پٹی کرنے کے بعد کیٹ نے سکون محسوس کیا تھا۔ وہ دیر تک چپ چاپ اس لمبے تڑنگے سیاہ فام کو دیکھتی رہی۔ وہ جاگ رہا تھا۔ کیٹ نے اسے مخاطب کر کے کہا "اب بتاؤ بانڈا۔ یہ سب کیا چکر ہے؟"
بانڈا نے غور سے کیٹ کو دیکھا۔ وہ بھلا اپنی کہانی کہاں سے شروع کرتا۔ اس کے مصائب کا آغاز تو اس وقت سے ہوا تھا۔ جب سفید فاموں نے اس کے دیس، اس کی جنم بھومی جنوبی افریقہ پر قبضہ کرنا شروع کیا تھا اور یہاں کے باشندوں سے ان کی آبائی زمینیں چھین لی تھیں۔ یا پھر اس وقت سے جب جنوبی افریقہ کی پارلیمنٹ میں یہ اعلان کیا گیا تھا "ہمیں سیاہ فاموں پر حکمرانی کا حق ہے۔ سیاہ فاموں کو غلام بنا لیا جائے۔" اس کے مصائب کا آغاز تو سفید فاموں کی آمد کے ساتھ ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے مہذب اور تعلیم یافتہ ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھایا تھا اور سیاہ فاموں کے خلاف ننگِ انسانیت کارروائیاں کر کے ان کا جینا حرام کر دیا تھا۔
بانڈا نے آہستگی سے کہا "پولیس نے میرے بیٹے کو قتل کر دیا تھا۔"
اور پھر اس نے تمام واقعات سنا ڈالے۔ اس کا بڑا بیٹا ٹومبے ایک سیاسی جلسے میں شریک تھا کہ پولیس نے اس جلسے کو درہم برہم کرنے کے لیے وحشیانہ کارروائی کی۔ فائرنگ ہوئی اور اس کے بعد فساد شروع ہو گیا۔ ٹومبے کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔ اگلی صبح وہ جیل کی کوٹھری میں لٹکا ہوا پایا گیا۔ پولیس کا بیان تھا کہ اس نے خودکشی کر لی تھی۔ "لیکن میں جانتا ہوں ایسا نہیں ہے۔ ہم اس طرح خودکشی نہیں کرتے۔ اسے پولیس نے قتل کیا تھا۔" بانڈا نے گہرا سانس لے کر کہا۔
"اُف میرے خدا۔ یہ تو سراسر ظلم ہے۔ وہ تو بالکل نوجوان تھا۔" کیٹ نے اٹکتے ہوئے کہا۔ پھر اس کے ذہن میں کئی یادیں تازہ ہو گئیں۔ کتنی ہی مرتبہ وہ ٹومبے کے ساتھ بچپن میں کھیل چکی تھی۔ وہ کتنا زندہ دل اور ہنس مکھ لڑکا تھا۔ اپنے باپ کی طرح مضبوط اعضا کا کڑیل جوان خوبصورت اور تندرست۔ اس کی بے وقت موت پر جتنا بھی افسوس کیا جاتا کم تھا۔ کیٹ نے گہرا سانس لے کر کہا "مجھے افسوس ہے۔ بے حد افسوس ہے لیکن وہ تمہارے تعاقب میں کیوں ہیں؟"
"ٹومبے کی موت کے بعد میں نے اپنے لوگوں کے مظاہروں کو منظم کیا۔ میں اس خون کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ میں اپنے بیٹے کے خونِ ناحق پر خاموش تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ ہم نے تو معاف کر دینا سیکھا ہی نہیں ہے اور پھر پولیس نے مجھے باغی قرار دے دیا۔ حکومت کا دشمن قرار دے دیا۔ پولیس نے مجھے ڈکیتی کی ایک واردات کے الزام میں گرفتار کر لیا حالانکہ میرا اس واردات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر مجھے بیس سال قید کی سزا دی گئی۔ ہم چار آدمیوں نے جیل توڑ کر فرار ہونے کا منصوبہ بنایا اور کامیاب رہے۔ اس کارروائی میں ایک محافظ گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا۔ وہ اس کی ہلاکت کا الزام مجھ پر لگا رہے ہیں۔ حالانکہ میں نے زندگی میں کبھی کوئی بندوق بھی ہاتھ میں نہیں لی۔ وہ ایک دوسرے قیدی

کے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا۔"

کیٹ تھوڑی دیر کچھ سوچتی رہی پھر ایک گہرا سانس لے کر بولی "میں جانتی ہوں۔ اب ہم سب سے پہلا کام یہ کریں گے کہ تمہیں کسی محفوظ جگہ منتقل کر دیا جائے۔"

"مجھے افسوس ہے کیٹ کہ میں نے تمہیں اس مصیبت میں ڈال دیا۔" بانڈا نے پھیکی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیر کے کہا

"نہیں بانڈا۔ تم نے مجھے کسی مصیبت میں گرفتار نہیں کیا۔ تم میرے دوست ہو میرے خاندان پر تمہارے کئی احسانات ہیں۔ تمہیں بچانا، تمہارے حقوق کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے، پہلا سفید فام جس نے مجھے دوست کہا تھا۔ تمہارا باپ جمی تھا۔ خیر یہ بتاؤ کہ تم کیپ ٹاؤن میں مجھے اس ٹرین سے باہر کیسے نکالو گی؟" بانڈا نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہم کیپ ٹاؤن نہیں جائیں گے۔"

"لیکن تم نے تو کہا تھا کہ ......"

"ہاں لیکن میں عورت ہوں جلد جلد اپنے ارادے تبدیل کر سکتی ہوں۔" کیٹ نے اس کی بات کاٹ کر جواب دیا۔

نصف شب کے قریب جب ٹرین ورسسٹر اسٹیشن پر رکی تو کیٹ نے اپنی ریل کار ٹرین سے علیحدہ کرالی اور حکام نے ریل کار کو ایک فاضل پلیٹ فارم پر لگا دیا۔

صبح جب کیٹ کی آنکھ کھلی تو اس نے بانڈا کا بستر خالی پایا۔ اس کا دوست جا چکا تھا۔ وہ کیٹ کو مزید پریشانیوں میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے بانڈا کی اس حرکت پر پیار بھی تھا اور غصہ بھی۔ لیکن وہ مطمئن تھی۔ بانڈا اب محفوظ تھا۔ اس کے بہت سے دوست تھے وہ ان کے درمیان محفوظ رہ سکتا تھا۔ اس کے مشن کی نوعیت ایسی تھی کہ وہ کبھی ایک جگہ ٹک کے نہیں رہ سکتا تھا۔

وہ بہت خوش تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ڈیوڈ یہ کارنامہ سنے گا تو بے حد خوش ہوگا۔

✿

"مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اتنی احمق بھی ہو سکتی ہو۔" ڈیوڈ نے چیخ کر کہا۔

دارالحکومت واپس پہنچ کر جب کیٹ نے تمام واقعہ ڈیوڈ کو سنایا تو وہ سخت برہم ہو گیا تھا۔ وہ حیرت سے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے وہ کام کیا تھا۔ جس کا تصور کوئی آدمی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک سیاہ فام معتوب مجرم کو پناہ دینا اور اسے پولیس کے نرغے سے بچانا جنوبی افریقہ میں بدترین جرم سمجھا جاتا تھا اور کیٹ یہ کام کر گزری تھی۔

ڈیوڈ کا غصہ اپنے عروج پر تھا۔ "تم نے خود کو ہی خطرے میں نہیں ڈالا تھا بلکہ پوری کمپنی کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ تمہیں معلوم ہے۔ اگر پولیس بانڈا کو اس دفتر سے برآمد کر لیتی تو کیا ہوتا؟ وہ کیا سلوک کرتے تم سے!"

"ہاں میں جانتی ہوں مجھے معلوم ہے وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتے۔ وہ مجھے ہلاک کر دیتے۔" کیٹ نے اطمینان سے جواب دیا

اس کا جواب ڈیوڈ کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کر گیا۔ "تم واقعی احمق ہو، تم معاملات کو سمجھ ہی نہیں سکتیں۔"

"میں سب کچھ جانتی ہوں اور سمجھتی ہوں لیکن انسان ہوں۔ بانڈا کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ وہ ابو کا دوست ہے۔ اسی کی وجہ سے آج ہم اتنے بڑے کاروبار کو چلا رہے ہیں۔ وہ ابو کا ساتھ نہ دیتا تو یہ کمپنی قائم نہ ہوتی۔ سمجھے ڈیوڈ۔ اتنے بے حس، بے رحم، بے مروت اور احسان فراموش نہ بنو۔" کیٹ بھی طیش میں آگئی تھی اور وہ شعلہ بار نگاہوں سے اسے گھور رہی تھی۔ اس کے سان و گمان میں نہ تھا کہ ڈیوڈ کا ردعمل اتنا برا ہوگا۔ اس پتھر دل شخص نے اسے بری طرح مایوس کیا تھا۔

"تم اب بھی بچی ہو کیٹ!" ڈیوڈ نے بدستور جھنجلاہٹ سے کہا۔

کیٹ نے اسے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ ڈیوڈ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "کیٹ! خدا کے لیے اپنے غصے پر قابو پانا سیکھو۔"

اپنے غصے پر قابو پانا سیکھو! یہ الفاظ اس کے ذہن میں گونجے۔ ان الفاظ کی بازگشت نے اسے ماضی میں پہنچا دیا۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ وہ چار برس کی تھی۔ ایک لڑکے نے اسے چھیڑا تھا اور وہ اس سے الجھ گئی تھی۔ پھر دونوں میں مکے بازی شروع ہو گئی تھی۔ مقابلہ جاری تھا کہ ڈیوڈ ادھر آنکلا۔ اس کو دیکھ کر لڑکا بھاگ گیا۔ کیٹ نے اس کے پیچھے بھاگنا چاہا تو ڈیوڈ نے اسے پکڑ لیا۔ "رک جاؤ کیٹ! اپنے غصے پر قابو پانا سیکھو۔ بچیاں مکے بازی نہیں کرتیں۔"

"میں بچی نہیں ہوں مجھے چھوڑ دو۔" وہ پیر پٹخ کر بولی۔

ڈیوڈ نے اسے چھوڑ دیا۔ اس کی گلابی فراک مٹی سے بھر گئی تھی اور کئی جگہ سے پھٹ چکی تھی۔ اس کے چہرے پر کئی جگہ خراشیں آگئی تھیں۔ "آؤ کیٹ، اپنی حالت درست کرو۔ کپڑے بدلو، بال بناؤ، تمہاری امی آنے والی ہیں۔"

کیٹ نے بھاگتے ہوئے لڑکے کو دیکھا اور بولی "اگر تم مجھے نہ پکڑتے تو میں اس چھوکرے کو وہ مزا چکھاتی کہ یاد رکھتا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی کلائی سے باچھوں سے بہتے ہوئے خون کو صاف کیا۔

پھر ڈیوڈ نے اسے گود میں اٹھالیا اور گھر میں لے گیا۔ بچپن ہی سے وہ ڈیوڈ کو پسند کرتی تھی۔ بڑوں میں صرف وہی تو تھا جو کیٹ کو سمجھتا تھا۔ اس کا مزاج داں تھا۔ وہ جب کبھی بھی شہر آتا۔ بیشتر وقت کیٹ کے ساتھ ہی گزارتا۔ جمی اکثر فرصت کے اوقات میں ڈیوڈ کو اپنی اس مہم کے قصے سنایا کرتا تھا۔ جو اس نے بانڈا کے ساتھ سر کی تھی اور اب یہی قصے ڈیوڈ کیٹ کو سناتا تھا۔ وہ انہیں غور سے سنتی۔ بہت سی باتیں اس کی سمجھ میں آجاتیں، بہت سی سمجھ میں نہ آتیں۔ پھر بھی اُسے بہت مزا آتا۔

"ڈیوڈ مجھے اس ہیرے کے بارے میں پھر بتاؤ جو انہوں نے بنایا تھا۔" وہ کہتی۔

اور ڈیوڈ اسے تمام تفصیلات بتانے لگتا۔

"مجھے شارک مچھلیوں والا قصہ سناؤ،.... اور ہاں وہ سمندری کہر۔ وہ کیا ہوتی ہے...."

کیٹ کی اپنی ماں سے ملاقات کم ہی ہوتی۔ وہ تو کمپنی کے معاملات میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ یہ کمپنی جمی نے قائم کی تھی اور وہ اسے زیادہ سے زیادہ ترقی دینا چاہتی تھی۔ وہ ہر رات ڈیوڈ سے کمپنی کے معاملات پر تبادلہ خیال کرتی۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ جمی کی بیماری کے دوران اس کی زندگی کے آخری دور میں تبادلہ خیال کرتی تھی اور جمی سے کہا کرتی تھی "یہ جو ڈیوڈ ہے نا بہت کام کا آدمی ہے، بہت محنتی اور ایماندار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب کیٹ کمپنی کا کاروبار سنبھالے گی تو وہ اسے بھی بہت مدد دے گا۔"

کیٹ بہت خودسر، ضدی اور ہٹیلی لڑکی تھی۔ وہ نہ اپنی ماں کا کہنا مانتی نہ جینا کا۔ وہ اس کے لیے کوئی لباس پسند کرتیں تو کیٹ اسے چھوڑ کر کوئی دوسرا لباس پہن لیتی۔ یہی حال خوراک کا تھا۔ جو اس کی مرضی میں آتا کھاتی۔ اس میں بھی کوئی نظم وضبط نہ تھا۔ اسے کتنا ہی لالچ دیا جاتا کتنی ہی دھمکیاں دی جاتیں لیکن وہ جس بات پر اڑ جاتی پھر ٹس سے مس نہ ہوتی۔ جب کبھی اُسے زبردستی کسی سالگرہ میں لے جایا جاتا تو وہاں وہ ہنگامہ کر دیتی۔ اس کی کوئی سہیلی نہیں تھی۔ رقص سے اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی اس کے برعکس وہ اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ لڑکوں کے کھیل کھیلا کرتی۔ جب اسے اسکول میں داخل کیا گیا تو وہ اسکول کے لیے ایک مسئلہ بن گئی۔ اس کے بعد مارگریٹ کا یہ معمول ہو گیا کہ ہر ماہ ایک آدھ مرتبہ اسکول جاکر ہیڈ مسٹریس کو مناتی کہ وہ کیٹ کو معاف کر دیں اور اسکول سے نہ نکالیں ہیڈ مسٹریس بڑی تشویش سے کہتی "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیٹ کا کیا کروں۔ وہ بہت ذہین اور ہوشیار بچی ہے۔ لیکن اس میں ضد اور بغاوت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ وہ نظم وضبط کی پابندی نہیں کرتی۔ آپ ہی بتایئے کیا کیا جائے۔"

لیکن خود مارگریٹ کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ کیٹ کو صرف ڈیوڈ ہی قابو کر سکتا تھا۔ ایک دن اس نے کہا "سنا ہے آج تمہیں ایک سالگرہ میں بلایا گیا ہے؟"

"مجھے یہ سالگرہ کی تقریبات قطعی پسند نہیں ہیں۔" کیٹ نے منہ بنا کر کہا۔

ڈیوڈ نے جھک کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "میں جانتا ہوں کہ تم ایسی تقریبات کو پسند نہیں کرتی ہو لیکن جس بچی کی یہ سالگرہ ہے اس کے والد میرے بہترین دوست ہیں۔ اگر تم وہاں نہ گئیں یا وہاں جاکر تم نے شرارت کی تو مجھے ان سے بہت شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔"

کیٹ نے غور سے ڈیوڈ کو دیکھا اور نرمی سے بولی "کیا وہ تمہارے بہت ہی اچھے دوست ہیں؟"

"ہاں۔"

"تو پھر میں ضرور جاؤں گی۔"

اس دن کیٹ نہ صرف تقریب میں گئی بلکہ وہاں اُس نے کوئی شرارت بھی نہیں کی۔ واپس آکر مارگریٹ نے ڈیوڈ سے کہا "تم نے واقعی کمال کر دیا۔"

وہ مسکرا کر دھیمی آواز میں بولا "وہ لڑکی بہت جذباتی ہے۔ اسے اگر اس کی اہمیت کا احساس دلایا جائے تو وہ ذمے داری کا مظاہرہ کرتی ہے۔ بس اہم بات یہ ہے کہ اُسے بچی نہ سمجھا جائے۔ اس کی طبیعت میں جو جولانی ہے اسے دبایا نہ جائے۔"

"مگر بعض اوقات یہ لڑکی مجھے اتنا زچ کر دیتی ہے کہ اس کی گردن مروڑ دینے کو جی چاہتا ہے۔"

وقت گزرتا رہا۔ کیٹ دس برس کی ہوگئی۔ وہ ڈلیوڈ سے اپنے والد اور بانڈا کے واقعات سن سن کر اتنی متاثر ہو چکی تھی کہ ایک دن اس نے کہا، "میں بانڈا سے ملنا چاہتی ہوں۔"

ڈلیوڈ نے حیرانی سے اُسے دیکھا اور بولا، "یہ ناممکن ہے۔ بانڈا کا گاؤں یہاں سے بہت دور ہے۔"

"مجھے بتاؤ کہ تم مجھے اس کے پاس لے کر چلو گے یا نہیں یا پھر تم یہ چاہتے ہو کہ میں تنہا ہی اس سے ملنے جاؤں؟"

اور ڈلیوڈ کے پاس اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اگلے ہفتے وہ اسے لے کر بانڈا کے کھیتوں پر گیا۔ جہاں وہ کھیتی باڑی کرتا تھا اور جہاں اس نے شتر مرغ پال رکھے تھے۔ بانڈا نے اپنے لیے جو رہائش گاہ تعمیر کی تھی مٹی اور گارے سے اس کی دیواریں اٹھائی گئی تھیں۔ یہ جھونپڑی گول تھی اور اس کے وسط میں ایک موٹی سی لکڑی کا کھمبا نصب تھا۔ جس کے سہارے مخروطی چھت ڈالی گئی تھی جس وقت ڈلیوڈ گاڑی میں کیٹ کو لیے ادھر پہنچا۔ بانڈا اپنی جھونپڑی کے باہر کھڑا تھا۔ گاڑی رکی تو دراز قد سیاہ فام نے قریب پہنچ کر کیٹ کا بغور جائزہ لیا اور پُر جوش لہجے میں بولا "تم..... تم میرے دوست جمی کی بیٹی ہو نا؟"

"ہاں،" وہ خوش ہو کر بولی "میں دیکھتے ہی پہچان گئی تھی۔ میں تم سے ملنے آئی ہوں۔ تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں کہ تم نے میرے ابو کی جان بچائی تھی۔ ان کی ترقی میں تم نے بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔"

دیو قامت حبشی نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا "تو تم کو کسی نے یہ کہانیاں بھی سنا دی ہیں۔ خیر اندر آؤ۔ میرے گھر والوں سے ملو۔"

اس کی بیوی بھی اسی کی طرح دراز قد عورت تھی اور بڑی وجیہہ تھی۔ بانڈا کے دو بیٹے تھے۔ ٹمبے جو کیٹ سے سات سال بڑا تھا اور ماگنا جو اس سے چھ سال بڑا تھا۔ ٹومبے ہو بہو اپنے باپ پر گیا تھا۔ وہ شام تک ان دونوں لڑکوں کے ساتھ کھیلتی رہی۔ کھانا انہوں نے مل جل کے ایک ہی دسترخوان پر کھایا۔ ڈلیوڈ کو ایک سیاہ فام خاندان کے ساتھ کھانا کھانا کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بانڈا کی عزت کرتا تھا۔ لیکن جنوبی افریقہ کا یہ قانون تھا کہ سیاہ فاموں اور سفید فاموں کے درمیان اس قسم کے تعلقات قائم نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اس باغی کی سیاسی سرگرمیوں کی طرف سے بھی پریشان تھا۔ یہ خبریں عام تھیں کہ بانڈا سفید فام حکومت کے خلاف چلائی جانے والی تحریک کے چوٹی کے رہنماؤں میں سے ایک تھا۔ وہ جنوبی افریقہ میں انقلابی سماجی تبدیلیوں کے لیے تحریک چلا رہا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب اس تحریک کی وجہ سے کان کے مالکوں کو مطلوبہ تعداد میں سیاہ فام کان کن نہیں مل رہے تھے اور حکومت نے ان تمام سیاہ فاموں پر دس شلنگ ٹیکس عاید کر دیا تھا جو کانکن کی حیثیت سے کام نہیں کرتے تھے۔ اس فیصلے کے بعد جنوبی افریقہ میں ہر جگہ فسادات شروع ہو گئے۔ سفید فاموں کو جان کے لالے پڑ گئے تھے اور سفر بھی خطرناک ہو گیا تھا۔ ڈلیوڈ کو یہ خیال آیا اور اس نے کہا، "چلو بھئی۔ سورج غروب ہونے والا ہے اور ہمیں بہت دور جانا ہے۔"

اس کے بعد ڈلیوڈ جب کبھی وہاں آتا کیٹ اس کے ساتھ بانڈا سے ملنے ضرور جاتی۔

وقت گزرتا رہا اور ڈلیوڈ کا یہ خیال بھی غلط ثابت ہو گیا کہ کیٹ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ سنجیدہ ہوتی جائے گی۔ اس کے برعکس وہ اور بھی ضدی اور ہٹ دھرم ہوتی چلی گئی۔ اس کی سرگرمیاں بالکل ہی مختلف تھیں۔ لڑکیوں کے مشغلوں میں اس کا جی ہی نہیں لگتا تھا۔ وہ ڈلیوڈ کے ساتھ کانوں میں جانے پر اصرار کرتی۔ اس کے ساتھ شکار پر جاتی۔ ایک دن وہ اس کے ساتھ دریائے وال کے کنارے مچھلیوں کا شکار کھیل رہی تھی کہ اس نے ایک بہت بڑی مچھلی پکڑی۔ ڈلیوڈ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا، "تمہیں تو قدرت نے غلط ہی لڑکی بنایا۔ تمہیں لڑکا ہونا چاہیے تھا۔"

کیٹ یہ سن کر غصے سے سرخ ہو گئی۔ ہاتھ زور سے اچھال کے بولی "یہ کیا بات کہی تم نے۔ میں لڑکا ہوتی تو پھر تم سے میری شادی کیسے ہوتی؟"

ڈلیوڈ ہنس پڑا۔ کس قدر احمق لڑکی ہے۔ بھلا اس بچی سے میری شادی کیسے ہو سکتی ہے۔ اس نے سوچا۔

"تم ہنس کیوں رہے ہو۔ تمہیں یقین نہیں کہ ہماری شادی ہو گی۔" کیٹ نے خفگی سے کہا۔

"ہاں بھئی۔ اب یہی دیکھو۔ میری عمر کیا ہے۔ تم سے کم از کم بائیس برس بڑا ہوں میں۔ میرا تمہارا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ ایک دن کسی سمت سے کوئی شہزادہ آئے گا اور تمہیں بیاہ کرلے جائے گا۔ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔"

"مجھے کسی شہزادے کی ضرورت نہیں۔ مجھے صرف تمہاری ضرورت ہے۔" کیٹ نے جیسے فیصلہ سنا دیا۔

ڈلیوڈ نے اُس سے مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اس کی ان باتوں کو اس کی ناسمجھی پر محمول کرتا رہا لیکن کیٹ کو سو فی صد یقین تھا کہ وہ ڈلیوڈ سے شادی کرے گی۔ وہ بس اتنا جانتی تھی کہ دنیا میں اس کے لیے ڈلیوڈ کے سوا کوئی اور آدمی نہیں۔ وہ اس ذہین اور

وہ یہ شخص سے خود کو ہمیشہ کے لیے وابستہ کر چکی تھی اور اس کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔
مارگریٹ ہفتے میں ایک مرتبہ ڈیوڈ کو اپنے گھر رات کے کھانے پر ضرور مدعو کرتی۔ عام طور پر کیٹ باورچی خانے میں ملازموں کے ساتھ کھانا پسند کرتی کیونکہ وہاں اسے کھانے کے آداب کا لحاظ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ لیکن جمعے کے دن وہ آتا تو کیٹ باورچی خانے میں کھانا نہیں کھاتی تھی۔ عموماً وہ تنہا ہی آتا لیکن کبھی کبھار اس کے ساتھ کوئی عورت بھی ہوتی جسے دیکھ کر کیٹ جل ہی تو جاتی اور موقع ملتے ہی اس پر اپنے جلاپے کا کھل کر اظہار بھی کر دیتی، ساتھ ہی اس عورت کے بارے میں ایسے ایسے فقرے کستی کہ ڈیوڈ کے ہوش ٹھکانے آجاتے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈیوڈ نے عورتوں کو لانا ہی چھوڑ دیا۔

کیٹ اب چودہ برس کی ہو گئی تھی لیکن اس کے طور طریقوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ صرف مارگریٹ کے لیے ہی نہیں اسکول میں استانیوں کے لیے بھی مسئلہ تھی۔ آخر ایک دن ہیڈ مسٹریس نے اس کے بارے میں بات کرنے کے لیے مارگریٹ کو بلا ہی لیا اور برہمی سے بولی ”مادام میں ایک ایسا اسکول چلا رہی ہوں جس کی ساکھ بہت اچھی ہے۔ جو بہت نیک نام ہے۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ کی بیٹی ہمارے لیے بدنامی کا سبب بن رہی ہے۔“
”کیوں۔ کیا ہوا؟“ مارگریٹ نے مسئلے کی نوعیت کو جاننے کے باوجود حیرت سے پوچھا۔
”وہ دوسری بچیوں کو ایسے گندے الفاظ سکھا رہی ہے جو اس سے پہلے انہوں نے کبھی نہیں سنے۔ ایسی بے ہودہ باتیں جو کبھی میرے کان میں بھی نہیں پڑیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ یہ باتیں کہاں سے سیکھ کر آتی ہے۔“
ایک ماں کی حیثیت سے وہ جانتی تھی کہ اس کی بیٹی نے یہ بے ہودہ باتیں کہاں سے سیکھی ہیں۔ اُس نے آخر کار اس جھگڑے کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا اور بولی ”آپ فکر نہ کریں۔ میں کیٹ کو اس اسکول سے اٹھا رہی ہوں۔ میں اُسے انگلستان بھیج دوں گی۔“
مارگریٹ نے بیٹی کو جنوبی افریقہ سے بہت دور انگلستان بھیجنے کا فیصلہ بہت غور و فکر کے بعد کیا تھا۔ جب اُس نے اس بارے میں ڈیوڈ سے گفتگو کی تو اُس نے کہا ”مگر وہ اسے پسند نہیں کرے گی۔“
”میں مجبور ہوں۔ وہ بہت بگڑ گئی ہے۔ بالکل لفنگوں کی طرح گفتگو کرتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر وہ ایسا کیوں کرتی ہے۔ وہ ذہین ہے۔ تیز ہے۔ پھر بھی ....“ اس کی آواز بھرا گئی اور جملہ ادھورا رہ گیا۔
”میرا خیال ہے کہ وہ بہت ہی مختلف لڑکی ہے۔ عام لڑکیوں سے زیادہ ذہین ہے۔“
”کچھ بھی ہو۔ میں اُسے انگلستان بھیج رہی ہوں۔“
اور جب کیٹ کو اس کی ماں نے یہ خبر سنائی تو ایک لمحے کو وہ حیران رہ گئی اور پھر غصے میں بھر کر بولی ”آپ مجھ سے جان چھڑانا چاہتی ہیں نا؟“
”یہ جان چھڑانے کی بات نہیں بیٹی۔ میں جو کچھ کر رہی ہوں تمہاری بھلائی کے لیے کر رہی ہوں۔“
”میں بھی اپنی بھلائی اور برائی سمجھ سکتی ہوں۔ میرے تمام دوست یہاں ہیں۔ آپ مجھے میرے دوستوں سے دور کرنا چاہتی ہیں۔“ کیٹ نے کہا۔
”تم ان لفنگوں کو اپنا دوست کہتی ہو؟“ مارگریٹ ناک بھوں چڑھا کے بولی۔
”وہ لفنگے نہیں ہیں۔ وہ سب بہت اچھے لوگ ہیں۔“ کیٹ نے پھر کہا۔
”میں تم سے بحث کرنا نہیں چاہتی۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تم انگلستان جاؤ گی اور یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔“
”میں اپنی جان ختم کر لوں گی۔ خودکشی کر لوں گی۔“ کیٹ بپھر گئی۔
”ٹھیک ہے۔ اوپر جاؤ۔ وہاں استرا موجود ہے۔ اس سے خودکشی کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے تو پھر گھر میں تمہیں کئی قسم کے زہر مل جائیں گے۔ جاؤ کر لو خودکشی۔“ مارگریٹ نے سرد لہجے میں جواب دیا۔
کیٹ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی ”ممی خدا کے لیے ایسا نہ کریں۔“
آخر وہ ماں تھی۔ اپنی بیٹی کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھ سکی۔ وہ ماں تھی اس لیے اپنی بیٹی کو بگڑتے بھی نہ دیکھ سکتی تھی۔ اس نے کیٹ کو پیار کرتے ہوئے کہا ”سنو بیٹی! میں تمہاری ماں ہوں۔ تمہاری بھلائی چاہتی ہوں۔ تم بڑی ہو رہی ہو۔ تمہاری شادی ہونی ہے اور کوئی بھی شخص کسی ایسی لڑکی سے شادی کرنا نہیں چاہے گا جو تمہاری طرح بے ہودہ گفتگو کرتی ہو۔ تمہاری مانند سڑکوں پر اچھل کود کرتی

ہو۔" کیٹ چلا کر بولی۔
"یہ غلط ہے ممی، یہ غلط ہے۔ ڈیوڈ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔"
"آخر ڈیوڈ کا اس سے کیا تعلق؟" مارگریٹ نے حیرت سے پوچھا۔
"ہم شادی کرنے والے ہیں ممی۔"
مارگریٹ نے گہری سانس لی اور بولی "ٹھیک ہے بیٹی میں جینا سے کہتی ہوں وہ تمہارا سامان باندھنا شروع کر دے گی۔ تم انگلستان روانہ ہونے کی تیاریاں کرو۔"
کیٹ کو لارڈز میں واقع دنیا کے سب سے بڑے اور اچھے اسکول میں داخل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس مہنگے اور شاندار اسکول میں امرا لارڈ، روسا اور نوابوں کی لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں۔ ڈیوڈ کے اسکول کی ہیڈ مسٹریس کے شوہر سے کاروباری تعلقات تھے۔ اس لیے کیٹ کو وہاں داخلہ کرانے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ جب کیٹ کو اس اسکول کے بارے میں علم ہوا تو اس نے اپنی ماں سے کہا "یہ آپ مجھے کس جہنم میں بھیج رہی ہیں۔ کیا آپ چاہتی ہیں کہ میں وہاں سے چھوئی موئی بن کر آؤں؟ سنا ہے دنیا بھر کی نرم و نازک، کمزور اور ڈرپوک لڑکیاں وہاں تعلیم حاصل کرتی ہیں۔"
"میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم وہاں سے طور طریقے سیکھ کر آؤ۔" مارگریٹ نے خشک لہجے میں جواب دیا۔
"مجھے طور طریقے سیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں، میں اپنے ذہن سے کام لینا جانتی ہوں۔"
"آدمی کو سلیقہ مند بیوی کی ضرورت ہوتی ہے۔ سلیقہ نہ سیکھو گی تو شادی کیسے کرو گی؟ کون آدمی تمہیں اپنائے گا؟"
"مجھے کسی سالے آدمی کی ضرورت نہیں۔ آپ مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتیں۔"
"میں نہیں چاہتی کہ تم آئندہ اس قسم کی زبان استعمال کرو۔"
ڈیوڈ کاروباری سلسلے میں انگلستان جانے والا تھا۔ لہٰذا یہی فیصلہ ہوا کہ وہ اسی کے ساتھ انگلستان جائے گی۔ مارگریٹ نے ایک روز ڈیوڈ سے کہا "میں چاہتی ہوں کہ تم خود اس بدتمیز لڑکی کو اسکول میں داخل کرا دو۔ اگر اسے اکیلا بھیجا گیا تو نہ معلوم کیا آفت ڈھا دے۔"
"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" ڈیوڈ نے جواب دیا۔
ڈیوڈ نے کیٹ کو بتایا کہ اسے اسکول میں داخل کرانے کا فریضہ اسے سونپا گیا ہے تو وہ غصے سے بھڑک کے بولی "تم بھی اتنے ہی خراب اور غلط آدمی ہو جتنی میری ممی ہیں۔ تم بھی مجھ سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہو۔ کیوں؟"
"نہیں میں تم سے جلد از جلد چھٹکارا نہیں چاہتا۔" ڈیوڈ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔
اور پھر وہ ڈیوڈ کے ساتھ سفر پر روانہ ہو گئی کیپ ٹاؤن سے لندن تک کا بحری سفر چار ہفتے کا تھا۔ کیٹ کو یہ سفر اس لیے بہت حسین لگ رہا تھا کہ ڈیوڈ اس کا ہم سفر تھا۔ یہ بات کہ وہ اس کے ساتھ تھی۔ اس کے رگ و پے میں ایک نشہ سا دوڑا دیتی تھی۔ وہ سوچتی۔ یہ تو بالکل ہنی مون جیسا لگ رہا ہے۔ فرق بس یہی ہے کہ ابھی ہماری شادی نہیں ہوئی ہے۔ سفر کے دوران بھی ڈیوڈ اپنے کمرے میں بیٹھا ہر وقت کام میں مصروف رہتا اور کیٹ صوفے پر دراز اسے کام کرتے دیکھتی رہتی ایک مرتبہ اس نے پوچھ ہی لیا "ڈیوڈ، ان ہندسوں کی ضرب تقسیم کرتے ہوئے تم بور نہیں ہوتے۔"
ڈیوڈ نے قلم رکھتے ہوئے کہا "یہ صرف ہندسے یا رقمیں نہیں ہیں۔ یہ سب کہانیاں ہیں۔"
"کیسی کہانیاں؟" کیٹ نے حیرت سے پوچھا۔
"اگر تم ان ہندسوں کو پڑھنا جانتی ہو، انہیں سمجھ سکتی ہو تو یہ ہندسے، یہ رقمیں ان کمپنیوں کی کہانیاں ہیں جن کی خرید و فروخت میں ہم مصروف ہیں۔ یہ رقمیں ان لوگوں کی کہانیاں ہیں جو ہمارے لیے کام کرتے ہیں۔ دنیا بھر میں ہزاروں افراد اپنی روزی اس کمپنی کی بدولت کما رہے ہیں جو تمہارے ابو نے قائم کی تھی۔"
"مسٹر ڈیوڈ! یہ بتاؤ کیا مجھ میں اپنے ابو کی کوئی بات آئی ہے؟"
"تم بہت سے معاملات میں اپنے ابو کی طرح ہو۔ انہی کی طرح ضدی، اپنی بات پر اڑ جانے والی، ان کی طرح ہی آزاد اور خود مختار۔"
"کیا واقعی میں ایک ضدی اور خود مختار عورت ہوں؟" کیٹ نے شرارت سے مسکرا کے پوچھا
ڈیوڈ چند لمحے خاموش رہا۔ پھر ایک گہرا سانس لے کے بولا "تم ایک بگڑی ہوئی بچی ہو۔ جو شخص بھی تم سے شادی کرے گا اس کی تو زندگی جہنم ہو جائے گی۔"

"ہائے بے چارہ۔ اسے کیا معلوم کہ میں اس کی زندگی جنت بنا دینا چاہتی ہوں۔" مارگریٹ نے دل ہی دل میں سوچا اور مسکرا دی۔

یوں ان کا سفر جاری رہا۔ بحری جہاز پہ یہ ان کا آخری دن تھا۔ ڈیوڈ نے آخر اس سے وہ سوال پوچھ ہی لیا جو کئی دن سے اس کے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔ "آخر تم اتنی ہٹ دھرم کیوں ہو؟"

"کیا تم بھی واقعی مجھے ایسی ہی سمجھتے ہو؟" کیٹ نے جواباً سوال کر دیا۔

"یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔ تم اپنی ممی کو بھی پاگل بنائے ہوئے ہو۔"

اس نے ڈیوڈ کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بڑے پیار سے پوچھا "تمہیں تو پاگل نہیں بنایا میں نے۔"

ڈیوڈ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ قدرے جھلا کے بولا "ایسی باتیں مت کرو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تم کس قماش کی لڑکی ہو؟"

"جھوٹ نہ بولو تم خوب سمجھتے ہو۔"

"آخر تم دوسری لڑکیوں جیسی کیوں نہیں ہو؟"

"میں ان جیسا بننے سے پہلے مرجانا پسند کروں گی۔" کیٹ نے نفرت سے کہا "میں کسی اور جیسی بننا نہیں چاہتی۔"

"خدا ہی جانے تمہارا کیا بنے گا؟" ڈیوڈ نے گہرا سانس لے کر کہا۔ وہ واقعی کیٹ کی طرف سے پریشان ہو گیا تھا۔

"بس تم اتنا وعدہ کرو کہ جب تک میں شادی کے قابل نہ ہوں۔ تم کسی سے شادی نہ کرنا۔ میں جلد از جلد بڑی ہو جاؤں گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔ تمہیں زیادہ دن انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔" کیٹ نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

ڈیوڈ اس کے لہجے کی سنجیدگی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے کیٹ کا ہاتھ تھام کر کہا "تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ بہت تیز، بہت ذہین بہت سمجھدار۔ میں چاہتا ہوں کہ جب میری شادی ہو اور خدا مجھے بیٹی دے تو وہ ہوبہو تم جیسی ہو۔"

کیٹ جھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور نہایت غصے میں چیخ کر کہا "مسٹر ڈیوڈ، تم سالے جہنم میں جاؤ۔" وہ یہ کہہ کر ڈائننگ ہال سے پیر پٹختی ہوئی نکل گئی۔ سب لوگ حیرت سے ان دونوں کو دیکھنے لگے۔ ڈیوڈ بغلیں جھانکنے لگا۔

لارڈز جانے سے پہلے انہوں نے تین دن لندن میں گزارے۔ یہ تین دن کیٹ کو خواب سے لگے۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ موٹر کاریں اور گھوڑا گاڑیاں ادھر اُدھر آجا رہی تھیں۔ لوگ خوبصورت اور رنگ برنگے لباسوں میں نہایت وقار سے چلتے نظر آتے تھے۔ تین دن انہوں نے لندن کی خوب سیر کی اور جب وہ لارڈز روانہ ہوئے تو کیٹ نے سوچا "خدا حافظ لندن۔ پیارے شہر میں ایک دن پھر یہاں آؤں گی۔ لیکن تب میں مسز ڈیوڈ بن چکی ہوں گی۔"

✡

لارڈز اسکول کیٹ جیسی آزاد فطرت لڑکی کے لیے ایک جیل تھا۔ ہر چیز کے اصول و قواعد تھے۔ ان کی خلاف ورزی پر کڑی سرزنش اور فہمائش ہوتی تھی۔ پرنسپل مسز جون بہت سخت گیر تھیں۔ استانیوں اور طالبات کے ساتھ ان کا رویہ انتہائی سخت تھا۔ کیٹ نے اسکول کے بارے میں اپنی امی کو لکھا "یہ اسکول ہے سالا۔ اس سے تو سالی جیل اچھی ہو گی اور یہاں کی لڑکیاں اف پناہ۔ گوبر ہیں گوبر امی۔ سالیوں کو سوائے کپڑوں اور لڑکوں کے کوئی اور موضوع ہی نہیں ملتا بات کرنے کا۔ جسے دیکھو کسی نہ کسی لونڈے کے چکر میں ہے اور یہاں کی استانیاں، سب کی سب چڑیلیں ہیں۔ یہ سمجھتی ہیں کہ مجھے یہاں قید رکھ سکیں گی۔ میں بھی دیکھتی ہوں کیسے کامیاب ہوتی ہیں وہ۔ جس دن بھی موقعہ ملا، بس بھاگ لوں گی تاپتی رہ جائیں گی سب کی سب۔"

اور کیٹ نے واقعی ایسا ہی کیا۔ تین مرتبہ وہ اسکول سے فرار ہوئی لیکن تینوں مرتبہ اسے پکڑ لیا گیا۔ وہ اپنی اس حرکت پر کبھی شرمندہ نہ ہوئی۔ البتہ افسوس اس بات پر ضرور ہوتا کہ وہ ہر مرتبہ پکڑ لی گئی۔ کیٹ کی ان حرکتوں سے اسکول کا سارا اسٹاف تنگ تھا۔ آخر ہفتے وار میٹنگ میں ایک استانی نے تجویز پیش کر دی "یہ لڑکی سخت خودسر اور بدتمیز ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ہم اسے واپس جنوبی افریقہ بھیج دیں۔"

دیگر استانیوں نے بھی اس تجویز کی تائید کی تو مسز جون نے کہا "میں بھی آپ سب کی ہم خیال ہوں لیکن اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم سب مل کر ایک لڑکی کو راہ راست پر لانے میں ناکام ہو گئے ہیں۔ یہ لڑکی ہم سب کے لیے ایک چیلنج ہے۔ اگر ہم اس چڑیل کو سدھارنے میں کامیاب ہو گئے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم کسی بھی لڑکی کو خواہ وہ کیسی ہی خودسر کیوں نہ ہو سدھارنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

اور یوں، کیٹ اسی اسکول میں رہی۔ اس کی خودسری جاری رہی۔ استانیوں کی کوششیں جاری رہیں۔

ایک دن کیٹ کو اسکول میں ڈیوڈ کا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ کسی کام سے لندن آرہا ہے اور وقت نکال کر اس سے ملنے بھی

آئے گا۔ ڈیوڈ کا خط پاکر وہ عجیب عجیب خیالات میں کھو گئی۔ اس نے ڈیوڈ کے خط سے کئی معنی اخذ کر لیے۔ یہ تمام معنی اس کی اپنی پسند کے تھے۔ وہ صرف اس سے ملنے کے لیے لندن آرہا ہے ورنہ اُسے لندن آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اسے یقین تھا کہ آخر ڈیوڈ پر بھی اُس کی محبت کا اثر ہو گیا ہے۔ اُسے اپنے ان تصورات کے صحیح ہونے پر اتنا اعتماد تھا کہ جس دن وہ اس سے ملنے کے لیے آنے والا تھا۔ اس نے اپنی تمام سہیلیوں کو خدا حافظ کہتے ہوئے یہ خوش خبری سنائی تھی "میرا محبوب مجھے یہاں سے لے جانے کے لیے آرہا ہے۔"

تمام لڑکیوں کو اس کی بات پر ذرا بھی یقین نہ آیا۔ وہ ان سے متعدد بار اس نوعیت کے جھوٹ بول چکی تھی۔ ایک تیز طرار لڑکی نے تو واضح لفظوں میں یہ بات جتا بھی دی۔ کیٹ نے دیکھا کہ لڑکیوں نے اس کی بات کو اہمیت نہیں دی تو وہ برا سا منہ بنا کے بولی "میں جھوٹ نہیں کہہ رہی ہوں۔ تم خود دیکھ لینا۔ وہ خوبصورت اور طویل قامت ہے اور وہ میرے لیے پاگل ہے۔" کیٹ کے لہجے میں بڑا زعم اور فخر تھا۔ اس کا چہرہ جذبات کی شدت سے تمتما رہا تھا۔

جب ڈیوڈ وہاں پہنچا تو وہ سخت پریشان ہو گیا۔ اسکول کی تمام ہی لڑکیاں تو جیسے اُسے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ اسے دیکھتیں سرگوشی میں باتیں کرتیں اور پھر کھی کھی کر کے ہنسنے لگتیں۔ جب کبھی اس کی نظر کسی لڑکی سے ٹکرا جاتی تو وہ شرم سے سرخ ہو جاتی۔

"یہ لڑکیاں تو ایسے دیکھ رہی ہیں مجھے جیسے آج سے پہلے انہوں نے کسی مرد کو دیکھا ہی نہ ہو۔" ڈیوڈ نے غور سے کیٹ کو گھورتے ہوئے کہا۔ "کیا تم ان لڑکیوں سے میرے بارے میں کچھ کہتی رہی ہو؟"

"میں نے تو ان سے کچھ نہیں کہا۔ بھلا مجھے کیا ضرورت پڑی ہے تمہارے بارے میں باتیں کرنے کی۔" کیٹ نے لاپروائی کے انداز میں شانے اچکا کر جواب دیا۔

انہوں نے اسکول کے بڑے سے کھانے کے کمرے میں کھانا کھایا۔ کیٹ کے کئی سوالات کے جواب میں وہ تمام حالات اسے بتانے لگا۔ "تمہاری ممی تمہیں بہت یاد کرتی ہیں۔ وہ گرمیوں کی چھٹیوں کی منتظر ہیں جب تم ان سے ملنے جاؤ گی۔ ان کی صحت بالکل ٹھیک ہے۔ ان دنوں وہ سخت محنت کر رہی ہیں۔ کام سے فرصت ہی نہیں ملتی انہیں۔ کمپنی طوفانی رفتار سے ترقی کر رہی ہے۔ نیا سال ہمارے لیے بہت ہی اچھا ثابت ہوا ہے۔ یوں سمجھو ہم پر دولت کی بارش ہو رہی ہے۔"

کیٹ اس کی باتوں کو بے توجہی سے سن رہی تھی۔ وہ اپنے اور ڈیوڈ کے روشن اور خوشگوار مستقبل کے بارے میں سوچ رہی تھی — جس جوش و خروش سے وہ کمپنی کا ذکر کر رہا تھا۔ اس سے کیٹ کو بڑی خوشی ہوئی تھی۔ ڈیوڈ اس کے اور کمپنی کے مستقبل کے لیے ناگزیر تھا۔ وہ اِس وجیہہ اور باوقار شخص کو ٹوٹ کے اور جنون کی حد تک چاہتی تھی۔

اچانک ڈیوڈ کو احساس ہوا کہ کیٹ تو کھا ہی نہیں رہی ہے۔ اس کی پلیٹ ویسے کی ویسے ہی رکھی تھی۔ اس نے پلیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "تم کھا نہیں رہی ہو؟"

کیٹ کو کھانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو ابھی تک اس خوش کُن لمحے کی منتظر تھی، جب ڈیوڈ اس سے کہتا "کیٹ آؤ میرے ساتھ چلو۔ تم اب جوان ہو گئی ہو۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ بس اب ہم شادی کر لیں گے۔" لیکن ڈیوڈ نے ابھی تک یہ جملے نہیں کہے تھے۔ کھانے کے بعد سوئیٹ ڈش کھائی گئی اور پھر کافی کا دور چلا۔ لیکن وہ الفاظ ابھی تک اس پتھر دل شخص نے نہیں کہے، جن کو سننے کے لیے اس کا وجود بے قرار تھا۔ کیٹ کا اضطراب بڑھتا رہا۔ لیکن وہ اسی طرح بے حسی سے فضول باتیں کرتا رہا اور پھر ڈیوڈ نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ "اچھا کیٹ۔ اب میں چلتا ہوں ورنہ میری ٹرین نکل جائے گی۔"

تب کیٹ پر یہ انکشاف ہوا کہ ڈیوڈ اُسے یہاں سے لینے کے لیے نہیں آیا تھا۔ وہ جل بھن ہی تو گئی۔ اس کا چہرہ غصّے سے سرخ ہو گیا۔ مگر اس نے زبان سے اپنی خفگی کا اظہار نہیں کیا۔ بس وہ شعلہ بار نظروں سے کٹھور ڈیوڈ کو گھورتی رہی۔

ڈیوڈ کیٹ سے مل کر بہت خوش ہوا تھا۔ وہ بہت غیر معمولی لڑکی تھی۔ اس کی خود سری بھی کچھ کم سی ہو گئی تھی۔ اس نے ضدی لڑکی کا ہاتھ تھپتھپایا۔ اسے خوشی اس بات کی بھی تھی کہ کبھی کبھار اس پر بھکنے کا جو دورہ پڑتا تھا۔ وہ اس پر بھی قابو پا چکی تھی۔

"جانے سے پہلے میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟"

کیٹ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہت میٹھے لہجے میں کہا۔ "ہاں، تم مجھ پر ایک بہت بڑا کرم کر سکتے ہو اور وہ یہ کہ سالے تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری زندگی سے نکل جاؤ۔ بڑی عنایت ہوگی یہ تمہاری۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور نہایت باوقار انداز میں سر اونچا کیے، سینہ تانے چلی گئی۔ اس نے پلٹ کر بھی ڈیوڈ کو نہ دیکھا۔

اور وہ ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے اُسے دیکھتا رہ گیا۔

بیٹی کی عدم موجودگی مارگریٹ پر بہت شاق گزر رہی تھی۔ اس کی جدائی اُسے مسلسل بے کل کیے رکھتی تھی۔ وہ بہت بے کینے، ضدی اور خود سر لڑکی تھی۔ لیکن وہی تو ایک ذات تھی جس کے لیے اُس کی تمام محبتیں تھیں، جسے وہ دنیا میں سب سے زیادہ چاہتی تھی۔ اُسے اپنی بیٹی پر بہت مان تھا۔ وہ اس کی ذہانت کی قائل تھی۔ اُسے یقین تھا کہ اس کی بیٹی ایک دن دنیا کی بہت نامور لڑکی ہوگی۔ لیکن وہ چاہتی تھی کہ کیٹ ایک سلیقہ مند عورت ہو۔ جس کی سلیقہ مندی کا ہر شخص معترف ہو اور اسی لیے وہ اس کی جدائی بھی برداشت کر رہی تھی۔

گرمیوں کی چھٹی میں کیٹ گھر آئی تو مارگریٹ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

"اور سناؤ بیٹی۔ اسکول کیسا لگا تمہیں؟" مارگریٹ نے اپنی بیٹی سے پوچھا۔

"میں نفرت کرتی ہوں اس اسکول سے۔ لگتا ہے جیسے میں ہر طرف سے سینکڑوں لاشوں میں گھری ہوئی ہوں۔ زندگی تو ہے ہی نہیں وہاں۔ وہ زندوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ہم تو جیسے مردے ہیں۔"

مارگریٹ نے اپنی بیٹی کو غور سے دیکھا اور بولی "کیا دوسری لڑکیاں بھی یہی محسوس کرتی ہیں؟"

"ان بے چاریوں کو تو دنیا کا کچھ پتہ ہی نہیں۔" کیٹ نے حقارت سے جواب دیا "انہیں تو زندگی کے معنی بھی معلوم نہیں۔"

"ہائے میری بیٹی، پھر تو واقعی تمہاری زندگی اجیرن ہو گئی ہوگی۔"

"میرے ساتھ ہمدردی نہ کریں ممی! میرے ساتھ جو لڑکیاں ہیں۔ وہ صرف جیتے جاگتے کھلونے ہیں۔ انہوں نے تو جانور بھی آزاد نہیں دیکھے۔ جو جانور انہوں نے دیکھے بھی ہیں وہ صرف چڑیا گھروں کے پنجروں میں بند دیکھے ہیں۔ انہوں نے تو کبھی سونے یا ہیرے کی کان بھی نہیں دیکھی۔"

"ان بے چاریوں کے یہ نصیب کہاں۔" مارگریٹ نے کہا۔

"ٹھیک ہے ممی۔ لیکن سوچ لیجیے کہ اگر میں ان جیسی ہو گئی تو آپ کو بہت دکھ ہوگا۔"

"تو کیا خیال ہے۔ تم ان جیسی نہیں بن سکو گی؟"

"ہرگز نہیں۔ میں کوئی پاگل ہوں۔" کیٹ نے شرارت سے کہا۔

گھر واپس آنے کے ایک گھنٹے بعد ہی کیٹ باہر لان میں ملازمین کے بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ مارگریٹ نے کھڑکی سے اسے کھیلتے ہوئے دیکھا اور بڑے دُکھ سے سوچا۔ شاید میں اس پر رقم ضائع ہی کر رہی ہوں۔ یہ کبھی تبدیل نہیں ہوگی۔

اس شام کیٹ نے کھانے پر اپنی ماں سے پوچھا "کیا ڈیوڈ شہر میں ہے؟"

"نہیں، وہ آسٹریلیا گیا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کل واپس آجائے گا۔" مارگریٹ نے جواب دیا۔

"جمعہ کی شب وہ کھانے پر موجود ہوگا؟"

"شاید۔" اس نے اپنی بیٹی کا غور سے جائزہ لیتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے تم ڈیوڈ کو بہت پسند کرتی ہو۔"

"میں اسے ناپسند نہیں کرتی! میرا مطلب ہے ایک انسان کی حیثیت سے تو میں اسے پسند کرتی ہوں۔ لیکن ایک مرد کی حیثیت سے میں اُسے برداشت نہیں کر سکتی۔"

جمعہ کی شب جب ڈیوڈ وہاں پہنچا تو کیٹ دوڑتی ہوئی دروازے پر گئی۔ وہ اس سے لپٹ گئی اور اس کے کان میں سرگوشی کی "میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے جانی۔ سچ کہتی ہوں، بہت یاد آتے رہے تم۔ کیا تم بھی مجھے یاد کرتے تھے؟"

"ہاں۔" ڈیوڈ نے بے ساختہ کہا اور یہ حقیقت بھی تھی۔ وہ ایسی لڑکی تھی جسے بھولنا یا یاد نہ کرنا ناممکن تھا۔ اس نے کیٹ کا جائزہ لیا۔ وہ جوان ہو چکی تھی۔ اس کے جسمانی نشیب و فراز واضح ہونے لگے تھے۔ وہ ذہین تھی اور خوبصورت بھی۔ جو شخص بھی اس لڑکی کا شوہر ہوگا، واقعی نہایت خوش نصیب انسان ہوگا۔ اس نے سوچا۔

اگلے دن وہ ڈیوڈ کے ساتھ کمپنی کی ہیروں کی سب سے بڑی کان دیکھنے گئی۔ ڈیوڈ نے اُسے یہاں کی سیر کراتے ہوئے اس عظیم الشان کان کی اہمیت کے بارے میں بتایا۔ ان کانوں کے بارے میں بتایا جو کمپنی کی ملکیت تھیں، پھر وہ اسے ہیروں کی مختلف اقسام کے بارے میں بتاتا رہا اور وہ حیرت اور دلچسپی سے اُس کی باتیں سنتی رہی اور اس ذہین شخص کی معلومات پر عش عش کرتی رہی۔

سہ پہر کو وہ واپس گھر پہنچی تو اس کی امی نے پوچھا "کیسی رہی کان کی سیر؟"

"حیرت انگیز! اتنا مزا آیا کہ کچھ نہ پوچھو۔ ڈیوڈ کی یادداشت ناقابلِ یقین ہے۔ اسے ہر کان کی تفصیل ازبر ہے۔"

نصف گھنٹے بعد وہ کھڑکی میں کھڑی کیٹ کو مالی کے ایک بیٹے سے کشتی لڑتے دیکھ رہی تھی۔ "اس بچی کے حال پر رحم کر میرے خدا۔" اس نے دعا کی۔

✡

اگلے برس اسکول سے کیٹ جو خطوط بھیجتی وہ بڑے حوصلہ افزا تھے۔ وہ اسکول کی ہاکی ٹیم کی کیپٹن بنا دی گئی تھی۔ تعلیمی اعتبار سے بھی وہ اپنی کلاس میں سرفہرست تھی۔ اس نے لکھا "ممی، یہ اسکول اتنا خراب بھی نہیں ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ یہاں اب میرے مطلب کی اور میرے ذوق کی بھی چند ایک لڑکیاں آ گئی ہیں۔ ہم سب نے اسکول والوں کا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ اس نے خط میں چھٹیوں پر دو سہیلیوں کو بھی ساتھ لانے کی اجازت مانگی تھی۔ کیٹ کا یہ خط پا کر مارگریٹ خوش ہو گئی۔ ان لڑکیوں کے آنے کی وجہ سے اس گھر میں قہقہے گونجیں گے۔ اس کے تمام خواب اب صرف کیٹ کے لیے تھے۔ وہ سوچا کرتی میں اور جمی تو اب ماضی بن گئے ہیں۔ کیٹ مستقبل ہے اور مستقبل بھی نہایت تابناک، خوشگوار اور حیرت انگیز!

اور جب وہ چھٹیوں میں واپس آئی تو کلب کے وہ تمام نوجوان جن کا مستقبل کسی نہ کسی اعتبار سے شاندار تھا۔ جو کسی نہ کسی بنا پر خود کو کیٹ کا امیدوار سمجھتے تھے۔ سب کے سب اس کے گرد پروانوں کی مانند منڈلانے لگے۔ ہر کوئی اُس سے تفصیلی ملاقات کا خواہشمند تھا۔ لیکن اسے ان میں سے کسی لڑکے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ڈیوڈ ان دنوں امریکہ گیا ہوا تھا اور کیٹ کو بس اُسی کا انتظار تھا۔ اس کی غیر موجودگی کیٹ کو بری طرح کھل رہی تھی۔ پھر جب وہ واپس آیا تو جیسے کیٹ کو ساری خوشیاں مل گئیں۔ ڈیوڈ نے اُسے گلے سے لگایا تو وہ کیٹ کی گرمجوشی سے چونکنا ہو گیا۔ کیٹ کے جسم کی تبدیلیوں نے اسے خبردار کر دیا تھا۔ اب وہ عمر کے اس حصے میں تھی کہ بے تکلفی سے اسے گلے نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک پیغام تھا۔ یہ پیغام ڈیوڈ پڑھ سکتا تھا۔ محسوس کر سکتا تھا۔ وہ محتاط ہو گیا۔ اس نے طے کر لیا کہ آئندہ وہ کیٹ سے بے تکلفی اور گرمجوشی سے پیش نہیں آئے گا۔

اس کے بعد وہ جب کبھی کیٹ کو مختلف لڑکوں کے درمیان گھرا دیکھتا تو یہی سوچتا رہ جاتا کہ آخر ان میں سے وہ کونسا خوش نصیب شخص ہوگا جو کیٹ کا شوہر بنے گا۔

✡

اسکول میں یہ کیٹ کا آخری سال تھا کہ ایک دن ڈیوڈ وہاں اچانک کسی اطلاع کے بغیر پہنچ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے آنے سے قبل کیٹ کو خط نہیں لکھا تھا۔ نہ اس نے فون کیا تھا۔ کیٹ اسے دیکھتے ہی خوشی سے نہال ہو گئی اور چلا کر بولی "ڈیوڈ! میں تو خوشی سے پاگل ہو جاؤں گی۔ پہلے سے اطلاع دیتے تو۔۔۔"

"کیٹ، میں تمہیں گھر لے جانے کے لیے آیا ہوں۔" ڈیوڈ نے اس کی بات کاٹ کے کہا۔

کیٹ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ ڈیوڈ کے چہرے پر پھیلی گھبراہٹ دیکھ کے اس کا رنگ زرد پڑ گیا اور وہ کپکپاتی آواز میں بولی "کیا کچھ گڑبڑ ہے؟"

"ہاں تمہاری والدہ بے حد بیمار ہیں۔" ڈیوڈ نے سر جھکا کے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

کیٹ کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ چند لمحے وہ سکتے کی سی کیفیت میں ڈیوڈ کو دیکھتی رہی پھر اس نے گہرا سانس لے کر کہا "ٹھیک ہے، میں تیاری کرتی ہوں۔"

اپنی ماں کی حالت دیکھ کر کیٹ حیران ہی تو رہ گئی۔ چند ماہ قبل جب اُس نے اپنی ماں کو دیکھا تھا تو وہ بالکل صحت مند تھی۔ لیکن اب وہ ہڈیوں کا پنجر ہو کر رہ گئی تھی۔ جسم کا سارا خون جیسے کسی نے نچوڑ لیا تھا۔ چہرے پر زردی کھنڈ رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے سرطان نہ صرف اس کے جسم کو بلکہ اس کی روح کو بھی چاٹ رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کے بستر کے پاس بیٹھ گئی۔ ایک ٹک مارگریٹ کو دیکھتی رہی پھر اُس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "ممی! میں سالی بہت خراب ہوں۔ بہت شرمندہ ہوں۔"

مارگریٹ نے مسکرا کر اپنی بیٹی کو دیکھا۔ "تم پریشان نہ ہو بیٹی۔ بس میں اپنے سفر کے لیے تیار ہوں۔ اس سفر کے لیے تو میں اُس دن سے تیار تھی جب تمہارے ابو مرے تھے۔" اس نے پھر مسکرا کر بیٹی کو دیکھا۔ "میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ بڑے پاگل پن کی بات ہے۔ آج تک میں نے کسی اور کو نہیں بتائی۔ جب سے تمہارے ابو مرے ہیں میں ہمیشہ، ہر روز یہی سوچا کرتی تھی کہ دوسری دنیا میں نہ معلوم وہ کیسے ہوں گے۔ ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ لیکن اب، اب میں ان کی دیکھ بھال کروں گی۔"

ماں خاموش ہو گئی۔ بیٹی کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

تین دن بعد مارگریٹ کو لحد میں اتار دیا گیا۔ ماں کی موت کیٹ کے لئے ایسا صدمہ تھا جس کے بارے میں اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اس کے والد اور بھائی بھی مر گئے تھے لیکن ان دونوں کو نہ تو اس نے ہوش میں دیکھا تھا نہ وہ ان سے واقف تھی۔ وہ دونوں تو بس قصے کہانیوں کے کردار تھے۔ لیکن ماں کو تو اس نے جانا تھا، اس کے ساتھ زندگی گزاری تھی۔ ماں کی موت اس کے لئے ایک گہرا زخم تھا۔ اس کا درد بہت شدید تھا۔ وہ اٹھارہ برس کی تھی اور اچانک موت کے ایک ہی وار نے اُسے اس دنیا میں یکہ و تنہا کر دیا تھا۔ اس تنہائی کا خیال اس کے لئے بڑا ہولا دینے والا تھا۔ آنے والی کٹھن زندگی کے تصور ہی سے وہ لرز رہی تھی۔

ڈیوڈ تدفین کے وقت قبر کے پاس کھڑا کیٹ کو بغور دیکھ رہا تھا جو بڑے حوصلے سے کام لے رہی تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ آنکھوں سے آنسو نہ ٹپکیں اس کے ہونٹوں سے سسکیاں نہ ابلیں۔ اس وقت ڈیوڈ کو اس ناتجربے کار نوجوان لڑکی پر بڑا ترس آیا۔ لیکن جب وہ قبرستان سے گھر آئی تو وہ خود پر قابو نہ پا سکی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"ڈیوڈ، ڈیوڈ، میری امی مر گئیں۔ انہوں نے ہمیشہ میرا خیال رکھا لیکن میں نے انہیں بہت دکھ دیئے ہیں۔"

ڈیوڈ نے اُسے دلاسہ دیا۔ "نہیں کیٹ، تم بہت اچھی بیٹی تھیں ان کے لئے تم نے انہیں کوئی دکھ نہیں دیا۔"

"جھوٹ مت بولو، میں ان کے لئے بس ایک آزار تھی، میں جانتی ہوں وہ میری وجہ ہی سے مری ہیں۔"

ڈیوڈ اُسے سمجھاتا رہا۔ مستقبل سے متعلق اندیشے اور خدشات اس کے دل و دماغ سے نکالتا رہا۔

اگلی صبح وہ اُس سے مستقبل کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔ "تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ اسکاٹ لینڈ میں تمہارا خاندان آباد ہے۔"

"نہیں"، کیٹ نے سختی سے جواب دیا۔ "ان کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ صرف نام کے رشتے دار ہیں۔ جب ابّو نے یہاں آنا چاہا تھا تو ان سب نے مذاق اڑایا تھا۔ کوئی بھی ان کی مدد پر تیار نہیں تھا۔ صرف دادی نے ان کی مدد کی تھی اور وہ بھی اب مر چکی ہیں۔ نہیں ڈیوڈ، میں ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔" اس کے لہجے میں نفرت اور تلخی کے سوا کچھ نہ تھا۔

ڈیوڈ سوچتا رہا۔ "تو کیا تم اسکول کا سال مکمل کرنا چاہتی ہو؟" اس سے پہلے کہ کیٹ جواب دیتی اس نے مزید کہا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ تمہاری والدہ کی خواہش بھی تھی۔"

"پھر میں۔ ضرور اپنا سال مکمل کروں گی۔" اس نے فرش پر نظریں مرکوز کئے ہوئے جواب دیا۔ "یہ سالا اسکول بھی جان نہیں چھوڑتا۔"

"میں جانتا ہوں کیٹ، میں تمہاری ذہنی کیفیت کو سمجھتا ہوں" ڈیوڈ نے آہستہ سے جواب دیا۔

اور کیٹ واپس چلی گئی۔ اس نے اسکول کا سال مکمل کیا۔ وہ کلاس میں سب سے نمایاں رہی تھی۔ جلسہ تقسیم اسناد میں ڈیوڈ موجود تھا۔ وہ اس کی تعلیم مکمل ہونے سے بہت خوش تھا۔ اب وہ اطمینان سے بزنس پر توجہ دے سکتا تھا۔

اسکول سے واپسی پر دارالحکومت سے اپنے قصبے تک وہ پرائیویٹ ریلوے کار میں سفر کر رہے تھے۔ کیٹ بہت افسردہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ گھر پر اب اس کا انتظار کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اس کی ماں وہاں نہیں تھی۔

ڈیوڈ اس کے غم سے واقف تھا۔ اُس نے بڑے پیار سے اسے سمجھایا۔ "تم جانتی ہو کیٹ۔ چند برس میں تم اس وسیع کاروبار اور میلوں میں پھیلی ہوئی جائیداد کی واحد مالک بن جاؤں گی۔ یہ ریل کار، ہیرو، سونے، تانبے اور جست کی کانیں تمہاری ملکیت ہوں گی کمپنی تمہاری ہوگی۔ تم اس وقت دنیا کی امیر ترین عورت ہو۔ تم چاہو تو اسی کاروبار کو چلا سکتی ہو، چاہو تو کمپنی کو کروڑوں پونڈ میں فروخت کر سکتی ہو۔ تمہیں اس کے بارے میں فیصلہ کرنا ہوگا۔"

"میں نے اس کے بارے میں خوب غور کر لیا ہے۔" کیٹ نے مسکرا کے کہا۔ "میں نے اس کمپنی کو چلانے اور ترقی دینے کا فیصلہ کیا ہے میں اپنے باپ کی خون پسینے سے بنائی ہوئی کمپنی کو اتنا عروج پر لے جاؤں گی کہ دنیا عش عش کر اٹھے گی۔ میں اسے دنیا کی سب سے بڑی کمپنی بنا کے دم لوں گی۔"

"میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟ کیا واقعی تم سنجیدہ ہو؟" ڈیوڈ نے تعجب خیز لہجے میں کہا۔

"ہاں اور اس کی وجہ بھی ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ میرے ابّو ایک اعتبار سے قزاق بھی تھے۔ میری خواہش تھی کہ میں اپنے ابّو سے اچھی طرح واقف ہوتی۔ ابّو نے اپنی اس کمپنی کا نام ان محافظوں کے نام پر رکھا تھا جو انہیں مار دینا چاہتے تھے۔ کیا یہ ایک عمدہ خیال نہیں تھا؟ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ راتوں کو میری نیند اڑ جاتی ہے اس وقت میں ابّو اور ان کے سیاہ فام ساتھی باندا کے بارے میں سوچتی ہوں کہ کس طرح ان دونوں نے دھند کی چادر میں اس ریگستان کو گھسٹ گھسٹ کر عبور کیا تھا۔ تب مجھے اس دھند

سے محافظوں کی آوازیں ابھرتی سنائی دیتی ہیں۔ کروگر ۔۔۔۔ بربٹ کروگر ۔۔۔۔ بریٹ !" میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنے والد کی قائم کی ہوئی اس کمپنی کو فروخت نہیں کروں گی۔ تم بھی اس کمپنی کو چلانے کے لئے موجود ہو، پھر مجھے اسے فروخت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم دونوں کمپنی کی ترقی اور ترویج کے لئے شب و روز محنت کریں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ تم کمپنی کی واحد مالک اور مختار ہو۔ مجھے تمہارا ہر فیصلہ قبول ہوگا۔

جب تک میری ضرورت ہے، میں اس کمپنی سے وابستہ رہوں گا۔" ڈیوڈ نے جواب دیا۔

"میں نے دارالحکومت کے ایک اسکول میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیا ہے جہاں ٹائپ، شارٹ ہینڈ اور کاروبار سے متعلق مختلف مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ میں کمپنی کو جدید ترین خطوط پر منظم کرنے میں تمہاری مدد کروں گی۔"

وہ مسکراتے ہوئے بڑی حیرت سے اس عجیب و غریب لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ زمانہ قیامت کی چال چل رہا تھا۔ اب سے پانچ سات برس پہلے سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ عورت کاروبار بھی کر سکتی ہے۔ اس لڑکی کے عزائم نے اسے حیرت زدہ کر دیا تھا۔ وہ ضرور کچھ نہ کچھ کرنے والی تھی۔ کیٹ نے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھے تو مسکرا کے بولی تم نے پوچھا تھا ناکہ اس دولت کا کیا کروں گی۔ میں اسی کو صحیح مصرف میں لانے کی تیاریاں کر رہی ہوں۔"

کاروبار سے متعلق تعلیم حاصل کرنا کیٹ کے لئے بہت خوشگوار تجربہ تھا۔ ہر کلاس میں وہ کوئی نئی بات سیکھتی۔ اس میں نئے پن کے علاوہ افادیت بھی ہوتی۔ یہ تعلیم کمپنی کے معاملات کو چلانے میں اس کے کام آنے والی تھی۔ وہ اس دن کا شدت سے انتظار کر رہی تھی کیونکہ پھر اسے ڈیوڈ کے ساتھ کمپنی کو مزید ترقی دینے کا موقع ملتا۔ اُس کے ساتھ ہی اسے یقین تھا کہ وہ ڈیوڈ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا لے گی۔ تعلیم کی مدت دو سال تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ دو سال کے عرصے میں اپنے اندر انقلابی تبدیلیاں پیدا کرے گی۔

دو سال بعد وہ تعلیم مکمل کر کے واپس قصبے میں پہنچی تو اسٹیشن پر ڈیوڈ اس کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ اُسے دیکھ کر کیٹ اتنی بے اختیار ہوئی کہ اس نے لوگوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اسے زور سے لپٹا لیا اور خوشی سے چلا کر بولی۔ "اوہ ڈیوڈ، تمہیں دیکھ کر میں اتنی خوش ہوئی ہوں کہ بیان سے باہر ہے۔"

ڈیوڈ جھینپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اور بری طرح گڑبڑا کے بولا "ارے ارے، یہ کیا کر رہی ہو؟ نوجوان لڑکیاں، سرعام مردوں کو اس طرح نہیں لپٹایا کرتیں۔

کیٹ چند لمحے اُسے دیکھتی رہی۔ "اوہ میں سمجھی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔"

گھر جاتے ہوئے اُس نے بغور کیٹ کا جائزہ لیا۔ وہ واقعی حسین تھی، معصوم تھی اور اس کے عشق میں گرفتار تھی۔ ڈیوڈ ذرا بھی اشارہ کرتا تو وہ بہک سکتی تھی لیکن اُس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ کیٹ کی اس کمزوری سے ہرگز فائدہ نہیں اٹھائے گا۔

پیر کی صبح سے کیٹ نے کمپنی میں اپنے شاندار دفتر میں باقاعدگی سے بیٹھنا شروع کیا۔ یہ بڑا سنسنی خیز تجربہ تھا۔ یہ ایک بالکل ہی نئی دنیا تھی جس سے کیٹ بالکل ناواقف تھی۔ اس دنیا کے اپنے اصول اور قواعد تھے۔ کمپنی کی وسعت اس کے خیالوں سے بھی زیادہ تھی۔ اس کے بے شمار شعبے تھے، متعدد ذیلی ادارے تھے، علاقائی دفاتر تھے۔ غیر ملکی شاخیں تھیں۔ کمپنی کی مصنوعات کی تعداد بھی بے شمار تھی۔ یہ صرف کمپنی نہیں تھی۔ یہ طاقت اور قوت کا سرچشمہ تھی۔ کیٹ ڈیوڈ کے دفتر میں بیٹھی اُسے مختلف مسائل کے بارے میں فیصلے کرتے دیکھتی۔ یہ فیصلے ہزاروں افراد کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتے۔ مختلف شعبوں کے جنرل منیجر اپنی سفارشات بھیجتے جن میں سے بیشتر کو ڈیوڈ مسترد کر دیتا۔ اور سفارشات منظور بھی ہوتیں ان میں بھی کتر بیونت ہوتی۔ وہ کاروباری معاملات میں بے رحم تھا۔ کسی سے رو رعایت نہیں کرتا تھا۔ اہم فیصلے وہ خوب سوچ سمجھ کے اور تمام پہلوؤں پر غور و فکر کرنے کے بعد کرتا تھا۔

"آخر تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ کیا یہ جنرل منیجر اپنے کام سے ناواقف ہیں؟" کیٹ نے ایک دن پوچھ ہی لیا۔

"یہ بات نہیں۔ یہ تمام لوگ بہت ہوشیار اور اپنے کام کے ماہر ہیں۔ مگر بات صرف اتنی ہے کہ ہر منیجر اپنے شعبے ہی کو دنیا کا مرکز سمجھ بیٹھتا ہے۔ ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے لیکن ان سے بھی بڑھ کر ایک شخص ایسا ہونا چاہیئے جس کے سامنے مجموعی صورت حال ہو، جو تمام معاملات کا جائزہ لے کر کمپنی کے مفاد میں بہترین فیصلہ کر سکتا ہو۔۔۔ خیر چھوڑو، آج دوپہر کے کھانے پر تمہاری ملاقات ایک نہایت کارآمد شخص سے ہوگی۔"

وہ کارآمد شخص راجر تھا۔ ڈیوڈ نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ راجر ہے، ہمارا خفیہ ہتھیار۔ اسے بھی کمپنی کے معاملات سے اتنی

ہی آگاہی ہے جتنی مجھے۔ اگر کبھی میں نے کمپنی چھوڑ دی تو تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، راجر تمام معاملات نہایت خوش اسلوبی سے سنبھال سکتا ہے۔''

ڈیوڈ نے یہ بات محض راجر کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے کہی تھی۔ مگر کیٹ پریشان ہو کر رہ گئی۔ یہ تصور ہی بڑا ہولناک تھا وہ اس کے بغیر کمپنی چلانے کے لئے سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

یہ نئی زندگی کیٹ کے لئے واقعی بہت دلچسپی کا سبب تھا۔ اس کی بے قرار طبیعت اور دوسروں پر حاوی رہنے کی خواہش کی تسکین کے یہاں تمام سامان موجود تھے۔ یہاں ہر فیصلہ لاکھوں کے جوئے کے مترادف تھا۔ یہ پھیلا ہوا وسیع اور ہمہ جہت کاروبار ذہانت اور ذکاوت کا ایک مستقل مقابلہ تھا۔ یہاں ہر روز ایک نئے فیصلے کے ساتھ ایک نیا جوا کھیلا جاتا تھا اس کے لئے جرأت اور حوصلے کی ضرورت تھی۔ یہ جاننے کی ضرورت تھی کہ کب کھیل ختم کرنا ہے، اور کب بازی کو آگے بڑھانا ہے۔

''کاروبار ایک کھیل ہے کیٹ، اس میں لاکھوں کا ہیر پھیر ہوتا ہے۔ بڑے خطرات مول لینے ہوتے ہیں۔ اس کھیل میں مقابل بھی بڑے تجربے کار گھاگ اور خرانٹ ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں جیتنے کے لئے ضروری ہے کہ تم کھیل کی ماہر ہو۔ تمہارا کوئی ثانی نہ ہو۔''

اور کیٹ نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ کاروبار کے تمام گُر سیکھ کر رہے گی۔

کیٹ اکیس برس کی ہوئی تو کمپنی کے تمام حصص کیٹ کے نام منتقل ہو گئے۔ اب قانونی طور پر وہ اس کمپنی کی مالک تھی۔ سب کچھ تھا لیکن کیٹ کی اصل منزل، ڈیوڈ کو اپنانے کا خواب ابھی تک شرمندہ تعبیر نہ ہوا تھا۔ وہ اُس کے ساتھ گھنٹوں رہتا لیکن اس نے اپنے گرد ایسا حصار قائم کر رکھا تھا۔ جسے توڑنا کیٹ کے لئے ابھی تک ممکن نہ ہوا تھا لیکن کیٹ نے بھی طے کر رکھا تھا کہ وہ اس حصار میں سیندھ لگا کر رہے گی۔ اُسے تسخیر کر کے دم لے گی۔

انہی دنوں کیٹ کی کمپنی، امریکہ کی ایک جہاز ران کمپنی کو خریدنے کی بات چیت کر رہی تھی۔ ''میرا خیال ہے کہ تم اور راجر امریکہ جا کر اس سودے کو طے کر لو۔ یہ تم دونوں کے لئے ایک اچھا تجربہ رہے گا۔'' ڈیوڈ نے تجویز پیش کی۔

کیٹ کی خواہش تھی کہ اس موقع پر ڈیوڈ اس کے ساتھ امریکہ چلے لیکن وہ بھی اپنے باپ کی ایک ہی تھی۔ اس خواہش کے اظہار میں اس نے اپنی توہین سی محسوس کی۔ وہ ڈیوڈ پر یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ وہ اس کی محتاج نہیں ہے، اس کے بغیر بھی بڑے بڑے فیصلے کر سکتی ہے۔ اس کے بغیر بھی بڑے بڑے فیصلے کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ اس سے پہلے کبھی امریکہ گئی بھی نہیں تھی۔ امریکا دیکھنے کا اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے اس نے طے کیا کہ اُسے ڈیوڈ کے سہارے کے بغیر وہاں جانا چاہیئے اور اپنی صلاحیتوں کو آزمانا چاہیئے

امریکہ میں جہاز راں کمپنی کی خریداری کا سودا نہایت خوش اسلوبی سے طے ہو گیا۔ اب ان کے پاس فرصت ہی فرصت تھی۔ ڈیوڈ نے چلتے ہوئے کہا امریکہ میں قیام کے دوران تم وہاں کی سیر بھی کرنا۔ وہ ایک عجیب اور قابل دید ملک ہے۔''

کیٹ اور راجر نے امریکہ کے بڑے بڑے شہروں میں کمپنی کی ذیلی شاخوں کا دورہ کیا۔ اس دورے سے وہ امریکہ کی وسعت اور اس کی خوشحالی سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔ امریکہ کے دورے میں کیٹ کی سب سے اہم مصروفیت ڈارک ہاربر کی سیر تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا سرسبز و شاداب جزیرہ تھا جہاں اُسے مشہور مصور جے نے مدعو کیا تھا اس نے کیٹ کا نہایت پرتپاک استقبال کیا تھا کھانے پر جزیرے کے بارہ سرکردہ افراد بھی مدعو تھے۔ اس ضیافت میں موجود ہر شخص کا جزیرے میں اپنا مکان تھا۔

کھانے کے بعد باتیں چھڑ گئیں۔ مصور جے اس جزیرے کی شان میں قصیدہ پڑھ رہا تھا۔ وہ اس کی تاریخ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے قدرتی حسن کی شان میں بھی زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ کیٹ شاید اس کی باتوں سے متاثر نہ ہوتی لیکن اس عرصے میں اس نے جس حد تک جزیرے کو دیکھا تھا اُس کی بنا پر وہ جانتی تھی کہ جے جے کو اس جزیرے کی تعریف کے لئے مناسب الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ خود کیٹ کو یہ جزیرہ بہت اچھا لگا تھا اسی لئے وہ یہاں ایک کی بجائے تین دن ٹھہری۔ دوسرے دن اس جزیرے کی سیر کرتے ہوئے وہ ایک نہایت خوبصورت مکان کے سامنے سے گزری۔ یہ مکان ہر اعتبار سے پرستان کا کوئی خوبصورت محل دکھائی دیتا ہے۔ اس نے مکان کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ وہ اسے ہر قیمت پر خریدنے کے لئے تیار ہو گئی۔ اسے بتایا گیا کہ جزیرے کے لوگ یہاں کسی اجنبی کو پسند نہیں کرتے گنے چنے منتخب لوگ ہی یہاں رہتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی اپنا مکان بیچنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ کیٹ نے جھکنا نہیں سیکھا تھا اس نے یہ مکان منہ مانگے داموں خریدنے کا تہیہ کر لیا۔ مالک مکان نے جو قیمت بتائی۔ کیٹ نے ایک لفظ بنائے بغیر چیک کاٹ کر اس کے حوالے کر دیا۔

کیٹ نے اس محل نما مکان کا نام گوشۂ عافیت رکھ دیا اور مستقبل کے دل خوش کن تصورات میں کھو گئی۔ وہ یہاں ڈیوڈ کے

ساتھ رہے گی۔ اس کے بچے ہوں گے اور ان کی قلقاریوں سے اس مکان کے درودیوار گونجا کریں گے اس خوبصورت جزیرے میں وہ اور ڈیوڈ اپنا بڑھاپا بھی سکون اور اطمینان سے گزاریں گے۔

امریکا سے واپس اپنے گھر پہنچتے ہی کیٹ ڈیوڈ سے اس کے دفتر میں ملی۔ وہ حسب معمول مصروف تھا۔ اسے دیکھ کر کیٹ کے دل کی دھڑکن بہت تیز ہو گئی۔ وہ ڈیوڈ کو اس مکان کے بارے میں بتانا چاہتی تھی۔

ڈیوڈ اسے دیکھتے ہی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اور پرجوش لہجے میں بولا "خوش آمدید کیٹ تم بڑے موقع سے آئی ہو۔ میں یہ خوشخبری سب سے پہلے تمہیں سنانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے جیون ساتھی کا انتخاب کر لیا ہے۔ میں بہت جلد شادی کرنے والا ہوں۔"

☆

یہ قصہ چھ ہفتے پہلے شروع ہوا تھا۔ امریکہ کے ایک اہم اور ہیروں کے بڑے خریدار کا دوست اونیل قصبے میں آیا ہوا تھا اس کی آمد کی اطلاع ڈیوڈ کو اسی امریکی خریدار نے دی تھی اور اس نے کاروباری مصلحتوں کی بناء پر اونیل کو مدعو کرنا ضروری سمجھا تھا۔ بس یہیں سے سارا معاملہ گڑبڑ ہو گیا۔ اونیل تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیٹی روبی بھی تھی۔ اتنی حسین لڑکی اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی اسے دیکھتے ہی ڈیوڈ کا سانس رک سا گیا۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں اسے دیکھتا رہا۔

جس خاطر تواضع کا آغاز کاروباری مصلحتوں سے ہوا تھا اس میں اب دل کے تقاضے بھی شامل ہو گئے تھے۔ ان تقاضوں نے دونوں باپ بیٹی کو ڈیوڈ کا مہمان عزیز بنا دیا تھا۔ اس نے ان دونوں کو کمپنی کی تمام کانوں کی سیر کرائی۔ شہر کے اطراف حسین اور خوشنما مقامات کی سیر کرائی۔ ہر نیا دن، ہر نیا لمحہ ڈیوڈ کو روبی کے قریب تر لے گیا۔ ڈیوڈ کی یہ محبت یک طرفہ نہیں تھی۔ خود اس کی قربت بھی روبی کے دل میں خوشگوار دھڑکنوں کا باعث تھی۔

اور پھر وہ لمحہ آ گیا جو اس بڑھتی اور جوان ہوتی محبت کا خوشگوار ترین لمحہ تھا۔ اس رات اونیل کی طبیعت قدرے گراں تھی اس لیے وہ ان کے ساتھ نہ تھا۔ وہ دونوں ہوٹل کی رقص گاہ میں ایک دوسرے کے ہم رقص بن گئے یہ پہلا موقع تھا کہ وہ مہ جبیں اس کے اتنے قریب تھی۔ یہ بڑے سحر خیز لمحات تھے۔ دونوں کے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کی کیف اور قربت سے سرشار تھے۔ اس عالم میں وہ ٹھیک سے رقص بھی نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ قدم کہیں رکھتے تھے اور پڑتے کہیں تھے۔

"روبی! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔" جذبات کی انتہاؤں پر پہنچ کر ڈیوڈ اظہار محبت کر بیٹھا۔

"خدا کے لئے ڈیوڈ۔۔۔ اس سے آگے کچھ نہ کہنا۔" روبی نے اس کے ہونٹوں پر نرم و نازک مخروطی انگلی رکھ کر کہا۔

"کیوں؟" ڈیوڈ چونک گیا۔ "ایسی کیا بات ہے؟"

"اس لیے کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔"

"کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے روبی؟"

اس نے مسکرا کر اپنی بڑی بڑی جھیل ایسی آنکھیں جھپکائیں" اور بولی میں تمہاری محبت میں پاگل ہو گئی ہوں ڈیوڈ۔"

"پھر تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کر سکتیں؟ آخر ایسی کیا مجبوری ہے؟ وہ بیتابی سے بولا۔

"اس لئے کہ میں یہاں اس چھوٹے سے شہر میں نہیں رہ سکتی۔ یہاں آدمی کچھ وقت تو گزار سکتا ہے، زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ میں تو پاگل ہو جاؤں گی۔" روبی نے کہا۔

"کوشش کر کے دیکھو۔ محبت بڑے بڑے معجزے کر دکھاتی ہے۔" ڈیوڈ نے کہا۔

"یہ خیال کئی بار میرے ذہن میں بھی آیا ہے لیکن میں ڈرتی ہوں۔ اگر شادی کے بعد مجھے یہاں رہنا پڑا تو میں جھلاہٹ میں مبتلا ہو جاؤں گی۔ اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو کاٹ کھانے کو دوڑیں گے۔ نفرت کرنے لگیں گے۔ میں یہ نہیں چاہتی، اس لئے میں بس اسی مرحلے پر تم سے جدا ہونے کو ترجیح دیتی ہوں۔ امید ہے تم میری مجبوری کو سمجھ کر مجھے معاف کر دو گے۔"

"لیکن میں یہ جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔" ڈیوڈ نے اعتراف حقیقت کیا۔

اس نے ڈیوڈ کو بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ اور ڈیوڈ کو یوں لگا جیسے روبی کا وجود اس کے آپے میں پگھل رہا ہو، قطرہ قطرہ، شبنم کی مانند۔ "کیا اس بات کا امکان نہیں کہ تم ہمارے ساتھ امریکہ چل کر رہو؟"

"میں وہاں کیا کروں گا؟" ڈیوڈ نے پوچھا۔

"میں رات کو اپنے کمرے میں اس بارے میں سوچوں گی۔ تم بھی صورت حال پر سنجیدگی سے غور کرنا صبح کوئی نہ کوئی صورت ضرور

نکل آئے گی۔"

"میں چاہتی ہوں کہ تم ڈیڈی سے اس سلسلے میں بات کرو۔"

ڈبلیو ڈ اس خوبصورت اور باوقار لڑکی کے لئے پاگل ہو رہا تھا۔ صبح وہ ناشتے پران کے ساتھ تھا۔ اونیل نے ہی گفتگو میں پہل کی۔

"روبی نے مجھے رات کی تمام گفتگو کے بارے میں بتا دیا ہے۔ تم دونوں واقعی ایک بڑے مسئلے سے دوچار ہو۔ اس مسئلے کا ایک حل ہے میرے پاس بشرطیکہ تمہیں اس سے کوئی دلچسپی ہو۔ مجھے تم دونوں کے مستقبل سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں ہے۔"

"میں بہت زیادہ دلچسپی رکھتا ہوں جناب فرمایئے، مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

اونیل نے اپنے بیگ سے بہت سے کاغذات نکالتے ہوئے کہا۔ "تمہیں ڈبوں میں بند کھانوں سے متعلق کچھ معلوم ہے؟"

"نہیں جناب۔ میں تو پہلی بار سن رہا ہوں کہ ڈبوں میں بند کھانے بھی ہوتے ہیں" ڈبلیو ڈ نے کہا۔

"خوراک کو منجمد کر کے محفوظ کرنے اور بعد میں استعمال کرنے کا طریقہ امریکہ میں ۱۸۷۵ء میں شروع ہوا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ خوراک کو طویل فاصلوں تک کس انداز میں پہنچایا جائے کہ گرمی سے وہ خراب نہ ہو۔ اب اس کے لئے ریل کاروں کے سرد خانے استعمال کئے جاتے ہیں لیکن ابھی تک کسی نے ٹرکوں کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ خیر اب میں نے اس کا پورا منصوبہ تیار کیا ہے اور اس کو رجسٹرڈ بھی کرا لیا ہے۔ اگر منصوبے پر کام کیا جائے تو اشیائے خورد ونوش کے کاروبار میں ایک انقلاب آجائے گا۔"

"لیکن میں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں جانتا جناب" ڈبلیو ڈ نے کہا۔ "پھر میں اس کاروبار میں کیسے ہاتھ ڈال سکتا ہوں"

"اس سلسلے میں مجھے فنی ماہر کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کسی ایسی پارٹی کی تلاش میں ہوں جو اس منصوبے میں معقول سرمایہ لگا سکے اور مجھے ایک ذہین آدمی بھی درکار ہے۔ جو اس کاروبار کو سنبھال سکے۔ اور میرا خیال ہے اس مقصد کے لئے تم نہایت موزوں شخص ہو۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اس کاروبار میں کتنا فائدہ ہو سکتا ہے۔ کتنی وسعت ہے۔ اس کاروبار میں۔"

"اس نئی کمپنی کا ہیڈ کوارٹر سان فرانسسکو میں ہوگا۔" روبی نے لقمہ دیا۔

"ڈبلیو ڈ تھوڑی دیر اس بارے میں غور کرتا رہا پھر ایک گہرا سانس لے کر بولا یہ منصوبہ آپ نے رجسٹرڈ کرا لیا ہے۔"

"ہاں۔" اونیل نے جواب دیا میں کاروباری معاملات میں بے حد محتاط رہتا ہوں۔ کاروبار میں سرمایے سے زیادہ آئیڈیلوں اور جامع منصوبہ بندی کی اہمیت ہوتی ہے۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو یہ مجھے دے دیں، میں اس پر تبادلہ خیال کر لوں۔"

"بڑی خوشی سے۔" اونیل نے جواب دیا اور تمام کاغذات اس کے حوالے کر دیئے۔

اور پھر ڈبلیو ڈ نے سب سے پہلے اونیل کے بارے میں اپنے ذرائع سے معلومات حاصل کیں۔ یہ معلومات نہایت حوصلہ افزا تھیں۔ سان فرانسسکو میں اونیل نہایت نیک نام شخص تھا۔ وہ برکلے کالج میں شعبۂ سائنس کا سربراہ رہ چکا تھا۔ لوگ اس کی بے حد عزت کرتے تھے۔ مگر ڈبلیو ڈ کو منجمد غذائی اشیاء کے بارے میں کوئی معلومات نہ تھیں اس لئے اس نے سوچا کہ پہلے وہ اس کے بارے میں دارالحکومت جا کر معلومات حاصل کرے گا۔

اس نے دارالحکومت میں گوشت پیک کرنے والے سب سے بڑے کارخانے کے مالک سے اس منصوبے پر تبادلہ خیال کیا۔ یہاں بھی نتائج بڑے حوصلہ افزا تھے۔ کارخانے کا مالک اس بات سے واقف تھا کہ امریکہ میں اس قسم کے منصوبے کو رجسٹرڈ کرایا گیا ہے۔ اس نے نہ صرف ضروری معلومات ڈبلیو ڈ کو فراہم کیں بلکہ یہ بھی کہا۔ "یہ بہت اہم اور بڑی ایجاد ہے۔ جناب اگر اس منصوبے کو عملی شکل دے دی گئی تو ایسا کرنے والا راتوں رات بے انتہا دولت مند ہو جائے گا۔"

اب ڈبلیو ڈ کے لئے فیصلہ کرنا دشوار نہیں تھا اس نے روبی کو بتا دیا۔ کہ وہ سان فرانسسکو جانے کے لئے تیار ہے۔ اس کے بعد وہ کیٹ کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔

☆

کیٹ واپس آگئی تھی اور وہ اسے اپنی شادی کے ارادے سے آگاہ کر چکا تھا۔

کیٹ کو یوں لگا جیسے ڈبلیو ڈ نے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہو۔ اسے تمام کمرہ چکراتا ہوا محسوس ہوا۔

اس نے میز کا کونہ تھام لیا۔ چند لمحے بعد اس نے خود پر قابو پالیا اور مسکراتے ہوئے کہا: ”مجھے بتاؤ وہ لڑکی کون ہے ؟“ کیٹ کو اپنے اوپر حیرت بھی ہوئی اور فخر بھی کہ اس نے نہایت حوصلہ مندی کا ثبوت دیا تھا۔

”اس کا نام روبی ہے۔ وہ ان دنوں یہاں اپنے والد کے ساتھ آئی ہوئی ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم دونوں بہت اچھی دوست ثابت ہوگی۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“ ڈیوڈ نے اس کے جذبات اور احساسات کا خیال کئے بغیر بے رحمی سے کہا۔

”بلاشبہ وہ حسین و جمیل اور باوقار لڑکی ہوگی۔ جبھی تو تم اس سے پیار کرتے ہو۔“ کیٹ نے پھر نہایت مضبوط لہجے میں کہا۔

”اس کے علاوہ ایک اور بات ہے کیٹ۔ میں یہ کمپنی چھوڑ رہا ہوں۔“ ڈیوڈ نے اسے ایک اور روح فرسا خبر سنائی۔

کیٹ کو ایسا لگا جیسے اس کی دنیا ہی تباہ ہوتی جا رہی ہے اس پر ہر طرف سے آفتیں نازل ہو رہی ہیں ”کیا اس کے بغیر نہیں بن سکتی۔“

”مسئلہ کچھ اس قسم کا ہے۔ روبی کے والد امریکہ میں مستقل سکونت رکھتے ہیں اور وہ وہیں ایک نیا کاروبار شروع کرنے والے ہیں۔ انہیں میری ضرورت ہے۔“

”خوب، تو گویا تم امریکہ جانا چاہتے ہو۔“

”ہاں، لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے جانے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ راجر میری ذمے داریاں آسانی سے سنبھال سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم ذہین اور باصلاحیت افراد پر مشتمل ایک ٹیم بنائیں گے۔ جو راجر کی مدد کرے گی... میں مجبور ہوں کیٹ میرے لئے یہ فیصلہ بہت مشکل تھا۔ مجھے کمپنی چھوڑنے کا بے حد افسوس ہے۔ میرا ازدواجی معاملہ نہ ہوتا تو میں کبھی کمپنی نہ چھوڑتا۔“

”میں جانتی ہوں ڈیوڈ، تمہاری مجبوری کو سمجھتی ہوں۔ محبت انسان سے بعض اوقات ناممکن فیصلے کرا دیتی ہے مگر یہ بتاؤ اپنی ہونے والی بیوی سے مجھے کب ملوا رہے ہو؟“

ڈیوڈ کے لئے یہ امر اطمینان اور خوشی کا باعث تھا کہ کیٹ نے اس خبر کو بڑے صبر و سکون سے سنا تھا اور نہایت بردباری کا ثبوت دے رہی تھی۔ ”تمہیں فرصت ہو تو آج رات ہی ملاقات ہو سکتی ہے۔“ وہ مسکرا کے بولا۔

”مجھے فرصت ہی فرصت ہے۔“ کیٹ نے کہا۔ ”تم انہیں میری طرف سے آج رات کھانے پر مدعو کر لو۔“

ڈیوڈ کے جاتے ہی سیلاب کا بند ٹوٹ گیا اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگے۔ اس کے وہ تمام خواب جو وہ بچپن سے دیکھتی آئی تھی، چکنا چور ہو چکے تھے۔ اس نے کیا سوچا تھا اور کیا ہونے والا تھا۔ اس کے سہانے اور رنگین خوابوں کی یہ بڑی بھیانک تعبیر تھی۔

رات کھانے پر اس کی ملاقات ڈیوڈ کی ہونے والی شریک حیات روبی سے ہوئی اور کیٹ نے ڈیوڈ کو فوراً معاف کر دیا۔ وہ واقعی ملکوتی حسن کی مالک تھی۔ ڈیوڈ اگر اس کی زلفوں کا اسیر ہو گیا تھا تو یہ تعجب خیز بات نہیں تھی۔ روبی کے سامنے کیٹ خود کو بدصورت سمجھنے لگی تھی۔ عجیب سے احساس کمتری میں مبتلا ہوئی تھی وہ، اور مصیبت یہ تھی کہ روبی بھی ڈیوڈ کی محبت میں مبتلا تھی۔

کھانے پر اوبیل نے کیٹ کو اپنی نئی کمپنی کے بارے بتایا۔ وہ تمام تفصیلات نہایت غور سے سنتی رہی۔ آخر میں اس نے کہا: ”آپ کا منصوبہ واقعی دلچسپ اور اچھوتا ہے۔“

”بات یہ ہے مس کیٹ، یہ آپ کی عظیم الشان کمپنی تو ہے نہیں۔ ہم بہت چھوٹے پیمانے پر یہ کام شروع کریں گے۔ لیکن ڈیوڈ جیسے شخص کے ہاتھ میں اس کا انتظام ہوگا تو مجھے امید ہے کہ یہ کمپنی کامیابی سے ضرور ہمکنار ہوگی۔“

یہ تمام وقت کیٹ کے لئے سخت اذیت کا باعث تھے۔ وہ ہر ہر لمحے میں نئے سرے سے مرتی رہی، نزاع کے عالم سے گزرتی رہی۔ جب وہ ہوٹل واپس جا رہے تھے تو روبی نے ڈیوڈ سے کہا: ”وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ میں اس کے چہرے پر یہ بات پڑھ چکی ہوں“

ڈیوڈ مسکرا کر بولا، ”نہیں روبی، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم دونوں دوست ہیں۔ وہ میرے ہاتھوں میں پل کر جوان ہوئی ہے۔“

روبی یہ سن کر خاموش ہو گئی۔ ”یہ مرد بھی کتنے بے بہرہ ہوتے ہیں“، اس نے سوچا۔

اگلے دن اوبیل، ڈیوڈ کے آفس میں بیٹھا اسی مسئلے پر اس سے گفتگو کر رہا تھا۔ ”جناب! مجھے یہاں سے فارغ ہونے میں دو ماہ

لگیں گے۔ میں اس منصوبے کو بروئے عمل لانے کے مسئلے پر غور کرتا رہا ہوں۔ اس کے لئے سرمائے کی فراہمی پر غور کرتا رہا ہوں۔ اگر ہم نے اس سلسلے میں کسی بڑی کمپنی سے مدد چاہی تو وہ ہمیں نگل جائے گی اور ہمیں بہت کم حصّے پر ٹرخا دے گی اور یوں یہ کمپنی ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کمپنی کو ہم اپنے ہی وسائل سے چلائیں۔ میرا اندازہ ہے کہ اس کے لیے ہمیں اسّی ہزار ڈالر کے بنیادی سرمائے کی ضرورت ہو گی۔ میرے پاس چالیس ہزار ڈالر کے قریب رقم ہے۔ اب ہمیں مزید چالیس ہزار ڈالر کی ضرورت اور رہو گی۔"

"میرے پاس دس ہزار ڈالر ہیں اور میرا ایک بھائی مجھے مزید پندرہ ہزار ڈالر دے سکتا ہے۔" اونیل نے بتایا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ۲۵ ہزار ڈالر کی کمی ہے۔ ہم یہ رقم کسی بینک سے حاصل کر لیں گے۔" ڈیوڈ نے کہا۔

"ٹھیک ہے تو میں اور روبی فوراً اپنے وطن روانہ ہو رہے ہیں۔ وہاں ہم ابتدائی تیاریاں کرتے ہیں۔ دو ماہ بعد تم آؤ گے تو کام شروع کر دیں گے۔"

دونوں باپ بیٹی دوسرے روز امریکہ روانہ ہو گئے اور ڈیوڈ اپنا کام سمیٹنے میں لگ گیا۔ اصولاً طے ہو گیا تھا کہ ڈیوڈ کی جگہ راجر کو سنبھالنی ہے۔ اب صرف انتظامیہ سے متعلق ٹیم کا انتخاب کرنا تھا۔ اس کے لیے نہایت احتیاط سے متوقع افراد کی فہرست تیار کی گئی اور اس پر وہ تینوں گھنٹوں تبادلہ خیال کرتے رہے۔ مستقبل کا لائحہ عمل مرتب کرتے رہے۔ مختلف پہلوؤں پر بحث و مباحثہ کرتے رہے۔

غور و فکر کے نتیجے میں وہ ایک ماہ بعد چار ایسے افراد کو منتخب کرنے پر رضامند ہو گئے۔ جنہیں راجر کے ساتھ کام کرنا تھا۔ یہ چاروں افراد بیرونی ممالک میں کام کر رہے تھے۔ انہیں فوری طور پر طلب کر لیا گیا تاکہ ان کا انٹرویو کر کے ان کے بارے میں حتمی فیصلہ کیا جا سکے۔ پہلے دو افراد سے انٹرویو نہایت اطمینان بخش رہے۔ دونوں ہی مطلوبہ معیار پر پورے اترے تھے۔

تیسری صبح، جب تیسرے امیدوار کا انٹرویو ہونا تھا، ڈیوڈ بہت مضمحل سا کیٹ کے آفس میں داخل ہوا۔ اُس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ وہ چھوٹتے ہی بولا "کیٹ، اس کمپنی میں کیا اب بھی میرے لیے گنجائش ہے؟"

کیٹ نے حیرت سے ڈیوڈ کو دیکھا "کیوں، کیا ہوا؟"

"مم..... میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا ہو گیا۔ یوں سمجھ لو جو سپنا میں نے دیکھا تھا۔ اس کی تعبیر بھیانک نکلی ہے۔"

کیٹ اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس آ گئی اور ہمدردانہ لہجے میں بولی "مجھے بتاؤ ڈیوڈ، آخر ہوا کیا؟"

"مجھے ابھی اونیل کا خط ملا ہے۔ اس نے اپنا منصوبہ فروخت کر دیا ہے۔" ڈیوڈ نے ہارے ہوئے جواری کے سے انداز میں کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" کیٹ نے حیرت سے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں کیٹ اونیل نے دو لاکھ ڈالر اور رائلٹی کے عوض اپنا منصوبہ فروخت کر دیا ہے۔ اب وہ کمپنی مجھے منیجر کی حیثیت سے رکھنے کے لیے تیار ہے۔ اونیل نے لکھا ہے کہ یہ پیشکش مسترد کرنا اس کے بس میں نہ تھا۔ وہ اس دولت سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ احمق کہیں کا وقتی فائدے کے لیے عمر بھر کا عیش و آرام گنوا دیا۔" ڈیوڈ کے لہجے میں تلخی تھی۔

کیٹ نے غور سے اُسے دیکھا اور زہرخند سے بولی "اور وہ تمہاری محبوبہ دلنواز روبی۔ اس کا کیا کہنا ہے؟"

"اس کا بھی خط آیا ہے۔ لکھا ہے کہ وہ اب بھی مجھ سے شادی کے لیے تیار ہے اور جونہی میں سان فرانسسکو پہنچوں گا، ہماری شادی ہو جائے گی۔"

"اور اب تم وہاں نہیں جانا چاہتے؟" کیٹ نے پوچھا۔

"ہاں، میں نے امریکہ جانے کا خیال دل سے نکال دیا ہے۔ میں اُس کمپنی کو ایک کامیاب اور بڑی کمپنی بنانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ بہت ہی لالچی ثابت ہوئے۔" ڈیوڈ کے لہجے میں زہر بھرا ہوا تھا۔

"تم روبی کے بارے میں زیادتی سے کام لے رہے ہو؟" کیٹ نے کہا۔

"زیادتی تو انہوں نے میرے ساتھ کی ہے۔ یہ ان کی ملی بھگت ہے۔ روبی نے مجھ سے شادی کرنے کا فیصلہ بھی کاروباری نقطۂ نظر سے کیا تھا۔ میں اس سے شادی نہیں کروں گا تو اس پر کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیوں؟" کیٹ نے کہا۔

"کچھ کہنے ضرورت نہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں شاید ہی کبھی اتنا احمقانہ فیصلہ کیا ہو گا۔"

کیٹ اپنی کرسی پر جا بیٹھی اور اُس نے انتظامیہ سے متعلق متوقع افراد کی فہرست پھاڑ ڈالی۔

ڈیوڈ کے لیے یہ زندگی کا بہت بڑا دھچکہ ثابت ہوا۔ اُس کو اپنے اس فیصلے پر ندامت تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر پوری دلجمی کے ساتھ کمپنی کے کام میں منہمک ہو گیا تھا۔ وہ مصروفیت میں اپنی ناکامی اور تلخی کو بھلا دینا چاہتا تھا۔ اس کے بعد ڈیوڈ کو ان باپ بیٹی کے کئی خط ملے لیکن اس نے ان خطوط کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ ان سے اب کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ کیٹ اس کی ذہنی کیفیت سے آگاہ تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ڈیوڈ کو خود ہی یہ احساس ہو جائے کہ اس کے دکھوں کا مداوا کرنے کے لیے وہ اس کے پاس ہی موجود ہے۔

اور یوں چھ مہینے گزر گئے۔ اب ڈیوڈ کے پاس ان دونوں میں سے کسی کا خط بھی نہیں آتا تھا۔ کیٹ اور ڈیوڈ دونوں نہایت قریب رہ کر کام کرتے۔ وہ ساتھ سفر کرتے، بیشتر وقت تنہا رہتے لیکن ڈیوڈ کے ذہن پر لپٹے ہوئے مایوسی اور افسردگی کے جالے نہ ہٹے۔ وہ اسے خوش رکھنے کے لیے ہر جتن کرتی۔ اس کی پسند کے کپڑے پہنتی۔ ایسے منصوبے بناتی جس سے اسے خوشیاں اور مسرتیں میسر آتیں۔ ڈیوڈ کو خوش رکھنے کے لیے بعض اوقات وہ بہت آگے نکل جاتی۔ لیکن اس پر کسی بات کا کوئی اثر ہی نہ ہوتا۔ آخر اس کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔ اِن دنوں وہ ڈیوڈ کے ساتھ اٹلی میں تھی۔ جہاں وہ ایک نئی کان کا سودا کرنے کے لیے آئے تھے۔ رات کے کھانے کے بعد دونوں کیٹ کے کمرے میں حساب کتاب میں مصروف تھے۔ نصف شب کے قریب انہوں نے حساب کتاب مکمل کر لیا۔ ڈیوڈ نے کاغذات سمیٹ لیے اور جمائی لے کر بولا

"اچھا بھئی، اب کام ختم۔ میں چلتا ہوں۔"

"ایک بات تو بتاؤ۔ تم ابھی تک اپنے سوگ سے کیوں نہیں نکل سکے؟" کیٹ نے سنجیدگی سے کہا۔

"سوگ، کیسا سوگ؟" ڈیوڈ نے حیرت سے پوچھا۔

"روبی کے کھو جانے کا سوگ۔ تم اب بھی اس کی یاد میں آہیں بھرتے ہو۔"

"اس کی بات نہ کرو۔ اب وہ میری زندگی سے نکل چکی ہے۔" وہ قدرے بے زاری سے بولا۔

"تو پھر تم ہر وقت منہ کیوں بسورے رہتے ہو؟" کیٹ نے پوچھا۔

"آخر تم کیا چاہتی ہو، کیا کرنا چاہیئے مجھے؟" ڈیوڈ نے تلخی سے پوچھا۔

"میں تمہیں بتاتی ہوں تمہیں کیا کرنا چاہیے۔" کیٹ بھی جھلا کر بولی "تم مجھے کیوں نہیں اپنا لیتے۔ مجھ سے پیار کیوں نہیں کرتے آخر مجھ میں کیا خرابی ہے؟ میں تم سے روبی سے ہزار گنا زیادہ چاہتی ہوں۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو کیٹ؟"

کیٹ اس کے اور قریب آگئی اور جارحانہ انداز میں بولی "تمہیں مجھے اپنانا ہوگا۔ سالے۔ میں تمہارے پاس ہوں۔ چلو مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ لو۔"

☆

اس کے چھ ہفتے بعد ان کی شادی ہو گئی۔ کلپ میں یہ ایک یادگار شادی تھی۔ قصبے کا کوئی شخص ایسا نہ تھا جو مدعو نہ ہو۔ ہزاروں افراد کے لیے شاندار ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ کیٹ نے شاندار انتظامات کیئے تھے۔ اس نے پیسہ پانی کی طرح بہایا تھا۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا جو پوری ہو گئی تھی۔

وہ رات کیٹ نے دلہن کی حیثیت سے ڈیوڈ کے گھر گزاری۔

اگلے روز وہ اپنے گھر گئی۔ یہ گھر آج بھی اس کا اپنا تھا لیکن اجنبی اجنبی سا لگ رہا تھا۔ وہ بالائی منزل پر اپنی خوابگاہ میں پہنچی دروازہ بند کر کے وہ دیوار پر آویزاں بڑی سی پینٹنگ کے پاس گئی۔ اس کے فریم پر دباؤ ڈالا اب پینٹنگ ہٹ گئی اور اس کے پیچھے سے دیوار گیر تجوری نمودار ہوئی۔ کیٹ نے تجوری کھول کر اس میں سے ایک معاہدہ کا کاغذ نکالا۔ یہ معاہدہ تھری اسٹار میٹ پیکنگ کمپنی سے متعلق تھا جو کیٹ نے خرید لی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ معاہدہ بھی تھا جو تھری اسٹار کمپنی نے اونیل سے اس کے منصوبے کی خریداری کے بارے میں کیا تھا۔ کیٹ نے ایک لمحے کو کچھ سوچا اور کاغذات واپس تجوری میں رکھ کر اسے بند کر دیا۔

وہ اب بہت آسودہ تھی۔ ڈیوڈ اب اس کا تھا۔ وہ ہمیشہ سے اس کا تھا۔ وہ اس کے ساتھ مل کر اپنے باپ کی محنت سے قائم کی گئی کمپنی کو دنیا کی سب سے بڑی کمپنی بنانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کی ماں اور اس کے باپ نے اسے بنانا چاہا تھا۔

وہ ایک بڑے بحران سے نمٹ چکی تھی۔ ڈیوڈ اس کے ہاتھ سے نکل جاتا تو اُس کا خواب پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ اب وہ یہ کام یکسوئی سے کر سکتی تھی کیونکہ اب کوئی ڈیوڈ کو اس سے نہیں چھین سکتا تھا۔ وہ اپنی راہ کے پتھر کو ٹھوکر مار کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ڈیوڈ کو اپنا چکی تھی۔

پھران کا ہنی مون شروع ہوا۔ انہوں نے دنیا بھر کی سیر کی یورپ اور امریکہ کے تمام بڑے اور خوبصورت شہر انہوں نے دیکھ ڈالے ہر جگہ انہوں نے تفریح کے ساتھ ساتھ کمپنی کے معاملات کا جائزہ بھی لیا۔ ڈیوڈ پر اب کیٹ کے جوہر کھلتے جا رہے تھے۔ وہ نہ صرف ایک مکمل عورت تھی بلکہ ایک کامیاب اور نہایت بے رحم منتظم تھی۔ ابتدا میں جب وہ دوسرے فریق سے کاروبار پر بات چیت کرتی تو لوگ اسے کوئی اہمیت نہ دیتے لیکن جلد ہی انہیں احساس ہو جاتا کہ وہ ایک نہایت زیرک اور ہوشیار کاروباری ذہن کے مقابل ہیں۔ وہ کاروبار میں انہیں ایسی ایسی پٹخنیاں دیتی کہ وہ حیران رہ جاتے۔ وہ کاروبار کے داؤ پیچ کو خوب سمجھتی تھی۔ ڈیوڈ حیرت سے اس کی کامیابیوں کو دیکھتا۔ وہ بڑے بڑے تجربے کار لوگوں کو چٹکیوں میں اڑا کر رکھ دیتی۔ وہ جانتی تھی کہ اسے کیا حاصل کرنا ہے اور کس طرح حاصل کرنا ہے۔ وہ طاقت اور قوت اپنے ہاتھوں میں مجتمع کرنا چاہتی تھی اور اس فن سے خوب واقف تھی۔

یوں کاروباری معاملات کو نمٹاتے ہوئے ان کا ہنی مون ڈاک ہاربر میں گوشۂ عافیت پر تمام ہوا۔

کیٹ کامیابیوں کی نئی منزلیں سر کرتی رہی۔

اسی سفر کے دوران ۱۹۱۴ء بھی آ گیا۔ پہلی جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ جس دن جرمنی نے اعلانِ جنگ کیا، کیٹ نے نہایت پُرجوش انداز میں ڈیوڈ سے کہا ”یہ ہمارے لیے نہایت سنہرا موقع ہے ہم کروڑوں ڈالر کما سکتے ہیں۔“

ڈیوڈ چونک گیا اور تعجب خیز لہجے میں بولا ”کیا کہہ رہی ہو؟“

”جنگ چھڑ گئی ہے میری جان۔ جنگ کے لیے ملکوں کو اسلحہ اور گولہ بارود کی ضرورت ہو گی اور وہ اسلحہ اور گولہ بارود ہم انہیں فراہم کریں گے۔“

”ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ ہم اسلحہ سازی کی صنعت میں داخل نہیں ہوں گے۔ ہمارا کاروبار پہلے ہی بہت وسیع ہے ہمیں انسانی خون کو منافع کا بہانہ نہیں بنانا چاہیے۔“ ڈیوڈ نے سرد لہجے میں کہا۔

”زیادہ اخلاقیات نہ بگھارو ڈیوڈ۔ جنگ، محبت اور کاروبار میں سب جائز ہے اور پھر ہم اسلحہ نہیں بنائیں گے تو کیا ہو گا۔ یہ کام کوئی اور کرے گا، پھر کیوں نہ ہم اس سنہرے موقع سے فائدہ اٹھائیں۔ موجودہ حالات میں اسلحہ اور گولہ بارود سے زیادہ منافع بخش کاروبار اور کوئی نہیں ہے۔ جنگ ہوتی ہے تو باقی سارے کام مندے پڑ جاتے ہیں صرف اسلحہ ساز فیکٹریاں چلتی ہیں۔“

”جب تک میں اس کمپنی سے وابستہ ہوں، ہم اسلحہ سازی کی صنعت میں داخل نہیں ہوں گے۔ اور آج کے بعد ہم اس موضوع پر کوئی گفتگو بھی نہیں کریں گے۔ اس موضوع کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم سمجھو۔“

کیٹ کو شادی کے بعد پہلی مرتبہ ڈیوڈ پر شدید غصہ آیا۔ سالا اخلاقیات کی دُم۔ اُلّو کا پٹھا! پتہ نہیں خود کو کیا سمجھتا ہے۔ اس رات شادی کے بعد پہلی بار وہ علیحدہ سوئے۔ ڈیوڈ کے بچکانہ اندازِ فکر پر کیٹ کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔ یہ کسی عملی شخص کا، کسی کامیاب کاروباری کے سوچنے کا انداز نہیں تھا۔ یہ تو بے عمل فلسفیوں کی سوچ تھی۔ یہ انداز ان لوگوں کا تھا جو کام کرنا نہیں جانتے صرف ہاتھ پر ہاتھ دھرے سوچتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف ڈیوڈ بھی حیران تھا۔ کیٹ اتنی سخت دل، کٹھور اور بے رحم بھی ہو سکتی ہے، اس کے تصوّر میں بھی نہ تھا۔ شاید کاروباری کامیابیوں نے اسے بدل کر رکھ دیا ہے۔ وہ ایک غیر معمولی عورت بن چکی تھی۔

اور اس کے بعد ہر آنے والا دن ان دونوں کے لیے بڑا عذاب ناک تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خود کو صحیح سمجھ رہے تھے۔ دونوں اپنے خیالات بدلنے کے لیے تیار نہ تھے۔ دونوں اپنے رویّے میں لچک پیدا کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ ان میں سرد جنگ چل رہی تھی۔

جنگ کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ جرمن آبدوزوں نے بحری جہازوں کے لیے سفر غیر محفوظ بنا دیا۔ امریکہ ابھی تک جنگ سے الگ تھلگ تھا۔ لیکن ڈیوڈ کو یقین تھا کہ جلد یا بدیر وہ بھی اس جنگ میں کود پڑے گا۔ یورپ میں جنگ نے شدت اختیار کر لی تھی۔ فرانس میں امریکی ہوابازوں کی مدد سے فضائی فوج تیار کر لی گئی تھی۔ ڈیوڈ پہلے ہی طیارہ اڑانا سیکھ چکا تھا۔ اس نے یہ خبر سنی تو فوراً ہی فرانس جا کر اس فضائی فوج میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ تمام تر عیش و آرام کو تیاگ کر وطن کی خدمت کرنے پر تل گیا تھا۔

کیٹ نے یہ خبر سنی تو حیران رہ گئی اور تعجب خیز لہجے میں بولی ”مگر ڈیوڈ، تمہیں اس جنگ میں حصّہ لینے کی کیا ضرورت ہے؟ اس جنگ سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“

”امریکہ اس جنگ سے زیادہ عرصے الگ تھلگ نہیں رہ سکے گا۔ میں امریکی ہوں اور اس ناطے فرانس جانا میرا فرض ہے میں ہوائی جہاز اڑانا جانتا ہوں اور اس وقت مجھ جیسے ہنرمندوں کی امریکہ کو سخت ضرورت ہے۔ یہ وقت کا تقاضا ہے کیٹ۔“

"مگر تمہاری عمر، تم چھیالیس برس کے ہو گئے ہو؟ تم بھلا فوج میں کس طرح بھرتی ہو سکتے ہو؟"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں طیارہ اڑا سکتا ہوں۔ انہیں ہر کارآمد شخص کی ضرورت ہے عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔"

کیٹ کی تمام دلیلیں بے کار ہو گئیں۔ اور وہ اُسے ہزاروں اندیشوں اور وسوسوں میں مبتلا چھوڑ کر فرانس چلا گیا۔ اس کی غیر موجودگی میں ہر آتی جاتی سانس تلوار کی مانند تھی۔ اس مسلسل عذاب کی شدت کم کرنے کے لیے اس نے کاروباری مصروفیات میں پناہ ڈھونڈ لی۔ وہ جنگ کی خبریں بہت توجہ کے ساتھ اور باقاعدگی سے پڑھتی تھی۔ جنگ کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا تھا، اس کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ جرمن فوجیں اتحادیوں پر حاوی آ رہی تھیں۔ اس پُرآشوب دور میں وہ اپنے جیون ساتھی کے بغیر اذیت ناک زندگی گزار رہی تھی۔

جنگ کی یہ بدترین صورت حال کیٹ کے لیے تشویشناک تھی۔ ڈیوڈ اتحادیوں کی طرف سے لڑ رہا تھا۔ اس لیے اس کی تمام ترہمدردیاں اتحادیوں کے ساتھ تھیں۔ آخر ایک دن اس نے راجر کو بلا کر کہا "حالات تم دیکھ ہی رہے ہو۔ اتحادیوں کو ٹینکوں، توپوں اور گولہ بارود کی ضرورت ہے یہ بہترین موقع ہے۔ وقت سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت ہوگی۔"

"مگر کیٹ! ڈیوڈ اسے پسند نہیں کرے گا وہ تمہارے اس منصوبے کی شدت سے مخالفت کر چکا ہے۔"

"وہ ڈیوڈ کی عدم موجودگی میں فیصلہ کرنا تمہارا اور میرا کام ہے۔"

راجر نے یہ جملہ سُنا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ کیٹ نے اس جملے میں اُس کا حوالہ محض تکلفاً دیا تھا، جو کچھ اسے کرنا تھا، اس کا فیصلہ وہ پہلے ہی کر چکی تھی۔

اس معاملے میں خود کیٹ کے لیے ڈیوڈ کا رویّہ ناقابلِ فہم تھا۔ اتحادیوں کو اسلحہ کی ضرورت تھی اور کیٹ یہ اسلحہ سپلائی کرنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ حب الوطنی کا تقاضا بھی یہی تھا۔ اس نے کوئی نصف درجن کے قریب ممالک کے سربراہوں سے اس سلسلے میں مذاکرات کیے۔ اور ایک برس کے اندر ہی اس کی کمپنی نے توپیں، ٹینک، بم اور گولہ بارود تیار کر کے سپلائی کرنا شروع کر دیا۔ کمپنی اس جنگ کے لیے تقریباً ہر ضروری چیز سپلائی کر رہی تھی۔ وردی سے لے کر ٹینک تک، سوئی سے ٹرین تک تیار کر رہی تھی۔ ایک دن کیٹ نے کمپنی کے منافع کے اعداد و شمار دیکھنے کے بعد بڑے فخر یہ لہجے میں راجر سے کہا تھا "ان اعداد و شمار کو دیکھنے کے بعد ڈیوڈ بھی یہ تسلیم کرے گا کہ اس کے سوچنے کا انداز غلط تھا۔"

اور پھر ڈیوڈ کا کہنا درست ثابت ہوا۔ ۱۹۱۷ء میں امریکہ بھی جنگ میں کود پڑا۔ امریکی فوجیں فرانس میں اترنے لگیں۔ اتحادیوں کو نئی طاقت مل گئی۔ جنگ کا پانسہ ان کے حق میں پلٹنے لگا۔ نومبر ۱۹۱۸ء میں جنگ بند ہو گئی۔ ڈیوڈ واپس آ گیا۔ کیٹ نے خود کیپ ٹاؤن کی بندرگاہ پر اس کا گرمجوشی سے استقبال کیا۔

گھر تک کا سفر باتوں میں گزرا۔ وہ اس کی باتیں سنتی رہی، اس کے چہرے کو تکتی رہی۔ ڈیوڈ اسے جنگ کے واقعات سناتا رہا۔ طویل عرصے بعد وہ ملے تھے۔ اس کیف اور ملاپ نے ان پر سرمستی اور بےخودی کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ کیٹ اس کے وجود میں کھو جانا چاہتی تھی۔ وہ ایک عرصے سے اس کی قربت کو ترس رہی تھی۔ جب انہیں تنہائی نصیب ہوئی تو کیٹ اس سے لپٹ گئی۔ ڈیوڈ نے دونوں بازو پکڑ کر اسے علیحدہ کیا اور نرمی سے بولا "بیٹھ جاؤ کیٹ، میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

کیٹ کے لیے ڈیوڈ کا یہ رویہ حیران کن تھا وہ تعجب خیز لہجے میں بولی "کیوں کیا بات ہے؟"

"لگتا ہے کہ ہم آدھی دنیا کے لیے اسلحہ فروخت کرنے والے تاجر بن گئے ہیں، کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"سنو ڈیوڈ! اعتراض کرنے سے پہلے حسابات دیکھ لو۔ تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارا منافع . . ."

"میں منافع کی نہیں، کچھ اور بات کر رہا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ میری روانگی سے پہلے بھی ہمارا منافع بہت تھا۔ اور مجھے یہ بھی یاد پڑتا ہے کہ میرے جانے سے قبل ہم اس بات پر رضامند ہو گئے تھے کہ اسلحہ سازی کی صنعت سے ہمیں کوئی غرض نہ ہوگی۔" ڈیوڈ کا لہجہ بہت سرد تھا۔ وہ بپھرا ہوا تھا۔ اسلحہ سازی کی صنعت میں کیٹ کے حصہ لینے پر اس کے دل کو سخت ٹھیس پہنچی تھی۔

"یہ تمہارا خیال تھا، میرا نہیں۔" کیٹ نے بمشکل اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا "وقت بدل رہا ہے ڈیوڈ، اور ہمیں وقت کا ساتھ دینے کے لیے تبدیل ہونا پڑتا ہے ہم یہ کام نہ کرتے تو کوئی اور کر لیتا اور ہم کروڑوں کے منافع سے محروم ہو جاتے۔"

ڈیوڈ چند لمحے اسے خاموشی سے تکتا رہا پھر کمزور اور دھیمی آواز میں پوچھا "تو کیا تم تبدیل ہو گئی ہو کیٹ؟"

اس شب کیٹ دیر تک جاگتی رہی اور سوچتی رہی کہ آخر ان دونوں میں سے کون تبدیل ہوا ہے۔ ڈیوڈ کچھ کمزور پڑ گیا ہے یا وہ زیادہ طاقتور ہو گئی ہے۔ اسلحہ سازی کے خلاف ڈیوڈ کی دلیلوں پر وہ پہلے بھی سوچتی رہی تھی لیکن یہ دلیلیں اسے بے وزن لگتی تھیں۔ جنگ . . .

تھی۔ اتحادیوں کو اسلحہ کی ضرورت تھی۔ یہ اسلحہ بہر حال انہیں حاصل کرنا تھا۔ کوئی نہ کوئی تو یہ اسلحہ سپلائی کرتا، پھر اگر انہوں نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا تھا تو کیا خرابی تھی اس میں۔ اور اگر جنگ اتنی ہی بُری چیز تھی، اسلحہ کی فراہمی ایسی ہی قابل نفرت تھی تو پھر خود ڈیوڈ نے اس جنگ میں کیوں حصہ لیا تھا۔ جنگ ہتھیاروں کے بغیر تو نہیں لڑی جاتی۔ اس نے تو یہ سوچا تھا کہ اسلحہ تیار کر کے وہ ایک طرح سے ڈیوڈ ہی کی مدد کر رہی تھی۔ وہ یہی سب کچھ سوچتی رہی، جاگتی رہی۔ جوں جوں وہ سوچتی رہی، توں توں اسے اسلحہ سازی سے متعلق اپنے اقدام کے بر وقت اور درست ہونے کا یقین پختہ ہوتا گیا۔ وہ بہر حال ڈیوڈ کی طرح جذباتی نہیں تھی۔

صبح ناشتے کے بعد وہ دونوں ٹہلنے کے لیے باہر نکل گئے۔ "یہ واقعی بہت حسین جگہ ہے کیٹ، یہاں واپس آ کر میں بے حد خوش ہوں۔" ڈیوڈ نے تازہ ہوا میں ایک گہرا سانس لے کے کہا۔

"اور رات ہماری جو بات ہوئی تھی اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" وہ سرد مہری سے بولی۔

"جو ہو گیا سو ہو گیا۔ میں یہاں نہیں تھا، سو تم نے جو مناسب سمجھا کیا۔ مجھے اس سے کیا غرض۔"

ڈیوڈ کے جواب میں جھلاہٹ اور سرد مہری تھی۔ وہ اس کے فیصلے کو غلط ہی سمجھتا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ اگر ڈیوڈ یہاں ہوتا تو کیا پھر بھی وہ اسلحہ سازی کے فیصلے پر قائم رہتی۔ شاید ایسا ہی ہوتا۔ اس نے جو کچھ کیا تھا کمپنی کے لیے کیا تھا۔ ڈیوڈ کے لیے کیا تھا لیکن وہ ان دونوں میں سے کس کو زیادہ اہمیت دیتی تھی، یہ فیصلہ کرنا اس کے لیے دشوار تھا۔

●

نئی نئی ایجادات نے دنیا کی وسعتوں کو سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ مواصلاتی نظام کی ترقی نے فاصلوں کو بے نام کر دیا تھا۔ انسان گھر میں بیٹھ کر دنیا میں کسی بھی جگہ ٹیلی فون پر بات کر سکتا تھا۔ مہینوں میں طے ہونے والا سفر اب دنوں میں تمام ہونے لگا تھا۔ ان ایجادات کے ساتھ کیٹ کے خیالات کی وسعتیں پھیلتی جا رہی تھیں۔ کلپ اس کے عزائم کی تکمیل کے لیے بہت چھوٹا شہر تھا۔ وہ اس تیز رفتار ترقی کا حصہ بن کر اس کی تیز رفتاری میں شامل ہونا چاہتی تھی۔ اسی لیے اس نے کمپنی کا ہیڈ کوارٹر نیویارک منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب اس نے ڈیوڈ کے سامنے یہ تجویز رکھی تو وہ حیران رہ گیا اور اس کے شانے پر تھپکی دے کر بولا "تمہارا فیصلہ صحیح ہے، معلوم نہیں یہ خیال میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا۔"

انہوں نے نیویارک کے مصروف ترین کاروباری مرکز وال اسٹریٹ پر کمپنی کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے لیے ایک قطعہ منتخب کیا۔ نقشے بنے اور عمارت کی تعمیر شروع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی کیٹ نے شہر کے سب سے مہنگے علاقے گولڈن ٹاؤن میں فرانسیسی نشاۃ ثانیہ کی طرز کا مکان بنانے کے لیے ایک اور بڑی تعمیراتی فرم کی خدمات بھی حاصل کر لیں۔ وہ ان دونوں عظیم الشان منصوبوں پر پانی کی طرح پیسہ بہانے لگی۔ وہ ان منصوبوں میں گہری دلچسپی لے رہی تھی۔ ایک دن اس نے نہایت پُرجوش لہجے میں کہا۔ "سچ کہتی ہوں ڈیوڈ نیویارک آنے والے برسوں میں دنیا کی تجارت کا مرکز ہو گا۔ ہم اس کے ساتھ ہی بڑھتے اور پھیلتے رہیں گے۔"

"اُف میرے خدا! آخر تم اور کتنا چاہتی ہو؟" ڈیوڈ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"وہ سب کچھ جو اس دنیا میں ہے۔" کیٹ نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

کیٹ کی مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں۔ بعض اوقات خود ڈیوڈ کو اس پر رشک آتا تھا۔ اس نے دو ایک مرتبہ کیٹ کو اس پر ٹوکا بھی لیکن اس کا جواب تھا "کمپنی کی ذمہ داریاں معمولی نہیں ہیں، یہ ہم سے کام اور قربانیاں طلب کرتی ہیں۔"

کمپنی پھلتی پھولتی رہی۔ کیٹ اب دنیا کی ایک ممتاز شخصیت ہو چکی تھی۔ مختلف ممالک کے سربراہ اس سے ملاقات کرتے تھے۔ اس سے سرمایہ کاری کے بارے میں گفتگو کرتے تھے۔ لوگوں کو اس سے ملنے کے لیے کئی دن پہلے وقت مقرر کرانا پڑتا تھا۔ اسے شہر کی ہر بڑی تقریب میں مدعو کیا جاتا تھا مگر وہ بہت کم تقریبات میں شریک ہوتی تھی۔

نیویارک منتقل ہونے کے ایک برس بعد کیٹ کا پیر بھاری ہوا۔ یہ خبر اس کے لیے بہت مسرت انگیز تھی مگر اس کے باوجود اس نے آرام کرنا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔ جسم میں نشوونما پانے والی نئی زندگی کی بنا پر اب اس کا جسم بے ڈول ہونے لگا تھا۔ اسے اٹھنے بیٹھنے میں مشکل پیش آتی تھی لیکن اس نے کمپنی کا کام پھر بھی ترک نہیں کیا تھا۔ ڈاکٹروں کے بورڈ نے اسے مکمل اور بھرپور آرام کی ہدایت کی تھی۔ مگر اسے ایک پل چین نہیں تھا۔ وہ پارے کی طرح متحرک رہتی تھی۔

ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق دو ماہ بعد ولادت ہونے والی تھی۔ ڈیوڈ پیتل کی کانوں کا معائنہ کرنے جنوبی افریقہ گیا ہوا تھا اور اگلے ہفتے واپس آنے والا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی کام کر رہی تھی کہ راجر بغیر دروازہ کھٹکھٹائے اندر آیا۔ اس کے چہرے پر مردنی چھائی

ہوئی تھی۔ کیٹ نے چھوٹتے ہی سوال کیا "کہو کیا ٹین کے سودے میں ہم ناکام ہو گئے ہیں کیا؟"

"نہیں کیٹ، میرا مطلب ہے کہ۔۔۔۔ مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے، ایک ہولناک حادثہ ہو گیا ہے۔ کان میں دھماکہ ہوا ہے۔"

درد کی ایک لہر جیسے کیٹ کے جسم میں دوڑ گئی اور وہ چلاّ کے بولی "کہاں، کس جگہ، کیا دھماکہ بہت شدید تھا، کیا اس میں کچھ لوگ مرے بھی ہیں"

راجر نے گہرا سانس لے کر کہا "چھ سات افراد دھماکے میں ہلاک ہوئے ہیں۔ ڈیوڈ بھی ان میں شامل ہے۔"

راجر کے یہ الفاظ بے شمار بموں کے مسلسل دھماکے بن کر اس کے کانوں میں گونجتے رہے۔ ہر دھماکے کے ساتھ وہ مرتی رہی، اور پھر ہر چیز تاریک اور خاموش ہو گئی۔ وہ رنج و غم کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گئی۔ ڈیوڈ کی بے وقت اور ناگہانی موت نے اسے ناقابلِ برداشت صدمہ پہنچایا تھا۔

اس کے دو گھنٹے بعد کیٹ نے بچے کو جنم دیا۔ یہ بچہ وقت سے دو ماہ پہلے پیدا ہوا تھا۔ کیٹ نے اس کا نام ٹونی رکھا۔ اس کے ایک ماہ بعد وہ اپنے شاندار نئے مکان میں منتقل ہو گئی۔ مکان کی تزئین و آرائش بے مثال تھی۔

۱۹۲۸ء میں ٹونی چار سال کا ہوا تو کیٹ نے اُسے نرسری میں داخل کر دیا۔ وہ بہت خوبصورت اور فرمین بچہ تھا۔ اس کے لیے موسیقی کی تعلیم کا اہتمام بھی کیا گیا تھا اور جب وہ پانچ برس کا ہوا تو اسے رقص بھی سکھایا جانے لگا۔ کیٹ کے لیے وہ لمحے بڑے خوش گوار ہوتے جب وہ اپنے بچے کے ساتھ جزیرے کے مکان کے گوشۂ عافیت میں جا کر چند دن گزارتی۔ کیٹ نے ایک بڑا سا بجرا بھی خرید لیا تھا وہ ٹونی کو لے کر دُور دُور تک سمندر کی سیر کو نکل جاتی تھی۔

یہ سب کچھ تھا لیکن کمپنی کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اس میں عجیب سی کشش اور قوت تھی۔ کمپنی ہی کی بدولت وہ اس قدر دنیا کی امیر ترین عورت تھی۔ اسے جو اہمیت بھی حاصل تھی اسی کمپنی کی وجہ سے تھی۔ اس کو قائم کرنے کے لیے اس کے باپ نے موت سے مقابلہ کیا تھا، اس کو فروغ دینے میں اس کی ماں اور شوہر نے اپنا خون دیا تھا۔ اسے عالمگیر سطح پر سب سے بڑی اور طاقتور کمپنی بنانے میں خود اس نے اپنا ذہن جلایا تھا، اپنی صلاحیتیں صرف کی تھیں، اسی کے لیے کام کرتے ہوئے اُسے جو سکون، طمانیت اور مسرت محسوس ہوتی، کسی اور کام میں نہیں ملتی تھی۔

اب وہ نیویارک میں رہنے لگی تھی لیکن جنوبی افریقہ کی یاد اب بھی اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی۔ وہاں کے حالات بہت تشویشناک صورت اختیار کر گئے تھے۔ نسلی مسائل شدید ہو گئے تھے۔ سفید فام خود کو آقا سمجھتے تھے اور سیاہ فام اس غلامی کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ وہ اپنے لیے انسانی حقوق چاہتے تھے، مساوات کا مطالبہ کر رہے تھے۔ سفید فاموں نے نئے قوانین بنا کر سیاہ فاموں کو مزید محکوم و مجبور بنا دیا تھا۔ اب وہ زمین کے حقِ ملکیت سے محروم ہو گئے تھے۔ انہیں ایسے علاقوں میں بسایا گیا تھا جہاں نہ معدنی وسائل تھے نہ بندرگاہیں اور نہ صنعتی مراکز۔ انہیں جیتے جی جہنم میں جھونک دیا گیا تھا۔ ان کی زندگی ایک مسلسل عذاب ہو کر رہ گئی تھی۔

اور پھر حالات کی سنگینی محسوس کر کے کیٹ جنوبی افریقہ پہنچی۔ اس نے وہاں کے اعلیٰ سرکاری حکام سے ملاقات کی، اس نے سیاہ فام لوگوں کی پُرزور حمایت کی "آخر آپ لوگ سمجھتے کیوں نہیں، یہ ٹائم بم ہے۔ آپ لوگ اسی لاکھ افراد کو غلام بنائے رکھنا چاہتے ہیں یہ بہت بڑا ظلم ہے۔ لاوا اندر ہی اندر پک رہا ہے اور جب یہ پھٹے گا تو ہر چیز جل کر راکھ ہو جائے گی۔"

"یہ غلامی نہیں، ہم جو کچھ کر رہے ہیں انہی لوگوں کی بھلائی کے لیے کر رہے ہیں۔"

"وہ کیسے؟ بڑا کرم ہو گا، اگر آپ مجھے آسان اور واضح انداز میں سمجھا دیں۔"

"بات یہ ہے کہ ہر نسل کو اپنا اپنا کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ اگر سیاہ فام، سفید فاموں سے گھلنے ملنے لگے تو وہ اپنا تشخص کھو دیں گے۔ ہم اس تشخص کو قائم رکھنا چاہتے ہیں گھٹیا اور نیچ کالے اسی قابل ہیں کہ ان کو دبا کر رکھا جائے۔"

"یہ سب بے رحمانہ حماقت ہے، تم لوگوں نے جنوبی افریقہ کو نسلی امتیاز کا جہنم بنا دیا ہے۔"

"آپ نہیں سمجھ سکتیں میڈم۔ یہ سیاہ فام پسماندہ ہیں۔ ذہنی طور پر بچے ہیں۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں انہی کی بھلائی کے لیے کر رہے ہیں۔ ہم ان غیر مہذب اور وحشی جانوروں کو انسان بنا رہے ہیں۔"

"آپ سب لوگ خود کو دھوکہ دے رہے ہیں اور مجھے بھی اس فریب میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں" وہ بے رحمی سے بولی۔

جنوبی افریقہ کے سفید فام حکمرانوں سے ملاقات کر کے کیٹ اور بھی مایوس اور پریشان ہو گئی۔ سب سے زیادہ پریشانی اُسے بانڈا کی طرف سے تھی۔ اس کا اخباروں میں بڑا چرچا تھا۔ جنوبی افریقہ کی حکومت نے اسے باغی قرار دے دیا تھا۔ اخبارات اس کے بارے میں مختلف

خبروں سے بھرے ہوتے۔ پولیس اس کی تلاش میں تھی لیکن وہ پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کبھی شوفر بن کر، کبھی قلی بن کر اور کبھی مزدور بن کر فرار ہو جاتا۔ بانڈا نے ایک چھاپہ مار فوج بھی تیار کر لی تھی۔ کیٹ جانتی تھی کہ وہ سر پھرا جس راہ پر چل نکلا ہے اب اُسے کوئی نہیں روک سکتا۔ بانڈا نے اس کے باپ سے بہت بڑا سبق سیکھا تھا اور وہ یہ کہ انسان کا ارادہ قوی اور قوت ارادی مضبوط ہو تو ناممکن کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔

وہ بانڈا سے ملنا چاہتی تھی۔ ایک دن اس نے اپنے ایک پرانے سیاہ فام فورمین کو بلایا۔ اس شخص پر وہ اعتماد کر سکتی تھی۔ فورمین کے آتے ہی اس نے پوچھا: "ولیم کیا تم بانڈا کی بابت کچھ جانتے ہو؟ اسے تلاش کر سکتے ہو؟"

"بانڈا سے ملنے یا نہ ملنے کا انحصار اس کی مرضی پر ہے۔ اگر وہ چاہے گا تو ملاقات ہو جائے گی۔ اگر وہ پسند نہیں کرے گا تو آپ اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکیں گی۔" سیاہ فام فورمین نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میں اس سے ملنا چاہتی ہوں اور میرا خیال ہے اسے بھی مجھ سے ملنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"کوشش کروں گا۔ اگر آپ کو یقین ہے کہ وہ ملنا پسند کرے گا تو یقیناً ملاقات ہو جائے گی۔"

اگلے دن صبح فورمین نے اسے بتایا: "بانڈا آپ سے ملنے کے لیے راضی ہے۔ اگر آپ آج رات فارغ ہوں تو ایک کار آپ کو بانڈا کے پاس لے جا سکتی ہے۔" وہ کار سے دارالحکومت سے ستر میل شمال میں ایک چھوٹے سے گاؤں پہنچی۔ ایک جھونپڑی کے سامنے کار رکتے ہی وہ دوڑتی ہوئی اندر پہنچی۔ بانڈا اُس کا منتظر تھا۔ وہ آج بھی ویسا ہی تھا جیسا پچھلی ملاقات کے موقع پر تھا۔ حالانکہ اب اس کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔ ذرا بھی تو فرق نہیں آیا تھا۔ اس عجیب شخص میں۔ وہ بہت سنجیدہ اور خاموش تھا۔

اُس نے بڑھ کر کیٹ کو سینے سے لگا لیا۔ اور بولا: "جب کبھی تم ملتی ہو، پہلے سے زیادہ حسین دکھائی دیتی ہو۔"

وہ مسکرا کے بولی: "میں بوڑھی ہو رہی ہوں بانڈا۔ چند برس بعد میں چالیس سال کی ہو جاؤں گی۔"

"لگتا ہے وقت تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ تم اب بھی مجھے بچی لگتی ہو۔ وقت کی کڑی دھوپ تمہارا حسن گہنا نہیں سکے گی۔"

وہ دونوں باورچی خانے میں چلے گئے۔ بانڈا نے اس کے لیے کافی چولہے پر رکھ دی۔ کیٹ نے کہا: "یہاں جو کچھ ہو رہا ہے بانڈا وہ مجھے قطعی پسند نہیں۔ آخر اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔ تم جس راہ پر چل رہے ہو۔ اس کی کوئی منزل بھی ہے؟ میں ڈرتی ہوں بانڈا۔ آخر ہوگا کیا؟"

"حالات بد سے بدتر ہوتے جائیں گے۔ حکومت ہم سے مذاکرات کے لیے تیار نہیں۔ ہمیں انسان سمجھنے پر آمادہ نہیں۔ سفید فاموں نے تمام پل توڑ ڈالے ہیں۔ جو ہمارے اور ان کے درمیان تھے۔ ایک دن انہیں پتہ چلے گا کہ ہم تک پہنچنے کے لئے انہیں ان پلوں کی کتنی ضرورت ہے۔ یہ سفید فام ہمیں جانور سمجھتے ہیں۔ مگر ہم جانور نہیں انسان ہیں۔ ہمارے خون کا رنگ بھی سرخ ہے اور ایک روز یہ سرخی پورے جنوبی افریقہ پر پھیل جائے گی۔"

"مگر تمام سفید فام ایسے نہیں ہیں۔ ان میں بہت سے تمہارے دوست بھی ہیں۔ ارے ہاں تمہارے گھر والے کہاں ہیں؟"

بانڈا نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا: "وہ بھی پولیس سے بچنے کے لیے چھپے پھرتے ہیں۔ لیکن فی الحال پولیس کو میری تلاش سے ہی فرصت نہیں۔"

مجھے بتاؤ بانڈا۔ میں کس طرح تمہاری مدد کر سکتی ہوں؟ میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھ سکتی۔ مجھے بتاؤ کیا پیسوں سے تمہارے مسائل کچھ حل ہو سکتے ہیں؟ میں ہر طرح تعاون کے لیے تیار ہوں۔ ظلم اور زیادتی کے خلاف تحریک میں میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"رقم سے کئی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔" بانڈا نے کہا: "پیسہ مل جائے تو ہماری تحریک زور پکڑ جائے گی۔"

"ٹھیک ہے میں اس کا انتظام کر دوں گی۔ اور بتاؤ، میں کیا کر سکتی ہوں؟" کیٹ نے پوچھا۔

"اور بس تم ہمارے لیے دعا کرو، صرف دعا۔" بانڈا نے جواب دیا۔

اگلے دن کیٹ نیویارک واپس چلی گئی۔

کیٹ کو اپنے بیٹے سے بے حد محبت تھی۔ وہ بہت ذہین اور پیارا بچہ تھا۔ کلاس میں ہمیشہ اول آتا تھا۔ اُسے اپنے بیٹے پر فخر تھا۔ وہ اس کی تمام تر آرزوؤں اور خواہشات کا مرکز تھا۔ اس کی بہترین تعلیم اور تربیت کے لیے شب و روز کوشاں رہتی تھی۔ ٹونی کو اپنے نانا کا عظیم الشان کاروبار سنبھالنا تھا۔ اور اس کے لیے زبردست قابلیت اور غیر معمولی صلاحیتوں کی ضرورت تھی۔

چھٹیوں میں وہ ٹونی کو لے کر مختلف مقامات کی سیر پر نکل جاتی۔ اسے میوزیموں کی سیر کا بڑا شوق تھا۔ فطری طور پر اس کا رجحان آرٹ کی

کی طرف تھا۔ وہ گھنٹوں بڑے بڑے مصوروں کی بنائی ہوئی پینٹنگز کو غور سے دیکھتا رہتا۔ گھر آکر وہ ان تصویروں کی نقل اپنی کاپی پر کرتا لیکن اس میں کبھی ہمت نہ ہوتی کہ وہ اپنی ماں کو یہ تصاویر دکھاتا۔ ذہین ٹونی جانتا تھا کہ اس کی ماں یہ بات کبھی پسند نہیں کرے گی۔ اس کی ماں فنون لطیفہ کو وقت کا زیاں سمجھتی تھی اور اس بارے میں کئی بار طویل لیکچر دے چکی تھی۔ شاعروں اور مصوروں سے تو وہ نفرت کرتی تھی۔ وہ چھوٹا تھا۔ اس کا ذہن ناپختہ تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں نے اس سے کیا توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔ اور اس لیے اس کی یہی کوشش ہوتی کہ وہ اپنی ماں کی توقعات پر پورا اترے۔

۱۹۳۶ء میں جب ٹونی بارہ سال کا ہوا تو کیٹ اس کی سالگرہ میں شرکت کے لیے مشرق وسطیٰ کے دورے سے واپس آئی۔ بیٹا اُسے بہت یاد آتا رہا تھا۔ ٹونی کو دیکھتے ہی کیٹ نے اسے لپٹا لیا "سالگرہ مبارک ہو بیٹے۔ خوش تو ہو میری جان؟"

"جج..... جی ہاں...... مم... ممی" وہ بری طرح نروس ہو گیا۔ آواز اس کے حلق میں پھنس گئی تھی۔

کیٹ نے جھجک کر اسے دیکھا۔ اس سے پہلے اُس نے ٹونی کو کبھی ہکلاتے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے تشویش سے پوچھا "تم ٹھیک تو ہو بیٹے۔

"ہاں، مم... ممی، میں بالکل ٹھٹ.... ٹھیک ہوں" وہ پھر ہکلاتے ہوئے بولا۔

"ہکلاؤ مت، آہستہ آہستہ، ٹھہر ٹھہر کر بولو" کیٹ نے نرم لہجے میں اُسے سمجھایا۔

"اچ... چھا، مم... ممی" باوجود کوشش کے وہ ہکلاہٹ پر قابو نہ پاسکا۔

کیٹ پریشان ہو گئی۔ چند دن بعد اُس نے ٹونی کی ہکلاہٹ کے بارے میں ڈاکٹر سے مشورہ کیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا۔ ٹونی سے بات کی۔ کیٹ سے سوالات کیے اور پھر اُس نے فیصلہ سنا دیا "آپ کا بیٹا بالکل ٹھیک ہے۔ وہ نفسیاتی اور ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔ میرا خیال ہے اُسے کہیں اور کسی پرائیوٹ اسکول میں بھیج دیا جائے۔ تو اس کا اعتماد بحال ہو جائے گا"

کیٹ برہم ہو گئی۔ ہاتھ نچا کر بولی "یہ... آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر۔ ٹونی کسی ذہنی دباؤ کا شکار نہیں۔ وہ اسکول میں اول آتا ہے گھر میں اُسے ہر قسم کا آرام حاصل ہے۔ اگر آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہے تو جان لیں کہ اس دباؤ اور الجھن کا تعلق میری ذات سے نہیں ہے۔ میں اس کی ماں ہوں۔ اس سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔ مجھے اس پر فخر ہے اور وہ بھی جانتا ہے کہ میں اُسے دنیا کا سب سے ذہین بچہ سمجھتی ہوں۔ پھر وہ کیوں ذہنی دباؤ کا شکار ہے؟"

اور یہی تمام مسئلے کی جڑ تھی۔ کیٹ اپنے بیٹے کو دنیا کا ذہین ترین بچہ سمجھتی تھی۔ کوئی بھی بچہ اس قسم کے دباؤ کو برداشت نہیں کر سکتا ڈاکٹر نے کیٹ کو سمجھایا۔ اُسے بچوں کی نفسیات بتائی اور وہ جیسے اپنے وجود میں سمٹتی چلی گئی"

چھ ہفتے بعد وہ اپنے بیٹے ٹونی کو ایرپورٹ پر رخصت کر رہی تھی۔ سوئٹزرلینڈ کے سب سے اچھے اسکول میں ٹونی کا داخلہ ہو گیا تھا۔ کیٹ کے لیے یہ لمحات بڑے تکلیف دہ تھے۔ لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی بھلائی کے لیے اس کی جدائی بھی برداشت کر لے گی۔ اس کے شاندار مستقبل کی خاطر وہ اپنے سینے پر پتھر رکھ لے گی۔

بیٹے کے جانے کے بعد وہ پھر کمپنی کی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئی۔ راجر اس کا دست راست تھا۔ اس کے شوہر نے واقعی نہایت موزوں شخص کا انتخاب کیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کام کرنے میں خوشی محسوس کرتی تھی۔ وہ ۴۷ برس کا ہو چکا تھا۔ عمر میں وہ کیٹ سے دو برس بڑا تھا۔ اتنے عرصے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے ان میں گہری دوستی پروان چڑھ چکی تھی۔ راجر کمپنی کے لیے وقف تھا۔ وہ شب و روز کام میں جتا رہتا تھا۔ یہ بات ایسی تھی جس نے کیٹ کے دل میں اس کے لیے محبت اور عزت کے جذبات بیدار کر دیئے تھے۔ راجر غیر شادی شدہ تھا۔ کئی خوبصورت لڑکیاں اُس کی دوست تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ کیٹ پر یہ حقیقت عیاں ہو گئی کہ راجر اُس میں دلچسپی لیتا ہے۔ کئی مرتبہ اس نے ذومعنی فقروں میں اپنا مدعا بھی بیان کیا۔ لیکن کیٹ انجان بن گئی۔ وہ راجر سے اپنے تعلقات کو صرف کاروبار کی حد تک محدود رکھنا چاہتی تھی۔ بس ایک مرتبہ اس نے تعلقات کی اس نوعیت کو توڑا تھا اور وہ بھی مجبوراً۔

راجر ان دنوں کسی لڑکی سے باقاعدگی سے مل رہا تھا۔ رات کو دیر گئے تک وہ اُس کے ساتھ رہتا۔ صبح کی میٹنگ میں وہ بہت تھکا تھکا ہوتا۔ اس کا ذہن بھی حاضر نہ ہوتا۔ کہیں اور بھٹک رہا ہوتا۔ اُس کی یہ ذہنی کیفیت کمپنی کے حق میں نہیں تھی۔ کمپنی کو ایک جیتے جاگتے، بیدار اور چاق و چوبند ذہن والے راجر کی ضرورت تھی۔ جب یہ سلسلہ طویل ہو گیا تو کیٹ نے معاملات کو راہ راست پر لانے کا فیصلہ کیا۔ وہ جانتی تھی کہ ایک مرتبہ محض ایک عورت کی وجہ سے ڈیوڈ نے بھی کمپنی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اسی طرح راجر کو بھی کھونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ کمپنی کے لیے ناگزیر تھا۔ وہ اُسے کسی بھی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ راجر کو اپنے

نسائی حربوں سے موم کی طرح پگھلا دے گی۔

کیٹ نے پیرس میں ایک امپورٹ ایکسپورٹ فرم کی خریداری کا سودا کرنے کے لیے نیویارک سے رخت سفر باندھا تھا۔ راجر بھی اس کے ساتھ تھا۔ پیرس پہنچنے کے اگلے دن میٹنگ اور ملاقاتوں سے فارغ ہو کر انہوں نے ایک عالیشان ہوٹل میں کھانا کھایا اور اس کے بعد اس نے راجر کو اپنے شاندار کمرے میں طلب کیا۔ وہ اس سے کاروباری معاملات پر گفتگو کرنا چاہتی تھی۔

راجر مقررہ وقت پر رات کو فائلیں لے کر اس کے کمرے میں پہنچا۔ کیٹ انتہائی دیدہ زیب اور دلفریب لباس میں اس کی منتظر تھی۔

"میں نظر ثانی شدہ پیش کش لے کر آیا ہوں۔" راجر نے چھوٹتے ہی کہا۔

"کاروباری معاملات پر ہم بعد میں بات کریں گے راجر۔" وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "اس لمحے میں تمہارے پاس تہیں ہوں۔ میں نے تمہیں ہمیشہ نظر انداز کیا اور آج میں اس کی تلافی کرنا چاہتی ہوں۔

"کیٹ..." راجر کا حلق خشک ہو گیا۔ وہ حیرت اور بے یقینی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

وہ اس کے بازوؤں میں سمٹ آئی۔ راجر نے ایک گہرا سانس لیا اور کپکپاتی آواز میں بولا۔ "کیٹ۔ میں کتنے عرصے سے تمہارے لیے تڑپ رہا تھا۔"

"میری بھی یہی حالت تھی راجر۔" کیٹ نے اُسے اپنی زلفوں کا اسیر بناتے ہوئے کہا۔

کیٹ کے لیے اس ناٹک میں کوئی جاذبیت نہیں تھی۔ وہ اس سے مصنوعی پیار جتا رہی تھی۔ ڈیوڈ کے ساتھ ہی اس کے جذبات مر چکے تھے۔ گزشتہ برسوں میں اس نے خود کو کام میں اتنا غرق کر دیا تھا کہ اب اسے تنہائی کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو مار دیا تھا۔ وہ جو کچھ کر رہی تھی صرف کمپنی کی خاطر کر رہی تھی۔ اس میں صرف اس مصلحت کو دخل تھا۔ کہ وہ راجر کو کمپنی کے لیے بہت ضروری سمجھتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ محض ایک عورت کی خاطر راجر کمپنی کو چھوڑ دے اور اس عورت کی طرف وہ اس لیے راغب ہو جائے کہ کیٹ نے اس کے جذبات کی قدر نہیں کی تھی۔ یہ سالے مرد، کمپنی کے لیے مجھ سے کتنی زیادہ قیمت طلب کر رہے ہیں۔ یہ سالا سمجھتا ہے جیسے میں اس کی محبت کی بھوکی ہوں۔" وہ سوچتی رہی۔

راجر اس سے مختلف انداز و الفاظ میں محبت کرتا رہا۔ ایک طرف صرف جذبات اور ارمان تھے اور دوسری طرف صرف مصلحتیں تھیں۔ "سالا سمجھتا تھا کہ کمپنی کو آسانی سے چھوڑ دے گا، کیٹ غصے سے سلگتی رہی۔

یک طرفہ خواہشیں بجلی بن کر رگوں میں کوندتی رہیں۔ یک طرفہ مصلحتیں خواہشوں کو زیر کرتی رہیں۔

بس یہ پہلا اور آخری موقع تھا۔ جب اُس نے راجر کو زیر کرنے کے لیے وہ حربہ اختیار کیا تھا۔ جسے وہ عام حالات میں استعمال کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ راجر نے اس کے بعد کئی مرتبہ پیش قدمی کی کوشش کی۔ کئی مرتبہ شادی کی پیش کش کی لیکن وہ ہمیشہ خوبصورتی سے اُسے ٹال دیتی۔ آخر ایک مرتبہ جب راجر کے تقاضے حد سے بڑھے تو اُس نے کہا "تم نہیں سمجھ سکتے کہ میں تمہیں کتنا چاہتی ہوں۔ تم سے دوری میرے لیے عذاب سے کم نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر ایسا ہوا تو شاید ہم کبھی ایک ساتھ کام نہ کر سکیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ قربانی دیتے رہیں۔"

اور راجر ایک امید موہوم کے سہارے اس کا مطیع ہو کر رہ گیا۔

کمپنی وسیع سے وسیع تر ہوتی رہی۔ کیٹ نے کئی خیراتی ادارے قائم کیے۔ کئی ایسے ادارے بنائے جن کی آمدنی کالجوں، گرجاؤں ہسپتالوں اور اسکولوں کے لیے وقف تھی۔ ساتھ ہی اس نے اپنے آرٹ کے ذخیرے میں قابل قدر اضافے کیے۔ اس نے قدیم اور جدید مصوروں کی پینٹنگز خریدیں۔ اس کا یہ ذخیرہ دنیا میں سب سے قیمتی اور یادگار تھا۔ ہر شخص کی رسائی اس تک ممکن نہ تھی اور جو اس ذخیرے کو دیکھ پاتا وہ خود کو گویا نہایت خوش قسمت انسان تصور کرتا۔ کیٹ نہ تو اس ذخیرے کی تصاویر اتارنے دیتی نہ پریس والوں سے اس سلسلے پر بات کرتی۔ پریس کے سلسلے میں اس کے اصول نہایت سخت اور بے لچک تھے۔ اس کی ذاتی زندگی ان کی دسترس سے باہر تھی۔ ملازمین اور کمپنی کے عملے کو اجازت نہیں تھی کہ وہ اس کے یا اس کے خاندان کے بارے میں ایک لفظ زبان سے نکالیں۔ بہرحال افواہوں پر تو کسی کا بس نہ تھا۔ وہ دنیا کی امیر ترین عورت تھی۔ اس کی ذات کے گرد ایک پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں ہزاروں سوال لوگوں کے ذہنوں میں کلبلاتے تھے۔ لیکن چند سوالات ہی کے جواب مل پاتے تھے۔

ایک دن اُس نے ٹونی کے اسکول کی ہیڈ مسٹریس کو فون کیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد وہ بولی "کہیے، ٹونی کا کیا حال ہے؟ پڑھائی میں کیسا جا رہا ہے؟"

"وہ بہت شاندار طالب علم ہے۔ مادام، بہت ہی ذہین اور ہوشیار۔"
"میں جانتی ہوں۔" وہ سرد لہجے میں بولی۔ "مگر میں اس کی ہکلاہٹ کے بارے میں معلوم کر رہی تھی۔"
"ہکلاہٹ؟ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ اس کی زبان بالکل صاف ہے۔ نام کو لکنت نہیں۔" ہیڈ مسٹریس نے جواب دیا۔
یہ سن کر کیٹ نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔

چار ہفتے بعد ٹونی جب واپس آیا تو کیٹ اس کے استقبال کے لیے ایئر پورٹ پر موجود تھی۔ اس نے ایک عرصے بعد ٹونی کو دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ جذبات کی شدت سے تمتما رہا تھا۔ وہ اسے سینے سے چمٹا کے بولی۔ "ارے میرا بیٹا۔ کہو کیسے ہو؟"
"مم ...... میں ٹھیک ہوں، آ ---- آ .... آپ کیسی ہیں؟" ٹونی سر جھکائے لکنت سے بولا
کیٹ کے دل پر جیسے کسی نے برف کی ڈلی رکھ دی۔

ٹونی اپنے گھر میں دنیا کے نامور مصوروں کی پینٹنگز کو بڑے ذوق و شوق سے دیکھا کرتا۔ وہ اب بھی چھپ چھپ کر تصویریں بناتا خطوط اور رنگوں کی یہ دنیا ٹونی کے دل و دماغ میں ایک ہلچل مچا دیتی۔ اس کی رگوں میں خون کی گردش کو تیز کر دیتی۔ لیکن اب بھی وہ اپنی تصاویر کسی کو دکھانے کی ہمت نہ کر پاتا۔ اس کے دل پر اپنی ماں کی ہیبت بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں کو اس سے کیا توقعات ہیں۔ اسے اس بات کا شدید احساس تھا کہ اس کی ماں دنیا کی ایک کامیاب ترین عورت ہے۔ وہ اپنی ماں پر فخر بھی کرتا تھا۔ لیکن اسے ڈر تھا کہ وہ کبھی اس کے سخت معیار پر پورا نہیں اتر سکتا۔ مصوری کے لیے جو آگ اس کے وجود میں بھڑک رہی تھی۔ اُسے کیٹ کبھی پسند نہ کرتی۔ یہی وہ کشمکش تھی۔ جس کی وجہ سے وہ کیٹ کے سامنے ہکلانے لگتا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ کمپنی اس کی ماں کو کتنی عزیز ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اکلوتا بیٹا ہونے کے ناطے کیٹ اُسے ایک دن کمپنی کا سربراہ دیکھنا چاہتی ہے معاملات کو اسی خوش اسلوبی سے چلاتے دیکھنا چاہتی ہے جس سے وہ چلا رہی تھی۔ مگر .... مگر اُسے اس سے کوئی .. دلچسپی نہ تھی۔ وہ مزاجاً ایک فنکار تھا۔ مصور بننا چاہتا تھا۔ ایک دن جب اُس نے ہمت کر کے اپنی ماں کو اس خواہش سے آگاہ کیا تو وہ ہنس پڑی۔ "کیا احمقانہ باتیں کر رہے ہو۔ تم مصوری کے لیے نہیں بنے ہو، مصوروں کو خریدنے کے لیے بنے ہو۔ مگر تم ابھی چھوٹے ہو تمہیں شاید علم نہیں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ تمہارا مستقبل یہ کمپنی ہے بیٹے۔ یہ کمپنی تمہاری ہے، تم اس کے مالک ہو۔ ایک دن تمہیں اس کا انتظام سنبھالنا ہے۔ یہ کمپنی طاقت ہے، قوت ہے۔"

"مگر ممی، مم ... میں اسے چلانا نہیں چاہتا .... میں اس کاروبار .... اس ... طا ... طا .... قت سے کوئی دلچسپی نہیں مجھے۔" وہ بدستور ہکلا کر بولا۔

کیٹ یہ سن کر جھلا گئی اور درشتی سے بولی۔ "تم احمق ہو! تمہیں کیا پتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ارے بیٹا یہ دولت ہی تو اصل طاقت ہے۔ اس کے بل پر تم تمام دنیا پر حکمرانی کر سکتے ہو اور یہ دولت اسی کمپنی سے حاصل ہوتی ہے کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں دنیا میں اس کے ذریعے برائیاں پھیلا رہی ہوں۔ لوگوں کو مصائب میں مبتلا کر رہی ہوں۔ نہیں بیٹے، یہ کمپنی تو بہت سے انسانوں کے لیے رحمت ہے۔ یہ صرف دولت کمانے کا ذریعہ نہیں، لوگوں کے لیے بھلائی کا وسیلہ ہے۔ ہزاروں خاندان اس کمپنی پر پل رہے ہیں۔ جب ہم کسی پسماندہ اور غریب علاقے میں کوئی کارخانہ قائم کرتے ہیں تو وہاں کے غریبوں کو اس سے روزگار ملتا ہے۔ پھر وہاں تعلیمی ادارے قائم ہوتے ہیں۔ علم کی روشنی پھیلتی ہے۔ خوشحالی بڑھ جاتی ہے۔ آئندہ میں کبھی تمہارے منہ سے ایسی بات نہ سنوں خاموشی سے تعلیم مکمل کرو اور آرٹ کا... فضول شوق ختم کر دو۔"

"مم .... مجھے افسوس ہے ممی ...." ٹونی نے جواب دیا۔ لیکن اس لمحے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا ... کہ وہ ہر قیمت پر مصور بن کر رہے گا۔ وہ بھی کیٹ ہی کا بیٹا تھا۔ اپنی ماں کی طرح ضدی، ہٹیلا اور ہٹ دھرم تھا۔

اگلی مرتبہ ٹونی چھٹیوں پر واپس آیا تو پندرہ برس کا ہو چکا تھا۔ کیٹ نے تجویز پیش کی کہ وہ یہ چھٹیاں جنوبی افریقہ میں گزارے۔ اس ملک کو اس علاقے کو دیکھے جہاں اس کے باپ نے، اس کے نانا اور نانی نے اس کمپنی کی داغ بیل ڈالی تھی۔
"مم .... میں تو یہ چھٹیاں جزیرے پر گوشۂ عافیت میں گزارنا چاہتا ہوں مم .... ممی۔"
"اگلے سال وہاں چلے جانا۔ اس مرتبہ جنوبی افریقہ چلے جاؤ۔ تم وہاں کبھی نہیں گئے ہو۔ مجھے یقین ہے تمہیں وہ ملک ضرور پسند آئے گا۔ میں تمہارے ساتھ نہ جا سکوں گی۔ لیکن میں تمہارے لیے تمام انتظامات کر دوں گی۔" کیٹ نے فیصلہ سنا دیا۔

اور یوں ٹونی جنوبی افریقہ روانہ ہوگیا۔ کیٹ نے وہاں کمپنی کے منیجر کو ہدایات جاری کر دیں کہ وہ اس کے بیٹے کے قیام کے دوران ایک جامع پروگرام بنائے کہ ہر نیا دن اس کے لیے زیادہ دلچسپ ہو۔ وہ وہاں کے معاملات میں گہری دلچسپی لے اور اسے یہ احساس ہو جائے کہ اس کا مستقبل اسی کمپنی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسے یہ احساس ہو جائے کہ کمپنی کی کیا اہمیت ہے۔

جنوبی افریقہ میں ٹونی کے قیام کے بارے میں کیٹ باقاعدہ رپورٹ لیتی رہی۔ یہ رپورٹیں بڑی حوصلہ افزا تھیں۔ چھٹیوں کے ختم ہونے سے پہلے اسے اطلاع ملی کہ ٹونی نے جنوبی افریقہ میں چند دن اور رہنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس کی کوششیں کامیاب رہی ہیں۔ ٹونی بالآخر سمجھ گیا ہے کہ کمپنی کی کیا اہمیت ہے اور اس کے کاندھوں پر کتنی بھاری ذمے داری پڑنے والی ہے۔

چند دن بعد ٹونی واپس آیا تو کیٹ کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ٹونی اس کی خواہشات پوری کرنے کی ڈگر پر چل پڑا تھا۔ اس کی توقعات پر پورا اتر رہا تھا۔ اس کا جنوبی افریقہ کا دورہ سودمند ثابت ہوا تھا۔ کیٹ نے انتہائی گرمجوشی سے بیٹے کو لپٹا لیا اور بولی۔ ٹونی میرے بیٹے، میری جان، کیسے ہو؟ یہ بتاؤ، جنوبی افریقہ کا دورہ کیسا رہا؟"

"بہت شاندار مم... ممی، میں نامب بھی گیا تھا۔ جہاں سے نانا نے پرنانا کے ہیرے چرائے تھے۔"

"تمہارے نانا نے ہیرے چرائے نہیں تھے بیٹے۔ اپنا حصّہ لیا تھا۔ اپنا حق چھینا تھا۔" کیٹ نے اس کی تصحیح کی۔

"جی ہاں .... میں وہاں بھی گیا تھا۔ لیکن اس وقت وہاں دھند نہیں تھی۔ وہاں اب بھی کت... کتے ہیں اور محافظ بھی ہیں... مم.. مگر انہوں نے مجھے نمونے کے طور پر اے ... اے ک ہیرا بھی نہیں دیا۔" ٹونی نے شکایت کی۔

کیٹ ہنس پڑی اور بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیر کے کہا۔ "ارے تمہیں نمونے کی کیا ضرورت ہے ایک دن تو آخر یہ سب تمہارا ہو ہی جانا ہے۔"

"شش.... شاید آپ نے انہیں منع کر دیا تھا۔ وہ مم.... میری کوئی بات ہی نہیں سنتے تھے۔"

کیٹ نے اُسے پھر گلے لگا لیا اور بولی "چھوڑو ان باتوں کو، یہ بتاؤ تمہیں وہ ملک کیسا لگا؟ مزا آیا یا نہیں؟"

"بہت مزا آیا مم... ممی... آپ کو پتہ ہے وہاں مجھے سب سے زیادہ کیا چیز پسند آئی ہے؟ وہاں کے رنگ۔ میں نے وہاں کے بے شمار مناظر پینٹ کیے ہیں۔ میرا دل نہیں چاہتا تھا وہاں سے آنے کو۔ قدرت نے اتنے رنگ بکھیرے ہیں وہاں کہ تصور میں بھی نہیں آ سکتے۔" ٹونی بڑی ترنگ میں کہتا چلا گیا۔ "میں مصور بننا چاہتا ہوں۔ مصوری میرے رگ و پے میں موجود ہے اور مم.... مجھے یقین ہے کہ میں مصور بن سکتا ہوں۔"

کیٹ کو محسوس ہوا کہ اپنے ہی بیٹے سے ہار گئی ہے۔ وہ اور ہی ڈگر پہ جا رہا تھا۔ کیٹ بہت پریشان تھی۔ اُسے یقین ہی نہ آتا تھا کہ اس کا بیٹا اتنا احمق بھی ہو سکتا ہے۔ اسے اپنے کروڑوں اور اربوں کے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ مصور بننا چاہتا تھا۔ کیٹ نے اب بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ ٹونی کو اس غلطی سے باز رکھنے کے لیے ہر کوشش کرنے کے لیے تیار تھی۔

اور پھر ستمبر میں جنگ چھڑ گئی۔ اب وہ دونوں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ کیٹ نے موقع غنیمت جانا اور ایک نئی تجویز پیش کی۔ "میں چاہتی ہوں کہ تم جدید سرمایہ کاری کے اسکول میں داخلہ لے لو۔ دو برس کا کورس ہے۔ وہ مکمل کر لو۔ اس کے بعد بھی اگر تم مصور بننا چاہو گے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

کیٹ نے یہ تجویز اس لیے پیش کی تھی کہ اسے اب بھی یقین تھا کہ اس دو برس میں ٹونی اپنا ارادہ تبدیل کرے گا۔ وہ بہرحال اس کا بیٹا تھا۔ کیٹ کو اس سے بڑی توقعات تھیں۔ یہ عظیم الشان کمپنی اس کو سنبھالنی تھی۔

دوسری جنگِ عظیم کیٹ کے لیے ایک اور بڑا موقع تھا۔ دنیا میں فوجی اسلحے کی کمی تھی۔ جو کروگر کمپنی فراہم کر رہی تھی۔ کمپنی کا ایک ڈویژن دنیا کی فوجی ضرورت پوری کر رہا تھا۔ اور دوسرا شہری ضروریات۔ اس کی فیکٹریاں دن رات کام کر رہی تھیں۔ منافع بڑھتا جا رہا تھا۔ نوٹوں کی بارش ہو رہی تھی۔ دولت کے انبار لگ رہے تھے۔

کیٹ جانتی تھی کہ امریکہ زیادہ عرصے اس جنگ سے علیحدہ نہیں رہ سکے گا۔

دو برس پلک جھپکنے میں گزر گئے۔ ٹونی تعلیم مکمل کر کے واپس آ گیا اور اپنی ماں کو فیصلہ سنا دیا کہ وہ اب بھی مصور بننا چاہتا ہے۔ اس نے صاف طور پر کہہ دیا کہ اسے کاروبار سے ذرہ برابر بھی دلچسپی نہیں ہے۔ جمع تفریق سے اسے سخت نفرت ہے۔ اس کا دل صرف اور صرف مصوری میں لگتا ہے۔ کیٹ بے بسی اور بے چارگی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ اس کے ذہن پر ہر لفظ ہتھوڑا بن کر پڑ رہا تھا۔ بیٹے کی یہ بے سروپا باتیں اس پر تازیانے کی طرح پڑ رہی تھیں۔ اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ پچھلے دو برسوں میں

وہ ذرا بھی تو تبدیل نہیں ہوا تھا۔ دو سالہ بزنس کورس کرنے کے بعد تو اس کا مصوّر بننے کا ارادہ اور بھی پختہ ہو گیا تھا۔ اس کا رویہ بھی قدرے جارحانہ ہو گیا تھا۔ کیٹ پریشان ہو گئی۔ یہ سب وقت اور توانائی کا ضیاع تھا۔ مگر وہ ہار گئی تھی۔ اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "تم کب جانا چاہتے ہو؟"

"پندرہ کو۔ آج ۱۰ دسمبر ہے" وہ دھیمی آواز میں بولا۔

لیکن ٹونی نہ جا سکا۔ اتوار ۷ دسمبر کو جاپانی طیاروں نے پرل ہاربر پر حملہ کر دیا۔ اگلے دن امریکہ نے اعلانِ جنگ کر دیا۔ اسی روز ٹونی امریکی بحریہ میں بھرتی ہو گیا۔ اسے فوجی تربیت کے لیے ورجینیا بھیج دیا گیا۔ یہاں تربیت مکمل کرنے کے بعد اُسے جنوبی بحرالکاہل کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔ کیٹ کی زندگی اب ایک مسلسل خوف میں گزر رہی تھی۔ ایسا خوف اس نے اس وقت بھی محسوس نہیں کیا تھا جب ڈیوڈ پہلی جنگ عظیم میں فرانس گیا تھا۔

سال پر سال گزرتے چلے گئے۔ یہ سال جیسے صدیوں پر محیط تھے۔ اسے اپنے بیٹے کے خطوط باقاعدگی سے ملتے تھے۔ ہر خط میں ٹونی اُسے محاذ کے بارے میں لکھتا اور پوچھتا کہ وہ کیسی ہے۔ کمپنی کیسی چل رہی ہے

چار سال بعد ۱۴ اگست ۱۹۴۵ء کو جنگ ختم ہو گئی، جاپان نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے تین ماہ بعد ٹونی گھر واپس آگیا۔ وہ اس کے ساتھ ڈارک ہاربر میں "گوشۂ عافیت" میں چند دن کے لیے چلی آئی۔ جنگ نے ٹونی کو بہت بدل دیا تھا۔ اب وہ ایک بالغ اور تجربے کار فوجی جوان تھا۔ اس میں خود اعتمادی آگئی تھی۔

"اب بتاؤ، تمہارا کیا پلان ہے، کیا سوچا ہے تم نے اپنی زندگی کے بارے میں؟"

"میں پیرس جا رہا ہوں مم... ممی" اس نے جواب دیا "علم و فن کے اس شہر میں مصوری سیکھوں گا۔"

کیٹ خاموش رہ گئی۔ اس کی تمام امیدیں دم توڑ گئیں۔ جنگ بھی ٹونی کے اندر مضطرب اور بے قرار مصوّر کو نہیں مار سکی تھی۔ وہ مصوّر اب بھی اپنے اظہار کا متمنی تھا۔ اپنی صلاحیتیں، اپنے جوہر دکھانا چاہتا تھا

"ٹھیک ہے ٹونی، میں ہار گئی" کیٹ نے بہت ہی افسردگی سے کہا "تم جو چاہو گے، وہی ہوگا۔ تم میرے بیٹے ہو نا، اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے باز کیسے آ سکتے ہو۔"

اور پھر ٹونی پیرس چلا گیا۔

اُس نے فرانس کے سب سے مشہور آرٹ اسکول میں داخلہ لیا۔ یہاں داخلہ ملنا کچھ آسان نہ تھا لیکن وہ جن قدرتی صلاحیتوں کا مالک تھا اس کی بنیاد پر اسے داخلہ مل گیا۔ یہاں اُس نے رہائش بھی ایک سستے سے فلیٹ میں اختیار کی۔ وہ چاہتا تو یہاں کیٹ کی شاندار حویلی میں رہ سکتا تھا، بہترین فلیٹ کرائے پر لے سکتا تھا اور اسے ہر قسم کی آسائشوں سے سجا سکتا تھا لیکن اُس نے یہ سب نہ کیا۔ وہ یہاں آرٹ کے ایک امریکی طالب علم کی حیثیت سے آیا تھا اور اسی حیثیت سے رہنا چاہتا تھا۔

اور پھر آرٹ کی تعلیم شروع ہو گئی۔ رنگ اور برش کی یہ دنیا ٹونی کی اپنی دنیا تھی۔ وہ مصوری کے توسط سے اپنا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ اسکول کے بعد جب وہ اپنے فلیٹ میں پہنچتا تب بھی وہ اسی فن کی باقاعدہ تعلیم میں منہمک رہتا۔ یہ پہلا سال تھا۔ اور اس سال اسے صرف جسمانی اعضا کو تناسب کے ساتھ اسکیچ کرنا تھا اور وہ بھی اس خوبی کے ساتھ جو اس کے معلم نے بیان کی تھی۔ "تم لوگ جب کوئی جسمانی عضو بناؤ تو صرف اس کے ظاہر کو نہ دیکھو، اسے محسوس کرو، اس کے درون میں جھانکو، اس میں دوڑتے گردش کرتے خون کو بھی محسوس کرو۔ تب ہی اس اسکیچ میں زندگی پیدا ہو سکے گی، تب ہی تصویر زندہ ہوگی۔"

مصوری اُسے عجیب سی آزادی کا احساس دلاتی۔ ایسی آزادی جو اُس نے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ پھر فرانس کا ماحول، یہ ۱۹۴۶ء کا زمانہ تھا۔ وہ عہد تھا جب پیرس میں عظیم مصوروں کا اجتماع تھا۔ ٹونی اور اس کے ساتھیوں کو ان عظیم مصوروں کو دیکھنے اور ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملتا۔ یہ ایسا اعزاز تھا جس پر وہ سب فخر کر سکتے تھے۔ جب کبھی فرصت ہوتی تو وہ ان نو آموز مصوروں کے ساتھ پیرس کی بڑی بڑی آرٹ گیلریوں میں جاتے اور عظیم مصوروں کے شہپاروں کو دیکھ کر عجیب سی تسکین محسوس کرتے۔

آرٹ اسکول میں داخلے کے دوران کیٹ ایک مرتبہ اس سے ملنے آئی۔ ٹونی کو اس سستے سے فلیٹ میں رہتے دیکھ کر اُسے بہت دکھ ہوا۔ لیکن اس نے اس کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ وہ ٹونی سے صرف اس کی تعلیم کے بارے میں گفتگو کرتی رہی۔ ایک مرتبہ بھی اُس نے کمپنی کا تذکرہ نہیں کیا۔

مصوری کے پہلے سال میں کنتال اس کا استاد تھا۔ یہ وہ شخص تھا جس کے منہ سے تعریفی اور توصیفی کلمات کم ہی نکلتے تھے۔ وہ کلاس میں اگر کسی کی تعریف کرتا تو ٹونی کی اور یہ تعریف بھی کیا ہوتی۔ "یہ میرا خیال ہے کہ میں نے اس سے بھی خراب اسکیچ دیکھے ہیں۔" کبھی وہ کہتا: "ہاں اب تم

نے جسم کے بطون میں سفر شروع کیا ہے۔ کوشش کرتے رہو۔"
پہلے سال کے اختتام پر ۳۵ طلبہ میں سے صرف آٹھ دوسرے سال کی کلاس میں جا سکے۔ اب ٹونی نے روغنی رنگوں میں زندہ ماڈلوں کی تصویر کشی شروع کر دی تھی۔ ایک سال کی مشق کے بعد اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ انسانی جسم کے ہر ہر رگ و ریشے سے واقف ہو، ہر شریان اور غدود سے واقف ہو۔ اس احساس کے ساتھ جب وہ اپنے موضوع کو ایزل پر منتقل کرتا وہ عجیب سی مسرت محسوس کرتا کنتال نہایت بخل سی تعریف کرتا" ہاں تم میں محسوس کرنے اور دوسروں کو محسوس کرانے کی صلاحیت پیدا ہو رہی ہے۔"
اسکول میں بارہ ماڈل لڑکیاں اور لڑکے تھے۔ ان میں کیرول بھی تھی۔ شکل و صورت اور جسمانی خطوط کے اعتبار سے نہایت حسین۔ کلاس کا ہر نو آموز مصور اس کا پروانہ تھا۔ اس سے تنہائیوں میں ملاقات کا خواہشمند رہتا تھا۔ باتوں میں بھی وہ بہت تیز و طرار تھی۔ جب کبھی ان نوجوان مصوروں کے مطالبے بڑھتے تو وہ کہتی "یہ میرا پیشہ ہے، میں پیشے کو تفریح کا ذریعہ نہیں بنانا چاہتی۔"
یوں ناآسودہ تمناؤں میں سلگتی ہوئی ذو معنی گفتگو جاری رہتی لیکن وہ عشوہ طراز حسینہ کبھی کسی لڑکے کے ساتھ نہ جاتی۔
ایک دن جب سب نو آموز مصور جا چکے تھے اور ٹونی اپنی تصویر مکمل کرنے میں مصروف تھا تو وہ غیر متوقع طور پر اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی "میری ناک بہت لمبی ہے۔" اس نے تبصرہ کیا۔
ٹونی گڑبڑا کر رہ گیا اور خفت سے بولا "مجھے افسوس ہے، میں اسے تبدیل کر دوں گا۔"
"ارے میں اسے نہیں کہہ رہی، تصویر میں تو ناک بالکل مناسب ہے لیکن میری اپنی ناک لمبی ہے۔"
ٹونی نے مسکرا کے کہا، "تب تو مجبوری ہے، اس سلسلے میں، میں کچھ نہیں کر سکتا۔"
"تمہاری جگہ کوئی فرانسیسی نوجوان ہوتا تو کہتا کہ نہیں تمہاری ناک بالکل ٹھیک ہے۔"
"میں امریکی ہوں اس کے باوجود مجھے تمہاری ناک پسند ہے۔"
"تم نے مجھ سے کبھی ساتھ چلنے کے لیے نہیں کہا۔"
شاید اس لیے کہ تم کسی کے ساتھ جانا پسند نہیں کرتیں۔"
"میں ہر ایرے غیرے کے ساتھ جانا پسند نہیں کرتی" کیرول نے کہا اور چلی گئی۔
اس کے بعد ٹونی نے غور کیا تو اسے پتہ چلا کہ جب کبھی وہ دیر تک بیٹھتا تو کیرول بھی وہیں موجود رہتی اور اسے تصویر بناتے دیکھتی رہتی۔ ایک ایسے ہی دن اُس نے کہا تھا "تم ایک دن بہت اہم اور مشہور پینٹر بنو گے۔"
"شکریہ میرا خیال بھی یہی ہے۔"
"مصوری کے سلسلے میں تم بہت سنجیدہ ہو؟"
"ہاں، یہ میری زندگی ہے۔" ٹونی نے جواب دیا۔
"کیا مستقبل کا یہ عظیم اور نامور مصور آج مجھے رات کے کھانے پر مدعو کر سکتا ہے؟" ٹونی کے تحیر کو محسوس کرتے ہوئے کیرول نے بڑی زندہ دلی سے کہا، "فکر نہ کرو، میں زیادہ نہیں کھاتی، تمہاری جیب پر زیادہ بوجھ نہیں پڑے گا۔"
"ضرور، ضرور، یہ میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہو گی۔"
کھانے کے دوران وہ مصوروں اور ان کی تصاویر پر گفتگو کرتے رہے۔ وہ اُسے ان بڑے بڑے، نامور مصوروں کے قصے سناتی رہی، جنھوں نے ماڈل کے طور پر اس کی خدمات حاصل کی تھیں، پھر اس نے کہا "میں ایک بات بتاؤں ٹونی، تم ان مصوروں سے کسی طرح کم نہیں ہو۔"
"مجھے ابھی بہت طویل سفر طے کرنا ہے۔ کیرول" ٹونی نے جواب دیا "ابھی تو میں مبتدی ہوں"
یوں رہ و رسم آشنائی بڑھتی رہی۔ اب وہ اکثر ٹونی کے فلیٹ پر بھی آتی۔ یہ فلیٹ ایک غیر شادی شدہ نوجوان مصور کا تھا، ہر طرف بے ترتیبی تھی۔ کیرول نے اس میں نظم پیدا کیا، اُس کی صفائی کی، اُس کی صورت ہی بدل ڈالی۔ ٹونی نے اُس جیسی لڑکی پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ اس کا ہر طرح خیال رکھتی، ہر شام اس کے فلیٹ پر آتی، اس کے لیے کھانا تیار کرتی۔ ہر اعتبار سے اس کی خدمت کرتی لیکن اس کے عوض کبھی اس نے ٹونی سے کچھ طلب نہیں کیا۔ ٹونی اُسے ہوٹلوں میں لے جاتا تو وہ ہمیشہ سستے ہوٹلوں کو ترجیح دیتی اور اس کو سمجھاتی "تمہیں کفایت شعاری سے کام لینا چاہیے ٹونی، تم طالب علم ہو، اگر تمہاری معقول آمدنی ہوتی تو پھر پرواہ نہیں تھی۔"
کیرول نے اپنی ان اداؤں سے اس کے دل میں گھر کر لیا۔ وہ اس کے لیے امید کی ایک کرن تھی۔ جب کبھی ٹونی پر مایوسی کا دورہ پڑتا تو وہ اپنی گفتگو سے اس کے ذہن پر چھائے ہوئے مایوسی کے بادلوں کو دور کر دیتی۔ وہ ٹونی کے لیے امنگوں اور حوصلہ مندی کا

ذریعہ تھی۔ اگر کبھی راتوں کو ٹونی مصوری کرنا چاہتا تو وہ بخوشی پوز کے لیے تیار ہو جاتی۔ اس کے ماتھے پر کبھی شکن نہ آتی۔ کبھی اُس نے ناخوشی کا اظہار نہیں کیا۔ یہ سب ایسی باتیں تھیں کہ ٹونی اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ کئی مرتبہ اُس نے چاہا کہ وہ کیرول کو اپنی اصلیت سے آگاہ کردے۔ اسے بتا دے کہ وہ دنیا کے نہایت امیر ترین افراد میں سے ہے۔ لیکن وہ اس اظہار سے ڈرتا تھا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں اس حقیقت کے اظہار کے بعد وہ کیرول کو کھو نہ دے۔ وہ بہت حساس لڑکی تھی۔

پھر ایک دن کیرول نے کہا "میں چاہتی ہوں تم میرے فلیٹ میں آ کر رہو، تمہیں یہاں نہیں رہنا چاہیئے۔ میرے ساتھ رہو، تمہیں کرایہ بھی نہیں دینا پڑے گا اور اس طرح تم اچھے خاصے پیسے بھی بچا لو گے۔"

"نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"تو پھر میں یہاں منتقل ہوئی جاتی ہوں۔"

اور اگلے دن وہ واقعی اس کے فلیٹ میں آ گئی۔

ٹونی کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ سب کچھ ہی تو اُسے میسر تھا۔ شوق کی تکمیل کا تمام سامان تھا، رفاقتوں کی تمام راحتیں اسے حاصل تھیں۔ ٹونی کی مصورانہ صلاحتیں اب نمایاں ہو کر اس کی تصاویر میں اظہار پانے لگی تھیں۔ ایک دن کلاس میں کنتال نے اس کی تصویر اٹھا کر باقی مصوروں کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "اس تصویر کو دیکھو، اس جسم کو دیکھو، یہ واقعی سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔"

آرٹ اسکول میں ہر شخص ٹونی سے متاثر تھا، ہر شخص کا خیال تھا کہ ایک نیا اور بڑا مصور پیدا ہو رہا ہے۔ ان تعریفوں سے اس کا حوصلہ اور بڑھتا۔ وہ اور انہماک سے تصویریں بناتا۔ ان سب سے بڑھ کر کیرول تھی جو اس کی حوصلہ افزائی کرتی تھی۔

"تم آج بھی ان بڑے بڑے مصوروں کے شانہ بشانہ کھڑے ہو ٹونی جن کی تعریف میں نقاد زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ تم اپنی تصویروں کی نمائش کیوں نہیں کرتے؟"

ٹونی ہنس کر کہتا "ابھی تو میں نے کچھ بھی نہیں کیا میری جان، ابھی تو میں کچھ بھی نہیں ہوں۔"

لیکن کیرول کا اصرار برقرار رہتا "تم نمائش تو کر کے دیکھو۔"

"ہر چیز مناسب اور موزوں وقت پر ہی ٹھیک رہتی ہے۔" وہ جواب دیتا

اس دن ٹونی دیر سے گھر آیا تو دیکھا کہ وہ تنہا نہیں تھی۔ اُس کے ساتھ کین بھی تھا۔ وہ کین گیلری کا مالک تھا۔ یہ گیلری اتنی مشہور نہیں تھی۔ کمرے میں ہر طرف ٹونی کی تصویریں پھیلی ہوئی تھیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" ٹونی نے دریافت کیا۔

"محترم، میں سمجھتا ہوں آپ کا فن بہت بلندیوں پر ہے۔" کین نے پر جوش انداز میں کہا۔ "آپ کی تصاویر کی نمائش میرے لیے باعث اعزاز ہوگی۔"

ٹونی نے کیرول کی طرف دیکھا، وہ مسکرا رہی تھی، اس کی آنکھوں میں مسرت کی چمک تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کہوں؟"

"تمھیں جو کچھ کہنا تھا وہ ان تصویروں میں کہہ چکے ہو۔" کین نے یہ کہتے ہوئے ایک تصویر اٹھائی "شاندار، نہایت شاندار۔ تم ایک عظیم آرٹسٹ ہو۔ دنیا جلد ہی تمہاری عظمت تسلیم کرے گی۔"

رات گئے تک ٹونی اس مسئلے پر کیرول سے گفتگو کرتا رہا۔

"مگر کیرول، ابھی اس کا وقت نہیں، نقاد مجھے سولی پر چڑھا دیں گے۔"

"پریشان مت ہو ٹونی، یہ گیلری چھوٹی سی ہے۔ صرف مقامی لوگ ہی وہاں آئیں گے۔ پھر اس گیلری کے مالک نے آخر ان تصویروں میں کوئی خوبی ہی دیکھی ہو گی جبھی تو اس نے بھی نمائش کی حامی بھری ہے۔ تم ایک عظیم آرٹسٹ ہو ٹونی، یہ میرا خیال بھی ہے اور کین کا بھی۔"

"ٹھیک ہے، کون جانے کیا سامنے آنا ہے۔"

اگلے دن اُسے کیٹ کا تار ملا۔ وہ پیرس آرہی تھی۔

اگلے روز جب کیٹ ٹونی کے اسٹوڈیو میں داخل ہوئی تو اس نے سوچا کہ اس کی ماں بہت سحر انگیز شخصیت کی مالک ہے۔ وہ اس

وقت پچپن برس کی ہو چکی تھی۔ بالوں میں سفیدی جھانکنے لگی تھی۔ اس کی شخصیت میں ایک بے قراری اور اضطراب تھا۔ وہ جیسے ہر وقت کوئی نیا معرکہ سر کرنے کی دھن میں رہتی تھی۔ ایک مرتبہ ٹونی نے اس سے پوچھا تھا کہ اس نے دوسری شادی کیوں نہیں تو اس نے جواب دیا تھا "میری زندگی میں صرف دو افراد اہم ہیں۔ ایک تمہارے والد اور دوسرے تم، میں کسی تیسرے شخص کو نہیں اپنا سکتی"۔

ٹونی کو دیکھ کر کیٹ کی مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اس نے ٹونی کو لپٹا لیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کا بیٹا اب اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ اس کے تصور میں بھی نہ تھا۔ اس نے فلیٹ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "خدا کا شکر ہے کہ تمہیں صفائی ستھرائی کے لیے کوئی معقول ملازمہ مل گئی۔

پھر وہ ایزل کی طرف گئی جس پر ٹونی ایک نئی تصویر بنا رہا تھا۔ وہ دیر تک اس تصویر کو دیکھتی رہی۔ وہ اپنی ماں کے تبصرے کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی ماں کوئی سخت تبصرہ کرے گی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے ایزل سے نظریں اٹھا کر کہا "بہت ہی شاندار ٹونی۔ واقعی یہ بہت اچھی تصویر ہے"۔ اس نے واقعی اس تصویر کو یونہی محسوس کیا تھا اور فخر سے اس کا سینہ پھول گیا تھا۔ ٹونی اس کا بیٹا تھا اس میں واقعی ایک بڑا مصور بننے کے تمام امکانات تھے۔

"مجھے اپنی اور تصویریں بھی دکھاؤ" اس نے کہا "مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم میں مصوری کی اتنی توانا صلاحیتیں مخفی ہیں"۔

اور پھر دو گھنٹے گزر گئے۔ کیٹ ہر تصویر اٹھاتی، اس کا غور سے جائزہ لیتی اور اپنے بیٹے سے اس پر گفتگو کرتی۔ وہ دل کھول کر تعریف کر رہی تھی۔ اس وقت ٹونی کو اپنی ماں پر بے حد پیار آیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ٹونی نے اپنی ماں کو اتنے وقار کے ساتھ اپنی شکست تسلیم کرتے دیکھا تھا۔ وہ بڑی حیرت سے اپنی اسمارٹ اور ذہین ماں کو دیکھ رہا تھا۔

"میں تمہاری تصاویر کی نمائش کا انتظام کرتی ہوں، چند ایک ڈیلر میرے جاننے والے"۔

"شکریہ ممی، اس کی ضرورت نہیں اگلے جمعے کو میری تصاویر کی نمائش ہو رہی ہے۔ ایک گیلری نے اس کا انتظام کیا ہے"۔

کیٹ نے اسے لپٹا لیا۔ اور پر جوش لہجے میں بولی "واقعی، یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ کون سی گیلری ہے؟"

"کین آرٹ گیلری"

"میں نے اس کا نام نہیں سنا"

"یہ ایک چھوٹی سی گیلری ہے۔ ظاہر ہے ابھی میں اتنا مشہور مصور نہیں ہوں کہ بڑی گیلریاں میری تصاویر کی نمائش پر آمادہ ہوں" ٹونی نے کہا۔

"یہ کون کہتا ہے۔ اسی تصویر کو دیکھو۔ یہ تصویر ایسی ہے کہ ....."

کیٹ کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ دروازہ زور سے کھلا تھا اور کیرول اندر آئی تھی۔ "ٹونی میں صبر نہیں کر سکتی۔ جلدی سے ....." وہ یہ کہتی ہوئی کمرے میں آئی اور کیٹ کو دیکھ کے خاموش رہ گئی۔ "معاف کیجئے گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔"

"یہ میری ممی ہیں کیرول"

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی" کیرول نے کمزور سے لہجے میں کہا "میں اس بدتمیزی سے کمرے میں گھسنے کی معافی چاہتی ہوں"۔

اور پھر گفتگو شروع ہو گئی۔ کیٹ اپنے بیٹے کی تعریفوں کے پل باندھ رہی تھی۔ کیرول بھی ان تعریفوں میں اس کی شریک تھی اور وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں اس کی ماں کیرول کے سامنے کمپنی کا تذکرہ چھیڑ کر اس کا بھانڈا نہ پھوڑ دے۔ وہ خوش تھا کہ اس کی ماں نے اسکی مصورانہ صلاحیتوں کو تسلیم کر لیا ہے۔ بالآخر وہ اپنے آپ کو منوانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"میں چاہتی ہوں کہ تمہاری تصاویر کی نمائش کچھ صحیح قسم کے لوگ بھی دیکھ لیں"۔

"صحیح لوگوں سے آپ کی مراد کیا ہے؟" کیرول نے پوچھا۔

ایسے لوگ جو رائے عامہ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ میرا مطلب نقادوں سے ہے۔ آندرے ایک قد آور نقاد ہے، اسے نمائش میں آنا چاہیئے"

"ارے ممی! آندرے جیسے عظیم لوگ ایسی چھوٹی گیلریوں میں کہاں آتے ہیں۔ وہ تو اس عہد کا سب سے بڑا نقاد ہے۔ نہایت بے رحمی کی حد تک کھرا نقاد، کسی کو نہیں بخشتا۔ تعریف میں نہایت بخل اور احتیاط سے کام لیتا ہے اور مصور میں کچھ نہ ہو تو اس کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ وہ اگر اتنا ہی کہہ دے کہ فلاں مصور خراب نہیں ہے اسے لوگ بڑا مصور کہنے لگتے ہیں"۔

"اگر وہ آجائے تمہاری نمائش میں تو تم راتوں رات مشہور ہو سکتے ہو!" کیرول نے پر جوش لہجے میں کہا

"اور وہ مجھے دفن بھی کر سکتا ہے" ٹونی نے کہا

"کیوں کیا تمہیں خود پر اعتماد نہیں؟" کیٹ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا

"اعتماد کیوں نہیں ہے، لیکن ہم تو ان کے آنے کی توقع ہی نہیں کر سکتے" کیرول نے ٹونی کی طرف سے جواب دیا۔
"میرے دو ایک دوست ہیں جو آندرے کو جانتے ہیں، میں ان سے کہوں گی" کیٹ نے کہا۔
"یہ تو بہت اچھا ہوگا! میں جانتی ہوں نقاد آندرے کو، وہ یقیناً ٹونی کی تصاویر پسند کریں گے۔"
"کیوں بیٹے کیا کہتے ہو۔ جب تک تم راضی نہیں ہوگے میں اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی" کیٹ نے اپنے بیٹے سے پیار بھرے لہجے میں کہا۔
"آپ ضرور ایسا کریں، ٹونی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے" کیرول نے پھر اس کی طرف سے کہا۔
ٹونی نے گہرا سانس لیا اور بولا "ٹھیک ہے آپ انھیں بلوالیں، جو ہونا ہے گا ہو جائے گا۔"
کیٹ پھر نامکمل تصویر کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے بیٹے سے مخاطب ہو کر افسردہ سے انداز میں کہا "میں کل پیرس سے جا رہی ہوں۔ میرا جانا از حد ضروری ہے، کیا تم آج رات میرے ساتھ کھانا کھا سکتے ہو؟"
"کیوں نہیں ممی" ٹونی نے جواب دیا "یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے"
"تو پھر تم دونوں لی آنار ریستوران میں میرے مہمان ہوگے" کیٹ نے پیرس کے سب سے مہنگے ریستوران میں انھیں مدعو کیا
"نہیں ممی، وہاں نہیں، یہاں ایک اچھا سا چھوٹا ہوٹل ہے۔ قریب ہی ہے۔ ٹونی نے جلدی سے کہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کیرول پر اس کی امارت ظاہر ہو، لی آنار ریستوران کے لوگ اس کی ماں کی حیثیت سے واقف تھے۔ اسے معلوم تھا کہ ان کے وہاں پہنچتے ہی پورے ریستوران میں کھلبلی مچ جائے گی۔
اس رات ان تینوں نے اسی سستے ہوٹل میں کھانا کھایا جس کا تذکرہ ٹونی نے کیا تھا۔ دونوں عورتیں بہت گھل مل کر باتیں کر رہی تھیں۔ ٹونی کو ان پر فخر تھا۔ وہ سوچ رہا تھا "یہ میری زندگی کی بہترین رات ہے۔ میں اپنی ماں کے اور اس لڑکی کے ساتھ ہوں جس سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔
اگلے دن کیٹ نے ایئر پورٹ سے ٹونی کو فون کیا "میں نے دس بارہ جگہ فون کیے ہیں، کوئی بھی مجھے آندرے کے بارے میں قطعی جواب نہیں دے سکا معلوم نہیں وہ آئے گا یا نہیں۔ بہر حال مجھے تم پر فخر ہے بیٹے۔ تمھاری تصاویر واقعی لاجواب ہیں۔"
اور پھر جمعہ بھی آگیا۔
یہ ٹونی کی زندگی کا ایک اہم دن تھا۔ اس کی تصاویر کین گیلری میں آویزاں تھیں۔ مقررہ وقت پر جب گیلری نمائش کے لیے کھلی تو لوگ رفتہ رفتہ آنا شروع ہوئے۔ کین دروازے پر کھڑا آنے والے مہمانوں کا گرم جوشی سے استقبال کر رہا تھا۔ ٹونی ان کو گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ان میں اُسے کوئی شخص تصاویر کا خریدار معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ سب کے سب ٹٹ پونجیا اور آوارہ گرد قسم کے لوگ تھے جو محض وقت گزارنے کے لیے آگئے تھے، وقت گزرتا رہا۔ ٹونی کی تین تصاویر فروخت ہو چکی تھیں۔ کین بہت خوش تھا اور ٹونی کی مسرت کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ لوگ اس سے ملاقات کر رہے تھے۔ اس کی تصاویر کی تعریف کرتے تھے اور مبارک باد دیتے تھے۔ ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ ٹونی کی کئی اور تصویریں فروخت ہوگئیں۔
اور پھر..... اور پھر..... آندرے گیلری میں داخل ہوا۔ پھر تو جیسے بھونچال آگیا۔ وہ کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔ آرٹ کی دنیا میں وہ بے پناہ مشہور تھا۔ لوگ اس کی عزت اور احترام کرتے تھے۔ اس گیلری میں وہ پہلی مرتبہ آیا تھا۔ لوگ احتراماً خاموش ہوگئے تھے۔ کین اس کی آمد پر بچھا جا رہا تھا۔ اس کے تو ہوش اڑ گئے تھے۔ اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ عظیم نقاد آندرے اس کی چھوٹی سی گیلری کو بھی زینت بخش سکتا ہے۔ آندرے کی آمد اس کے لیے باعثِ صد افتخار تھی۔
"یہ میری بہت عزت افزائی ہے جناب "بہت کرم ہے آپ کا کہ تشریف لائے، فرمائیے آپ کیا پینا پسند کریں گے؟" کین نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔
"میں یہاں صرف اپنی بصیرت کو، اپنی بصارت کو سیراب کرنے آیا ہوں،" عظیم نقاد نے جواب دیا "میں آرٹسٹ سے ملنا چاہتا ہوں۔"
کین نے ٹونی کا اس سے تعارف کرایا "میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں جناب" اس نے نہایت احترام سے کہا۔
آندرے نے اس کا ہاتھ تھاما اور تصاویر کی طرف بڑھ گیا۔ لوگوں نے احتراماً اسے راستہ دے دیا۔
وہ ہر تصویر کو نہایت غور سے دیکھتا اور آگے بڑھ جاتا۔ ٹونی اس کے چہرے کے تاثرات پڑھنا چاہتا لیکن وہ ہر قسم کے تاثرات

سے خالی تھا اس کے ہونٹ بند تھے، اُس کے چہرے پر نہ مسکراہٹ آئی نہ ناپسندیدگی کی کوئی لہر۔ وہ کیرول کی ایک تصویر کے سامنے دیر تک کھڑا رہا۔ غور سے اُسے دیکھتا رہا۔ اور آگے بڑھ گیا۔ یہ وہی تصویر تھی جس کے بارے میں کیٹ نے کہا تھا کہ یہ تصویر دنیا کے بڑے سے بڑے مصور کی تصویروں کے مقابلے پر رکھی جا سکتی ہے۔

آندرے نے پورے ہال کا چکر مکمل کر لیا۔ وہ تمام تصویریں دیکھ چکا تھا اور لوٹی کے جسم سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ تصاویر دیکھ کر وہ لوٹی کی طرف مڑا اور بولا "مجھے خوشی ہے کہ میں آیا" اس نے اس کے سوا کوئی اور تبصرہ نہیں کیا۔

آندرے کے جاتے ہی چند منٹ کے اندر لوٹی کی تمام تصاویر فروخت ہو گئیں۔

اگلے روز صبح چھ بجے لوٹی اور کیرول پیرس کا ایک کثیر الاشاعت اخبار لے آئے۔ اخبار کے آرٹ سیکشن میں آندرے کے نام سے لوٹی کی تصاویر پر پورا تبصرہ شائع ہوا تھا۔

"لوٹی نے بلند آواز میں پڑھنا شروع کیا۔ گزشتہ شب کین آرٹ گیلری میں نوجوان امریکی مصور، لوٹی کی تصاویر کی نمائش شروع ہوئی۔ میرے لیے یہ ایک بہت بڑا تجربہ تھا۔ اس سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے باصلاحیت مصوروں کی تصاویر پر مبنی اتنی نمائشیں دیکھی ہیں کہ میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ خراب تصاویر واقعتاً کس نوعیت کی ہوتی ہیں لیکن کل شب اس نمائش میں جا کر مجھے اپنا یہ بھولا ہوا سبق یاد آ گیا۔"

یہاں تک پڑھتے پڑھتے لوٹی کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس کے ہاتھ بری طرح کپکپانے لگے۔

"خدا کے لیے لوٹی آگے نہ پڑھو۔" کیرول نے کہا اور اس کے ہاتھ سے اخبار چھیننے کی کوشش کی۔

"بکواس مت کرو۔" لوٹی نے سرد اور سخت لہجے میں کہا اور آگے پڑھنا شروع کر دیا۔

"پہلے پہل تو میں سمجھا کہ یہ سب مذاق ہے۔ بھلا کوئی شخص ایسی جرأت کر سکتا ہے کہ ایسی بھونڈی اور بچوں کی سی تصویروں کی نمائش آرٹ کے نام پر کرے۔ میں نے ان تصاویر میں صلاحیت یا تخلیق کی کوئی چنگاری نہیں پائی۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ان تصاویر کو لٹکانے کی بجائے اس مصور کو سولی پر چڑھا دیا جاتا۔ میں اس مصور کو بھی مشورہ دے سکتا ہوں کہ وہ اپنے اصل پیشے میں چلا جائے جو میرے خیال میں گھروں کو رنگ و روغن کرنے ہی ہو سکتا ہے۔"

"مجھے یقین نہیں آتا ایسا کیسے ہو سکتا ہے، کیا ہو گیا ہے اُسے۔" کیرول نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں سسکتے ہوئے کہا۔

لوٹی کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس کے سینے میں کسی نے سیسہ بھر دیا ہو۔ اسے سانس لینے میں تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ اور سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ "نہیں کیرول، وہ آرٹ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ اسی وجہ سے تو مجھے اتنی تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔ میں بھی کتنا بے وقوف تھا۔" وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "طفلِ مکتب ہوتے ہوئے تصویروں کی نمائش کروا بیٹھا۔ میرے بارے میں اتنے بڑے نقاد نے کہہ دیا ہے کہ مجھ میں صلاحیت یا تخلیق کی کوئی چنگاری نہیں ہے۔ اس کی رائے درست ہے کیرول"

"کہاں جا رہے ہو لوٹی؟"

"پتہ نہیں میں کہاں جاؤں گا؟" یہ کہہ کر وہ فلیٹ سے باہر نکل گیا۔

لوٹی بے مقصد سڑکوں پر گھومتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اب تک پورے پیرس میں آرٹ سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص نے وہ تبصرہ پڑھ لیا ہو گا۔ ہر شخص اس کا مذاق اڑا رہا ہو گا۔ وہ کتنی بڑی خوش فہمی میں مبتلا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مصور کی حیثیت سے وہ نام کمائے گا لیکن اس میں تو مصور کا تخلیقی جوہر ہی نہیں تھا۔ ایک غم تھا، ایک دکھ تھا لیکن یہ اطمینان بھی تھا کہ آندرے نے اسے ایک بہت بڑی غلطی سے بچا لیا تھا۔

وہ اگلے روز صبح پانچ بجے گھر واپس آیا۔ کیرول اس کی منتظر تھی اور بہت پریشان تھی۔ چھوٹتے ہی بولی "لوٹی تم کہاں تھے تمہاری والدہ کا کئی مرتبہ فون آ چکا ہے۔ وہ بہت پریشان ہیں۔"

"تم نے انہیں تبصرہ سنا دیا تھا؟" لوٹی نے بجھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں، وہ اڑ گئی تھیں، مجھے سنانا ہی پڑا۔"

اسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ کیرول نے ٹیلیفون اٹھا لیا "ہیلو، جی ہاں وہ ابھی ابھی آئے ہیں،" یہ کہہ کر اس نے ریسیور لوٹی کی طرف بڑھا دیا۔

"ہیلو، مم... ممی" لوٹی نے جھجکتے ہوئے کہا۔
کیٹ کی آواز میں غم اور افسوس تھا "سنو بیٹے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے، میں اُسے رائے بدلنے پر مجبور کردوں گی، اُسے دوسرا مضمون لکھنا ہوگا۔ اس نے میرے باصلاحیت بیٹے کی توہین کی ہے۔ اُسے معافی مانگنی ہوگی۔"
لوٹی نے تھکے تھکے سے انداز میں کہا "نہیں ممی، یہ کوئی کاروبار نہیں ہے۔ یہ ایک نقاد کی رائے ہے اور اس کی رائے ہے کہ مجھے سولی پر چڑھا دیا جائے، آندرے بغیر سوچے سمجھے کوئی بات نہیں کہتا۔ مجھ میں واقعی مصوّر بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔"
"سنو بیٹے! میں یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ کوئی تمہیں اس طرح تکلیف پہنچائے۔ میں اسے سبق سکھا کے رہوں گی۔ میں سب کچھ کر گزروں گی۔"
"نہیں ممی آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ہی خوش فہمی میں مبتلا تھا۔ میں نے اپنی سی کوشش کی اور ناکام رہا۔ مجھ میں وہ جوہر ہی نہیں ہے جو ایک آدمی کو مصور بناتا ہے۔ مجھے بھی آندرے سے نفرت ہے۔ لیکن کیا کیا جائے، وہ مصوری کا اس وقت سب سے بڑا نقاد ہے، اور واقعتہً وہ جو کچھ کہتا ہے صحیح اور پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ اس نے مجھے ایک بہت بڑی غلطی کے ارتکاب سے بچا لیا۔"
"تم میرا انتظار کرو بیٹے، میں کل جنوبی افریقہ جارہی ہوں۔ ہم ساتھ ہی نیو یارک واپس چلیں گے۔"
"اچھا ممی، جیسے آپ کی مرضی۔ ویسے بھی اب اس شہر سے میرا دل اُٹھ گیا ہے" اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور مڑ کر کہا "مجھے افسوس ہے کیرول۔ تم نے ایک غلط شخص کا انتخاب کیا تھا۔ تمہیں کسی چھوٹے موٹے نقاد کو بلوانا چاہیے تھا۔ ہم نے بغیر قوت پرواز کے اونچا اڑنے کی کوشش کی اور زمین پر آرہے، میں منہ کے بل گر چکا ہوں اور اب مجھ میں دوبارہ اٹھ کر چلنے کی طاقت نہیں ہے۔"
کیرول نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی گہری نیلی آنکھوں میں ناقابل بیان غم اور افسوس تھا۔
اس سے اگلے روز کیٹ اپنی کمپنی کے پیرس آفس میں بیٹھی ایک چیک لکھ رہی تھی۔ اس کے مقابل میز کی دوسری طرف آرٹ کا سب سے بڑا نقاد آندرے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ وہ قدرے افسردہ دکھائی دے رہا تھا۔
"ویسے آپ نے بہت ظلم کیا ہے مادام، آپ کا بیٹا بہت باصلاحیت ہے۔ وہ بہت بڑا اور اہم مصور بن سکتا ہے۔"
کیٹ نے سرد آنکھوں سے اُسے دیکھا اور خشک لہجے میں بولی "مسٹر آندرے اس دنیا میں ہزاروں، لاکھوں مصور موجود ہیں۔ میرا بیٹا ان میں شامل ہونے کے لیے نہیں ہے۔" یہ کہہ کر اس نے چیک آندرے کی طرف بڑھا دیا "آپ نے اس سودے میں اپنا کردار ادا کردیا ہے اب سودے کا باقی حصہ میں پورا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میری کمپنی، جنوبی افریقہ میں مصوری کے فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گی۔
اس کے علاوہ نیو یارک اور لندن میں بھی میوزیم قائم کیے جائیں گے۔ ان میوزیموں کے لیے تصاویر کے انتخاب کی ذمے داری آپ پر ہوگی۔ اس پر آپ کو نہایت معقول کمیشن بھی دیا جائے گا۔"
آندرے کے جانے کے بہت دیر بعد تک کیٹ خاموش بیٹھی رہی۔ وہ بہت افسردہ تھی۔ اس نے خود اپنے بیٹے کے شوق اور جذبے کو کچلنے کا انتظام کیا تھا۔ اسے اپنے بیٹے سے بے حد محبت تھی۔ اگر لوٹی کو معلوم ہوگیا کہ اس کی ماں نے اس کے شوق کے خلاف گہری سازش کی ہے تو نہ معلوم وہ کیا کر گزرے گا۔ مگر وہ بھی تو مجبور تھی۔ وہ یہ برداشت نہیں کرسکتی تھی کہ اس کا بیٹا یوں اپنا مستقبل برباد کردے۔ صلاحیتوں کو یوں ضائع کردے۔ اس نے اپنے بچے کو بچایا تھا۔ اس کے لیے کیا قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔ اُسے اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اسے کمپنی کو بھی تو بچانا مقصود تھا۔ آگے چل کر اس بڑی کمپنی کا انتظام اسی کو سنبھالنا تھا اور یہ ایک مصوّر کے بس کی بات نہیں تھی۔ فنکاروں کو کیا معلوم کہ کاروبار کیا ہوتا ہے۔
کیٹ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بہت تھک گئی تھی۔ تھکن کا یہ احساس شاید اس نئی کامیابی کے احساس کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اس کا بیٹا اب مصوری کی طرف نہیں پلٹ سکتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کے فضول شوق پر کاری ضرب لگائی تھی۔ اب وہ سنبھل نہیں سکتا تھا جس ذلت سے وہ گزرا تھا، اس کے بعد اس میں برش اٹھانے کی ہمت نہیں رہ گئی تھی۔
وہ اب کمپنی کو چلانے پر مجبور تھا۔ ابتداً وہ کمپنی کے کام میں جت گیا۔ دو برس کے عرصے میں وہ کمپنی کی وسعت اور اس کی آمدنی سے خوب واقف ہوچکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی شہرت اور واقفیت بھی لوگوں میں پھیل گئی تھی۔ کمپنی کے واحد وارث ہونے کے ناطے اس کی اہمیت کی وجہ سے ہر جگہ، ہر موقع پر ایک منفرد مقام حاصل تھا لیکن وہ اس سے مطمئن نہ تھا۔ جو

کچھ اُسے حاصل تھا اس میں اس کی اپنی کوششوں کا کوئی دخل نہ تھا۔ وہ جیسے ایک ہیرو بیا تھا۔ وہ اپنے دادا کے سایے میں زندہ تھا۔ وہ فنکار تھا اور تخلیق کا قائل تھا۔ اسے وراثت میں جو کچھ ملا تھا۔ وہ سب بنا بنایا تھا۔ کمپنی کی ترقی اور ترویج میں اس کا اپنا کوئی حصہ نہیں تھا اور یہ حقیقت اسے مضطرب رکھتی تھی۔

اس کے باوجود ٹونی نہایت محنت اور دلجمعی سے کام کرتا۔ مصروفیت میں وہ ماضی کی تلخ یادوں کو بھلا دینا چاہتا تھا۔ اس نے کیرول کو پیرس کے پتے پر کئی خطوط لکھے لیکن وہ واپس آ گئے۔ آرٹ اسکول میں کنتال کو خط لکھے اور اسے معلوم ہوا کہ کیرول نے وہاں ماڈلنگ ترک کر دی ہے۔ اس کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ وہ اپنا پتہ دیئے بغیر پیرس سے غائب ہو گئی تھی۔ ٹونی اس کام میں محنت کرتا تھا۔ اسے نہ خوشی محسوس ہوتی نہ غم۔ بس ایک کھوکھلا پن تھا جو اس کے وجود میں پھیلتا جا رہا تھا۔ مگر کوئی اس کے کھوکھلے پن سے واقف نہ تھا۔ کوئی اس کے درد کو محسوس نہیں کرتا تھا۔ کیٹ بھی واقف نہ تھی۔ وہ تو بس ان رپورٹوں پر خوش ہوتی تھیں، جو اُسے ٹونی کے بارے میں ہر ہفتے موصول ہوتی تھیں۔ ٹونی طویل عرصے تک دفتر میں بیٹھا کام کرتا رہتا تھا تو وہ یہی سمجھتی کہ اس کے بیٹے نے واقعی اس کام میں دلچسپی لینی شروع کر دی ہے۔ اس کو کیا معلوم تھا وہ اپنی شخصیت کھو چکا ہے۔

اور پھر ایک دن ٹونی نے اپنی محبوبہ دلنواز کیرول کو دیکھ لیا۔ حسین و جمیل کیرول کی آفت تصویر نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ یہ تصویر فیشن کے ایک رسالے کے اشتہار میں شائع ہوئی تھی۔ اس اشتہار کے حوالے سے اس نے کیرول کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ رسالے سے اس نے اشتہاری کمپنی کا نام معلوم کیا جس کے توسط سے رسالے کو وہ اشتہار ملا تھا۔ اشتہاری کمپنی سے اس نے ماڈل ایجنسی کا نام معلوم کیا اور اس سے کیرول کے بارے میں پوچھا۔ متعلقہ افسر نے کہا "مجھے افسوس ہے جناب۔ ہم کسی کے بارے میں ذاتی معلومات فراہم نہیں کرتے۔"

لیکن ٹونی جانتا تھا کہ وہ کس طرح پتا چلا سکتا ہے۔ وہ راجر کے کمرے میں پہنچا۔ اور نرم لہجے میں بولا "راجر تم نے کارٹس ماڈل ایجنسی کا نام سنا ہے؟" مجھے اس ایجنسی سے ایک اہم کام ہے"

"کیوں نہیں۔ وہ ہماری ملکیت ہے۔" راجر نے اس کی کم علمی پر مسکرا کے کہا۔

"کیا؟" ٹونی نے متعجب خیز لہجے میں کہا "ایک تو میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ امی نے کیا کیا کھڑاگ پھیلا رکھا ہے"

"یہ ہماری ایک ذیلی کمپنی کی شاخ ہے" راجر نے بتایا۔

"یہ کمپنی ہم نے کب خریدی تھی؟" ٹونی نے پوچھا

"تقریباً انہی دنوں جب تم نے کمپنی میں کام شروع کیا تھا" راجر نے اس کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے کہا "کیوں کیا کوئی خاص بات؟"

"میں ان کی ایک ماڈل گرل سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ میری پرانی دوست ہے۔"

"بس اتنی سی بات ہے، ابھی فون کر کے . . . . ."

"نہیں، میں خود یہ کام کر لوں گا، شکریہ" یہ کہہ کر وہ باہر آ گیا۔

ٹونی اسی روز سہ پہر کو ماڈل ایجنسی پہنچ گیا۔ اس کی آمد سے وہاں ایک کھلبلی مچ گئی۔ کمپنی کے صدر نے اس کا پرجوش استقبال کیا "یہ ہمارے لیے اعزاز ہے کہ آپ یہاں تشریف لائے" اس نے مودبانہ کہا

"شکریہ میں آپ کی ایک ماڈل گرل کیرول سے ملنا چاہتا ہوں"

"کمپنی کے صدر کا چہرہ چمک اٹھا" وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولا "وہ ہماری سب سے بہترین ماڈل ثابت ہوئی ہے۔ آپ کی امی واقعی جوہر شناس ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں" ٹونی نے حیرت سے کہا "امی کا اس لڑکی سے کیا تعلق ہے؟"

"آپ کی امی نے ذاتی طور پر کیرول کو ملازم رکھنے کی درخواست کی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کمپنی کی خریداری کے لیے انھوں نے یہ شرط عائد کی تھی۔ تمام تفصیلات ہماری فائلوں میں موجود ہیں، کہیں تو دکھاؤں"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ سب کیا سن رہا ہے۔ آخر اس کی امی کو اس کمتر لڑکی سے ایسی کیا دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ اس نے کمپنی خریدنے کے لیے یہ شرط عائد کی تھی۔ اس نے کیرول کا پتہ لیا اور رخصت ہو گیا۔

اسی شام وہ کیرول کی رہائش گاہ کے باہر کھڑا انتظار کر رہا تھا کہ ایک سیاہ سیڈان وہاں آ کر رکی اور اس میں سے کیرول

ری۔ اس کے ساتھ ایک لمبا تڑنگا کھلاڑی جیسا آدمی بھی تھا۔ مرد کے ہاتھ میں اس کا سوٹ کیس تھا۔ ٹونی کو دیکھ کر کیرول کے قدم رک گئے۔ اور وہ خوشی سے چلا کے بولی "اف میرے خدا، ٹونی، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"
"میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں" ٹونی نے کہا۔
"کسی اور وقت آنا، اس وقت ہم مصروف ہیں" کھلاڑی جیسے نوجوان نے کہا۔
ٹونی نے اس کی طرف توجہ نہ دی، اور کیرول سے بولا "اپنے دوست سے کہو کہ یہاں سے دفع ہو جائے"۔
"اے مسٹر، تم کیا خدائی فوجدار لگے ہو یہاں؟" وہ بگڑ گیا۔
کیرول نے پلٹ کر اپنے ساتھی سے کہا "پلیز بین، اس وقت چلے جاؤ، میں تمہیں فون کر لوں گی"۔
بین چند لمحے کے لیے وہاں کھڑا رہا اور پھر شانے جھٹک کر واپس ہوا اور کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔
"بہتر ہے کہ اندر چلو، وہیں باتیں ہوں گی" کیرول نے تجویز پیش کی۔
وہ دونوں فلیٹ میں آگئے۔ فلیٹ بہت شاندار تھا۔ اس کی تزئین و آرائش بھی نہایت شاندار تھی۔ ٹونی اسکے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر حیران رہ گیا اور بولا "بہت عیش سے زندگی گزر رہی ہے"۔
"ہاں خوش قسمتی ہے کہ اچھی ملازمت مل گئی۔ یہ سب کچھ اس نوکری کی بدولت ملا ہے، کچھ پیو گے؟"
ٹونی نے اس کی پیشکش کو نظر انداز کر دیا اور قدرے سخت لہجے میں بولا برس سے آنے کے بعد میں نے تم سے رابطہ قائم کرنے کی بہت کوشش کی، پھر ایک رسالے سے پتا چلا کہ تم امریکہ منتقل ہو چکی ہو۔ یہ بتاؤ تمہیں کارٹس ایجنسی میں ملازمت کیسے ملی؟ دوسری بات یہ کہ میری امی سے تمہاری پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟"
کیرول جو پہلے ہی پریشان دکھائی دے رہی تھی، ٹونی کے سخت رویے اور جارحانہ سوالات سے اور زیادہ پریشان ہوگئی۔ اس نے سر جھکا لیا اور کمزور آواز میں بولی "تمہاری ماں سے میری پہلی ملاقات پیرس میں تمہارے فلیٹ پر ہی ہوئی تھی۔ بھول گئے کیا؟ تم نے ہی ان کا تعارف کرایا تھا۔ اور یہ ملازمت میں نے اخبار میں اشتہار دیکھ کر حاصل کی ہے"۔
غم و غصے سے ٹونی کی بری حالت ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ وہ چلا کے بولا "بکواس مت کرو۔ مجھے سب معلوم ہو گیا ہے۔ میں نے آج تک کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ لیکن تمہارے ایسا چانٹا لگاؤں گا کہ چہرہ بگڑ جائے گا۔ سمجھی"۔
کیرول نے کچھ کہنا چاہا مگر ٹونی کے غضب ناک چہرے کو دیکھ کر گھگھیا کر رہ گئی۔ ٹونی بدستور جارحانہ انداز میں بولا "میں تم سے ایک مرتبہ پھر پوچھ رہا ہوں۔ میری ماں سے پہلی مرتبہ تم ... کب اور کہاں ملی تھیں؟"
کیرول چند لمحے خاموش رہی۔ پھر اس نے ایک گہرا سانس لیا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولی "جب تمہیں اسکول میں داخلہ ملا تھا۔ اس وقت تمہاری والدہ نے اس آرٹ اسکول میں مجھے ماڈل کی حیثیت سے رکھوایا تھا۔ مجھے تو وہ اسکول پسند بھی نہیں تھا۔ مگر تمہاری والدہ نے مجھے مجبور کر دیا تھا"۔
ٹونی کو جیسے اپنے دل میں شدید درد اٹھتا محسوس ہوا۔ وہ کمزور آواز میں بولا "تاکہ وہاں میری ملاقات تم سے ہو سکے؟"
"ہاں، اور میں ....."
"اس کے لیے وہ تمہیں تنخواہ ادا کرتی تھیں۔ اسی لیے تم نے میری داشتہ بننا پسند کیا؟" ٹونی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔
"ہاں۔ میں مجبور تھی ٹونی۔ جنگ کے بعد کے حالات تم جانتے ہی ہو۔ میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ میں کیا کرتی۔ مگر ٹونی یقین کرو وہ تنخواہ ہی سب کچھ نہیں تھی۔ میں واقعی تمہارا خیال رکھتی تھی۔ میں تم سے محبت کرتی تھی"۔
"صرف میرے سوالوں کا جواب دو" ٹونی کے لہجے میں درندگی تھی۔ وہ سہم کر خاموش ہوگئی۔ یہ وہ ٹونی نہیں تھا جسے اس نے پیرس میں دیکھا تھا۔ یہ تو کوئی اجنبی درندہ تھا۔
"آخر اس کا مقصد کیا تھا؟" ٹونی نے پوچھا "تمہیں مجھ پر کیوں مسلط کیا گیا تھا؟"
"تمہاری والدہ چاہتی تھیں کہ میں تم پر نظر رکھوں، تمہارا خیال رکھوں" وہ کمزور لہجے میں بولی۔
ٹونی سخت طیش میں تھا۔ وہ اس عورت کو کیا سمجھا تھا اور وہ کیا نکلی۔ وہ ساری قربتیں، وہ ساری محبتیں، وہ سب نوازشیں اور عنایتیں ایک بکاؤ مال تھا۔ ان میں ہمدردی یا پیار کو کوئی دخل نہ تھا۔ وہ سب محض دکھاوا تھا۔ گویا وہاں بھی وہ اپنی ماں ہی کی نگرانی میں تھا۔ اپنی ماں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھا۔ گویا وہ ایک بیٹا نہیں تھا۔ ایک ولیعہد شہزادہ تھا۔ محض اس کا وارث تھا۔ اس کی ماں کو اپنے

بیٹے کی نہیں صرف کمپنی کی پرواتھی۔ٹونی نے اپنی ماں کی لونڈی پہ آخری نظر ڈالی اور لڑکھڑاتا ہوا وہاں سے واپس ہولیا۔

کیرول اُسے آنسو بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی "ٹونی میں سچ کہتی ہوں۔ مجھے تم سے محبت تھی۔ میں سچ کہہ رہی ہوں"۔ لیکن وہ اس کی دل کی آواز نہ سن سکا۔

رات کو وہ گھر پہنچا تو کیٹ لائبریری میں موجود تھی۔ٹونی نشے میں دھت لڑکھڑاتا ہوا اس کے سامنے پہنچا اور سخت لہجے میں بولا "میں نے آج کیرول سے بات کی تھی۔ سنا آپ نے! آپ کی زرخرید نوکرانی سے بات کی تھی۔آپ دونوں نے... مجھے خوب بے وقوف بنایا تھا... ٹھیک ہے نا... بہت مذاق اڑاتی ہوں گی آپ دونوں میرا"۔

کیٹ سمجھ گئی کہ کیا ہوا ہے۔اس کے ذہن کو شدید دھچکا پہنچا تھا۔اس کے سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ یہ بات کھل جائے گی۔اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔اس کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔پھر اس سے کوئی جواب بھی تو بن نہیں پڑ رہا تھا۔

ٹونی نے ماں کی خاموشی کو اقرار جرم خیال کیا اور زہریلے لہجے میں بولا "سن لیجئے... آج سے آپ میری ذاتی زندگی میں دخل نہیں دیں گی۔مجھ سے دور رہیں گی۔میری جو مرضی ہوگی۔ میں کروں گا۔آپ کوئی تعرض نہیں کریں گی۔سن لیا آپ نے؟"

کیٹ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ خوفزدہ ہو کر رہ گئی تھی۔کاش وہ اس ماڈل کو نیویارک نہ بلاتی پھر یہ بات چھپی رہ سکتی تھی۔ ٹونی آخر کو اسی کا بیٹا تھا۔

اگلے دن اس نے گھر چھوڑ دیا۔اس نے شہر کے گھٹیا علاقے میں ایک فلیٹ کرایے پر لے لیا تھا۔اب وہ اپنی ماں سے دور رہنا چاہتا تھا۔کمپنی میں کیٹ سے اس کے تعلقات بھی غیر ذاتی نوعیت کے اور صرف دفتری کام کی حد تک رہ گئے تھے۔کبھی کبھار وہ مصالحت کی سمت بڑھنے کے لیے ایک آدھ جملہ کہتی بھی تو وہ اسے نظر انداز کر دیتا۔بیٹے کے اس معاندانہ رویے سے اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھتی لیکن وہ اسے برداشت کر کے رہ جاتی۔ جو کچھ کیا تھا۔بیٹے کی بھلائی کے لیے کیا تھا۔بالکل اسی طرح جیسے اس نے شوہر کی خاطر کیا تھا۔باپ کی طرح وہ بیٹے کو بھی کمپنی سے جاتے نہیں دینا چاہتی تھی اور پھر اب دنیا میں اس کا تھا ہی کون۔ ایک بیٹا ہی تو تھا۔جس سے وہ ٹوٹ کر اور بے پناہ محبت کرتی تھی۔اس کی تمام تر دلچسپیاں صرف بیٹے کی ذات سے وابستہ تھیں۔

ٹونی اب بہت خاموش رہنے لگا تھا۔وہ اپنی ذات کے خول میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔اس کا کوئی دوست نہ تھا۔کسی کو منہ لگانا وہ پسند نہ کرتا تھا۔اس کے رویے میں سرد مہری، لہجے میں تلخی اور مزاج میں سختی آگئی تھی۔اپنے گرد اس نے ایک دیوار کھڑی کر لی تھی۔ایسی دیوار جسے کوئی بھی نہ توڑ سکتا تھا۔اس نے اپنی ایک الگ ہی دنیا بسالی تھی۔جس میں وہ کسی کو گھسنے نہیں دیتا تھا۔کیٹ سے تو وہ بہت ہی کم اور لیے دیئے انداز میں بات کرتا تھا۔ماں کا قصور اس نے معاف نہیں کیا تھا۔کیٹ اب سنجیدگی سے بیٹے کی شادی کا سوچ رہی تھی۔اسے ایک محبت کرنے والی بیوی کی ضرورت تھی۔ایسی بیوی جو اس کا خیال رکھ سکے، اُسے بھرپور محبت دے سکے۔اس کے بچے کی ماں بن سکے۔

وہ ایسے ہی بے مزہ دن تھے کہ ایک دن راجر گھبرایا ہوا آیا۔اس کی حالت دیکھتے ہی کیٹ نے پوچھا "کیا بات ہے؟ پریشان کیوں ہو؟"

"جنوبی افریقہ سے ابھی اطلاع ملی ہے کہ پولیس نے بانڈا کو گرفتار کر لیا ہے"۔ راجر نے سر جھکا کے جواب دیا

کیٹ اگلی ہی پرواز سے جنوبی افریقہ روانہ ہو گئی۔اس نے ٹیلیفون پر کمپنی کے وکلا کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ اس بات کا جائزہ لیں کہ ان حالات میں بانڈا کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے۔وہ جانتی تھی کہ اپنی تمام قوت، اثر و رسوخ اور ساکھ کے باوجود وہ بانڈا کی مدد نہیں کر سکے گی۔اس کو رہا نہیں کرا سکے گی۔حکومت نے اسے باغی قرار دے دیا تھا اور باغی کی سزا موت تھی۔وہ تو بس جا کر اپنے باپ کے برے دنوں کے ساتھی اور رفیق سے ملنا چاہتی تھی۔اس سے بات کرنا چاہتی تھی اور پوچھنا چاہتی تھی کہ اس کے لیے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے... اس پُر آشوب وقت میں بانڈا کو اس کی ہمدردی اور پیار کی ضرورت تھی۔

کیٹ کو اس سے ملاقات کے لیے اجازت حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔اگلی صبح وہ جیل میں بانڈا کے سامنے بیٹھی تھی۔ اسے خطرناک قیدیوں کے بلاک میں الگ تھلگ رکھا گیا تھا۔ان کے درمیان شیشے کی مضبوط دیوار حائل تھی۔ وہ کچھ کمزور سا دکھائی دیتا تھا۔اس کے بال بال سفید ہو چکے تھے۔اس کے چہرے پر افسردگی اور مایوسی کی بجائے آسودگی اور فخر کے تاثرات تھے۔کیٹ کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔اس کے چہرے پر رونق آگئی اور وہ مسکرا کے بولا "میں جانتا تھا تم ضرور آؤ گی۔ تم بالکل اپنے باپ کی طرح ہو۔خطرات مول لینے سے کبھی نہیں جھجکتیں"۔

"یہ باتیں مت کرو بانڈا۔یہ بتاؤ تمہیں یہاں سے کیسے نکالا جا سکتا ہے؟" کیٹ نے سنجیدگی سے پوچھا

وہ تابوت میں۔ اس کے سوا یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ اب یہاں سے میری لاش ہی نکل سکتی ہے۔ مجھے اپنی زندگی کی رتی برابر بھی امید نہیں ہے۔ میرے دن پورے ہو چکے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں عزت اور آبرو سے مر رہا ہوں ورنہ میری موت تو برسوں قبل تمہارے بہادر باپ کے ساتھ خونخوار کتوں کے یا محافظوں کے ہاتھوں بھی ہو سکتی تھی۔ بارودی سرنگ پھٹنے سے میرے جسم کے پرخچے بھی اڑ سکتے تھے۔ مگر میں اب باوقار انداز میں اپنی قوم کے لیے مر رہا ہوں۔

کیٹ نے اسے بہترین وکلا کی خدمت پیش کیں اور بانڈا نے شکریے کے ساتھ یہ پیشکش مسترد کر دی۔ وہ پھیکی مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر بولا "دنیا کا کوئی بھی وکیل قانونی طور پر مجھے رہا نہیں کرا سکتا۔ اسے بھول جاؤ کیٹ۔ میں یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کروں گا۔ مجھے، یہ قید خانے میرے لیے نہیں بنے ہیں مجھے یہ قطعی پسند نہیں ابھی تک یہ لوگ کوئی ایسا قید خانہ نہیں بنا سکے۔ جس میں یہ مجھے رکھ سکیں۔"

"بانڈا، خدا کے لیے ایسا نہ کرنا۔ وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔" کیٹ نے التجا کی۔

"مجھے کوئی نہیں مار سکتا۔ بانڈا ایک فرد نہیں، ایک قوم ہے، ایک جذبہ ہے۔ بانڈا اس ملک کی اصل آبادی ہے۔ آزادی کی روح ہے۔ مجھے کوئی نہیں مار سکتا کیٹ، افریقی قوم کو کوئی نہیں مار سکتا۔" بانڈا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

کیٹ حیرت اور غیر یقینی سے اس عجیب شخص کو دیکھ رہی تھی جو موت سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں تھا اور جس کے دل میں اپنی قوم اپنے وطن کا درد تھا۔ بدترین حالات میں بھی وہ ہمت نہیں ہارا تھا۔ کچھ اسی قسم کی صورتِ حال سے وہ برسوں اس کے باپ کے ساتھ دوچار تھا۔ ہر طرف موت ہی موت نظر آ رہی تھی۔ بچنے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی اور پھر معجزہ ہوا تھا۔ دھند نے ان کی جان بچائی تھی۔ کیا اب بھی ایسا ہی کوئی معجزہ رونما ہو گا؟

"سنو کیٹ، تم ایک ایسے شخص سے بات کر رہی ہو جو آدم خور شارک مچھلیوں کے درمیان زندہ رہا۔ بارودی سرنگوں سے بچھے ہوئے میدان کو پار کر گیا اور زندہ رہا۔ محافظوں اور خونخوار کتوں کے درمیان رہا اور زندہ رہا۔" اس کی آنکھوں میں پرانی یادیں تازہ ہونے سے ایک چمک آگئی تھی۔ پھر اس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا "کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ وہ دن میری زندگی کے سب سے بہترین دن تھے۔"

اگلے دن جب کیٹ اس سے ملنے گئی تو جیلر نے کہا "مجھے افسوس ہے مادام! آپ اس سے نہیں مل سکتیں۔ وہ بے حد خطرناک قیدی تھا۔ اس جیل سے اس کا بھاگنا نسبتاً . . . آسان تھا۔ لہٰذا اسے دوسری جیل میں منتقل کر دیا گیا ہے۔"

کیٹ نے جیلر سے دوسری جیل کا پتا معلوم کرنے کی بہت کوشش کی۔ اسے خطیر رقم کی پیشکش کی لیکن وہ مان کر نہیں دیا۔ وہ اپنی نوکری سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کیٹ سے معذرت کر لی اور وہ مایوس واپس آ گئی۔

اگلے روز ناشتے پر اخبار میں اس نے وہ اندوہناک خبر پڑھ لی، جو شہ سرخی کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ کیٹ کے دل پر ایک گھونسا سا پڑا تھا۔ اس کے سینے میں بڑے زور کا درد اٹھا تھا۔ بانڈا جیل سے فرار کی کوشش میں ہلاک ہو گیا تھا۔ اس نے ناشتہ چھوڑ دیا اور سیدھی جیل پہنچی۔ جیلر نے اسے بتایا "مادام اس نے جیل توڑنے کی کوشش کی تھی۔ اسی دوران اسے گولی مار دی گئی۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔" وہ افسردہ سی واپس آ گئی اور بانڈا کی تدفین کے انتظامات کیے اور پھر دو دن بعد نیویارک روانہ ہو گئی۔ اسے اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ یہ وہی ملک تھا جہاں وہ پیدا ہوئی، جہاں وہ پلی بڑھی۔ جہاں کروگر برینٹ کمپنی قائم ہوئی۔ یہاں کی زمینیں قدرتی قیمتی معدنیات سے مالا مال کر رکھی تھیں لیکن اس ملک پر نسل پرستی کی لعنت بھی تھی۔ یہاں انسان وحشی درندوں سے بدتر تھا۔ طیارے کی کھڑکی سے اس نے اس سرزمین پر آخری نظر ڈالی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ کبھی یہاں نہیں آئے گی۔ اس فیصلے پر وہ اداس بھی تھی لیکن اسے تبدیل کرنے کا خیال بھی اس کے دل میں نہ تھا۔

○

راجر کی ایک ذمے داری یہ بھی تھی کہ وہ کمپنی کے اس شعبے کی نگرانی بھی کرتا تھا جسے مستقبل کی منصوبہ بندی کے لیے کھولا گیا تھا۔ وہ اس معاملے میں بھی بہت ہوشیار ثابت ہوا تھا۔ وہ کمپنی کے لیے ایسے کاروبار تلاش کرتا تھا جو بہت منفعت بخش ہوتے تھے۔ وہ اوائل مئی کا ایک دن تھا کہ راجر کیٹ کے دفتر میں داخل ہوا۔

"بعض نہایت دلچسپ معلومات میرے علم میں آئی ہیں۔" اس نے دو فائل میز پر رکھتے ہوئے کہا "یہ فائل دو کمپنیوں سے متعلق ہیں۔ ان میں سے ایک کمپنی بھی اگر ہمارے پاس آ جائے تو یہ بہت بڑا انقلاب ہو گا۔ یہ ہماری چند بڑی کامیابیوں میں سے ایک ہو گی میں

کل اس بارے میں بات کروں گا۔ رات تم دونوں فائلیں دیکھ لینا۔"

"شکریہ راجر! میں آج رات ہی ان کا مطالعہ کروں گی۔" کیٹ نے مسکرا کے کہا۔

اس رات کیٹ نے تنہا کھانا کھایا اور راجر کی دونوں خفیہ رپورٹیں پڑھنے بیٹھ گئی۔ ایک رپورٹ ویٹ آئل کے بارے میں تھی، دوسری انٹرنیشنل ٹیکنالوجی کے بارے میں۔ دونوں رپورٹیں نہایت مفصل اور طویل تھیں۔ دونوں کے آخر میں وہ خفیہ الفاظ لکھے ہوئے تھے جن کا مطلب تھا، "مالکان کمپنیاں فروخت سے دلچسپی نہیں رکھتے۔" اس کا مطلب یہی تھا کہ اگر وہ ان میں سے کسی کمپنی کو خریدنا چاہتی ہے تو اس کے لیے عام کاروباری اصولوں سے ہٹ کر کوئی طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔

دونوں کمپنیوں کے مالک نہایت دولت مند اور سخت گیر تھے۔ بڑی جارحانہ طبیعت کے مالک تھے اور انہیں کسی طرح بھی اپنی کمپنیاں فروخت کرنے پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ ایک چیلنج تھا۔ کیٹ کو عرصے سے کوئی ایسا موقع نہیں ملا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ناممکن کو ممکن کر دکھائے گی۔ اُس نے ایک مرتبہ پھر ان رپورٹوں کا مطالعہ کیا۔ ان کی بیلنس شیٹوں کو بغور دیکھا۔ ویٹ آئل کا مالک ٹیکساس کا ایک شخص چارلی تھا۔ اُس کے اثاثوں میں تیل کے کنوئیں بھی شامل تھے۔ دوسری کمپنی انٹرنیشنل ٹیکنالوجی کا مالک ایک جرمن فریڈ تھا۔ اس نے فولاد کے ایک چھوٹے سے کارخانے سے اپنے کاروبار کا آغاز کیا تھا اور برسوں کے ہیر پھیر سے اب وہ کروڑ پتی بن چکا تھا۔ اس کے اپنے شپ یارڈ تھے، کیمیکل کے کارخانے تھے، تیل بردار جہازوں کا بیڑا تھا اور ایک کمپیوٹر ڈویژن تھا۔

کیٹ نے فائلوں کو واپس رکھ دیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ان میں سے کسی ایک کمپنی کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

"مالکان فروخت سے دلچسپی نہیں رکھتے۔" اسے راجر کے ریمارکس یاد آئے اور خود کلامی کے انداز میں کیٹ بڑبڑا اٹھی "دیکھا جائے گا۔ دیکھتی ہوں کیسے وہ اپنی کمپنیاں نہیں بیچتے۔ میں ان کی کوئی دُکھتی رگ پکڑوں گی اور انہیں شکست تسلیم کرنی پڑے گی میں اُن کے لیے فرار کا کوئی راستہ نہیں چھوڑوں گی۔"

اگلے روز صبح ہی صبح کیٹ نے راجر کو اپنے دفتر میں طلب کر لیا۔ "یہ قصہ تو میں بعد میں سُنوں گی کہ تم نے یہ معلومات کیونکر حاصل کیں، پہلے یہ بتاؤ کہ چارلی کیسا آدمی ہے؟"

راجر اس سلسلے میں پہلے ہی تمام معلومات حاصل کر چکا تھا۔ اس نے بتایا "چارلی بہت ہوشیار اور گھاگ آدمی ہے۔ اپنے معاملات پر گہری نظر رکھتا ہے۔ ساری دولت اپنی محنت سے کمائی ہے۔ اب نصف ریاست کا مالک ہے۔ عمر سینتالیس برس ہے، اس کی ایک ہی پچیس سالہ مطلقہ بیٹی ہے اور سُنا ہے بہت خوبصورت اور بادوق ہے۔ لگے ہاتھوں فریڈ کے بارے میں بھی سُن لو۔ اُس کی عمر چارلی سے دو برس کم ہے۔ جرمنی کے ایک انتہائی معزز شاہی گھرانے سے اس کا تعلق ہے۔ بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کے دادا نے بھی فولاد کے ایک چھوٹے کارخانے سے کاروبار کا آغاز کیا تھا جسے فریڈ نے اپنی ذہانت اور شب و روز کی محنت سے بہت بڑا اسٹیل مل بنا دیا۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے کمپیوٹر کے میدان میں قدم رکھا۔ اس شعبے میں اس نے بے شمار ایجادات پیٹنٹ کرائی ہیں۔ اس کی بھی ایک ہی بیٹی ہے۔ میں اس کی نجی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں کر سکا۔ دراصل یہ خاندان بہت الگ تھلگ رہتا ہے۔ لوگوں سے زیادہ تعلقات پیدا کرنے کا قائل نہیں۔ میرا خیال ہے، شاید ان میں سے کسی ایک کمپنی کو بھی ہم نہ اپنا سکیں۔ اس سلسلے میں ہماری کوششیں شاید بارآور ثابت نہ ہوں۔ دو ایک مرتبہ میری ان لوگوں سے ملاقات ہوئی ہے۔ یہ لوگ مالی طور پر بہت ہی مضبوط ہیں، اس لیے شاید...."

"میں ناممکن کو ممکن کرنا جانتی ہوں۔" کیٹ نے یہ کہہ کر گفتگو ختم کر دی۔

دس دن بعد کیٹ کو امریکہ کے صدر کی جانب سے دعوت نامہ موصول ہوا۔ صدر امریکہ نے سرکردہ بین الاقوامی صنعتکاروں کی ایک کانفرنس طلب کی تھی۔ اس کانفرنس میں پسماندہ ممالک کی ترقی کے لیے امداد پر تبادلۂ خیال ہونا تھا۔ کیٹ نے دعوت نامہ موصول ہوتے ہی واشنگٹن فون کیا۔ اس کے فوراً بعد ہی چارلی اور فریڈ کو بھی صدر امریکہ کی جانب سے دعوت نامے جاری کر دیے گئے۔ کیٹ کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ وہ اکثر حکومت کے فیصلوں پر اثر انداز ہو جاتی تھی۔

کانفرنس تین دن جاری رہی۔ اس کانفرنس میں ہر شخص کیٹ سے متاثر تھا۔ اس عرصے میں کیٹ کو چارلی اور فریڈ سے متعارف ہونے اور ان کے کردار کا اندازہ لگانے کا بھی موقع ملا تھا۔ راجر کا تجزیہ صحیح تھا۔ دونوں آہنی قوتِ فیصلہ کے مالک تھے۔ انہیں ان کی مرضی کے خلاف جُھکانا ناممکن تھا۔ لیکن وہ یہ بھی اندازہ لگا چکی تھی کہ ان کی شخصیت کے وہ کون سے کمزور پہلو ہیں جہاں سے ان پر کاری ضرب لگائی جا سکتی ہے۔ ان کی دُکھتی رگ کو وہ دیکھ چکی تھی اور اب اُسے عملی قدم اٹھانا تھا۔

کیٹ نے چارلی کو چند لمحوں کے لیے تنہا پا کر نہایت معصومیت سے دریافت کیا "کیا آپ کی فیملی بھی آپ کے ساتھ ہے؟"
"میں اپنی بیٹی کو ساتھ لایا ہوں۔ میں تو اُسے ساتھ لانا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ اَڑ گئی کہ اسے شاپنگ کرنی ہے۔ اکلوتی بیٹی ہے نا۔
ں کی ہر بات ماننی پڑتی ہے۔"
"اچھا کیا آپ نے" کیٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ اتنی معصومیت سے گفتگو کر رہی تھی کہ کسی کو یہ اندازہ بھی نہ ہو سکا کہ اُسے
صرف اس بات کا علم تھا بلکہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی بیٹی نے اب تک کیا کیا خریداری کی ہے۔ "بات یہ ہے مسٹر چارلی! میں جمعے کو
پنی جزیرے کی رہائش گاہ گوشۂ عافیت میں ایک چھوٹی سی پارٹی دے رہی ہوں۔ بڑی خوشی ہوگی اگر آپ اور آپ کی بیٹی اس میں
یک ہوں، یہ ایک روایتی تقریب ہے جس میں دُور دراز کے دوست اکٹھا ہوتے ہیں، آپ آئیں گے تو محفل کی رونق بڑھے گی۔"
چارلی نے بلا جھجک کہا "میں نے اس کے بارے میں بہت کچھ سُنا ہے، میں ضرور شریک ہوں گا۔"
"شکریہ، میں کل رات آپ کے لیے فضائی سفر کا انتظام کر دوں گی۔"
دس منٹ بعد کیٹ فریڈ سے گفتگو کر رہی تھی "مسٹر فریڈ آپ اکیلے یہاں تشریف لائے ہیں یا آپ کی بیگم بھی آپ کے ساتھ ہیں؟"
"میری بیوی کا انتقال تو چند برس پہلے ہو چکا ہے۔ البتہ میں اپنی بیٹی کو ساتھ لایا ہوں" فریڈ نے جواب دیا۔
کیٹ کو تو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ کون سے ہوٹل میں اور کس کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اُس نے چار آدمی مستقل فریڈ اور چارلی کے
پیچھے لگا رکھے تھے جو اُسے پل پل کی رپورٹ دیتے تھے۔ ان کے صبح بیدار ہونے سے رات سونے تک کی تمام سرگرمیاں کیٹ کے علم میں
رہتی تھیں۔ اس نے فریڈ اور اس کی بیٹی کو گوشۂ عافیت کی تقریب میں شرکت کی دعوت دی۔ فریڈ نے جان چھڑانے کی بہت کوشش کی،
ئی عذر پیش کیے لیکن کیٹ نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ فریڈ نے دعوت قبول کر لی۔
ڈارک ہاربر جزیرے میں گوشۂ عافیت پر ہر دو ماہ بعد ایک شاندار تقریب کا انعقاد کیٹ کا معمول تھا۔ ان تقریبات میں وہ
کے بڑے بڑے لوگوں کو مدعو کرتی۔ ان میں سیاستدان بھی ہوتے اور صنعتکار و سرمایہ دار بھی۔ تقریبات بہت مفید اور سُود مند ثابت
ہوتیں۔ وہ چاہتی تھی کہ یہ تقریب بھی کامیاب رہے۔ یہ اس کے نزدیک نہایت اہم اور خصوصی تقریب تھی۔ اب صرف مسئلہ یہ تھا کہ وہ
سی طرح ٹونی کو بھی اس میں شرکت پر آمادہ کرلے۔ اس نے ایک سال سے ان تقریبات میں شرکت کرنا چھوڑ دی تھی۔ اگر وہ کبھی آتا بھی
تو محض رسماً اور تھوڑی دیر بعد ہی چلا جاتا۔ اس مرتبہ نہ صرف اس کا تقریب میں شریک ہونا بلکہ وہاں آخر تک موجود رہنا بھی ضروری تھا۔
جب کیٹ نے اس بارے میں ٹونی سے گفتگو کی تو اس نے ٹکا سا جواب دے دیا "میں شریک نہیں ہو سکوں گا۔ میں کینیڈا جا رہا ہوں
اور اس سے پہلے مجھے بہت سے کام نمٹانے ہیں۔"
"مگر یہ تقریب بھی بہت اہم ہے۔ چارلی اور فریڈ بھی آ رہے ہیں" کیٹ نے بے چارگی سے کہا۔
"جی ہاں، مجھے معلوم ہے، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ کون ہیں۔ میں اس بات سے بھی واقف ہوں کہ اس تقریب کا اصل مقصد کیا ہے۔
راجر سے میں بات کر چکا ہوں، اور میرا خیال ہے کہ ہم ان میں سے کوئی ایک بھی کمپنی حاصل نہیں کر سکیں گے۔"
"لیکن میں کوشش کرنا چاہتی ہوں۔"
"اچھا، یہ بتائیے کہ آپ ان میں سے کس کمپنی کو شکار کرنا چاہتی ہیں۔"
"ڈیٹ آئل کو۔ یہ کمپنی ہمارے ہاتھ میں ہو تو ہمارے منافع میں پندرہ فیصد اضافہ ہو سکتا ہے۔"
"فریڈ کی کمپنی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"
"وہ بھی اچھی کمپنی ہے۔ لیکن ڈیٹ آئل سے زیادہ نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اس تقریب میں شریک ہو۔ کینیڈا بعد میں چلے جانا۔"
کیٹ نے اُسے سمجھایا۔
ٹونی کو تقریبات سے اور ان کے دوران ناختم ہونے والی طویل گفتگو سے نفرت تھی۔ وہاں ہر شخص شیخی بگھارتا نظر آتا تھا۔ لیکن
بہر حال یہ کاروبار تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا "ٹھیک ہے، میں شریک ہو جاؤں گا۔"
کیٹ مطمئن ہو گئی۔ اب ہر معاملہ اُس کے حسبِ منشا طے پا گیا تھا۔ اُس نے جال بچھا دیا تھا، چارہ بھی تیار تھا۔ اُسے یقین تھا
کہ دونوں میں سے ایک شکار ضرور اس کے دام میں پھنس جائے گا۔
چارلی اور اس کی بیٹی لوسی کیٹ کے چھوٹے نجی طیارے سے ڈارک ہاربر پہنچے۔ جہاں سے انہیں ایک بڑی کار میں گوشۂ عافیت
پہنچایا گیا۔ دروازے پر کیٹ نے ان کا استقبال کیا۔ چارلی کی بیٹی لوسی واقعی بہت خوبصورت تھی۔ کیٹ نے لوسی اور ٹونی کا آپس

میں تعارف کرایا اور غور سے اپنے بیٹے کے تاثرات دیکھے لیکن اس کا چہرہ پتھر کا بنا رہا۔ ٹونی نے باپ، بیٹی کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا اور انہیں مشروبات کی میز کی طرف لے گیا جہاں ایک باوردی ملازم مستعد کھڑا تھا۔

"کیا خوبصورت کمرہ ہے۔" لوسی نے نہایت شیریں آواز میں تعریف کی۔ "کیا آپ بیشتر وقت یہاں گزارتے ہیں؟"

"نہیں۔" ٹونی نے مختصر سا جواب دیا۔

لوسی کچھ دیر منتظر رہی کہ شاید ٹونی کچھ اور کہے، پھر اُس نے کہا۔ "کیا آپ کی پرورش یہیں ہوئی تھی؟"

"جزوی طور پر۔" ٹونی نے پھر مختصر جواب دیا۔

کیٹ نے دخل درمعقولات کرتے ہوئے کہا۔ "ٹونی کی بعض بہترین یادیں اس گھر سے وابستہ ہیں۔ اب بے چارہ اتنا مصروف ہوگیا ہے کہ یہاں آنے کا موقع ہی نہیں ملتا، کیوں بیٹا؟"

ٹونی نے سرد نگاہوں سے اپنی ماں کو دیکھا اور خشک لہجے میں بولا۔ "بات کچھ ایسی ہی ہے۔ آج بھی پروگرام کے مطابق مجھے کینیڈا میں ہونا چاہیئے تھا۔ امی کے اصرار پر رُک گیا ہوں۔ یہ چاہتی تھیں کہ میں آپ سے ضرور ملوں۔ اگر آپ دونوں کا خیال نہ ہوتا تو میں کسی طور بھی نہ رُکتا۔"

"بہت بہت شکریہ مسٹر ٹونی۔" چارلی نے سر کو قدرے خم کرکے کہا۔ "میں نے آپ کے بارے میں بہت کچھ سُنا ہے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ آپ اپنی کمپنی کے معاملات میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔"

"مگر امی کا خیال مختلف ہے۔" ٹونی نے جواب دیا۔ "انہیں یہی شکوہ ہے کہ میں کاروبار میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا۔"

"تمہاری امی بہت حیرت انگیز خاتون ہیں۔ انہوں نے بڑا کاروباری ذہن پایا ہے اور وہائٹ ہاؤس میں تو انہوں نے سب کو اپنا گرویدہ کرلیا تھا۔ میں نے ..." چارلی کہتے کہتے رُک گیا۔ فریڈ اپنی بیٹی مریم کے ساتھ کمرے میں داخل ہورہا تھا۔ وہ بھی خوبصورت تھی لیکن لوسی کے حُسن جمال سے اس کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لوسی کا شمار تو دنیا کی چند حسین ترین لڑکیوں میں کیا جاسکتا تھا۔

"یہ میری بیٹی مریم ہے۔" فریڈ نے مسکرا کے کہا۔ "معاف کیجئے ہمیں دیر ہوگئی۔ ایئرپورٹ پر طیارے میں آخری لمحوں میں کچھ گڑبڑ ہوگئی تھی۔"

"بعض اوقات یہ فنی خرابیاں مزا کرکرا کردیتی ہیں۔" کیٹ نے کہا، لیکن ٹونی جانتا تھا کہ اس تاخیر کا اہتمام خود کیٹ نے کیا تھا تاکہ چارلی پہلے پہنچے اور فریڈ بعد میں۔ اسی لیے تو اس نے دونوں کے لیے الگ الگ طیاروں کا انتظام کیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دوسرے مہمان بھی آنے شروع ہوگئے اور ان بے ہُودہ باتوں کا آغاز ہوگیا جس سے ٹونی کو کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی مگر اس کی ماں اس گفتگو میں نہایت پُرجوش طریقہ سے حصّہ لے رہی تھی۔ یہ محض گفتگو نہیں تھی بلکہ کاروباری شطرنج کی بساط پر مختلف چالیں تھیں۔ سارے مہمان ٹولیوں کی صورت میں کھڑے مختلف کاروباری معاملات پر تبادلۂ خیال کررہے تھے۔ کیٹ نے ہر طرح سے یہ اہتمام کیا تھا کہ لوسی کو ٹونی کے قریب رہنے کا موقع ملے۔ خود لوسی نے اس کی خاصی مدد کی تھی۔ وہ اپنے طور پر بھی ٹونی کے گرد منڈلانے کی کوشش کررہی تھی، یہ بات کیٹ کے لیے بہت طمانیت بخش تھی۔

اگلے دن ناشتے پر چارلی نے موٹر بوٹ میں سمندر کی سیر کی فرمائش کی تو کیٹ نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آج میں آپ کو اس جزیرے کی سیر کرادوں، سمندر کی سیر کل کی جائے۔"

ٹونی ان دونوں کو دیکھتا رہا۔ وہ اپنی ماں کی صلاحیتوں پر رشک کررہا تھا۔ کیٹ نے پہلی چال چل دی تھی۔ ٹونی نہیں کہہ سکتا تھا کہ چارلی اس کھیل کو سمجھ رہا ہے یا نہیں۔ وہ بہت چالاک تاجر تھا لیکن کیٹ جیسی کاروباری شخصیت سے شاید اس کا پہلے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ کیٹ نے ان دونوں سے کہا تھا۔ "جاؤ بھئی تم دونوں بادبانی کشتی کی سیر کرو۔"

اس سے پہلے کہ ٹونی انکار کرتا لوسی نے خوش ہوکر کہا۔ "واقعی! میں بھی یہی چاہتی ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے، میں ایک فون کا انتظار کررہا ہوں۔" ٹونی کے اس جواب پر کیٹ جھلاّ گئی۔ وہ شعلہ بار نگاہوں سے اپنے گستاخ بیٹے کو گھورتی رہ گئی۔

بدمزگی کو ختم کرنے کے لیے کیٹ مریم سے مخاطب ہوئی۔ "میں نے تمہارے والد کو نہیں دیکھا۔"

"وہ اس وقت شاید جزیرے کی سیر کررہے ہوں گے۔ علی الصبح اُٹھنے کے عادی ہیں۔" مریم نے بتایا۔

"شکریہ، میں بس یہیں سیر کروں گی۔" مریم نے مسکرا کے کہا۔
"شوق سے، مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" کیٹ نے کہا اور ٹونی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ "کیا تم واقعی لوسی کو کشتی کی سیر نہیں کرا سکتے؟"
"میں نے بتایا نا، میں بہت ضروری فون کا منتظر ہوں۔" ٹونی نے سرد لہجے میں کہا۔
اپنی ماں پر اس کی یہ بہت معمولی سی فتح تھی لیکن بہرحال فتح تو تھی۔ دونوں میں ایک سرد جنگ چھڑ چکی تھی اور ٹونی اس جنگ میں ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ اب اس کی ماں اُسے دھوکہ اور فریب نہیں دے سکتی تھی۔ وہ ایک مرتبہ اُسے مہرے کی طرح استعمال کر چکی تھی اور اب پھر اس کی یہی کوشش تھی۔ لیکن اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ اس مرتبہ وہ اُسے شکست دے کر رہے گا۔ کیٹ کی حریصانہ نظریں ویسٹ آئل کمپنی پر لگی تھیں۔ اس کا مالک چارلی بہت مضبوط قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ کا مالک تھا۔ اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن کیٹ نے اس کی کمزوری دریافت کر لی تھی۔ یہ کمزوری اس کی بیٹی لوسی تھی۔ اگر لوسی اور ٹونی کی شادی ہو جاتی تو دونوں کمپنیوں کا انضمام لازمی ہو جاتا۔ ٹونی کو مہرے کے طور پر استعمال کر کے وہ یہ بازی جیت سکتی تھی۔
ناشتہ ختم ہونے پر کیٹ نے اپنے بیٹے سے کہا "میرا خیال ہے، جب تک تمہارا فون آئے، تم لوسی کو باغ کی سیر کرا دو۔"
اس مرحلے پر ٹونی کوئی بہانہ نہ سوجھ پایا۔ لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ سیر انتہائی مختصر ہو گی۔ وہ ایک گہرا سانس لے کے بولا "اچھی بات ہے، جو آپ کا حکم۔"
اس طرف سے مطمئن ہو کر کیٹ چارلی سے مخاطب ہوئی۔ "قدیم اور نایاب کتابوں سے اگر آپ کو کوئی دلچسپی ہو تو میں آپ کو اپنے کتب خانے میں لے چلوں۔ میرے پاس قدیم ترین اور نادر کتابوں کا انمول ذخیرہ موجود ہے۔"
"بسر و چشم۔ مجھے بھی پرانی چیزوں سے بڑی دلچسپی ہے۔" چارلی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔
اور کیٹ کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔ وہ مریم کی طرف متوجہ ہوئی۔ "تم ٹھیک ہو نا؟"
"جی ہاں، میری فکر نہ کیجیے، میں ٹھیک ہوں۔" مریم نے مسکرا کے کہا۔
"چلو بھئی میں تمہاری طرف سے بھی بے فکر ہو جاتی ہوں۔" اس نے قہقہہ لگایا۔
ٹونی جانتا تھا کہ اس کی ماں کا یہ قہقہہ کتنا کھوکھلا تھا۔ مریم پر توجہ دینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس کی اہمیت ہی کیا تھی۔ وہ اس کی ماں کے لیے فضول تھی۔ ان کی نظر تو ویسٹ آئل کمپنی پر تھی اور اسی لیے مریم ایک ناپسندیدہ مہمان بن گئی تھی۔ اس معاملے میں اس کی ماں نہایت بے رحم اور سفاک تھی۔ ٹونی اس سے سخت نفرت کرتا تھا۔ وہ ہر بات میں اپنا مفاد پیشِ نظر رکھتی تھی۔ اس کے نزدیک رشتے ناتے اور انسانی ہمدردی کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔
"کیا سوچ رہے ہو، باغ میں نہیں چلو گے کیا؟" لوسی نے ٹونی کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں آؤ۔" وہ جیسے اپنے خیالات کے گہرے سمندر سے نکل آیا۔
وہ دروازے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ اس نے اپنی ماں کو کہتے سنا "کتنا اچھا جوڑا ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے۔"
وہ دونوں باہر آ گئے اور سرسبز قطعے پر چلنے لگے۔ دور دور تک، ہر طرف ہریالی تھی۔ خود رو پودوں میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے اور ماحول میں بھینی بھینی خوشبو پھیل رہی تھی۔ لوسی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ یہ علاقہ اسے جنت کا ٹکڑا لگ رہا تھا۔ کتنا سکون اور ٹھہراؤ تھا یہاں۔
"کیا بات ہے، آخر تم کوئی بات کیوں نہیں کرتے۔ کیا میں نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جو تمہیں بری لگی ہے۔ تم صرف ہاں یا نہیں میں جواب دے رہے ہو۔ لگتا ہے جیسے میں تمہارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہوں۔" لوسی امیرزادیوں کے مخصوص انداز میں لہرا کے اور اٹھلا کے بولی۔
ٹونی پھیکی سی بے جان مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیر کے بولا "یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ کوئی کور ذوق ہی ہو گا جو تمہاری رفاقت نہ چاہے گا۔"
لوسی دیر تک احمقانہ باتوں سے ٹونی کا دماغ چاٹتی رہی۔ وہ اس کے بے سروپا سوالات کے ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔ خاصی دیر بعد لوسی نے اس کے سرد اور معاندانہ رویے کو محسوس کر لیا۔ اس نے ٹونی سے واپس چلنے کی استدعا کی جو ٹونی نے جھٹ منظور کر لی۔

○

ٹونی اپنے لکھنے پڑھنے کے خاص نجی کمرے میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ یہ خوبصورت کمرہ ہال کے نیچے تہہ خانے میں واقع تھا۔ وہ ایک گہری

آرام کرسی میں بیٹھا ہوا تھا۔ معاً اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور چونک پڑا۔ کوئی اندر آیا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ آنے والی مریم تھی۔ اس سے پہلے کہ ٹونی اسے اپنی موجودگی کا احساس دلاتا مریم نے گہرا سانس لیا۔ وہ دیوار پر آویزاں تصویریں دیکھ رہی تھی۔ یہ تصویریں ٹونی کی بنائی ہوئی تھیں۔ یہ وہ چند تصویریں تھیں جو ٹونی پیرس سے لے آیا تھا۔ یہ اس کا ماضی تھا۔ اس کا ایک ناتمام شوق تھا، اس کی ناآسودہ تمنا تھی۔ ٹونی نے اپنی یہ تصاویر اس کمرے میں آویزاں کی تھیں۔ وہ دیکھتا رہا۔ مریم بڑے ذوق و شوق سے باری باری ہر تصویر دیکھ رہی تھی۔

"اف میرے خدا۔ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں" وہ تنویمی کیفیت میں بڑبڑائی۔

ٹونی غصے میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مریم اس کی موجودگی کا احساس کرتے ہی چونک پڑی اور دھیمی آواز میں بولی "معاف کیجیے، مجھے معلوم نہ تھا کہ یہاں آپ موجود ہیں"

"کوئی بات نہیں، کس چیز کی تلاش تھی آپ کو؟" ٹونی نے درشتی سے کہا۔

"جی! مجھے کسی بھی چیز کی تلاش نہیں ہے۔ میں بس یونہی سیر کرتی ہوئی ادھر آنکلی تھی۔ آپ کی تصاویر کا ذخیرہ تو شاید کسی میوزیم میں ہی ہے نا؟"

"جی ہاں سوائے ان تصویروں کے" ٹونی نے بدستور خشک لہجے میں کہا۔

مریم اس کے لہجے کی درشتی کو نہ سمجھ سکی اور آنکھیں پٹ پٹا کے بولی "یہ تصویریں آپ نے بنائی ہیں؟"

"آپ کو پسند نہیں آئیں تو میں معذرت خواہ ہوں" ٹونی نے رکھائی سے جواب دیا۔

"جی نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں، یہ تصویریں تو نہایت شاندار ہیں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اتنے اچھے مصور ہیں تو پھر یہ دوسرے کام کیوں کرتے ہیں۔ آپ کی تصویریں حیرت انگیز طور پر شاندار ہیں۔ میں سچ کہہ رہی ہوں"

ٹونی جیسے کسی طوفانی جھکڑ میں پھنس گیا تھا۔ اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ تو بس یہ چاہتا تھا کہ مریم وہاں سے چلی جائے۔ اس نے ٹونی کے پرانے زخموں کو کھرچ دیا تھا اور وہ بہت تکلیف محسوس کر رہا تھا۔

مریم کہہ رہی تھی "میں بھی مصور بننا چاہتی تھی۔ ایک برس تک میں نے باقاعدہ ایک نامور مصور سے تعلیم بھی حاصل کی۔ پھر میں نے مصوری ترک کر دی۔ کیونکہ میں سمجھ گئی تھی کہ میں کبھی اتنی اچھی آرٹسٹ نہیں بن سکتی جتنا میں بننا چاہتی ہوں۔ لیکن تم تو بہت اچھے مصور ہو ٹونی۔ کیا تم پیرس میں تعلیم حاصل کی ہے؟"

"ہاں" اس نے جواب دیا۔

مریم اب پرانے زخموں پر مرہم رکھ رہی تھی۔ ٹیسیں ختم ہو رہی تھیں اور عجیب سا سکون محسوس ہو رہا تھا۔ وہ چند لمحے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیتی رہی، پھر وہ مترنم آواز میں بولی "لگتا ہے تم نے مصوری چھوڑ دی ہے۔ کیا میں اس کی وجہ جان سکتی ہوں؟"

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا۔ اس کی ماں کی آواز گونج گئی "ارے مریم! تم یہاں ہو۔ میں تمہیں ہر جگہ دیکھتی پھری ہوں۔ تمہارے والد تمہیں تلاش کر رہے ہیں" پھر وہ ٹونی سے مخاطب ہوئی "میرا خیال ہے تمہیں مہمانوں کا خیال کرنا چاہیئے" یہ کہہ کر وہ مریم کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

ٹونی بڑی دلچسپی سے اپنی ماں کی سرگرمیوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ہر شخص پر اپنی ضرورت اور کاروباری تقاضوں کے مطابق توجہ دے رہی تھی۔ اس کا ہر قدم سوچا سمجھا ہوتا، اس لیے کبھی اس کا کوئی وار خالی نہ جاتا تھا۔ یہ کھیل جو کیٹ نے اس تقریب کے موقع پر شروع کیا تھا ہر اعتبار سے نہایت ذہانت سے مرتب کیا گیا تھا۔ اس کا آغاز چارلی کی پہلے آمد کے ساتھ ہوا۔ پھر ہر کھانے پر وہ لوسی کو ٹونی کے ساتھ بٹھاتی تھی اس کے بعد وہ چارلی سے علیحدگی میں ملاقاتیں کر رہی تھی۔ یہ سب کچھ نہایت عیاں تھا۔ لیکن اسے صرف ٹونی ہی سمجھ سکتا تھا۔ چارلی پر خصوصی توجہ کے باوجود وہ فریڈ یا دوسرے مہمانوں کو یہ احساس نہیں ہونے دیتی تھی کہ وہ ان پر توجہ نہیں دے رہی ہے۔ ٹونی یہ سب اس لیے سمجھتا تھا کہ اس کھیل کی چابی تو اسی کے پاس تھی۔ وہ بھی جانتا تھا کہ لوسی حسین ہے۔ وہ اچھی بیوی ثابت ہو سکتی تھی لیکن اس کے سوا ہر دوسرے شخص کے لیے۔ وہ لوسی کو بیوی کے طور پر قبول نہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ یہ سب کچھ... اس کی ماں کی بھی خواہش ہو۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں کاروبار کے معاملے میں سفاک اور بے رحم ہے۔ یہ شادی بھی اس کے نزدیک محض کاروبار تھی۔ ان تمام باتوں سے واقف ہونے کے باوجود وہ حیران ہی رہتا کہ نہ معلوم اب اس کی ماں کیا چال چلنے والی ہے۔ اس کے شاطرانہ ذہن کے ترتیب دیئے ہوئے کھیل کو سمجھنا آسان نہیں تھا۔ کوئی شخص بھی قبل از وقت اس کے عزائم کا اندازہ نہیں لگا

سکتا تھا۔ وہ پر اسرار انداز میں مہرے چلتی تھی اور پھر اچانک ہی بساط الٹ دیتی تھی۔
وہ باغ میں بیٹھے کافی پی رہے تھے کہ کیٹ نے اُسے خوشخبری سنائی "مسٹر چارلی نے اگلے ہفتے ہمیں اپنے باغات پر مدعو کیا ہے یہ نامرے کی بات ہے میں نے آج تک ٹیکساس کے باغات اور کھیت نہیں دیکھے" کیٹ کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔
ٹونی جانتا تھا کہ یہ مسرت نہایت مصنوعی ہے۔ ان کی کمپنی، ٹیکساس میں وسیع و عریض باغات اور زرعی زمینوں کی مالک تھی اور یہ رقبہ چارلی کے رقبے سے کہیں بڑا تھا۔ باغات دیکھنا تو ایک بہانہ تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ کیٹ نے اس کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ لوسی کو اس کے پلے باندھنے کے انتظامات کر رہی تھی۔ لوسی اور اس کے باپ نے ٹونی کو اپنے باغات پر آنے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ ٹونی نے طوعاً و کرہاً ہامی بھر لی لیکن اس نے دل ہی دل میں طے کر رکھا تھا کہ وہ ان سب کو ایسا مایوس کرے گا کہ وہ بھی یاد رکھیں گے۔

*

اتوار کو ٹونی علی الصبح سوئمنگ پول پر پہنچا تو اُس نے مریم کو تیراکی کی مشقیں کرتے پایا۔ وہ اُسے دیکھتا رہا۔ وہ تیرتی ہوئی اس کی طرف آگئی اور شیریں لہجے میں بولی "صبح بخیر، کہئے کیسے مزاج ہیں؟"
"اچھا ہوں۔ آپ سنائیے؟" ٹونی نے پوچھا۔
"بس ٹھیک ہی ہوں" وہ باہر آگئی، ٹونی نے تولیہ اس کی طرف بڑھا دیا اور وہ جسم خشک کرنے لگی۔
"ناشتہ کیا تم نے؟" ٹونی نے پوچھا۔
"نہیں۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ باورچی اٹھ گئے ہوں گے اتنی صبح" مریم نے مسکرا کے جواب دیا۔
"کمال کرتی ہو، یہ تو ہوٹل ہے، ۲۴ گھنٹے کی سروس ہے۔ تکلف کی کیا ضرورت تھی"
"اب نہیں کروں گی" وہ مسکرائی۔
"کہاں رہتی ہیں آپ؟" ٹونی نے اس کے حسین چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔
"زیادہ تر میونخ میں رہتی ہوں۔ وہاں شہر کے باہر ایک پرانا قلعہ ہے، اسی میں ہم رہائش پذیر ہیں"
ٹونی نے اس سے چند ذاتی نوعیت کے سوالات پوچھے اور مریم نے ان کے سلجھے ہوئے جوابات دیئے پھر مریم نے اس کی پیدائش پرورش اور تعلیم سے متعلق استفسارات کیے اور یوں دونوں میں اچھی خاصی بے تکلفی ہو گئی۔ ٹونی نے سبز گھاس کے قطعے پر میز لگوائی۔ جہاں انہوں نے تنہا بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ مریم نہایت شائستہ اور سنجیدہ لڑکی تھی۔ لوسی کی طرح ہنگامہ خیز نہ تھی۔ اس کے لب و لہجے اور انداز گفتار میں ایک وقار اور ٹھہراؤ تھا۔ نہ چبڑ چبڑ باتیں کرتی تھی نہ بلاوجہ دوسروں کو متاثر کرنے کی کوشش۔ ٹونی کو یہ سادہ سی معصوم لڑکی بے حد پسند آئی تھی۔ شاید اس لیے بھی کہ اس کی ماں اسے موزوں نہیں سمجھتی تھی۔ باتوں ہی باتوں میں مریم نے بتایا کہ اگلے ہفتے وہ جرمنی جارہی ہے۔ جہاں ایک ڈاکٹر سے اس کی شادی ہو رہی ہے۔ ٹونی اس اطلاع کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ کچھ مایوس سا ہو گیا۔ حسین و جمیل اور ذہین مریم نے اسے بے حد متاثر کیا تھا اور وہ اس کے بارے میں سنجیدہ ہو رہا تھا۔ اس کی شادی کی خبر نے ٹونی کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔
رات کا کھانا انہوں نے ایک چھوٹے سے ساحلی ہوٹل میں کھایا۔ وہ چاہتا تھا کہ مریم اس کی ماں کی نظروں سے دور اس کے پاس رہے اس کی رفاقت نے ٹونی پر نشہ سا طاری کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کیٹ کو ان کی دوستی اور بے تکلفی کا پتہ چلے۔ ٹونی کو یقین تھا کہ وہ ان کی خوشیوں میں زہر گھول دے گی۔ وہ مریم سے باتیں کرتا رہا اور اپنی ماں کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ مریم کو پسند کرتا تھا۔ اس کی قربت کے بہت کم لمحات ٹونی کو میسّر تھے اور وہ ان لمحات کو ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مریم بہت اچھی گفتگو کرتی تھی۔ دلنشیں مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیرے وہ دھیمی اور شیریں آواز میں دل موہ لینے والی باتیں کر رہی تھی اور ٹونی کا دل بری طرح دھڑ دھڑا رہا تھا۔ ایک عرصے سے اس کے دماغ پر دھند چھائی ہوئی تھی اور اب یہ دھند دھیرے دھیرے چھٹ رہی تھی۔ اب وہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تھا۔ کافی دنوں سے اس کے ذہن میں جو آندھیاں چل رہی تھیں، وہ اب تھمتی جارہی تھیں۔
مگر وہ ...... وہ اگلے ہفتے جارہی تھی، اس کی شادی ہونے والی تھی۔
اس کے اگلے پانچ دن ٹونی نے مریم سے کئی ملاقاتیں کیں۔ اس نے کینیڈا کا دورہ بھی منسوخ کر دیا تھا۔ وہ اس مختصر سی مہلت میں اس کے زیادہ سے زیادہ قریب رہنا چاہتا تھا۔ قدرت نے اُسے ملانے سے پہلے ہی اس کی جدائی کا انتظام کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مریم کو حاصل کرنا ناممکن ہے۔ اس کی شادی ہونے والی تھی۔ پھر بھی ایک نادیدہ قوت تھی جو اسے مریم کی طرف دھکیل رہی تھی۔ کیسی خوشی تھی کہ ایک

غم آگیں حقیقت کے ساتھ اُسے میسر آئی تھی - اسے مریم سے محبت ہوگئی تھی اور یہ محبت اس حقیقت کے باوجود شدید تر ہوتی چلی گئی کہ وہ اس سے بہت جلد بچھڑنے والی تھی -

یہ پانچ دن نہایت کیف آور اور سرور آگیں تھے - ان پانچ دنوں میں اس نے مریم کو نیو یارک کی خوب سیر کرائی تھی - یہ لمحات بڑے خواب ناک تھے - اتنی تیزی سے گزرے جیسے بس ابھی ابھی پلک جھپکی ہو اور دن گزر گئے ہوں -

یوں جمعہ آگیا - اس دن ٹونی کو چارلی کے باغات پر جانا تھا - اس نے مریم سے پوچھا "تم جرمنی کب روانہ ہو گی ؟"

" پیر کی صبح " اُس کی آواز میں افسردگی ہی افسردگی تھی -

ٹونی سہ پہر کو ہوسٹن روانہ ہوا - وہ اپنی ماں کے ساتھ کمپنی کے طیارے میں بھی جا سکتا تھا - لیکن وہ اس کے ساتھ تنہائی میں ملنا نہیں چاہتا تھا - وہ اپنی ماں سے صرف کاروباری تعلق رکھنا چاہتا تھا - جہاں تک اس کا تعلق تھا - اس نے ماں بیٹے کا رشتہ ختم ہی کر دیا تھا - اس کے نزدیک تو اس کی ماں بس ایک کاروباری شریک تھی - نہایت ذہین، چالاک، عیار، طاقتور اور خطرناک !

ہوسٹن ایئر پورٹ پر اسے لینے کے لیے ایک نئے ماڈل کی شاندار کار موجود تھی - ایئر پورٹ سے باغات کے گیٹ تک ایک گھنٹے کا سفر تھا - گیٹ سے رہائشی مکان تک کا نصف گھنٹے کا جو باغات کی وسعت کا واضح ثبوت تھا - لیکن ان کے اپنے باغات اس سے بھی کہیں بڑے تھے - کیٹ وہاں پہلے ہی پہنچ چکی تھی اور چارلی سے جوڑ توڑ میں مصروف تھی - ٹونی کو دیکھتے ہی چارلی اپنا جملہ نامکمل چھوڑ کر خاموش ہو گیا - ٹونی سمجھ گیا کہ وہ اسی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے - اسے سنہرے جال میں پھانس رہے تھے اور اس نے نہ پھنسنے کا تہیہ کر رکھا تھا -

چارلی نے اسے دیکھتے ہی پر جوش لہجے میں کہا " لو بھئی ٹونی بھی آگیا - کہو بیٹے سفر تو ٹھیک رہا ؟"

" جی ہاں، شکریہ " ٹونی نے سرد لہجے میں جواب دیا -

" لوسی کا خیال تھا کہ تم کو پہلے آنا چاہیئے تھا " کیٹ نے لقمہ دیا -

ٹونی نے ماں کو بغور دیکھا - وہ کوئی سخت جواب دینا چاہتا تھا - پھر کچھ سوچ کے خاموش رہا -

" ہم نے آج رات تمہارے اعزاز میں خصوصی اہتمام کیا ہے " چارلی نے ٹونی کے شانے تھپتھپاتے ہوئے کہا " تم اس تقریب کے مہمان خصوصی ہو - لاتعداد مہمان اس میں شرکت کے لیے دور دور سے آ رہے ہیں "

" بہت بہت شکریہ جناب " ٹونی نے سرد مہری برقرار رکھی

اسی وقت لوسی بھی آدھر آئی - وہ سفید قمیص اور چست جینز میں ملبوس تھی - وہ واقعی بے انتہا حسین تھی - وہ ٹونی کے پاس آگئی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی " آخر تم آ ہی گئے - میں تو سمجھی تھی کہ تم شاید ہی آؤ "

" مجھے افسوس ہے کہ دیر ہوگئی - میں دراصل ایک ضروری کام میں پھنسا ہوا تھا "

لوسی کے چہرے پر دلفریب مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ سر کو ایک ادائے خاص سے جھٹک کے بولی " چلو کوئی بات نہیں، تم آ تو گئے - اب یہ تو بتاؤ کہ تم پسند کیا کرو گے ؟"

" تم کیا پیش کر سکتی ہو ؟" ٹونی نے پوچھا -

لوسی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا " جو تم کہو، پیش کر دیا جائے گا "

ضیافت واقعی بہت شاندار تھی - کوئی دو سو مہمان اس میں موجود تھے - یہ سب لوگ نجی طیاروں اور لمبی لمبی کاروں سے وہاں پہنچے تھے - دو بینڈ میدان کے مختلف گوشوں میں باری باری نغمہ سرائی کر رہے تھے - ایک درجن کے قریب باوردی اور مہذب بیرے مہمانوں کو ان کی پسند کے مشروبات پیش کر رہے تھے - چار باورچی کھلے میدان میں چولہوں پر کھانا تیار کر رہے تھے - ان سب کو... ایک خصوصی طیارے سے نیو یارک سے لایا گیا تھا -

کھانے میں ہر چیز ہی تو تھی - کھانے کے لیے کم، بعد میں ضائع کرنے کے لیے زیادہ - ہر طرف امارت کا مظاہرہ تھا - عورتوں کے لباس بھڑکدار تھے - انہوں نے ہر قسم کے زیورات پہن رکھے تھے - ٹونی ایک طرف کھڑا ان تمام مہمانوں کو دیکھ رہا تھا - یہاں ہر شخص ایک پاگل پن میں مبتلا تھا - لوگ ایک دوسرے سے زور زور سے باتیں کر رہے تھے - پرانے دوستوں کو بلند آواز میں پکار رہے تھے - ان کی گفتگو کا مقصد صرف دوسروں کو متاثر کرنا تھا - اپنی امارت، ذہانت، کاروبار میں اپنی کامیابیوں کے تذکروں سے اپنا رعب جمانا تھا -

لوسی گھومتی ہوئی اس کے پاس آگئی " تم کھا نہیں رہے ہو کچھ - کیا کچھ ناراض ہو ؟"

"ناراض؟ نہیں تو۔ بس دل نہیں چاہ رہا ہے۔" ٹونی نے کہا۔ "تقریب بہت شاندار ہے۔"
"ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے پارٹنر۔ ابھی تو تم آتش بازی کا مظاہرہ دیکھنا۔"
"آتش بازی کا مظاہرہ؟" اس نے حیرت سے کہا پھر دل ہی دل میں اس پر لعنت بھیج دی۔
لوسی نے اس کا بازو تھام لیا اور بولی "میرا خیال ہے تم اس بھیڑ سے تنگ آگئے ہو۔ یہ سب محض تمہاری والدہ کو متاثر کرنے کے لیے ہے۔ کل یہ سب چلے جائیں گے۔ پھر ہمیں تنہائی اور سکون میسر آجائے گا۔ ہم خوب باتیں کریں گے۔"
"تم اپنے آپ سے باتیں کرنا۔ میں تو چلا جاؤں گا۔" ٹونی نے دل ہی دل میں کہا۔ یہاں آنا ایک غلطی اور حماقت ہی تھی۔ اُس نے اپنی ماں کو دیکھا۔ وہ لوگوں میں گھری بڑے زور و شور سے گفتگو کر رہی تھی۔ عام آدمی یہی سمجھتا کہ وہ بہت خوش ہے۔ لیکن ٹونی جانتا تھا کہ اُس کی ماں کو اس قسم کی گفتگو سخت ناپسند ہے لیکن اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے وہ اس سے بھی زیادہ خلافِ طبیعت باتیں برداشت کرنے کی عادی تھی۔ کاروبار میں وہ سب کچھ جائز سمجھتی تھی۔ چارلی کی کمپنی پر قبضہ جمانے کے لیے وہ ہر ممکن حربہ آزما رہی تھی۔
ٹونی کو مریم کا خیال آیا۔ وہ بھی اس قسم کے پاگل پن کو پسند نہیں کرتی تھی۔ اس کا خیال آتے ہی درد کی ایک لہر اُس کے دل میں اُٹھی۔ وہ جرمنی واپس جا رہی تھی۔ اُس کی شادی ہونے والی تھی۔ زندگی میں ایک ہی لڑکی تو اسے پسند آئی تھی اور وہ بھی کسی دوسرے کی ہونے والی تھی۔
نصف گھنٹے بعد جب لوسی اس کی تلاش میں آئی تو وہ نیویارک واپس جا رہا تھا۔
نیویارک ایئرپورٹ سے اس نے مریم کو فون کیا۔ "میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"
"آجاؤ۔" مریم نے بلا تکلف فوراً ہی کہا۔ "میں بھی بور ہو رہی ہوں۔"
مریم کو بھول جانا، اسے اپنے خیالوں اور خوابوں سے نکال دینا ٹونی کے لیے ناممکن تھا۔ اس دلکش اور معصوم لڑکی سے دوری اور جدائی اُسے عجیب قسم کی عذاب ناک تنہائی سے دوچار کر دیتی تھی۔ لگتا تھا جیسے اس کے وجود کا کوئی اہم حصہ کھو گیا ہو۔ اس کی قربت میں زندگی کی حرارت اور تمازت تھی، اس کا فراق موت کی سردی تھی۔ وہ تو بس یہ جانتا تھا کہ اگر اس نے مریم کو کھو دیا۔ اگر مریم اُسے نہ ملی تو وہ خود بھی کھو جائے گا۔ مر جائے گا۔
اور شاید مریم بھی ایسے ہی خیالات کا شکار تھی۔ ٹونی اس کے کمرے میں داخل ہوا اور اگلے لمحے وہ اس کے بازوؤں میں تھی۔ کیسا عجیب پُرسکون احساس تھا۔ جیسے ہر طرف شبنمی چاندنی پھیلی ہو جو قطرہ قطرہ وجود میں گھل رہی ہو۔ جیسے سمندر کی لہروں کے جھاگ پر وہ تیر رہے ہوں، جیسے وہ اس دنیا میں نہ ہوں، جیسے ان کے وجود نہ ہوں۔ جیسے وجود محض احساس ہو اور ایک دوسرے میں کھو جانا سب سے بڑی حقیقت ہو۔
ٹونی نے اسے جتا دیا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے، اس کے بغیر وہ زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مریم یہ بات سن کر خوشی سے نہال ہو گئی۔ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی۔ وہ بھی ٹونی کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے ٹونی سے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اس کی ماں اس رشتے کو پسند نہیں کرے گی اور شادی کے بعد اس سے نفرت کرنے لگے گی۔ وہ ٹونی کی شادی لوسی سے کرنا چاہتی تھی لہٰذا مریم کے بیچ میں آنے سے اسے بہت غصہ آئے گا۔ ٹونی نے اسے اطمینان دلایا کہ کچھ نہیں ہوگا۔ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ زندگی اُسے گزارنی ہے لہٰذا وہ اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ وہ دونوں دیر تک اپنی ازدواجی زندگی کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔ مستقبل کے رنگین اور سہانے خواب دیکھتے رہے۔

*

کیٹ ٹونی کی طرف سے پریشان تھی۔ وہ اُسے کہیں بھی نہیں مل رہا تھا۔ وہ کچھ کہے سنے بغیر، ملے بغیر، اجازت لیے بغیر تقریب سے چپ چاپ واپس آگیا تھا۔ اس حرکت پر چارلی حیران تھا۔ لوسی سخت غصے میں تھی۔ کیٹ کے لیے معذرت طلب کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اسی رات کمپنی کے طیارے سے نیویارک واپس آگئی تھی۔ اس نے ٹونی کے اپارٹمنٹ پر فون کیا لیکن ادھر سے کوئی جواب نہ ملا۔ نہ اگلے روز ٹونی کا کچھ پتہ چل سکا۔
یہ چوتھا دن تھا۔ کیٹ اپنے دفتر میں بیٹھی تھی کہ اس کا پرائیویٹ فون بج اٹھا۔ ریسیور اٹھانے سے پہلے ہی وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ فون کس کا ہے۔ اس کا اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔ دوسری طرف ٹونی اس سے مخاطب تھا۔ اس نے مریم سے شادی کی

خوشخبری سنائی۔ چند لمحوں کے لیے تو وہ سناٹے میں رہ گئی۔ پھر سنبھل کے بیٹے کو نئی زندگی کی مبارکباد پیش کی۔ ٹونی کا خیال تھا کہ یہ دھماکہ خیز خبر سن کے وہ چیخ اٹھے گی۔ اسے بُری طرح لتاڑ دے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ کیٹ نے کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا اس کے لہجے میں تلخی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ بلکہ اس کی آواز سے تو خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ٹونی کے لیے یہ بات قطعی غیر متوقع اور مایوس کن تھی۔ اس نے اپنی ماں کو بتایا کہ وہ اور مریم ہنی مون پہ ہیں اور چند ہفتوں بعد نیویارک پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد ٹونی نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ریسور رکھ کر کیٹ نے انٹرکام کا بٹن دبایا اور راجر کو طلب کر لیا۔ چند ہی لمحوں بعد راجر کمرے میں داخل ہوا۔ کیٹ نے چھوٹتے ہی کہا "ٹونی کا فون آیا تھا۔ اس نے مریم سے شادی کر لی ہے۔"

"واقعی؟ گویا تمہارا منصوبہ کامیاب رہا؟" راجر نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"یہ کامیابی ٹونی نے حاصل کی ہے۔ فریڈ کی کمپنی ہماری گود میں آگئی ہے۔" کیٹ فاتحانہ لہجے میں بولی۔

راجر کرسی میں دھنس گیا اور غیر یقینی سے کیٹ کو دیکھتے ہوئے تعجب خیز لہجے میں کہا "مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔ میں ٹونی کو جانتا ہوں۔ وہ بہت ضدی ہے۔ مگر تم نے اُسے مریم سے شادی پر تیار کیسے کیا؟"

"بہت آسان تھا راجر! ٹونی میرا بچہ ہے۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ضد میں ہر کام میری خواہش کے الٹ کرے گا۔ بس یہی سوچ کر میں نے اسے لوسی کی طرف دھکیلنا چاہا تھا۔"

"تم واقعی بہت ظالم ہو کیٹ، اپنے بیٹے کو بھی نہیں بخشتیں۔" راجر نے تاسف سے سر ہلا کر کہا۔

"میں نے وہی کیا ہے جو ٹونی کے حق میں بہتر تھا۔ مریم اُس کے لیے بہترین بیوی ثابت ہو گی۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ لوسی ہرگز اُس کے لیے مناسب نہیں تھی۔ وہ بہت بدمزاج لڑکی ہے۔ پھر اُس کے باپ نے بھی اُسے بہت بگاڑ دیا ہے۔ وہ ٹونی کے لیے ایک مصیبت بن جاتی۔ میں جان بوجھ کر لوسی کی طرف متوجہ ہوئی تھی تاکہ ضد میں ٹونی مریم سے تعلقات بڑھا لے اور ہمت کر کے اس سے شادی کر لے اور وہی ہوا جو میں نے سوچا تھا۔"

"اور وہ یہی سمجھ رہا ہو گا کہ تم اس کی شادی پر خوش نہیں ہو گی۔"

"ہاں۔ اُسے سمجھنے دو۔ اہم بات یہ ہے کہ اس نے وہی کیا ہے جو میں چاہتی تھی۔ جو اس کے لیے اور کمپنی کے حق میں بہتر تھا۔" کیٹ خاموش ہو گئی۔ اُسے امید تھی کہ مریم ٹونی کے لڑکے کو جنم دے گی۔ اب وہ اپنے پوتے کی منتظر تھی۔

•

ٹونی کی شادی کے ٹھیک چھ ماہ بعد فریڈ کی کمپنی، کروگر برینٹ کمپنی میں ضم ہو گئی تھی۔

ٹونی حیران تھا کہ اس کی ماں نے نہایت خندہ پیشانی سے اس شادی کو قبول کر لیا تھا۔ یہ ایک طرح سے کیٹ کی شکست تھی اور وہ اپنی شکست آسانی سے تسلیم کرنے والوں میں سے نہ تھی۔ وہ مریم سے بھی بہت خوش تھی۔ ہنی مون سے جب وہ دونوں واپس آئے تھے تو کیٹ نے ان کی شادی پر انتہائی مسرت کا اظہار کیا تھا۔ ٹونی کے لیے پریشان کن بات یہ تھی کہ کیٹ کے رویے اور اظہار مسرت میں بناوٹ اور دکھاوا نہ تھا۔ وہ واقعی خوش تھی۔ یہ بہت بڑی تبدیلی تھی۔ یہ کیٹ کے مزاج میں ایک انقلاب تھا۔ ٹونی حیران تھا اور سوچا کرتا تھا کہ شاید وہ اپنی ماں کو ابھی تک صحیح طور پر سمجھنے میں ناکام رہا ہے۔

یہ شادی ہر اعتبار سے کامیاب تھی۔ مریم نے ٹونی کی زندگی کے ایک بہت بڑے خلا کو پُر کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ٹونی کے رویے میں بھی بہت بڑی تبدیلی آگئی تھی۔ یہ تبدیلی سب ہی محسوس کر سکتے تھے اور اس تبدیلی پر سب سے زیادہ خوشی کیٹ کو تھی۔ ٹونی جب بھی کسی کاروباری سفر پر جاتا مریم اس کے ساتھ ہوتی۔ ان کی زندگی مسرتوں سے عبارت تھی۔ یہ مسرت کیٹ کے لیے بہت طمانیت کا باعث تھی۔

اور یہ مریم ہی تھی جس نے ماں اور بیٹے کے درمیان حائل خلیج کو پاٹا تھا۔ اب ہر ہفتے وہ دونوں کیٹ سے ملنے کے لیے اس کے گھر جاتے۔ دن بھر وہیں رہتے۔ دونوں عورتوں میں بہت گہری دوستی ہو گئی تھی۔ ہفتے میں کئی کئی مرتبہ وہ ایک دوسرے سے فون پہ گفتگو کرتیں اور ہفتے میں ایک مرتبہ وہ ضرور ایک مخصوص ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھاتیں اور اس دوران گھریلو مسائل پر بھی بات چیت ہوتی رہتی۔

وہ بھی ایسی ملاقات تھی۔ دونوں ہوٹل میں بیٹھی تھیں۔ مریم کچھ چپ چپ دکھائی دے رہی تھی۔ کیٹ نے اس کے ناخوشگوار موڈ کو محسوس کر لیا۔ اس نے خاموشی کی وجہ معلوم کی تو مریم نے ٹال دیا۔ مگر کیٹ نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ...

ضرور کوئی خاص بات ہے۔ کیٹ کے مجبور کرنے پر مریم نے بتایا کہ چند دن پہلے کی بات ہے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ معائنے کے لیے ڈاکٹر ہارلے کے پاس گئی تھی۔ مریم نے تفصیل سے اس ملاقات اور معائنے کا احوال اپنی ساس کو سنا دیا۔

ڈاکٹر ہارلے کا شمار نیویارک کے چند بہترین ڈاکٹروں میں ہوتا تھا۔ وہ کیٹ کا خاندانی ڈاکٹر اور دوست تھا۔ اس کے مشورے کارآمد ہوتے تھے۔ اس نے کیٹ کی بہو مریم کا تفصیلی معائنہ کیا اور مرض کی نوعیت جاننے کے لیے کئی طبی اور نجی سوالات کیے۔ ڈاکٹر ہارلے کے ایک سوال کے جواب میں مریم نے بتایا کہ اسکول میں ہاکی کھیلتے ہوئے وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی اور ہوش میں آنے کے بعد اس نے اپنے جسم کے دونوں پہلوؤں میں ایک قسم کی کمزوری محسوس کی تھی اور چند دن بعد یہ کمزوری جاتی رہی تھی۔ اس کے بعد اس نے ایسی شکایت محسوس نہیں کی تھی۔ مریم ڈاکٹر ہارلے کے تابڑ توڑ سوالات سے گھبرا گئی اور بولی "ڈاکٹر ہارلے! میں ان بیسیوں سوالات کا مقصد نہیں سمجھ سکی ہوں۔ کیا مجھ میں کوئی خرابی ہے؟"

"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں چند ایک ٹیسٹ کراؤں گا تبھی کچھ کہہ سکوں گا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ دماغ سے متعلق چھوٹا سا ٹیسٹ ہے جو میں ابھی کرائے دیتا ہوں۔"

تین دن بعد ڈاکٹر ہارلے نے اُسے فون کیا "ہم نے یہ راز حل کر لیا ہے آپ فوراً آ جائیں۔"

تھوڑی دیر بعد مریم ڈاکٹر کے سامنے بیٹھی تھی وہ خوفزدہ لہجے میں بولی "کوئی پریشان کن بات تو نہیں ڈاکٹر؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں میں نے تمہارا جو ٹیسٹ لیا تھا۔ اس سے ساری بات واضح ہو گئی ہے۔ سولہ برس کی عمر میں آپ پر ہلکا سا دورہ پڑا تھا۔ عورتوں میں یہ عام ہے خاص طور پر دس سے بیس برس کی عمر میں۔ اس میں دماغ کی ایک چھوٹی سی شریان سے کسی وجہ سے ذرا سا خون بہہ جاتا ہے۔ اس کے دباؤ سے سر درد اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہو جاتا ہے۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو وقت گزرنے کے ساتھ ہی ٹھیک ہو جاتی ہیں۔"

مریم کو احساس ہو چلا تھا کہ بات اتنی معمولی نہیں ہے جتنا ڈاکٹر ہارلے اُسے ظاہر کر رہا تھا۔ وہ سخت پریشان تھی۔ اس نے کرسی کے دونوں ہتھوں کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا "آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں ڈاکٹر؟ کیا میں اس قسم کے دورے کا پھر شکار ہو سکتی ہوں؟"

"میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے بشرطیکہ تم پھر ہاکی کھیلنا شروع نہ کر دو۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ مجھے معلوم ہے تم اور ٹونی گھڑ سواری کے شوقین ہو، ٹینس بھی کھیلتے ہو۔ اگر تم یہ سرگرمیاں اعتدال میں رکھو۔ زیادتی نہ کرو تو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ تم ہر اعتبار سے معمول کے مطابق زندگی گزار سکو گی۔"

"شکر ہے خدا کا، میں تو ڈر گئی تھی۔" مریم نے کہا۔

وہ اٹھنے ہی والی تھی کہ ڈاکٹر نے کہا "ایک بات اور ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ اگر تم اور ٹونی اولاد کے بارے میں کچھ سوچ رہے ہو تو پھر بہتر ہے کہ کسی بچے کو گود لے لو۔"

مریم جیسے اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور وہ شکستہ لہجے میں بولی "آپ تو کہہ رہے تھے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں پھر اب کیا ہوا؟ میں بچہ پیدا نہیں کر سکتی؟"

"تم بالکل ٹھیک ہو مریم۔ لیکن بات یہ ہے کہ حمل کے دوران شریانوں میں خون کی گردش بڑھ جاتی ہے۔ خاص طور پر حمل کے آخری چھ آٹھ ہفتوں کے دوران بلڈ پریشر بہت بڑھ جاتا ہے۔ تم پر جو دورہ پڑ چکا ہے اس کے بعد تمہارے لیے خطرہ بہت بڑھ جائے گا۔ اس میں جان جانے کا بھی اندیشہ ہے۔ ان دنوں کسی بچے کو گود لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ میں اس کا انتظام کر سکتا ہوں۔"

لیکن مریم اب کچھ نہیں سن رہی تھی۔ اس کے ذہن میں تو بس ٹونی کے الفاظ گونج رہے تھے "میں چاہتا ہوں مریم کہ ہماری ایک بیٹی ہو، ہو بہو تم جیسی۔"

مریم نے یہ بات سن کر کیٹ سے کہا "اس کے بعد میں کچھ نہیں سن پائی۔ میرے لیے وہاں ٹھہرنا دوبھر ہو گیا اور میں جیسے تیسے گھر پہنچ گئی۔ اس وقت میری جو حالت ہو رہی تھی۔ وہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ میری تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی۔"

یہ کیٹ کے لیے بھی بہت بڑا صدمہ تھا۔ اس نے اپنے جذبات کو چھپانے کی سخت جدوجہد کی۔ یہ ایک بہت بڑا اور گمبھیر مسئلہ تھا۔ لیکن ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تو ہوتا ہی ہے۔ وہ اس مسئلے کا حل تلاش کرنا چاہتی تھی۔ بمشکل تمام خود پر قابو پا کے وہ مسکرا کے بولی "میں تو سمجھی تھی نہ معلوم کیا بات ہے۔ تم فکر مت کرو۔"

"مگر ممی، میں اور ٹونی، دونوں بچہ چاہتے ہیں۔ آپ کے بیٹے کو تو بیٹی کی بڑی تمنا ہے! یہ خبر سن کر اسے یقیناً صدمہ ہوگا۔"

"تم فکر نہ کرو میری جان۔ میں ڈاکٹر ہارے کو جانتی ہوں۔ وہ بات کا تبنگڑ بنا دیتا ہے۔ اب یہی دیکھ لو، چھ سات برس پہلے تم پر ایک دورہ پڑا تھا۔ اب وہ ڈاکٹر ہارے اسے لے کر ہی بیٹھ گیا ہے۔ رائی کا پہاڑ بنانا تو کوئی ان ڈاکٹروں سے سیکھے" اس نے مریم کا ہاتھ تھام لیا اور اسے سہلاتی ہوئی بولی "یہ ڈاکٹر اپنی مہارت اور علم کی بنا پر اور ہماری ناواقفیت سے فائدہ اٹھا کر معمولی معمولی بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں تاکہ اپنا بل بڑھا چڑھا کر بنا سکیں۔ ویسے تم تو ٹھیک ہو نا؟"

"جی ہاں۔ اب تو میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہے"

"تم پریشان نہ ہو مریم۔ تم بالکل ٹھیک ہو۔ اب تم پر ایسا دورہ نہیں پڑے گا"

"ڈاکٹر کہہ رہا تھا بچے کی پیدائش میں جان جانے کا اندیشہ ہے" مریم بھرائی آواز میں بولی۔

کیٹ نے گہرا سانس لے کر کہا "مریم میری جان۔ بچے کو جنم دینا آسان نہیں ہے۔ عورت خود کو داؤ پر لگا دیتی ہے۔ جب ایک ننھی سی جان کو جنم دیتی ہے۔ زندگی خطرات سے کھیلنے ہی کا نام ہے۔ زندگی ایک پر خطر راستہ ہے۔ زندگی میں اہم بات یہ ہے کہ یہ فیصلہ کیا جائے کہ کون سے خطرات مول لینے ہیں کون سے نہیں۔ میں نہیں سمجھتی ماں بننے میں کوئی خطرہ ہے۔ یہ تو ایک قدرتی عمل ہے اور اس میں بعض اوقات صحت مند عورتیں بھی مر جاتی ہیں"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ممی۔ ہم اس کے بارے میں ٹونی سے کچھ نہیں کہیں گے۔ اس سے صرف اس کی پریشانیوں میں اضافہ ہوگا۔ ہم یہ راز اپنے درمیان رکھیں گے"

کیٹ سوچ رہی تھی، اس ڈاکٹر ہارے سالے کو جان سے مار دینا چاہیئے۔ بلا وجہ بے چاری کو ڈرا رہا ہے۔ وہ مریم کی پشت پر ہاتھ پھیر کے بولی "یہ ٹھیک ہے۔ یہ ہمارے درمیان راز رہے گا۔ میں یہ بات اپنے بیٹے سے چھپائے رکھوں گی"

اس کے تین ماہ بعد مریم کا پیر بھاری ہو گیا۔ یہ خبر سن کر ٹونی تو جیسے خوشی سے پاگل ہو گیا۔ کیٹ اپنی جگہ خوش تھی اور ڈاکٹر ہارے کے ہوش اڑ گئے تھے۔ ان کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ مریم ان کی ہدایت پر عمل نہیں کرے گی۔

"میں فوری طور پر اس خطرے کو ٹالنے کا انتظام کرتا ہوں" اس نے مریم سے کہا۔

"نہیں ڈاکٹر، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں اپنا بچہ ضائع نہیں کرنا چاہتی"

اور جب مریم نے اس گفتگو سے کیٹ کو آگاہ کیا تو وہ سخت برہم ہو گئی۔ پہلی فرصت میں وہ ڈاکٹر ہارے کے پاس جا پہنچی "ڈاکٹر ہارے! آخر تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی کہ میری بہو کو ایسا بے ہودہ مشورہ دو"

"کیٹ، میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ اگر یہ نہ کیا گیا تو اس کی جان کو خطرہ ہے۔ وہ زندہ نہیں بچ سکے گی" ڈاکٹر ہارے نے کہا "میں پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ بچے کی پیدائش کے وقت وہ اپنی زندگی......"

کیٹ نے ہاتھ کے اشارے سے اس کی بات کاٹ کے کہا "تم یہ اندیشے اور وسوسے اپنے پاس رکھو۔ اسے خوفزدہ کرنے کی کوشش نہ کرو ڈاکٹر۔ بس میں تم سے صرف اتنا ہی چاہتی ہوں"

آٹھ ماہ بعد زچگی کے لیے ایک رات مریم کو اسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ وہ شدید تکلیف میں تھی۔ اس کا بلڈ پریشر بہت بڑھ چکا تھا۔ گھر سے اسپتال تک کے سفر کے دوران اس نے کئی مرتبہ سوچا تھا کہ سب کچھ بتا دے۔ لیکن پھر وہ خاموش ہو گئی تھی۔ یہ فیصلہ اس کا اپنا تھا اور پھر اب بہت دیر ہو گئی تھی۔

اسپتال میں سب کچھ تیار تھا۔ وہ جیسے ہی مریم کو لے کر وہاں پہنچا نرسوں نے اسے معائنے کے کمرے میں پہنچا دیا۔ ڈاکٹر نے بلڈ پریشر دو تین مرتبہ چیک کیا۔ وہ سخت پریشان ہو گیا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولا "فوراً انہیں آپریشن روم میں لے کر چلو"

ٹونی اسپتال کے وسیع و عریض دالان میں بے چینی کے عالم میں ٹہل رہا تھا اور سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اچانک اس نے ایک مردانہ آواز سنی جو شاید اسی پر تبصرہ کر رہی تھی "اوہو، تو یہ پکا سو صاحب ٹہل رہے ہیں"

ٹونی نے مڑ کر دیکھا۔ یہ بین تھا۔ وہی نوجوان جسے اس نے کیرول کی رہائش گاہ کے سامنے دیکھا تھا۔ وہ ٹونی کو کینہ توز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ٹونی پر نہایت گہرا طنز کیا تھا۔ اس کی انا کو ٹھیس پہنچائی تھی۔

اسی لمحے کیرول کمرے سے باہر آئی "میری سہیلی اس وقت انتہائی نگہداشت کے کمرے میں ہے۔ آؤ چلو، ہم پھر آئیں گے" اچانک اس کی نظر ٹونی پر پڑی اور وہ چلا کر بولی "ارے ٹونی تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ خیریت تو ہے؟"

"میری بیوی کے ہاں بچہ ہونے والا ہے" ٹونی نے پریشانی کے عالم میں بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"کیا اس بچے کا انتظام بھی تمہاری والدہ نے کیا ہے؟" بین نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔
"کیا کہنا چاہتے ہو تم؟" ٹونی بپھر گیا۔ وہ بین کی گز بھر کی زبان گُدی سے کھینچ لینا چاہتا تھا۔
"مجھے تو یہی بتایا گیا ہے کہ تمہاری ماں ہی تمہارے لیے ہر چیز کا انتظام کرتی ہے۔"
"بین خاموش رہو۔" کیرول نے دخل دیا۔
"کیوں خاموش رہوں۔ تم نے ہی تو بتایا تھا مجھے۔" بین جارحانہ انداز میں بولا۔
ٹونی نے پلٹ کر کیرول سے پوچھا "یہ کیا کہہ رہا ہے۔"
"کچھ نہیں ٹونی۔ آؤ بین ہم چلیں۔" وہ پریشان ہو کر بولی
لیکن بین تو جیسے ٹونی کو ستانے پر تلا ہوا تھا زہریلے لہجے میں بولا "کتنا جی چاہتا ہے کہ خدا مجھے بھی ایسی ہی ماں دیتا جیسی تمہاری ہے۔ وہ شب بسری کے لیے تمہارے واسطے خوبصورت ماڈل فراہم کرتی ہے۔ تم پیرس میں اپنی تصاویر کی نمائش کرنا چاہتے ہو اور وہ اس کا بھی انتظام کر دیتی ہے۔ ایسی ماں بھلا کب کسی کو ملتی ہے۔"
"تم پاگل ہو گئے ہو۔ کیا بکواس لگا رکھی ہے تم نے۔" کیرول نے پھر موضوع بدلنے کی کوشش کی
"میں پاگل ہوں۔ کیوں، کیا اسے یہ سب باتیں معلوم نہیں ہیں؟" بین نے سخت لہجے میں پوچھا۔
"مجھے کچھ نہیں معلوم، بتاؤ یہ کیا کہہ رہا ہے؟" ٹونی نے کیرول کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"کچھ نہیں ٹونی، کچھ بھی تو نہیں۔" کیرول نے بات ٹالنا چاہی۔
"یہ کہہ رہا ہے پیرس میں میری تصویروں کی نمائش کا انتظام میری ماں نے کرایا تھا۔ کہو۔ کیا یہ بات سچ ہے؟"
"ہاں۔" وہ کمزور لہجے میں بولی۔
"کیا مطلب؟ انہوں نے جارج کو رقم دی تھی کہ وہ میری تصاویر کی نمائش کرے؟"
"ہاں مگر ٹونی اصل بات یہ ہے کہ جارج کو تمہاری تصاویر پسند تھیں۔"
"اور اسے آرٹ کے اس عظیم نقاد کے بارے میں بھی تو بتاؤ۔" بین نے پھر ایک نشتر لگایا۔
"بس بین بہت ہو گیا۔ آؤ چلیں۔" یہ کہہ کر وہ مڑی۔
ٹونی نے کیرول کا بازو تھام لیا اور درشتی سے بولا "تم ایسے نہیں جا سکتیں۔ مجھے بتاؤ کیا میری ماں نے ہی نقاد آندرے کو نمائش میں بھجوایا تھا؟"
"ہاں۔" وہ روہانسا ہو کر بولی۔
"لیکن اسے تو میری تصویروں سے نفرت تھی۔"
اس نے ٹونی کے لہجے میں درد اور کرب محسوس کیا تھا "و نہیں ٹونی یہ بات نہیں تھی۔ آندرے نے تمہاری ماں سے کہا تھا کہ تم ایک آرٹسٹ بن سکتے ہو۔"
یہ سب باتیں ناقابلِ یقین تھیں وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا "تو میری ماں نے مجھے تباہ کرنے کے لیے آندرے کو بھی خرید لیا تھا؟"
"تمہیں تباہ کرنے کے لیے نہیں ٹونی۔ تم نہیں جانتے تمہاری ماں تم سے کتنی محبت کرتی ہیں۔ انہوں نے وہ سب کچھ تمہاری بھلائی کے لیے کیا تھا۔" کیرول نے کہا۔
وہ دونوں چلے گئے۔ ٹونی کا دل خون کے آنسو روتا رہا۔ اس کے سان و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس کی ماں اس کے ساتھ اتنا بڑا ظلم کر سکتی ہے۔ اس کی ماں نے اس سے جو کچھ بھی کہا سب جھوٹ تھا۔ اور وہ نقاد آندرے۔ آخر اس جیسے آدمی کو کیا ہو گیا تھا؟ چند ٹکوں کی خاطر آخر وہ کیسے بک گیا تھا؟ اس کی ماں ایک نہایت سفاک کاروباری عورت تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کس آدمی کو کس قیمت پر خریدا جا سکتا ہے۔ اسے تو اپنے بیٹے کا بھی خیال نہ تھا۔ اس کے لیے سب کچھ بس کمپنی ہی تھی۔ بیٹے کو کاروباری بنانے کے لیے کیٹ نے بے دردی سے اس کے شوق کو پامال کر دیا تھا۔
ٹونی سوچتا رہا۔ اندر ہی اندر سلگتا رہا۔ پھر وہ ایک بینچ کی طرف بڑھ گیا۔
آپریشن روم میں ڈاکٹر مریم کی جان بچانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ اس کے خون کا دباؤ انتہائی کم ہو گیا تھا۔ نبض بے ترتیب ہو گئی تھی۔ اسے آکسیجن دی گئی۔ خون دیا گیا۔ ساری کوششیں کر لی گئیں لیکن سب بے سود تھا۔ پہلی بچی کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کے

دماغ کی شریان پھٹ گئی تھی۔ اور دوسری بچی کی پیدائش کے تین منٹ بعد وہ مر چکی تھی۔

"آپ کے دو خوبصورت بچیاں ہوئی ہیں۔" ڈاکٹر نے اس کے شانے پر محبت سے تھپکی دے کر کہا۔

ٹونی نے ڈاکٹر کی آنکھوں کی تحریر پڑھ لی تھی۔ وہ چند لمحے خاموش رہا۔ پھر ایک گہرا سانس لے کے بولا۔ "وہ کیسی ہے؟"

ڈاکٹر نے بھی ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "مجھے افسوس ہے۔ ہم اسے نہیں بچا سکے۔"

"کیا!" وہ پوری قوت سے چیخ پڑا۔ اگلے لمحے اس نے ڈاکٹر کا کالر پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔ "تم جھوٹ بول رہے ہو ڈاکٹر۔ جھوٹ مت بولو۔ وہ نہیں مری، وہ مر نہیں سکتی۔"

"مسٹر ٹونی۔" ڈاکٹر نے اسے تسلی دینی چاہی۔ "ہم نے آپ کی بیوی کو بچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

"وہ کہاں ہے؟ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔

"ابھی نہیں جناب۔ انہیں تیار کیا جا رہا ہے۔" ڈاکٹر نے سر جھکا کے کہا۔

اور ٹونی چیخ اٹھا۔ "تم نے اسے مارا ہے ڈاکٹر۔ الو کے پٹھے۔ کتے کے بچے۔ تم نے اسے مار ڈالا ہے۔" اور پھر اس نے ڈاکٹر پر حملہ کر دیا۔ شور سن کر لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ انہوں نے ٹونی کو پکڑ لیا۔ وہ وحشی ارنا بھینسے کی طرح بپھرا ہوا تھا۔ پانچ چھ تندرست مرد اسے۔۔۔ قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"ٹونی ہوش میں آؤ۔" ڈاکٹر نے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ "اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ انسان صرف کوشش کر سکتا ہے زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

ٹونی اب بھی لوگوں کی گرفت میں پاگلوں کی طرح مچل رہا تھا۔ "چھوڑ دو مجھے ذلیلو! میں اپنی بیوی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اسی وقت ڈاکٹر ہارلے بھی وہاں پہنچ گیا اور نرمی سے بولا۔ "ٹونی کو چھوڑ دو۔ چھوڑ دو اسے اور آپ سب لوگ از راہِ کرم یہاں سے چلے جائیں۔" اس نے تمام لوگوں کو وہاں سے بھگا دیا۔

ڈاکٹر اور دوسرے لوگ وہاں سے چلے گئے۔ ٹونی بری طرح رو رہا تھا، سسک رہا تھا۔ "ان لوگوں نے اسے مار ڈالا۔ اسے قتل کر دیا ہے ڈاکٹر۔"

"مجھے اس کی موت کا بہت افسوس ہے ٹونی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہی کچھ ہو گا۔ اسے کسی نے قتل نہیں کیا۔ میں نے اسے مہینوں پہلے بتایا تھا کہ اگر اس نے زچگی پر اصرار کیا تو وہ اس میں مر سکتی ہے۔"

"کک۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو ڈاکٹر؟" ٹونی اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولا

"کیا مریم نے تمہیں کچھ نہیں بتایا، تمہاری والدہ نے کچھ نہیں بتایا تھا تمہیں؟" ڈاکٹر ہارلے نے حیرت سے کہا۔

ٹونی پھیلی پھیلی آنکھوں سے ڈاکٹر کو دیکھتا رہا پھر کھوکھلی آواز میں پوچھا۔ "میری ماں نے؟"

"ان کا خیال تھا کہ میں یونہی بات کا بتنگڑ بنا رہا ہوں۔ انہوں نے ہی مریم کو بچہ ضائع کرانے سے روکا تھا۔ مجھے افسوس ہے ٹونی۔ میں نے تمہاری جڑواں بچیوں کو دیکھا ہے۔ وہ بہت خوبصورت ہیں۔ انہیں دیکھو گے نہیں؟"

مگر ٹونی چپ چاپ وہاں سے جا چکا تھا۔

ٹونی علی الصبح کیٹ کے گھر پہنچ گیا۔ بٹلر نے دروازہ کھولا اور مودب ہو کر سلام کیا۔ ٹونی نے اس کے سلام کا جواب دیا اور وسیع و عریض ہال میں داخل ہو گیا۔ بٹلر نے اس کے چہرے پر چھائی ہوئی دہشت، مایوسی اور غم کی کیفیتوں کا امتزاج دیکھا۔ مگر اسے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑی۔ ٹونی نے اسے کافی بنانے کی ہدایت کی اور وہ سر کو قدرے خم کر کے باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا ٹونی اسے جاتے دیکھتا رہا۔ اس کے دماغ میں چنگاریاں سی اڑ رہی تھیں۔ اس کی وحشت لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ اس پر جنون سوار تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کی دیوانگی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ہپناٹزم کے کسی معمول کی طرح تنویمی کیفیت میں اس الماری کی طرف بڑھ گیا جس میں مختلف قسم کے پستول، ریوالور اور بندوقیں رکھی تھیں۔ وہ سحر زدہ سا اس اسلحہ خانے کو دیکھتا رہا۔ اس کے اندر سے ایک آواز ابھری۔ "چلو ٹونی اپنا کام کر گزرو۔"

ٹونی نے اس آواز پر لبیک کہا اور ایک پستول اٹھا لیا۔ اسے چیک کیا۔ چیمبر میں گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ "وہ اوپر ہو گی ٹونی" اس کے اندر سے پھر وہی آواز ابھری۔ ٹونی مڑا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا

ٹونی کو یقین تھا کہ اس کی ماں اپنی ذات میں خراب نہیں ہے۔ اپنی ذات سے ظالم اور سفاک نہیں ہے۔ اس پر کسی بدروح کا سایہ ہے اور وہ اپنی ماں کو اس سے بچانا چاہتا تھا۔ کیٹی ایک بدروح بن کر اس کی ماں سے چمٹ گئی تھی اور اس نے اُس کی ماں کی تمام اچھائیوں کو چوس لیا تھا اور پھر اس کی ماں اور کیٹی ایک ہو گئے تھے۔ اس کی اپنی اچھی شخصیت ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اپنی ماں کو مار دے گا تو کیٹی بھی خود بخود ختم ہو جائے گی۔ وہ اس منحوس کیٹی کو نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا' جس نے اس کی پیاری اور بے پناہ محبت کرنے والی بیوی کو چھین لیا تھا۔ وہ آسیب کیٹ کی موت سے ہی دور ہو سکتا تھا اور کوئی صورت نہیں تھی۔

ٹونی، اپنی ماں کی خواب گاہ کے دروازے پر پہنچ گیا تھا۔ پراسرار آواز نے دروازہ کھولنے کا حکم دیا اور ٹونی نے تعمیل کی۔ وہ دبے قدموں کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی ماں آئینے کے سامنے بیٹھی تیار ہو رہی تھی۔ بیٹے کے ہاتھ میں پستول اور چہرے پر پھیلی وحشت دیکھ کے اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ دہشت زدہ ہو گئی۔ لگتا تھا ٹونی نے دوسرا جنم لیا تھا۔ ان کی نظریں پستول پر مرکوز تھیں جو ٹونی نے اس پر تان رکھا تھا۔ کیٹ نے اُسے روکنے، چیخنے چلانے کی کوشش کی لیکن آواز اس کے حلق میں پھنس کے رہ گئی۔

ٹونی نے احتیاط سے نشانہ لیا اور پھر ٹریگر دباتا چلا گیا۔

عجیب و غریب حالات تھے۔ فلموں والا قصہ لگتا تھا۔ ڈاکٹر ہلن نے مریم کا کیس کیا تھا۔ آغاز ہی میں اس نے محسوس کر لیا تھا کہ دو بچے پیدا ہوں گے۔ وہ یہ بات جانتی تھی کہ پہلا بچہ وارث ہوتا ہے۔ دونوں بچیاں ایک ساتھ پیدا ہوئی تھیں۔ اس لیے اس نے اس بات کو بطور خاص نوٹ کیا تھا کہ ان میں سے کون سی بچی پہلے پیدا ہوئی تھی۔ یہ خدا کی قدرت تھی کہ دونوں بچیوں میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں تھا۔ اسپتال میں جس شخص نے بھی دیکھا یہی کہا کہ ان سے خوبصورت بچیاں اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ وہ صحت مند تھیں۔ اسپتال کی نرسیں ان کا بے حد خیال رکھتیں۔ کچھ اس وجہ سے بھی کہ ان بچیوں کی پیدائش کے ساتھ ہی کئی پراسرار واقعات ہوئے تھے۔ ان کی ماں زچگی کے دوران مر گئی تھی۔ باپ غائب ہو گیا تھا۔ اس کے بارے میں افواہ اڑی ہوئی تھی کہ اس نے اپنی ماں کیٹ کو قتل کر دیا ہے۔ مگر یہ سب صرف افواہیں تھیں۔ ان کی تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اخبارات میں اس کے سوا کوئی خبر نہیں چھپی تھی کہ بیوی کی موت کے صدمے میں ٹونی کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے۔ وہ اپنے آپ میں نہیں رہا۔ صحافیوں نے اس سلسلے میں ڈاکٹر ہارلے سے کئی سوالات کیے تھے اور انہوں نے گول مول جواب دے کر ٹال دیا تھا۔ دو تین ڈھیٹ اخبار نویسوں کو تو انہوں نے بری طرح لتاڑ دیا تھا۔

گزشتہ چند دن ڈاکٹر ہارلے کی زندگی کے سب سے مشکل دن تھے۔ اس کا جینا دوبھر ہو گیا تھا۔ ٹیلیفون ملتے ہی وہ کیٹ کے گھر پہنچا تھا۔ اس کی خواب گاہ میں جو منظر اس نے دیکھا تھا۔ وہ زندگی بھر نہیں بھول سکتا تھا۔ کیٹ زخمی حالت میں خون میں لت پت، فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔ گردن اور سینے میں گولیوں کے زخم تھے۔ اس کے جسم سے خون بہہ بہہ کر سفید قالین میں جذب ہو رہا تھا۔ ٹونی پر جیسے پاگل پن کا دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ الماریوں سے اپنی ماں کے کپڑے نکال نکال کر انہیں پھاڑ رہا تھا۔ قینچی سے کاٹ رہا تھا۔ وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ ڈاکٹر ہارلے نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ ٹونی کا ذہنی توازن خراب ہو چکا ہے' اس نے فوراً ہی ایمبولنس کے لیے فون کیا اور کیٹ کے پاس بیٹھ کر اس کی نبض دیکھی۔ نبض بہت کمزور اور بے ترتیب سی تھی۔ کیٹ کا چہرہ نیلا پڑنے لگا تھا۔ اس نے ... جلدی سے اُسے دو انجیکشن لگا دیئے۔

"آخر ہوا کیا؟" ڈاکٹر ہارلے نے بٹلر سے پوچھا۔

بٹلر کے پسینے چھوٹے ہوئے تھے۔ خوف سے اس کی بری حالت ہو رہی تھی۔ وہ سر تا پا کپکپاتے ہوئے بولا "مجھے کچھ نہیں معلوم جناب، مسٹر ٹونی نے مجھ سے کافی تیار کرنے کے لیے کہا تھا۔ میں کچن میں تھا کہ میں نے فائرنگ کی آوازیں سنیں۔ میں دوڑتا ہوا یہاں پہنچا تو مادام کو اسی طرح فرش پر پڑے دیکھا۔ مسٹر ٹونی اُن کے قریب کھڑے جنونی کیفیت میں کہہ رہے تھے "ممی اب یہ بدروح آپ کو زیادہ نہیں ستا سکتی، میں نے اُسے مار دیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ الماریوں کی طرف گئے اور انہوں نے مادام کے کپڑے پھاڑنے شروع کر دیے۔"

ڈاکٹر ہارلے نے پلٹ کر ٹونی سے پوچھا "تم کیا کر رہے ہو ٹونی؟"

ٹونی نے ایک لباس پھاڑتے ہو کہا "میں ممی کی مدد کر رہا ہوں۔ میں کیٹی کو تباہ کر رہا ہوں۔ اس کیٹی نے ہی مریم کو قتل کیا ہے۔" وہ کیٹ کے کپڑے پھاڑتا رہا۔ قینچی سے ان کے ٹکڑے کرتا رہا۔

کیٹ کو فوری طور پر ایک پرائیویٹ اسپتال لے جایا گیا۔ جو اس کی کمپنی کی ملکیت تھا۔ گولیاں نکالنے کے لیے آپریشن ہوا آپریشن کے دوران چار مرتبہ اس کے خون چڑھایا گیا۔ اگر آدھے گھنٹے کی تاخیر ہو جاتی تو اس کی۔ ۔ ۔ ۔ زندگی بچائی نہیں جا سکتی تھی۔

لوٹی پاگل ہو گیا تھا۔ چار افراد نے بمشکل اُسے قابو میں کر کے ایمبولینس میں بٹھایا۔ اس کے بعد ہی ڈاکٹر ہارلے نے اُسے پُر سکون کرنے کے لیے انجیکشن لگایا۔ ایمبولینس کے ساتھ ہی پولیس بھی کیٹ کے گھر آگئی تھی جن سے نمٹنے کے لیے ڈاکٹر نے واجر کو طلب کر لیا تھا۔

یہ سب کچھ ہو گیا تھا لیکن اخبارات میں فائرنگ کا کہیں ذکر نہیں تھا۔

ڈاکٹر ہارلے، کیٹ کو دیکھنے کے لیے انتہائی نگہداشت کے شعبے میں گیا۔ کیٹ نے ڈاکٹر کو دیکھتے ہی سرگوشی میں پوچھا "میرا بیٹا کہاں ہے؟"

"وہ ٹھیک ہے کیٹ، ہماری نگرانی میں ہے تم اس کی فکر مت کرو۔" ڈاکٹر ہارلے نے نرمی سے جواب دیا۔

لوٹی کو ایک دوسری ریاست میں پرائیویٹ پاگل خانے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

"آخر اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کیوں کی تھی؟" کیٹ نے پوچھا۔

"وہ مریم کی موت کا ذمہ دار تمہیں سمجھتا ہے۔" ڈاکٹر ہارلے نے کہا۔

کیٹ نے تاسف سے سر ہلایا۔ ڈاکٹر ہارلے نے بھی خاموش رہنے میں عافیت جانی اور کیٹ کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے الوداعی رسمی کلمات کہے اور رخصت ہو گیا۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد کیٹ ساکت لیٹی سوچتی رہی۔ اسے یہ یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اس کا بیٹا مریم کی موت کا ذمے دار اسے سمجھتا تھا۔ اس نے تو جو کچھ کیا تھا۔ لوٹی کو خوش کرنے کے لیے کیا تھا۔ اس نے تو تمام خواب صرف اپنے بیٹے کے لیے دیکھے تھے۔ اس دنیا میں اُس کا اور تھا ہی کون۔ لوٹی ہی تو اس کے لیے سب کچھ تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ اس کی ماں نے مریم کو مارا ہے اور اس کے لیے لوٹی نے اُسے قتل کرنا چاہا تھا۔ کیسا عذاب تھا، کیسی مایوسی تھی۔ ایسا درد تھا کہ وہ مر جانا چاہتی تھی۔ اس نے وہی کیا تھا جو اُس کے بیٹے کے لیے صحیح تھا اور اس کے سوا باقی سب کچھ غلط تھا۔ جھوٹ تھا۔ لوٹی ایک کمزور ذہن کا لڑکا تھا۔ سب ہی کمزور تھے سب بڑی ذمے داریوں سے بچنے کے لیے انہیں قبول کرنے سے گریز کرتے تھے۔ سب ہی تو زندگی کی تلخ حقیقتوں سے ڈرتے تھے کیٹ ۔ ۔ ۔ ۔ سوچتی رہی۔ ہاں سب کمزور تھے۔ اس کا باپ جمی بھی کمزور تھا کہ اپنے بیٹے کی موت کا صدمہ نہ سہہ سکا اور مفلوج ہو کر مر گیا۔ اس کی ماں بھی کمزور تھی کہ تنہا زندگی گزارنے سے خوفزدہ تھی۔

"لیکن میں کمزور نہیں ہوں۔ میں اس کا بھی مقابلہ کروں گی۔ میں ہر صدمہ برداشت کر سکتی ہوں میں زندہ رہوں گی۔ میں زندہ رہوں گی، کمپنی زندہ رہے گی۔ میں بزدل نہیں ہوں۔" کیٹ بڑبڑاتی رہی۔

کیٹ اس دلخراش واقعہ کے بعد جزیرے میں واقع اپنے محل نما شاندار مکان گوشۂ عافیت میں منتقل ہو چکی تھیں۔ صدمے نے انھیں نڈھال کر دیا تھا۔ ان کے سینے میں گھاؤ لگ چکے تھے اور انھیں مندمل ہونے میں ایک عرصہ درکار تھا۔ ان کے پیارے بیٹے لوٹی کو ذہنی امراض کے ایک مہنگے شفاخانے میں داخل کر دیا گیا تھا۔ کیٹ نے اس کے علاج کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ انھوں نے دنیا بھر کے نامور ماہرین نفسیات کو بلوا لیا تھا۔ لوٹی کے مرض سے متعلق ان سب کی ایک ہی رائے تھی۔ لوٹی کو بیسیوں ادویات دی گئی تھیں اور کوئی بھی دوا کارگر نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کسی طور بھی لوٹی کے جنون کو قابو نہیں کر پائے تھے۔ اس کی وحشت ذرہ برابر بھی کم نہیں ہوئی تھی۔ اسے ایک خالی کمرے میں باندھ کر رکھا گیا تھا اور یہ بہت ضروری تھا۔ وہ جنونی لوٹی کو آزاد چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے وہ کسی بھی فرد کو جان سے مار سکتا تھا۔

کیٹ نے اپنے پاگل بیٹے کے بارے میں ساری تفصیل سن کر ایک سرد آہ بھری اور آنکھیں موند لیں۔ ان کے سینے پر چھریاں سی چل رہی تھیں۔ لوٹی نے انھیں ہر اعتبار سے مایوس کیا تھا۔ ان کا وجیہہ و شکیل اور خوش مزاج اور خوش لباس بیٹا ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ وہ ان کے لیے اجنبی ہو گیا تھا۔ اس پر کسی بد روح نے قبضہ جما لیا تھا۔ ڈاکٹروں نے متفقہ طور پر لوٹی کے لیے ایک علاج تجویز کیا تھا۔ اس کے دماغ کے ایک چھوٹے سے حصے کو نکال کر اس کے وحشت اور جنون پر قابو پایا جا سکتا تھا مگر اس کا سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ لوٹی ہر قسم کے جذبات سے عاری ہو جاتا۔ محبت، نفرت، خوشی، رنج و غم، اداسی، رشک حسد اور ایسے ہی دیگر الفاظ اس کی زندگی کی لغت سے نکل جاتے۔ وہ جانتی تھیں کہ ہر قسم کے جذبات سے عاری شخص معاشرے میں نہیں رہ سکتا۔ انھیں یقین دلایا گیا کہ اس کے علاوہ لوٹی کا کوئی علاج نہیں ہے تو طوعاً و کرہاً انھوں نے آپریشن کی اجازت دے دی

لوٹی کے کروڑپتی سسر فریڈ اپنی دونوں نواسیوں کو جرمنی لے جانا چاہتے تھے۔ اپنی بیٹی مریم کی موت نے انھیں کھوکھلا اور کمزور بنا دیا تھا۔ وہ اپنی

عمر سے بیس سال بڑے دکھائی دینے لگے تھے۔ کیٹ کو انھیں دل گرفتہ اور ٹوٹا پھوٹا دیکھ کر بہت افسوس ہوا تھا۔ نواسیاں ان کو تقویت پہنچا سکتی تھیں مگر وہ اپنے چمن کے شگفتہ پھولوں کو ان کے حوالے کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ بچیوں کو وہ اپنے سے جدا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ انھوں نے پرسکون آواز میں کہا تھا "مجھے افسوس ہے فریڈ، ایوا اور ماریا تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ میں تمہارے جذبات کو سمجھتی ہوں مگر ان کے اچھے مستقبل کے لیے تمھیں یہ قربانی دینا پڑے گی۔ انھیں قدم قدم پر ایک تجربہ کار اور مہربان عورت کی ضرورت پیش آئے گی۔ تمہاری بیوی زندہ ہوتی تو مجھے ذرا بھی تامل نہ ہوتا۔ تم جب چاہو ان سے ملنے آسکتے ہو۔"

فریڈ نے بچیوں کو لیجانے کے لیے بہت اصرار کیا مگر کیٹ کے مضبوط دلائل نے اسے ہار ماننے پر مجبور کر دیا۔

دونوں جڑواں بہنیں ہسپتال سے گھر آچکی تھیں۔ ان کے لیے ہوا کے رخ پر ایک وسیع و عریض کمرے کو جدید ترین فرنیچر سے آراستہ کیا گیا تھا۔ کیٹ نے بیسیوں عورتوں کے انٹرویو لیے تھے اور چھان پھٹک کر سونیا شین نامی ایک نوجوان اور خوبصورت فرانسیسی خاتون کو گورنس منتخب کیا تھا۔

کیٹ نے پہلے پیدا ہونے والی بچی کا نام ایوا رکھا تھا اور تین منٹ چھوٹی بچی کے لیے ماریا نام پسند کیا تھا۔ وہ دونوں ہمشکل تھیں۔ ان میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں تھا۔ ایک بہن دوسری کو دیکھ کے یہی سمجھتی کہ آئینے میں اپنی شکل دیکھ رہی ہے۔ ان کی حیرت انگیز مماثلت سے سبھی متاثر ہوتے تھے۔

کیٹ نے ان کے لیے بیش قیمت ملبوسات اور کھلونوں کے ڈھیر لگا دیئے تھے۔ بچیاں صحت مند تھیں۔ ان کی قلقاریاں سن کے دادی کے بے قرار دل کو قرار آجاتا تھا۔ چند ہی ہفتوں میں ایوا نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ اپنی بہن ماریا سے کہیں زیادہ ذہین اور فطین ہے۔ ایوا نے پہلے رینگنا، بولنا اور چلنا سیکھا تھا اور ماریا نے چند ہی روز بعد اس کی تقلید کی تھی۔ ایوا ابتدا ہی سے لیڈر بن گئی تھی۔ ماریا اپنی بہن سے بے پناہ محبت کرتی تھی اور اس کی ہر بات کی نقل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ کیٹ کا زیادہ تر وقت پوتیوں کے ساتھ گزرتا تھا۔ بچیوں کے معصوم قہقہے اور دلچسپ حرکتیں ان کی تمام تھکن دور کر دیتی تھیں اور وہ خود کو کم عمر محسوس کرنے لگتی تھیں۔ ان کا رنگین اور حسین سپنا شروع ہو چکا تھا۔

ایک روز، جب وہ عمر رسیدہ اور ریٹائر ہوں گی تو ان میں سے ایک میری جگہ سنبھال لے گی۔

جڑواں بہنوں کی پہلی سالگرہ پر کیٹ نے ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ ایک ہی طرح کے دو کیک بنوائے گئے۔ دوستوں، کمپنی کے چنیدہ ملازموں اور گھر کے نوکروں نے خوبصورت تحائف پیش کیے۔ دوسری سالگرہ بھی گزر گئی اور کیٹ حیران تھیں کہ وقت پر لگائے کتنی تیزی سے اڑا جا رہا تھا۔ دونوں جڑواں اور ہمشکل بہنیں طوفانی رفتار سے پروان چڑھ رہی تھیں۔ ان ان کی شخصیتوں کے تضاد واضح ہو رہے تھے۔ ایوا بہت ذہین بیباک اور مضبوط قوتِ ارادی کی مالک تھی۔ ماریا اس کے برعکس قدرے غبی، شرمیلی اور ڈرپوک تھی۔ اپنے طور پر وہ کوئی قدم اٹھانا جانتی ہی نہیں تھی۔ وہ ہر معاملے میں ایوا کی تقلید کرتی تھی۔ اپنی بہن کے نقشِ قدم پر چلتی تھی۔

یہ خدا کا بڑا کرم ہے، کیٹ نے بارہا سوچا تھا، ماں باپ کی عدم موجودگی میں وہ دونوں ایک دوسرے کا سہارا ہیں۔ ان میں آپس میں کتنی محبت ہے!

لیکن دادی کیٹ کا یہ خیال قطعی غلط تھا۔ کاتبِ تقدیر نے کچھ اور لکھا تھا۔ پانچویں سالگرہ سے ایک روز قبل رات کے دوسرے پہر ایوا نے ماریا کو جان سے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

ایوا بچپن ہی سے اپنی بہن سے نفرت کرتی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی نفرت شدید سے شدید تر ہو رہی تھی۔ جب بھی کوئی ماریا کو گود میں لیتا، اس کو پیار کرتا یا اسے تحفہ دیتا تو ایوا کا خون کھولنے لگتا تھا۔ وہ اپنی شدید توہین محسوس کرتی تھی۔ وہ تمام چیزوں پر قبضہ جمانا چاہتی تھی۔ تمام تر محبت اپنے لیے مخصوص کرنے کی خواہشمند تھی۔ سالگرہ پر جو تحائف ملتے۔ ایوا سب کے سب اپنے تصرف میں لے لیتی۔ ماریا ایک بھی تحفہ اٹھاتی تو وہ چیخ چیخ کے سارا گھر سر پر اٹھا لیتی۔ ماریا اس کی ہمشکل تھی، اسی کے انداز میں کپڑے پہنتی تھی، دادی کی محبت اور شفقت میں شریک ہو جاتی تھی اور یہ سب کچھ ایوا کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ ماریا کو اپنے لیے مصیبت خیال کرتی تھی۔ ماریا اپنی بہن سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ اس کی کسی بھی زیادتی کا برا نہیں مانتی تھی۔ ایوا کو یہ بات بھی سخت ناپسند تھی۔ ماریا بہت سخی تھی۔ اپنے کھلونے بڑی فیاضی سے ایوا کے حوالے کر دیتی اور وہ ماریا کا شکریہ ادا کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ ایوا اپنی بہن کی کسی بھی خوشی میں شریک نہیں ہوتی تھی۔ ماریا کو تکلیف اور پریشانی میں دیکھ کے اسے راحت محسوس ہوتی تھی۔ ایوا اپنی تمام چیزوں کو جان سے لگائے رکھتی تھی۔ وہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی چیز سے بھی محروم ہونا نہیں چاہتی تھی اور یہی نہیں۔ وہ ماریا کی تمام چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے بے تاب رہتی تھی۔

سونے سے قبل گورنس سونیا کی ہدایت پر دونوں بہنیں باآوازِ بلند دعا گو ہوتی تھیں اور آخر میں ایوا دل ہی دل میں ماریا کی موت کی دعا ضرور کرتی تھی۔ ایوا نے دیکھا کہ اس کی یہ دعا قبول نہیں ہو رہی تو اس نے تہیہ کر لیا کہ کسی روز وہ موقع پا کر ماریا کو ٹھکانے لگا دے گی۔ ان کی پانچویں سالگرہ میں چند ہی روز رہ گئے تھے۔ ایوا نے طے کیا کہ اس مرتبہ وہ اکیلی اپنی سالگرہ منائے گی تاکہ تقریب میں شریک ہر فرد کی مبارکباد اور تحفہ صرف

اسی کو مل سکے۔

سالگرہ سے ایک روز قبل ایوا بہلا پھسلا کے اپنی بہن کو کیک دکھانے باورچی خانے میں لے گئی، ماریا کیک دیکھنے کی خواہشمند نہیں تھی لیکن وہ انکار کرکے اپنی بہن کے جذبات مجروح کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ دبے پاؤں باورچی خانے میں پہنچ گئیں۔ دونوں نے شب خوابی کا ریشمی گلابی لباس پہن رکھا تھا۔ سونیا کے کمرے کے بند دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے انھوں نے خاصی احتیاط برتی تھی۔ باورچی خانہ وسیع وعریض تھا۔ آرام وآسائش کی تمام جدید سہولتوں سے مزین اس باورچی خانے میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ پہلی نظر میں تو الیکٹرانک کی ایک بڑی دکان کا گمان ہوتا تھا۔

باورچی خانے میں چھوٹے بڑے چار ریفریجریٹر موجود تھے۔ ایوا نے سب سے بڑا ریفریجریٹر کھولا۔ نچلے خانے میں دو کیک رکھے ہوئے تھے جو باورچن ہیلن نے بڑی محنت سے بنائے تھے۔ ایک کیک پر ایوا کا اور دوسرے پر ماریا کا نام لکھا ہوا تھا۔

”اگلے سال یہاں صرف ایک کیک رکھا ہوگا“ ایوا نے سوچا اور اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اس نے ماریا کا کیک نکالا اور بڑی احتیاط سے ایک چھوٹی میز پر رکھ دیا پھر اس نے الماری سے رنگ برنگی شمعوں کا پیکٹ نکال لیا۔ ماریا نے سہمی ہوئی آواز میں ایوا کو شمعیں کیک پر لگانے سے منع کیا۔ ایوا نے اپنی بہن کی بات سنی ان سنی کردی اور شمعوں کو کیک پر لگا کے بڑی الماری کی نچلی دراز سے ماچس کے دو بڑے پیکٹ نکال لیے۔ ماریا نے باورچن کی ناراضی کا خدشہ ظاہر کیا اور ایوا نے لاپرواہی کے انداز میں شانے اچکا دیئے۔ اس نے ماچس کا ایک پیکٹ ماریا کو تھمایا اور بولی ”چلو، موم بتیاں جلانے میں میری مدد کرو، یقین جانو، بہت مزا آئے گا۔“

ماریا ماچس کا پیکٹ لیے سرتا پا کپکپا رہی تھی۔ اس کا ننھا سا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسے آگ سے بہت ڈر لگتا تھا۔ دونوں بہنوں کو بار بار ماچسوں سے کھیلنے سے خبردار کیا جاتا رہا تھا۔ بار ہا انھیں اس کے خوفناک نتائج سے آگاہ کیا گیا تھا لیکن ماریا اپنی بہن کو مایوس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے موم بتیاں جلانی شروع کردیں۔

ایوا چند لمحے اسے دیکھتی رہی، پھر بولی ”تم دوسری طرف کی موم بتیاں چھوڑ رہی ہو بے وقوف“

ماریا دوسری طرف کی موم بتیوں تک پہنچنے کے لیے کیک پر جھک گئی۔ اس کی پشت ایوا کی طرف تھی۔ اس نے پھرتی سے ایک تیلی جلائی اور ادھ کھلے ڈبے میں ڈال دی جو ماریا تھامے کھڑی تھی۔ تیلیاں تیزی سے جلنے لگیں۔ ایوا نے جھپٹا مارا اور جلتا ہوا ڈبا ماریا کے ریشمی لباس میں الجھ گیا۔ ایک لمحے میں لباس نے آگ پکڑلی ماریا بری طرح بوکھلا گئی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس کی ٹانگیں جھلسنے لگیں تو وہ حلق پھاڑ کر چیخنے لگی ”مدد! مدد! میں جل رہی ہوں!“

ایوا چند لمحے تو اپنی کامیابی پر شاداں وفرحاں کھڑی رہی، پھر چلا کر بولی ”ساکت کھڑی رہو، میں پانی کی بالٹی لا رہی ہوں۔“

اسی لمحے باورچن ہیلن اپنے پولیس افسر دوست کے ساتھ دوڑتی ہوئی باورچی خانے میں داخل ہوئی اور یوں ماریا کی جان بچ گئی۔ اگر وہ دس منٹ دیر سے پہنچتی تو ماریا کو شعلے نگل جاتے۔ ہیلن اپنے دوست پولیس سارجنٹ کے ساتھ فلم دیکھنے گئی تھی۔ یہ ماریا کی خوش بختی تھی کہ مار دھاڑ سے بھرپور فلم میں ہیلن کا دل نہیں لگا تھا اور اس نے سارجنٹ کو واپس گھر چلنے پر مجبور کردیا تھا۔ سارجنٹ نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا تھا۔ عقاب کی سی تیزی سے جھپٹ کر اس نے ماریا کے جلتے ہوئے لباس کو پھاڑ کے اس کے جسم سے علیحدہ کردیا تھا۔ ماریا بے ہوش ہوکر فرش پر گر پڑی تھی۔ ہیلن نے ایک بڑے برتن میں پانی لے کر ماریا کا جلتا ہوا لباس ٹھنڈا کردیا جو تقریباً راکھ میں تبدیل ہوچکا تھا۔

سارجنٹ نے ایمبولینس منگوانے اور بچی کی دادی کو جگانے کی ہدایت کی اور اسی لمحے ایوا ایک چھوٹے برتن میں پانی لیے سسکیاں لیتی ہوئی باورچی خانے میں داخل ہوئی۔ وہ چلا کر بولی ”کیا ماریا مرچکی ہے؟ کیا وہ مرچکی ہے؟“

ہیلن نے اس کا بازو تھام لیا اور پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی ”نہیں میری جان۔ تمہاری بہن بالکل ٹھیک ہے۔ وہ بہت جلد صحت یاب ہوجائے گی۔“

”غلطی میری ہے“ ایوا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”وہ اپنے سالگرہ کے کیک پر موم بتیاں جلانا چاہتی تھی۔ مجھے اس بے وقوف کو روکنا چاہیئے تھا“

ہیلن بچی کی پشت پر ہاتھ پھیرتی رہی، اسے تسلی دیتی رہی۔

ماریا کو بہترین طبی امداد دی گئی۔ ڈاکٹر ہارے نے جلدی امراض کے دو ماہر ڈاکٹروں کو طلب کرلیا تھا۔ کیٹ نے بچی کے زخموں کا جائزہ لیا تھا اور تھرا گئی تھیں انھیں پھول سی معصوم بچی کو اذیت اور تکلیف میں دیکھ کر بہت افسوس ہوا تھا۔ انھیں ایوا کی طرف سے بھی تشویش لاحق ہوگئی تھی۔ وہ خود کو اس ناگہانی حادثے کا ذمے دار سمجھ رہی تھی۔ اسے بھیانک خواب دکھائی دے رہے تھے۔ دو تین مرتبہ وہ چیخ مار کے اٹھ بیٹھی

تھی گذشتہ تین راتوں سے وہ ان کے پاس سو رہی تھی۔ ڈاکٹر ہارلے کو یہ بات بتائی گئی تو انھوں نے کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ ایوا بہت جلد نارمل ہو جائے گی۔

ماریا کی حالت کے پیش نظر سالگرہ کی تقریب منسوخ کر دی گئی۔ یہ بات ایوا کو سخت ناگوار گزری اور دل ہی دل میں اپنی بہن کو صلواتیں سنا دیں۔ ماریا کے زخم ایک ہفتے میں مندمل ہو گئے۔ اب اس کے جسم پر ہلکے نشانات رہ گئے تھے۔ ڈاکٹر ہارلے نے بتایا تھا کہ بہت جلد یہ نشانات بھی مٹ جائیں گے۔ ایوا بھی نارمل ہو چکی تھی۔ اب وہ باورچن سے بھی نفرت کرنے لگی تھی، جس نے اس کی بہن کی جان بچا لی تھی اور اس کا بہترین منصوبہ خاک میں ملا دیا تھا۔

اُدھر ٹونی کو ایک دور افتادہ علاقے میں واقع انتہائی مہنگے پاگل خانے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ کیٹ مہینے میں ایک بار بذریعہ کار اپنے بیٹے سے ملنے جاتی تھیں۔ آپریشن کامیاب رہا تھا۔ اس کا تمام تر جنون اور وحشت جاتی رہی تھی، وہ اپنی ماں کو پہچانتا تھا۔ اپنی بچیوں کے بارے میں رسمی سوالات کرتا تھا لیکن اس میں انھیں دیکھنے، ان سے ملنے اور انھیں پیار کرنے کا جذبہ نہیں ابھرتا تھا۔ اس کے تمام جذبات مر چکے تھے۔ وہ کسی چیز میں دلچسپی ظاہر نہیں کرتا تھا۔ وہ گھنٹوں الٹی سیدھی تصویریں بناتا رہتا تھا۔ اس نے اپنی ایک دنیا بنا لی تھی اور اس میں مگن رہتا تھا۔ کیٹ اپنے ذہین بیٹے کی تباہی و بربادی پر خون کے آنسو روتی تھیں۔ اس کے الجھے ہوئے دماغ کی عکاسی اس کی تصویروں سے ہوتی تھی جو کسی کے پلّے نہیں پڑتی تھیں۔

اگلے دو برسوں میں کیٹ نے ماریا کی تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ وہ مسلسل ان کی نظروں میں رہتی تھی۔ وہ حد سے زیادہ لاپروا تھی۔ کوئی بھی حادثہ جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا۔ مشرقِ بعید کے ایک حسین جزیرے میں ان کی وسیع و عریض جاگیر تھی۔ کیٹ نے دونوں بچیوں کے ساتھ موسم گرما کی تعطیلات اس جزیرے پر گزاری تھیں اور ماریا وہاں ڈوبتے ڈوبتے بچی تھی۔ وہ ایوا کے ساتھ غسل کے تالاب کے کنارے کھیل رہی تھی کہ پانی میں جا پڑی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ مالی وہاں آ نکلا اور ماریا کی جان بچالی۔ اس سے اگلے برس ایک پہاڑی مقام پر پکنک منانے گئے تو ماریا ایک گہرے کھڈ میں گرتے گرتے بچی تھی۔ اس کا پیر پھسلا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ کھڈ میں جا گرتی، ایک جھاڑی کی موٹی شاخ اس کے ہاتھ آ گئی اور وہ بمشکل تمام اوپر پہنچ گئی۔ کیٹ نے ایوا کو اپنی بہن پر کڑی نگاہ رکھنے کی تاکید کی تھی اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ماریا کا ہر ممکن خیال رکھے گی۔

کیٹ کو اپنی پوتیوں سے بے پناہ محبت تھی لیکن وہ اس کا زیادہ اظہار نہیں کرتی تھیں۔ ان کی عمر اب سات برس ہو چکی تھی۔ وہ روز بروز نکھرتی جا رہی تھیں۔ ان کے لانبے بھورے بال ریشم کی طرح ملائم تھے۔ آنکھیں نیلی اور چمکدار تھیں، چہرے کے نقوش دلکش تھے۔ وہ ہنستی تھیں تو گالوں پر گڑھے پڑ جاتے تھے جو بھلے معلوم ہوتے تھے۔ ان کی جسامت اور حلیے میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں تھا۔ لگتا تھا ایک ہی نیگیٹیو سے دو پازیٹیو نکالے گئے ہیں لیکن ان کی شخصیتوں میں بڑا تضاد تھا۔ ان کی طبعیتیں ایک دوسرے سے قطعی میل نہیں کھاتی تھیں۔ مزاج کے اعتبار سے وہ ایک دوسرے کی ضد تھیں۔ ایک مشرق تھی اور دوسری مغرب ایک چاندنی کی ٹھنڈک تھی اور دوسری سورج کی دھکتی آگ۔

ایک باوردی ڈرائیور دونوں بہنوں کو دنیا کی سب سے مہنگی کار میں ملک کے سب سے مہنگے اسکول چھوڑنے جاتا تھا۔ کیٹ بچیوں کی فیسوں کے علاوہ دس ہزار ڈالر کی ماہانہ خصوصی گرانٹ اسکول کو دیتی تھیں۔ ماریا کو اتنی بڑی اور شاندار کار میں اسکول پہنچ کر شرمندگی محسوس ہوتی تھی، اس کی ہم جماعت لڑکیاں رشک و حسد سے انھیں دیکھتی تھیں۔ ماریا کا سر ندامت سے جھک جاتا تھا اور ایوا کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا تھا۔ کیٹ دونوں پوتیوں کو ہفتہ وار خرچ دیتی تھیں اور ہر ہفتے اس کا حساب دیکھتی تھیں۔ ایوا تین چار روز میں سارے پیسے ٹھکانے لگا دیتی تھی۔ اور ماریا سے اُدھار لینا شروع کر دیتی تھی اور بہت کم لوٹانے کی زحمت کرتی تھی۔ وہ حساب کتاب میں اتنی صفائی سے ہیر پھیر کرتی تھی کہ اس کے تئیں دادی کو شبہ بھی نہیں ہوتا تھا لیکن وہ فوراً سمجھ جاتی تھیں اور منہ پھیر کے مسکرانے لگتی تھیں۔ سات سال کی عمر میں اس کی یہ صلاحیت بلاشبہ حیرت انگیز تھی۔

ابتدا میں کیٹ کے ذہن کے ایک گوشے میں یہ دل خوش کُن خیال موجود تھا کہ ٹونی ایک روز مکمل صحت یاب ہو کر پاگل خانے سے گھر واپس آ جائے گا اور کمپنی کو سنبھالے گا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خیال معدوم ہوتا چلا گیا اور اب انھیں یقین ہو چکا تھا کہ ٹونی اپنی چھوٹی سی دنیا سے کبھی باہر نہیں آ سکے گا۔

۱۹۶۲ء کا آغاز ہو چکا تھا۔ کروگر برینٹ کمپنی تیزی سے پھل پھول رہی تھی۔ کاروبار طوفانی رفتار سے پھیل رہا تھا۔ ایک نئے سربراہ کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ کیٹ نے اپنی سترویں سالگرہ دھوم دھام سے منائی تھی۔ ان کے تمام بال سفید ہو چکے تھے۔ اس عمر میں بھی وہ تندرست اور چست و چالاک تھیں۔ صبح سے شام تک وہ کمپنی کے اہم ترین اور فوری نوعیت کے معاملات نمٹاتی تھیں۔ انھیں بخوبی احساس

تھا کہ وقت تیزی سے ان کے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے اور وہ دن دور نہیں جب ان کے قویٰ مضمحل اور اعصاب جواب دینے لگیں گے۔ ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو جائے گی اور وہ صحیح اور دور رس فیصلے کرنے کے قابل نہیں رہیں گی۔ انھیں اس پُر آشوب دور سے نمٹنے کی تیاری ابھی سے کرنی تھی۔ کمپنی کی قیادت خاندان کا کوئی فرد ہی کر سکتا تھا۔ اس عظیم ادارے کی باگ ڈور کسی غیر کے ہاتھوں میں نہیں دی جا سکتی تھی۔ راجر بلاشبہ انتہائی ذہین، قابل اور ذمے دار منیجر تھا۔ وہ ادارے کا اہم ترین ستون تھا لیکن وہ ان کے خاندان سے نہیں تھا۔ وہ لاکھ قابل اعتماد سہی، ادارے کا سربراہ بننے کا اہل نہیں تھا۔ اس عظیم الشان سلطنت کا وارث ان کے خاندان کا کوئی فرد ہی ہو سکتا تھا۔ وہ یہ بھاری ذمے داری اپنی جڑواں پوتیوں کے کاندھوں پر ڈالنا چاہتی تھیں۔ وہ اس دن کا بے تابی سے انتظار کر رہی تھیں جب دونوں بہنیں اس منصب کی اہل ثابت ہو جائیں گی اور وہ بلا خوف و خطر ریٹائر ہو سکیں گی۔

دونوں بہنیں بارہ سال کی ہو چکی تھیں۔ وہ تیزی سے جوانی کے پُرخطر اور سنگین دور میں داخل ہو رہی تھیں۔ اگلے چند برس کڑی آزمائش کے تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت پوتیوں کے قریب رہتی تھیں۔ وہ شکرے کی مانند ان پر نظریں جمائے رہتی تھیں۔ یہی وہ وقت تھا کہ انھیں اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ کرنا تھا۔

ایسٹر کے تہوار کی آمد آمد تھی۔ کیٹ دونوں بہنوں کے ہمراہ کمپنی کے خصوصی طیارے میں ڈاک ہاربر جزیرے پر پہنچ گئیں۔ ایوا اور ماریا طیارے سے اترتے ہی دیوانہ وار رقص کرنے لگی تھیں۔ وہ جنوبی افریقہ کے دارالحکومت میں واقع وسیع و عریض جاگیر کے سوا تمام خاندانی جاگیروں کا دورہ کر چکی تھیں اور وہ اتنی تھیں کہ دونوں بہنیں زبانی یاد بھی نہیں کر سکی تھیں "گوشۂ عافیت" ان کی پسندیدہ جاگیر تھی۔ اس خوبصورت ترین جزیرے پر انھیں آزادی اور سرمستی کا خوشگوار احساس ہوتا تھا۔ یہاں رہنے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ کشتی رانی، غوطہ خوری، مرغابیوں اور مچھلیوں کا شکار، یہ ان کے محبوب مشاغل تھے۔ ایوا نے حسبِ سابق اسکول کی چند ساتھیوں کو ساتھ لانے کی اجازت دادی جان سے طلب کی تھی۔ انھوں نے چند لمحے کچھ سوچ کر اپنی لاڈلی پوتی کی یہ تجویز رد کر دی تھی۔ ایوا ان کے منہ سے انکار سن کر خاموش ہو گئی تھی۔ اصرار سے کچھ حاصل بھی تو نہیں تھا۔ دادی جان کے فیصلے ٹھوس اور اٹل ہوتے تھے۔ ان کا حکم پتھر کی لکیر ہوتا تھا۔ لڑکیاں سمجھ چکی تھیں کہ وہ اس مرتبہ زیادہ تر وقت ان کے سروں پر سوار رہیں گی اور انھیں وہ آزادی میسر نہیں آئے گی جو ماضی میں حاصل رہی تھی۔ ان کی چھٹی حس نے بتا دیا تھا کہ اب کے معاملہ مختلف رہے گا۔ وہ ہر کھانے پر ان کے ساتھ ہوتی تھیں۔ اس سے پہلے تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ کشتی رانی، تیراکی، حتیٰ کہ گھڑ سواری کیلئے بھی دونوں کو ساتھ لیجا رہی تھیں۔ وہ گھوڑے کو انتہائی مشاق اور تجربہ کار گھڑ سوار کی طرح دوڑاتی تھیں۔

دونوں بہنیں اب بھی حیرت انگیز طور پر ایک دوسرے سے مشابہ تھیں۔ یہ مشابہت اجنبیوں کے لیے ناقابل یقین ہوتی تھی۔ وہ انھیں اکٹھا آنکھیں پھاڑ کے دیکھتے رہتے تھے۔ ان پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ کیٹ کو ان کی شکل و صورت کی مماثلت سے کہیں زیادہ ان کی شخصیتوں کے تضاد سے دلچسپی تھی۔ وہ کئی ماہ سے ان کی حرکات و سکنات کا بالغور مشاہدہ کر رہی تھیں اپنے ذہن کی کسوٹی پر انھیں پرکھ رہی تھیں۔ ایوا رہنما تھی۔ اور ماریا اس کی رہنمائی کی طالب رہتی تھی۔ ایوا اپنی ضد پر اڑی رہتی تھی اور ماریا کو ہار ماننے یا اپنی رائے تبدیل کرنے میں دیر نہیں لگتی تھی۔ اس کے مزاج میں ربڑ ایسی لچک تھی۔ ایوا تمام کھیلوں میں ماہر تھی اور ماریا کوئی بھی کھیل ڈھنگ سے نہیں کھیل پاتی تھی۔ اسے اب بھی حادثے پیش آتے رہتے تھے۔ جزیرے پر ان کی آمد کے تیسرے ہی روز اسے ایک حادثہ پیش آ گیا تھا۔ سہ پہر کو دونوں بہنیں چپکے سے کشتی رانی کے لیے نکل گئی تھیں۔ بادبانی کشتی صاف و شفاف سمندر کے سینے پر رواں دواں تھی۔ بادبان کی رسی ایوا کے ہاتھوں میں تھی کشتی کو وہی چلا رہی تھی۔ ماریا آج تک کشتی چلانا تو در کنار تیرنا بھی نہیں سیکھ سکی تھی۔ تیز و تند ہوا بادبان کے عقب میں آ گئی۔ دباؤ سے بھاری بادبان بری طرح پھڑپھڑائے، ماریا بروقت خود کو ہٹا نہیں سکی اور توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں سمندر میں جا گری اور ہاتھ پیر مارنے لگی۔ قریب سے گزرتی ہوئی ایک کشتی کے مالک کی مدد سے ایوا نے بڑی مشکل سے اپنی بہن کی جان بچائی تھی۔ ماریا کی شخصیت کی کمزوری کی وجہ یہ تو نہیں تھی کہ وہ ایوا کے جنم لینے کے تین منٹ بعد پیدا ہوئی تھی؟ لیکن اس سے فرق بھی کیا پڑتا تھا؟ وجوہ کچھ بھی ہوں۔ اس کی شخصیت ایوا کی نسبت بہت زیادہ دبی ہوئی تھی۔ کیٹ نے فیصلہ کر لیا تھا اور اب وہ مطمئن ہو چکی تھیں۔ ان کا یہ فیصلہ قطعی غیر جذباتی تھا۔ انھوں نے مسئلے کے ہر پہلو پر غور کیا تھا اور اب ان کے ذہن میں کوئی الجھن نہیں تھی۔ بات ایک دو کروڑ کی نہیں تھی۔ اربوں، کھربوں کا معاملہ تھا۔ ایوا میں لاتعداد خوبیاں تھیں اور وہ ادارے کو چلا سکتی تھی۔ اس کے برعکس ماریا میں بے شمار خامیاں تھیں۔ اس کی حماقتوں سے کمپنی کا سارا نظام درہم برہم ہو سکتا تھا اور پھر اس کی اپنی بھلائی اسی میں تھی کہ ایوا کو ادارے کی سربراہ بنا دیا جائے۔ کیٹ نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ جب بھی ریٹائر ہوں گی۔ ادارے کی سربراہ ایوا اور صرف ایوا ہو گی ماریا کے لیے بھی اتنا کچھ ہو گا کہ وہ تمام عمر عیش و آرام میں گزار دے گی۔ وہ اس کے ساتھ ناانصافی کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ انھوں نے خوب سوچ بچار کے ایک منصوبہ بنایا تھا اور اس کے لیے پہلا مرحلہ ایوا کے لیے بہترین اسکول کا انتخاب تھا۔ دنیا بھر کے اعلا ترین اسکولوں کے کوائف منگوائے گئے اور کیٹ لینا

کے برائٹ اسٹار اسکول کو منتخب کر لیا گیا۔ کیٹ نے پرنسپل سے تفصیلی ملاقات کی، پوتیوں کی تعلیم سے متعلق خصوصی ہدایات دیں اور ماریا کی خصوصی نگرانی کی درخواست کی۔ انھوں نے بچی کو اب تک پیش آنے والے حادثات کی تفصیل بتا دی۔

ایوا اور ماریا کو نیا اسکول بہت پسند آیا تھا خصوصاً ایوا تو بے انتہا خوش تھی۔ وہ گھر سے دور رہنے کی آزادی سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھی، دادی جان اور گورنس سونیا کی روک ٹوک نہیں رہی تھی۔ اسکول کا اپنا ایک نظم و ضبط تھا۔ قواعد و ضوابط تھے اور ان پر سختی سے عمل کرایا جاتا تھا لیکن ایوا کو ان کی پروا نہیں تھی۔ اس نے بڑی ذہانت اور مہارت سے بچاؤ کی راہیں نکال لی تھیں۔ اس کی سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ ماریا اس کے ساتھ تھی۔ ایوا نے دادی جان سے درخواست کی تھی کہ ماریا کو اس کے ساتھ نئے اسکول میں داخل نہ کیا جائے اور اس کی درخواست سختی سے مسترد کر دی گئی تھی۔ ایوا کے دل میں نفرت کی ایک لہر اٹھی تھی مگر اس نے چہرے سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ ان کے سامنے خوش اخلاقی اور محبت کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ دادی جان طاقت کا منبع ہیں۔ وہ انھیں ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا باپ پاگل ہو چکا تھا اور زندگی بھر کے لیے ایک دور افتادہ پاگل خانے میں بند کر دیا گیا تھا۔ ماں انھیں جنم دے کر چل بسی تھی اور اب تمام دولت اور اختیارات دادی جان کے ہاتھ میں تھے۔ ایوا کو اپنے خاندان کی امارت کا بخوبی احساس تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ خاندان کا کل سرمایہ کتنا ہے۔ وہ تو اتنا جانتی تھی کہ دولت کی ریل پیل ہے۔ ایک دریا ہے جو بہہ رہا ہے اور وہ اپنی پسندیدہ لاتعداد چیزیں خرید سکتی ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ ماریا کا تھا جو اس دولت میں برابر کی شریک تھی۔

اسکول میں دونوں بہنوں کا محبوب ترین مشغلہ گھڑ سواری تھی۔ ملک کے ماہر ترین سائیس انھیں گھڑ سواری کی تربیت دیتے تھے۔ ہر لڑکی کا اپنا ایک گھوڑا تھا۔ کیٹ نے دونوں بہنوں کو ان کی بارہویں سالگرہ پر دو تندرست و توانا ریس کے قیمتی گھوڑے تحفتاً دیے تھے۔ وہ اسکول کے سب سے اچھے گھوڑے تھے اور لڑکیاں رشک و حسد سے انھیں دیکھتی تھیں۔ کئی لڑکیوں نے ایوا سے اس کا گھوڑا مانگا تھا اور اس نے سب کو ٹکا سا جواب دیا تھا جبکہ ماریا کے گھوڑے کی سواری اسکول کی تقریباً تمام لڑکیاں کر چکی تھیں۔ ایوا کی مہارت قابل دید تھی۔ گھڑ سواری میں ایک بھی لڑکی اس کے مقابلے کی نہیں تھی۔ بوڑھا اور دراز قد سائیس ایوا کو گھوڑا دوڑاتے اور رکاوٹیں عبور کرتے دیکھ کر پھولا نہیں سماتا تھا۔ اسے اپنی اس ذہین اور چست شاگرد پر فخر تھا۔ وہ اکثر لڑکیوں کو اس کی مثال دیتا تھا۔

ایک سہ پہر کو وہی ہوا جس کا پرنسپل کو ڈر تھا۔ ماریا کا گھوڑا بری طرح بدکا اور سرپٹ دوڑنے لگا تھا۔ پھر وہ تیزی سے اچھلا اور پشت پر چپکی ہوئی ماریا کو زمین پر گرا دیا۔ ماریا گرتے ہی بے ہوش ہو گئی۔ بوڑھا سائیس اپنی تمام تر قوت سے بپھرے ہوئے گھوڑے کی طرف دوڑ رہا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ سُموں سے حسین اور نرم و نازک ماریا کا منہ کچل دیتا۔ سائیس اس تک پہنچ گیا اور بڑی مشکل سے گھوڑے کو قابو کر لیا۔ پرنسپل کو خبر ملی تو وہ دوڑتی ہوئی آ پہنچی۔ ماریا کو صحیح سلامت پا کر اس نے اطمینان کا ایک طویل سانس لیا۔ اتنے میں اسکول کا ڈاکٹر بھی دواؤں کا بیگ لیے پہنچ گیا۔ اس نے اچھی طرح معائنہ کیا اور پرنسپل کو اطمینان دلا دیا کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ جسم کی کوئی بھی ہڈی نہیں ٹوٹی معمولی خراشیں تھیں جن پر اس نے دوا لگا دی تھی۔ ایوا نے بار بار رومال سے آنکھیں پونچھی تھیں اور کئی مرتبہ بھرائی ہوئی آواز میں اپنی بہن کی خیریت معلوم کی تھی۔ ڈاکٹر بہن سے اس کی محبت سے بہت متاثر ہوا تھا۔

سائیس نے بعد میں گھوڑے کی پشت سے زین اتاری تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کھانے کا ایک کٹا ہوا تیز دھار ڈبہ کچل کر زین کے نیچے رکھا ہوا تھا جس سے گھوڑے کی جلد کٹ گئی تھی اور اس پر رکھا ہوا کمبل کا بڑا سا ٹکڑا خون آلود ہو چکا تھا۔ سائیس نے دوسری صبح پرنسپل کو رپورٹ پیش کر دی اور انھوں نے فوراً تحقیقات شروع کر دی۔ ان تمام لڑکیوں سے پوچھ گچھ کی گئی جو کل میدان میں موجود تھیں۔ پرنسپل کا خیال تھا کہ جس نے بھی یہ حرکت کی ہے اس کا مقصد چھوٹا سا عملی مذاق کرنا ہو گا لیکن یہ شرارت ماریا کی جان بھی لے سکتی تھی۔ وہ اس حادثے کی ذمے دار لڑکی کو کڑی سزا دینا چاہتی تھیں انھوں نے اعلان کیا کہ جس لڑکی نے یہ شرارت کی ہے۔ اگر وہ خود کو رضا کارانہ طور پر پیش کر دے تو اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ کوئی بھی لڑکی آگے نہیں بڑھی تو پرنسپل نے تمام لڑکیوں کو ایک ایک کر کے اپنے دفتر میں طلب کیا اور سختی سے پوچھ گچھ کی۔ تمام لڑکیوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ سبھی کے چہروں سے سچائی ظاہر ہو رہی تھی۔ کسی بھی لڑکی کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار نہیں تھے۔ ایوا کی باری آئی تو وہ قدرے فکر مند اور سہمی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

"تمھیں کچھ اندازہ ہے کہ یہ شرارت کس کی ہو سکتی ہے؟" پرنسپل نے پوچھا

ایوا نے نظریں قالین پر مرکوز کر دیں اور دھیمی آواز میں بولی "میں اس بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتی"

"اس کا مطلب ہے تم مجرم کو جانتی ہو، گھبراؤ نہیں، میں اس خبیث لڑکی کا نام جاننا چاہتی ہوں جس نے یہ ذلیل حرکت کی ہے۔ یہ حادثہ تمھاری بہن کے لیے جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا تھا"

"یہ حرکت کسی لڑکی کی نہیں ہے میڈم"
"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"
"اس حادثے کا ذمے دار سائیس ہے میڈم"
"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ایوا!" پرنسپل اپنی نشست سے اچھل پڑی
"میں سچ کہہ رہی ہوں میڈم۔ میں نے سائیس کو اپنی آنکھوں سے تیز دھار کچلے ہوئے ڈبے کو زین کے نیچے گھسیڑتے دیکھا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ کچلے ہوئے ڈبے کی مدد سے زین کو زیادہ مضبوطی سے کسنا چاہتا ہے۔ اُس لمحے میں تصور بھی نہیں کرسکتی تھی کہ وہ میری معصوم بہن کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ دراصل ماریا بوڑھے سائیس پر حکم بہت چلاتی تھی۔ میرا خیال ہے وہ اُسے سبق دینا چاہتا تھا۔ اوہ میڈم! کاش میں آپ کو یہ بات نہ بتاتی۔ میں۔۔۔۔۔۔ میں نہیں چاہتی کہ اس غریب کو نوکری سے نکال دیا جائے" ایوا نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپالیا اور سسکنے لگی۔

پرنسپل اس کے قریب پہنچی اور اس کی پشت پر تھپکی دے کر بولی۔ "کوئی بات نہیں ایوا۔ تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ تم نے اچھا کیا جو مجھے حقیقت سے آگاہ کردیا۔ اب تم اس قصے کو بھول جاؤ۔ میں سب ٹھیک کرلوں گی"

دوسرے روز لڑکیاں میدان میں گھڑسواری کے لیے پہنچیں تو ایک نیا سائیس ان کا منتظر تھا۔

چند ماہ بعد اسکول میں ایک اور ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ دس بارہ لڑکیاں چرس پیتی ہوئی پکڑی گئیں اور ان میں سے ایک لڑکی نے ایوا پر الزام عائد کیا کہ اس نے انھیں چرس کی لت ڈالی ہے اور وہی انھیں چرس سپلائی بھی کرتی ہے۔ وہ انھیں انتہائی مہنگے داموں چرس فروخت کرتی ہے۔ ایوا نے سختی سے اس الزام کی تردید کی۔ تمام لڑکیوں کے سامان کی تلاشی لی گئی اور ماریا کے سوٹ کیس سے چرس برآمد کرلی گئی۔ ایوا نے اپنی بہن کا دفاع کیا۔ اس نے ماریا کو بے قصور قرار دیا۔ اس واقعے کی تفصیلی رپورٹ ان کی دادی کیٹ کو بھیج دی گئی اور انھوں نے بہن کا دفاع کرنے پر ایوا کی بہت تعریف کی۔ اس نے صحیح معنوں میں خود کو جمی خاندان کا ایک فرض شناس اور وفاشعار فرد ثابت کیا تھا۔

جڑواں بہنوں کی پندرھویں سالگرہ کیریبین کی ہزاروں ایکڑ پر پھیلی ہوئی عظیم الشان جاگیر پر منائی گئی۔ وقت آگیا تھا کہ ایوا کو ذہین وجیہہ اور امیر نوجوانوں سے متعارف کیا جائے لہٰذا کیٹ نے ایسے کروڑ پتی اور ارب پتی گھرانوں کو بطور خاص مدعو کیا تھا جن کے اٹھارہ سے پچیس سال تک کے لڑکے تھے۔ زیادہ تر لڑکے ایوا کے ہم عمر یا اس سے ایک آدھ سال بڑے تھے۔ کیٹ کو احساس تھا کہ یہ ایسی عمر ہوتی ہے کہ لڑکے سنجیدگی سے لڑکیوں میں دلچسپی نہیں لیتے۔ وہ لڑکیوں سے گفتگو کرتے ہوئے جھجک اور گھبراہٹ محسوس کرتے ہیں اور اچھے خاصے چغد دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن کیٹ چاہتی تھیں کہ لڑکے ایوا کے قریب ہوجائیں۔ اُس سے دوستی پیدا کریں۔ انہی لڑکوں میں سے کسی خوش نصیب کو ایوا کا شوہر بننا تھا اور کروگر کمپنی کی بھاری ذمے داری اپنے کاندھوں پر لینی تھی۔ ماریا کو تقریبات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ بھڑکیلے کپڑوں میں ملبوس قہقہے لگاتے اور شیخیاں بگھارتے مہمانوں کو سخت ناپسند کرتی تھی مگر دادی جان کی خفگی کے خیال سے وہ بے دلی سے تقریبات میں شریک ہوجاتی تھی۔ ایوا تقریبات کو جنون کی حد تک پسند کرتی تھی اس کے بس میں ہوتا تو وہ روزانہ شام کو گھر میں تقریب منعقد کرتی ان ہی مواقع پر تو وہ خود کو نمایاں کرنے اور اپنی اہمیت ثابت کرنے کی خواہش پوری کرتی تھی جس سے اس کی اَنا کو بے پناہ تسکین ملتی تھی۔ وہ ہمیشہ منفرد اور بیش قیمت کپڑے آرڈر پر تیار کرواتی تھی اور تقریب کے آغاز سے دو گھنٹے قبل سنگھار میز کے سامنے بیٹھ جاتی تھی۔ ماریا اس دوران پڑھتی رہتی یا پھر اپنی کسی اُدھوری پینٹنگ میں رنگ بھرنے لگتی 'گوشۂ عافیت' کے ایک بڑے کمرے میں اس کے والد کی بنائی ہوئی پینٹنگز سجی ہوتی تھیں۔ وہ گھنٹوں ان شہ پاروں کو دیکھتی رہتی تھی۔ وہ اس کے پیدا ہوتے ہی پاگل ہوگئے تھے اور ان کے صحت یاب ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔ وہ کئی بار پاگل خانے کے دو ہٹے کٹے ملازموں کے ساتھ 'گوشۂ عافیت' میں آئے تھے اور ماریا کوشش کے باوجود ان تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ وہ مہذب، شائستہ، سنجیدہ اور بردبار سے اجنبی تھے۔ ماریا نے انھیں ہمیشہ خاموش دیکھا تھا۔ ان کے نانا فریڈ ہزاروں میل دور جرمنی میں سالہا سال سے بیمار پڑے تھے۔ دونوں بہنوں سے ان کی ملاقات شاذونادر ہی ہوتی تھی۔

اسکول میں انھیں دوسرا سال ہی تھا کہ ایوا نے تہلکہ مچا دیا۔ ایوا امید سے تھی۔ پرنسپل نے یہ ہولناک خبر سنی تو ان پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ انھیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ کئی ہفتوں سے اس کا چہرہ زرد ہورہا تھا اور وہ بے چین سی رہنے لگی تھی۔ کئی روز تو وہ اپنی کلاس سے غیرحاضر رہی تھی۔ تین چار مرتبہ وہ چکرا کر گرتے گرتے بچی تو اسے طبی معائنے کے لیے اسکول کی ڈسپنسری میں بھیج دیا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی ڈاکٹر کا بلاوا آگیا۔ پرنسپل بھاگم بھاگ ڈسپنسری پہنچی جہاں ہوش اڑا دینے والی خبر اسکی منتظر تھی چند لمحے تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے

ڈاکٹر کو دیکھتی رہی۔ پھر کپکپاتی آواز میں بولی ”یہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ناممکن ہے! ایوا لوا ابھی بچی ہے ڈاکٹر!“

”میں پورے وثوق سے یہ بات کہہ رہا ہوں میڈم۔ جس لڑکی کو آپ بچی کہہ رہی ہیں، وہ ماں بننے والی ہے“۔

ایوا نے بچے کے باپ کا نام بتانے سے صاف انکار کردیا۔ وہ بیباکی سے بولی ”میں اُس شخص کو مصیبت میں مبتلا کرنا نہیں چاہتی“

پرنسپل کو ایوا سے اسی قسم کے جواب کی توقع تھی۔ وہ دیر تک بہلا پھسلا کر ایوا سے اُس ظالم کا نام پوچھتی رہی۔ بالآخر ایوا سے ضبط نہ ہوسکا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پرنسپل اس کی پشت پر تھپکیاں دیتی رہی۔ ایوا نے بمشکل اپنے آپ پر قابو پایا اور بولی ”میں بے قصور ہوں میڈم یقین کیجیے۔ یہ سب کچھ میری مرضی کے خلاف ہوا ہے۔ مجھے لوٹا گیا ہے۔ برباد کیا گیا ہے“۔

پرنسپل کی بری حالت ہورہی تھی۔ اسے سخت صدمہ ہوا تھا۔ اس معصوم بچی پر واقعی بڑا ظلم ہوا تھا۔ ایوا سرتاپا خزاں رسیدہ پتے کی مانند کپکپا رہی تھی ”مجھے بتاؤ ایوا۔ تم پر یہ ستم کس نے ڈھایا ہے؟“

”مسٹر ۔ ۔ ۔ مسٹر ولیم نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے برباد کیا ہے“۔ ایوا نے جھجکتے ہوئے کہا۔

پرنسپل کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مسٹر ولیم انگریزی ادب کے مایہ ناز استاد تھے۔ ایوا کسی اور استاد کا نام لیتی تو یقین کیا جاسکتا تھا مگر فرشتہ سیرت اور حد درجہ قابل احترام ولیم اس حد تک گر سکتے تھے۔ اسکول کا کوئی بھی فرد اس کا تصوّر بھی نہیں کرسکتا تھا۔ سنجیدہ، ذہین اور بردبار ولیم شادی شدہ تھے۔ وہ گذشتہ آٹھ برس سے بڑی محنت اور لگن سے بچیوں کو علم کی دولت سے مالا مال کررہے تھے۔ اس تمام عرصے میں ان کا کردار بے داغ رہا تھا۔ ان سے ایک بھی چھچھوری اور گھٹیا حرکت سرزد نہیں ہوئی تھی۔ پرنسپل نے فوری طور پر ولیم کو اپنے دفتر میں طلب کرلیا۔ اُس نے ایک ہی نظر میں اندازہ لگالیا کہ ایوا کا الزام بے بنیاد نہیں ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ ماتھے پر پسینے کے قطرات جھلملا رہے تھے۔

”مسٹر ولیم، آپ جانتے ہیں، میں نے آپ کو کیوں طلب کیا ہے؟“

”مجھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے اندازہ ہے کہ آپ نے ایوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔“ ولیم نے جملہ اُدھورا چھوڑ دیا جیسے اس کے حلق میں گولا پھنس گیا ہو۔

”اس نے آپ پر نہایت سنگین الزام عائد کیا ہے“۔ پرنسپل نے سخت لہجے میں کہا ”وہ امید سے ہے اور اس کی ذمے داری اس نے آپ پر عائد کی ہے“!

”یہ جھوٹ ہے میڈم!“ ولیم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”میں نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی“۔

”مسٹر ولیم! آپ کا مطلب ہے وہ بچی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔“

”وہ بچی نہیں ہے میڈم!“ ولیم نے اس کی بات کاٹ کر کہا ”وہ شیطان ہے اس کے جسم میں کوئی بدروح حلول کرگئی ہے۔ گذشتہ چھ ماہ سے وہ سب سے اگلی قطار میں کونے کی نشست پر بیٹھ رہی تھی۔ اس نے میری زندگی اجیرن کررکھی تھی کلاس ختم ہونے پر وہ میرے قریب پہنچ جاتی تھی۔ وہ مجھ سے بھڑ کر کھڑی ہوتی تھی اور معنی خیز سوالات کرنے لگتی تھی۔ میں اس کی بیہودہ اور ناشائستہ باتوں سے تنگ آگیا تھا۔ پہلے تو میں نے سنجیدگی سے اس پر توجہ نہیں دی۔ میں نے سوچا، وہ یقیناً کسی کے بہکاوے میں آگئی ہے اور پھر ایک روز سہ پہر کو وہ میرے گھر پہنچ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ میری بیوی بچے گھر پر نہیں ہوں گے اور پھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔“ ولیم نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپالیا ”شیطان مجھ پر حاوی ہوگیا۔ ۔ ۔ ۔ میں ہوش و حواس کھو بیٹھا“ ولیم بری طرح آنسوؤں سے رونے لگا

پندرہ منٹ بعد ایوا اسکول کے دو ادھیڑ عمر اساتذہ اور مقامی پولیس کے چیف کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ اسکے چہرے پر معصومیت تھی۔ پولیس چیف نے نرمی سے پوچھا ”ایوا تمہارے ساتھ جو زیادتی کی گئی ہے، اس کے بارے میں ہمیں تفصیل بتانا پسند کروگی؟“

”جی ہاں جناب“ ایوا نے بغیر کسی جھجک کے پرسکون آواز میں کہا ”مسٹر ولیم نے کہا تھا کہ وہ میری ذہانت سے بے حد متاثر ہیں اور مجھے انگریزی ادب کی بعض خاص باتیں بتانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے مجھے اتوار کی سہ پہر کو اپنے گھر بلوالیا۔ وہ بالکل اکیلے تھے۔ پندرہ بیس منٹ وہ انگریزی ادب پر گھسا پٹا لیکچر دیتے رہے پھر وہ عجیب عجیب باتیں کرنے لگے۔ انھوں نے مجھے اپنی خواب گاہ میں کوئی چیز دکھانے کی دعوت دی اور میں ان کے پیچھے اوپری منزل پر ان کی خوابگاہ میں پہنچ گئی اور پھر ان پر وحشت سوار ہوگئی۔ ان کی شخصیت بالکل ہی بدل کر رہ گئی وہ مجھے۔“

ولیم نے سختی سے ایوا کی تردید کی۔ وہ چیختا چلاتا رہا مگر کسی نے اس کا یقین نہیں کیا۔ ایوا کی دادی کو فوری طور پر بلوایا گیا اور تفصیل سے صورتحال انھیں سمجھائی گئی پھر یہ بات متفقہ طور پر طے کی گئی کہ سبھی کا مفاد اس میں ہے کہ معاملے کو خفیہ رکھا جائے۔ ولیم کو اسکول سے نکال دیا گیا اور ریاست سے نکل جانے کے لیے اسے اڑتالیس گھنٹوں کی مہلت دی گئی۔ ایوا کو ڈاکٹر کے حوالے کردیا گیا جس نے جدید ترین ادویات کی مدد سے قصہ ہی تمام کردیا اب وہ ولیم کے بچے کی ماں نہیں بن سکتی تھی اور یوں اسکول بھی بدنامی سے بچ گیا تھا۔ کیٹ نے خاموشی سے اسکول کے بھاری قرضے ادا کردیے تھے جو اسکول کی عمارت رہن رکھ کر بینکوں سے لیے گئے تھے۔ دونوں بہنوں کو اسکولوں سے اٹھالیا گیا اور یوں تمام معاملات

بخیر و خوبی طے پا گئے۔ ایوا نے یہ خبر سنی تو اس نے اپنی دادی سے افسوس کا اظہار کیا۔ اُسے یہ اسکول بے حد پسند تھا۔

ایوا کے آپریشن کے تین ہفتے بعد دونوں بہنوں کو ملک کے دوسرے بڑے اور مہنگے لوسیانا پبلک اسکول میں داخل کر دیا گیا۔

ایوا کے جسم میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ شعلے اس کے وجود کو جلائے دے رہے تھے۔ وہ محض کسی مرد کی رفاقت نہیں چاہتی تھی۔ وہ زندہ رہنے کی آرزو میں جل رہی تھی۔ وہ اپنی بھڑی ہوئی فطرت سے لڑ رہی تھی۔ بے پناہ غصے نے اس کے خون کو کھولا دیا تھا۔ اُس کے اندر لاوا کھدبد کر رہا تھا جو کسی بھی روز پھٹ کر باہر آسکتا تھا۔ وہ ہر کام کر گزرنا چاہتی تھی۔ ہر چیز اپنانے کے لیے مری جا رہی تھی۔ زندگی اس کے لیے ایک محبوب کی مانند تھی اور وہ ہر اعتبار سے اس پر اپنا تصرف جمائے رکھنا چاہتی تھی۔ وہ ہر فرد سے حسد کرتی تھی۔ کسی فرد کے پاس کوئی نئی چیز دیکھتی تو اسے اس وقت تک چین نہیں ملتا تھا جب تک اُسے وہ چیز مل نہیں جاتی تھی۔ وہ کوئی رقص دیکھنے جاتی تو اسے رقاصہ سے شدید نفرت محسوس ہوتی تھی کیونکہ وہ اس مہارت سے رقص کر کے ہزاروں تماشائیوں کی داد و تحسین حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ رقص ختم ہوتا اور تحسین کے طور پر رقاصہ کے لیے تماشائی تالیاں بجاتے تو اس کا جی چاہتا کہ وہ دوڑ کر رقاصہ کے پاس پہنچے، اسے دھکا دے کر اسٹیج سے گرا دے اور خود اس کی جگہ کھڑی ہو کر داد وصول کرے۔ وہ بیک وقت سائنسداں، گلوکارہ، ڈاکٹر، پائیلٹ، اداکارہ اور پتہ نہیں کیا کچھ بننا چاہتی تھی۔ وہ دنیا کا ہر کام کرنا چاہتی تھی اور دنیا کے ہر فرد سے بہتر کرنا چاہتی تھی۔

ان کا نیا اسکول سرسبز و شاداب علاقے میں واقع تھا۔ آب و ہوا بہت اچھی تھی۔ تقریباً سارا سال آسمان سفید یا گہرے سیاہ بادلوں سے ڈھکا رہتا تھا۔ لڑکیوں کے خوبصورت اسکول سے چار فرلانگ کے فاصلے پر لڑکوں کا ملٹری اسکول تھا جہاں بہترین فوجی تعلیم و تربیت دی جاتی تھی۔ ایوا کی عمر سترہ برس کی ہوئی تو ملٹری اسکول کے نصف لڑکے اور نصف سے زائد اساتذہ اس کی زلفوں کے اسیر ہو چکے تھے۔ وہ دھڑلے سے لڑکوں کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی۔ ہر دوسرے تیسرے روز وہ کسی لڑکے کے ساتھ جنگل کی سیر کو نکل جاتی تھی جہاں سے اس کی واپسی دو تین گھنٹوں کے بعد ہوتی تھی۔ ملٹری اسکول کے تمام لڑکوں کا موضوعِ گفتگو ان دنوں ایوا کی ذات تھی۔ اس ویرانے میں وہ ان کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی تھی۔ اُدھر ایوا شب و روز اس نشے میں سرشار رہتی تھی کہ اس کے اتنے شیدائی ہیں۔ اسکول میں سیکڑوں لڑکیاں تھیں مگر ملٹری اسکول کے لڑکے اسی کے نام کی مالا جپتے تھے۔ ایوا اب اس معاملے میں خاصی تجربہ کار ہو چکی تھی۔ اس نے تمام حفاظتی اقدامات کر لیے تھے اور اسے یقین تھا کہ مسٹر ولیم والی مصیبت اس کے گلے کبھی نہیں پڑے گی۔ وہ جانتی تھی کہ دادی جان اس کی دوسری غلطی کبھی معاف نہیں کریں گی۔ دوسری مرتبہ اس کے کسی عذر کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ ایوا کو ملٹری اسکول کے لڑکوں کو تڑپانے جھڑکنے اور نچانے میں بہت لطف آتا تھا۔ وہ التجا آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے تھے اور اسے عجیب سی تسکین ہوتی تھی۔ ایوا کی خوشنودی کے لیے وہ قیمتی تحائف لاتے تھے اور وہ انھیں بڑی حقارت سے ٹھکرا دیتی تھی وہ کسی لڑکے سے سہ پہر کو جنگل میں ملنے کا وعدہ کرتی اور ٹھاٹ سے اپنے کمرے میں بستر پر نیم دراز کوئی رومانی ناول پڑھنے لگتی۔ لڑکا بیچارہ دن ڈھلے تک اس کے انتظار میں سوکھتا رہتا اور دوسرے روز وہ اس سے طبیعت کی خرابی کا عذر پیش کر کے معذرت چاہ لیتی۔ ایوا کو اس کھیل سے ناقابلِ بیان مسرت حاصل ہوتی تھی۔ اسے اب یقین ہو چکا تھا کہ تمام مرد بے وقوف ہوتے ہیں۔

ایوا ذہین اور حسین تھی۔ جدید طرز کے قیمتی ملبوسات پہن کے اور بناؤ سنگھار کر کے وہ نکلتی تو لڑکوں کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ جاتی تھیں۔ وہ اربوں ڈالر کی بیسیوں ممالک میں پھیلی ہوئی جائداد اور کاروبار کی وارث تھی۔ ایوا کے لیے دولت مند گھرانوں کے بیسیوں رشتے آچکے تھے اور اس نے کسی بھی رشتے میں دلچسپی نہیں لی تھی البتہ ماریا نے جن لڑکوں کو اپنے لیے پسند کیا تھا، ایوا ان میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گئی تھی۔ ماریا نے ایک ذہین اور حساس لڑکے رینو کو سنیچر کی شام سات بجے اسکول سے تین میل دور واقع قصبے کے کلب میں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ رینو اس کے دل کو بھا گیا تھا۔ وہ بہت پُرجوش تھی۔ اس نے ایوا کو رینو کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

ماریا سنیچر کی شام مقررہ وقت پر کلب پہنچی تو خلاف توقع رینو اس کا منتظر نہیں تھا۔ ماریا نے اُسے قرب و جوار میں تلاش کیا مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ ماریا آدھے گھنٹے کلب میں اور آدھے گھنٹے کلب کے باہر رینو کا انتظار کرتی رہی۔ راہگیر اسے عجیب نظروں سے گھور رہے تھے اور وہ خود کو دنیا کی احمق ترین لڑکی محسوس کر رہی تھی۔ تھک ہار کر اس نے ایک چھوٹے سے ریستوران میں بے دلی سے کھانا کھایا اور افسردہ اور دل گرفتہ واپس اسکول پہنچ گئی۔ ایوا کمرے میں موجود نہیں تھی۔ ماریا رات گئے تک ایک تاریخی ناول پڑھتی رہی۔ پھر بتیاں بجھا کر سونے کے لیے لیٹ گئی۔ تین بجے کے قریب ایوا دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی۔

"میں تمہارے بارے میں فکرمند ہونے لگی تھی" ماریا نے سرگوشی میں کہا۔

"چند پرانے دوستوں سے ملاقات ہو گئی تھی۔ ان کے ساتھ کیرم کھیلتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ تم سناؤ تمہارے خوابوں کے شہزادے رینو سے ملاقات کیسی رہی؟"

"کیا بتاؤں بہن۔ میں اس کے چکر میں آج بہت خوار ہوئی ہوں۔ یہ میری زندگی کی بدترین شام تھی۔ میں دیر تک اس کا انتظار کرتی رہی اور وہ نہیں آیا۔ اس نے کوئی پیغام تک بھیجنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔"

"یہ تو بڑی شرمناک بات ہے" ایوا نے اپنی بے پناہ خوشی کو چھپاتے ہوئے کہا "رینو نے بہت گری ہوئی اور نیچ حرکت کی ہے۔ میری بھولی بہن میں کئی مرتبہ تمہیں سمجھا چکی ہوں، مرد ہرجائی اور دھوکے باز ہوتے ہیں۔ ان کے وعدوں کا اعتبار نہ کیا کرو"

"ممکن ہے اسے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو؟"

"واقعی تم بہت بھولی ہو ماریا تم جاگتے میں بھی خواب دیکھنے لگی ہو۔ میں ان ہرجائی مردوں کو تم سے کہیں زیادہ جانتی ہوں۔ ان سے وفا کی امید رکھنا، آندھی میں چراغ لے کر چلنے کے مترادف ہے۔ رینو کو تم سے زیادہ خوبصورت اور بیباک لڑکی مل گئی ہوگی۔ مجھے یقین ہے، جس وقت تم اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ کسی لڑکی کے ساتھ گلچھرے اڑا رہا ہوگا"

ماریا نے اپنی سمجھ دار بہن کی بات کا یقین کر لیا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی اس سے پہلے بھی وہ ایسے مراحل سے گزر چکی تھی۔ اُسے اپنی خوبصورتی کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بہن کے مقابلے میں اس کی شخصیت بے جان اور دبی دبی سی ہے۔ بہن کا سایہ اس کی پوری زندگی پر محیط رہا تھا۔ وہ اپنی ذہین اور حسین و جمیل بہن سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ لڑکے ایوا کی طرف متوجہ ہوتے تھے تو اس کے دل میں رشک اور حسد کے جذبات نہیں ابھرتے تھے۔ وہ اس ٹھوس حقیقت کو اپنی بہن کے لیے قدرت کا انعام سمجھتی تھی وہ ایوا کے مقابلے میں خود کو ہر اعتبار سے کمتر محسوس کرتی تھی۔ وہ اس امر سے قطعی بے خبر تھی کہ اس کی بہن نے بچپن ہی سے اِسے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ رینو کی بے وفائی سے ماریا کو صدمہ نہیں ہوا تھا۔ ایسا تو کئی بار ہوا تھا۔ لڑکے اس سے متاثر ہوتے تھے۔ عہد و پیمان کرتے تھے اور پھر کبھی دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ایک ہفتے بعد ہی ماریا کی مڈبھیڑ سرِ راہ رینو سے ہو گئی۔ ماریا پر اس کی نظر پڑی تو وہ ایک لمحے کو گھبرایا اور پھر اجنبی بن گیا تھا۔ رینو نے یوں نظریں پھیر لیں جیسے وہ اسے جانتا ہی نہ ہو۔ ماریا اُسے آوازیں دیتی رہ گئی مگر اس نے ایک نہ سنی اور وہ گزرتا چلا گیا۔

ملٹری اسکول کے لڑکوں اور اساتذہ سے ایوا کی دوستی زیادہ عرصے چھپی نہ رہ سکی یہ ایک ایسا راز تھا جو کسی طور پر راز نہیں رہ سکتا تھا۔ ملٹری اسکول ہی کے ایک اُستاد نے لوسیانا اسکول کی ایک دوست ٹیچر کو ایوا کے کرتوت سے آگاہ کر دیا اور اُس ٹیچر نے اپنی پہلی فرصت میں یہ دلچسپ اور ہولناک خبر اسکول کی پرنسپل کیرول تک پہنچا دی۔ معاملے کی خفیہ چھان بین شروع کر دی گئی اور اس کے نتیجے میں پرنسپل نے ایک روز ایوا کو خاموشی سے اپنے دفتر میں طلب کر لیا۔ وہ چھوٹتے ہی ایوا سے بولی "اسکول کا مفاد اسی میں ہے کہ تم جتنی جلد ممکن ہو سکے واپس اپنے گھر چلی جاؤ۔ تم یہاں رہیں تو ہماری برسوں کی بنائی ہوئی ساکھ مٹی میں مل جائے گی اور یہ اسکول ایک روز ویران ہو جائے گا"

ایوا معصومیت سے آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے اس طرح پرنسپل کو دیکھ رہی تھی جیسے اس نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں میڈم؟"

"میں ملٹری اسکول کے لڑکوں کے بارے میں بات کر رہی ہوں۔ یہ سنی سنائی بات نہیں ہے۔ میں اپنے طور پر خفیہ تحقیقات کر چکی ہوں اور اب میں پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ تم یہاں سے چلی گئیں تو یہ اسکول پر تمہارا بہت بڑا احسان ہوگا"

"میں نے اپنی پوری زندگی میں اس سے بڑا جھوٹ نہیں سنا" ایوا نے پُرسکون اور مستحکم لہجے میں کہا "میرے خاندان کو بدنام کرنے کیلئے یہ گھٹیا سازش کی گئی ہے۔ میں دادی جان سے اس موضوع پر تفصیلی بات کروں گی۔ جب وہ یہ سنیں گی......"

"میں تمہیں اس زحمت کا موقع نہیں دوں گی" پرنسپل نے اس کی بات کاٹ کر کہا "مجھے تمہارے خاندانی وقار سے زیادہ اسکول کی ساکھ کا خیال ہے اور اگر تم خاموشی سے رخصت نہ ہوئیں تو میں لڑکوں کے ناموں کی ایک بڑی فہرست تمہاری دادی جان کو بھیج دوں گی۔"

"میں وہ فہرست دیکھنا چاہتی ہوں"

پرنسپل نے خاموشی سے دراز سے ایک ٹائپ شدہ بڑا کاغذ نکال کر کے ایوا کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ایوا ناموں کی لمبی چوڑی فہرست دیکھنے لگی۔ اس کے محتاط اندازے کے مطابق فہرست میں آٹھ لڑکوں کے نام شامل نہیں تھے۔ وہ پرنسپل کے سامنے بڑے اعتماد سے بیٹھی کچھ سوچتی رہی پھر اس نے ایک گہرا سانس لیا اور بولی "مجھے یقین ہے کہ میرے خاندان کو بدنام کرنے کی زبردست سازش کی گئی ہے۔ مجھے دادی جان کی نظروں سے گرانے کی ناپاک کوشش کی گئی ہے اور میں حاسدوں کے مذموم مقاصد پورے نہیں ہونے دونگی۔ میں کل ہی یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

"تم نے یہ فیصلہ کر کے بڑی سمجھداری کا ثبوت دیا ہے" پرنسپل نے خشک لہجے میں کہا "کل صبح ایک کار تمہیں ایئرپورٹ چھوڑ دیگی۔ تمہاری دادی جان کو بذریعہ ٹیلیگرام تمہارے پہنچنے کی اطلاع آج ہی دے دی جائے گی۔ اب تم جا سکتی ہو۔"

ایوا ایک گہرا سانس لے کر اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی اور آہستگی سے چلتی ہوئی دروازے کے قریب پہنچ گئی۔ کچھ سوچ کر وہ پلٹی اور دھیمی آواز میں بولی "میری بہن کے بارے میں کیا فیصلہ کیا گیا ہے؟"

"ظاہر ہے تمہارے گناہوں کی سزا معصوم ماریا کو نہیں دی جا سکتی۔ وہ یہیں رہے گی۔"

ماریا نے بہن کو کپڑے اور ذاتی استعمال کی اشیا سمیٹتے اور تین بڑے سوٹ کیسوں میں رکھتے دیکھا تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔ ماریا کے استفسار پر ایوا نے کہا کہ وہ اس بوگس اور گھٹیا اسکول سے تنگ آ چکی ہے اور واپس نیویارک جا رہی ہے۔ وہ دیر تک اسکول اور ٹیچروں کی برائیاں کرتی رہی۔ وہ ماریا کو اسکول سے متنفر کر دینا چاہتی تھی۔ ماریا پندرہ بیس منٹ تو اسکول کا دفاع کرتی رہی۔ پھر ایوا چیخنے چلانے لگی تو اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور اس کے ساتھ جانے کا اعلان کر دیا۔ ایوا نے اپنی افسردہ بہن کا ہاتھ تھام لیا اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ پھر وہ مسکرا کر بولی "میں تمہاری چیزیں بھی پیک کر دوں گی، تم ایک کام کرو۔ پوسٹ آفس سے دادی جان کو فون کر کے اطلاع دے دو ہم کل دوپہر کی فلائٹ سے نیویارک پہنچ رہے ہیں۔ انھیں بتا دینا کہ یہ گھٹیا اسکول اب ہم سے برداشت نہیں ہو رہا۔ یہاں کا غلیظ ماحول ہمیں تباہ کر دے گا۔"

ماریا نے قدرے ہچکچاہٹ کے بعد کہا "بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ لیکن دادی جان ہمارے اس فیصلے کو پسند نہیں کریں گی۔"

"تم بڑی بی کی پرواہ نہ کرو" ایوا نے کہا "میں انھیں سنبھال لوں گی۔"

ماریا کو یقین تھا کہ ایوا جو کچھ کہتی ہے، اسے سچ کر دکھاتی ہے۔ بلاشبہ وہ دادی جان کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے بہلا لے گی۔ ماریا نے اپنا پرس اٹھایا اور فون کرنے چل دی۔

ایوا کا خیال تھا کہ وہ اپنے دامن کے دھبوں کو دادی جان سے چھپانے میں کامیاب ہو جائے گی، لیکن اس کا یہ خیال، خیال خام ثابت ہوا۔ ان کی دادی کے بے شمار دوست، دشمن اور کاروباری حلیف اور حریف تھے جو ان کے خاندانی معاملات پر اچھے برے تبصرے کرتے رہتے تھے۔ اور وہ تمام باتیں کسی نہ کسی طرح کیٹ تک پہنچ ہی جاتی تھیں۔ گزشتہ دو تین ماہ سے کیٹ کے کانوں تک بعض تکلیف دہ افواہیں پہنچ رہی تھیں۔ ابتدا میں تو انہوں نے ان افواہوں پر دھیان نہیں دیا تھا لیکن افواہوں کا یہ سلسلہ شدت اختیار کر گیا تو انھیں تشویش ہوئی۔ ان تمام افواہوں کا محور ایوا تھی۔ اس کے متعلق متواتر ایک ہی بات کہی جا رہی تھی کہ وہ ملٹری اسکول کے بیسیوں لڑکوں سے بڑے دھڑلے سے ملتی ہے۔ اس سے متعلق یہ ہولناک خبر بھی ان تک پہنچی تھی کہ وہ اپنے ایک ٹیچر کے بچے کی ماں بنتے بنتے رہ گئی ہے۔ انہوں نے پوتیوں کے آنے کی خبر سنی تو انہیں قدرے سکون محسوس ہوا۔ وہ ان افواہوں کی تہہ تک پہنچنے کا تہیہ کر چکی تھیں۔

ایوا اور ماریا کے گھر پہنچتے ہی کیٹ نے ایوا کو اپنی خواب گاہ میں بلوایا اور ان افواہوں کی تصدیق چاہی جو وہ ایوا کے بارے میں سنتی رہی تھیں۔ پہلے تو ایوا نے حسب عادت دادی کو ٹالنا چاہا مگر وہ اپنی بات پر اڑی رہیں تو ایوا کو جواب دینا ہی پڑا۔ "دادی جان مجھے معلوم تھا کہ آپ تک یہ افسوس ناک باتیں پہنچ چکی ہوں گی۔ میری تو خواہش یہ ہی تھی کہ آپ مجھ سے اس موضوع پر بات نہ کریں لیکن میں آپ کے جذبات و احساسات کو بخوبی سمجھتی ہوں۔ میں چاہتی تھی کہ ماریا پر کوئی مصیبت نازل نہ ہو۔ آپ کو یہ ہی بتایا گیا ہوگا کہ میں ملٹری اسکول کے لڑکوں سے بہت زیادہ ملنے جلنے لگی ہوں۔ حقیقت اس کے قطعی برعکس ہے دادی جان۔ آپ تو جانتی ہیں کہ میں لڑکوں سے کتنا دور رہتی ہوں۔ وہاں بھی لڑکوں سے میری نہیں ماریا کی دوستی تھی۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ایوا؟" کیٹ نے تعجب خیز لہجے میں پوچھا۔

"میں صحیح کہہ رہی ہوں دادی جان۔" ایوا نے جلدی سے کہا۔ "آپ نے میرے بارے میں جو کچھ سنا ہے، اس کی تمام تر ذمے دار ماریا ہے پلیز آپ اُسے قصوروار نہ سمجھیں۔ اس نے یہ سب شعوری طور پر نہیں کیا ہے آپ تو جانتی ہیں کہ اس کا ذہن نا پختہ ہے۔ وہ اپنا اچھا برا نہیں سوچ سکتی۔ وہ بچاری نیکی بدی میں امتیاز برتنے کے لائق نہیں ہے۔ لڑکوں سے دوستی کو وہ برا نہیں سمجھتی جبکہ یہ بہت بری بات ہے۔ ماریا نے ستم ظریفی یہ کی کہ اس تمام کھیل میں میرا نام استعمال کیا۔ وہ لڑکوں سے ایوا بن کے ملتی رہی۔ پہلے تو وہ لڑکیوں کے سامنے خود کو ایوا کی حیثیت سے پیش کرتی رہی اور میں نے اس بے ضرر شرارت کا برا نہیں مانا۔ میرے سان و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ آگے جا کر وہ اتنا ہولناک کھیل کھیلے گی۔ ہماری شکل و صورت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں ہے۔ ماریا نے قدرت کے اس معجزے کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور مجھے ایک عالم میں بدنام کر دیا۔"

ایوا نے شرم سے سر جھکا لیا۔

کیٹ پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ ماریا اتنی بگڑ بھی سکتی ہے؟ اس کا انہوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا یہ ہی وجہ ہے کہ افواہوں کے سلسلے میں ایوا کا نام لیا گیا تو انہیں ان خبروں کی صداقت پر خاصی حد تک یقین بھی آ گیا تھا۔ انہوں نے کپکپاتی آواز میں کہا "جب تمہیں یہ معلوم ہوا کہ تمہاری شخصیت اپنا کر وہ بھیانک آگ سے کھیل رہی ہے تو تم نے اسے کیوں نہیں روکا؟"

"میں نے اُسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن شیطان اس کے دل و دماغ پر بری طرح حاوی ہو چکا تھا۔" ایوا نے بے بسی کے اظہار کے طور پر دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا۔ "میں نے سختی برتی تو اس پر جنون سا سوار ہو گیا۔ اُس نے مجھے خودکشی کی دھمکی دی۔ اوہ دادی جان ..... میرا خیال ہے ماریا کا ذہنی توازن تھوڑا سا بگڑ چکا ہے۔ وہ نفسیاتی مریض ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ آپ نے اس معاملے کے کسی بھی پہلو پر اُس سے بات کی تو وہ ضرور کچھ کر بیٹھے گی اور میں نہیں چاہتی کہ ......" ایوا نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ایوا کو روتے دیکھ کر دادی کا دل بھر آیا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولیں "نہیں ایوا۔ اس طرح نہیں روتے آنسو پونچھ لو۔ میں ماریا سے کچھ نہیں کہوں گی۔ یہ معاملہ ہم دونوں تک محدود رہے گا۔"

ایوا کے جانے کے بعد وہ دیر تک بستر پر نیم دراز ماریا کے بارے میں سوچتی رہیں۔ انھیں اس معصوم صورت اور شیطان سیرت لڑکی سے خوف آنے لگا تھا۔ ماریا نے انھیں مایوس کیا تھا محض لڑکوں سے دوستی گانٹھنے کا معاملہ ہوتا تو وہ نظرانداز کر دیتیں لیکن ایوا بن کے اس نے جو گناہ کیے تھے۔ انھیں وہ کسی طور پر بھی فراموش نہیں کر سکتی تھیں.

اگلے دو برسوں میں ایوا اور ماریا نے اپنی اسکول کی تعلیم مکمل کر لی، اس دوران ایوا بے حد محتاط رہی تھی۔ اس نے اپنا طرز زندگی یکسر بدل لیا تھا۔ پہلے کے دو واقعات نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔ اب وہ ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھا رہی تھی۔ وہ دادی سے اپنے تعلقات مستحکم رکھنا چاہتی تھی۔ بڑی بی اناسی ۷۹ سال کی ہو چکی تھیں اور کسی بھی روز عالم بالا کو کوچ کر سکتی تھیں۔ ایوا نے خاندان کی تمام دولت کی اکلوتی وارث ہونے کا تہیہ کر لیا تھا۔

لڑکیوں کی اکیسویں سالگرہ دھوم دھڑکے سے پیرس میں منائی گئی۔ ان کے تمام کپڑے، جوتے، موزے اور پرس اور میک اپ کا ڈھیروں سامان نوکرانیوں میں بانٹ دیا گیا۔ دونوں بہنوں کے لیے جدید ترین فیشن کے انتہائی مہنگے دو سو جوڑے تیار کیے گئے تھے۔ ہر جوڑے سے میل کھاتے جوتے، پرس اور زیورات تھے۔ ایوا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ چہکتی پھر رہی تھی۔ -- دیوانہ وار رقص کر رہی تھی۔

تقریب میں پیرس کے تمام معززین شریک تھے۔ شیمپئن کی بوتلیں دھڑا دھڑ کھل رہی تھیں۔ کاؤنٹ الفریڈ بھی اپنی اہلیہ سمیت اس تقریب میں شریک تھے۔ ان کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ تھی۔ بالوں پر برف گرنے لگی تھی۔ ان کا دبلا اور مضبوط جسم کسی پھرتیلے کھلاڑی کا سا تھا۔ کاؤنٹ کی حسین و جمیل اہلیہ نے سادہ اور بے حد دیدہ زیب لباس پہن رکھا تھا۔ یہ باوقار خاتون پیرس کی نامور میزبان تسلیم کی جاتی تھیں۔ ایوا نے ان پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی لیکن ان کے بارے میں ایک بات سن کر وہ چونک پڑی۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے۔ "..... مجھے آپ دونوں کی مثالی خوشگوار ازدواجی زندگی پر رشک آتا ہے۔ آپ دونوں نے ایک طویل عرصہ ساتھ گزارا ہے اور میں نے آج تک آپ دونوں سے متعلق ایسی ویسی بات نہیں سنی۔ آپ کی شادی کو پچیس برس تو ہو چکے ہیں؟"

"اگلے ماہ ہم اپنی شادی کی چھبیسویں سالگرہ منا رہے ہیں" الفریڈ نے مسکرا کر کہا "اور میں غالباً فرانس کی تاریخ کا واحد مرد ہوں جس نے ایک بار بھی اپنی بیوی سے بے وفائی نہیں کی۔"

وسیع و عریض ہال قہقہوں سے گونج اٹھا لیکن ایوا کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ تقریب کے اختتام تک وہ الفریڈ اور اس کی خوبصورت بیوی کا جائزہ لیتی رہی، وفا شعار شوہر کو نظروں ہی نظروں میں تولتی رہی۔ اس کی وفا کو جفا میں بدلنے کی تدابیر سوچتی رہی۔ ایوا کو یقین تھا کہ وہ الفریڈ کا یہ دعویٰ غلط ثابت کر دیگی کہ وہ فرانس کا واحد باوفا شوہر ہے۔ وہ اس کے لیے چیلنج تھا اور ہمیشہ کی طرح ایوا نے یہ چیلنج بھی قبول کر لیا تھا۔

دوسرے روز ایوا نے باوفا شوہر کو اس کے دفتر ٹیلیفون کیا۔ رابطہ قائم ہونے پر وہ شیریں لہجے میں بولی "میں ایوا بول رہی ہوں، غالباً میں آپ کو یاد نہیں رہی ہوں گی، میں ......"

"میں اتنی معصوم اور خوبصورت بچی کو بھلا کیسے بھول سکتا ہوں" وہ بارعب لہجے میں اس کی بات کاٹ کر بولا "تم ہماری بہترین دوست اور کرم فرما کیٹ کی پوتی ہو۔"

"مجھے یہ سن کر بے حد مسرت ہوئی کہ آپ نے مجھ ناچیز کو یاد رکھا، میں اس زحمت کے لیے آپ سے معافی کی خواستگار ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ آپ کا وقت بے حد قیمتی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ آپ اعلیٰ تقریبات میں پیش کیے جانے والے کھانوں کے ماہر ہیں اور اس بارے میں وسیع معلومات رکھتے ہیں۔ میں اپنی پیاری دادی جان کے اعزاز میں ایک شاندار دعوت کا اہتمام کر رہی ہوں اور اس کی تیاریاں خفیہ رکھی جائیں گی۔ یہ تقریب ان کے لیے خوشگوار حیرت کا باعث بنے گی۔ مجھے تقریب کے سلسلے میں آپ کی قیمتی آراء کی ضرورت ہے۔ کیا آپ میری رہنمائی کی زحمت فرمائیں گے؟"

"مجھے آپ کی مدد کر کے بے حد خوشی ہوگی" وہ پرجوش لہجے میں بولا "اور میں اسے اپنے لیے عین سعادت سمجھوں گا۔ میرا خیال ہے

ہیں پیرس کے مشہور باورچی ۔۔۔۔۔"

"دخل در معقولات کی معذرت چاہتی ہوں جناب" ایوا نے جلدی سے اس کی بات کاٹ کر کہا "کیا یہ ممکن ہوگا کہ میں اس بارے میں بالمشافہ گفتگو کرسکوں؟ مجھے افسوس ہے۔ آپ جو کچھ فون پر بتائیں گے ۔ میں یاد نہیں رکھ سکوں گی۔ کیا آپ کل دوپہر کے کھانے میں میرے ساتھ شریک ہوسکیں گے؟"

"ضرور۔ مجھے بے حد خوشی ہوگی"

"بہت بہت شکریہ" ایوا نے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا اور سوچنے لگی۔ کل دوپہر کا کھانا وہ باوفا شوہر چغد شوہر زندگی بھر نہیں بھول سکے گا۔"

دوسرے روز ان کی ملاقات شہر کے سب سے بڑے ریستوران میں ہوئی۔ تقریب کے بارے میں بات چیت خاص مختصر رہی۔ وہ بڑے صبر و ضبط سے کھانوں سے متعلق اس کا بور لیکچر سنتی رہی، پھر اس نے الفریڈ کا ہاتھ تھام لیا اور بولی "مجھے تم سے محبت ہے الفریڈ"

الفریڈ پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ چند لمحے تو وہ خاموشی سے ایوا کو گھورتا رہا پھر تیزی سے پلکیں جھپکا کر بولا "معاف کیجئے، میں آپ کی بات ٹھیک سے سن نہیں سکا ہوں"

"مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے الفریڈ"

الفریڈ نے مشروب کی چسکی لی اور مسکرا کے بولا "ہم سب اچھے دوست ہیں ایوا۔ ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہے"

"میں اس محبت کی بات نہیں کررہی ہوں الفریڈ"

الفریڈ نے ایوا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور فوراً ہی اس کی سمجھ میں آگیا کہ وہ کس قسم کی محبت کی بات کررہی ہے۔ وہ سرتاپا کپکپا کر رہ گیا۔ وہ بری طرح نروس ہوگیا۔ ایوا اکیس برس کی لڑکی تھی اور وہ خود پچاس کے پیٹے میں تھا۔ ان کی عمروں میں دوگنے سے زیادہ کا فرق تھا۔ اس کی بیوی بہت خوبصورت اور باوقار تھی۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی سے ہر اعتبار سے مطمئن اور خوش تھا۔ آج کل کی لڑکیوں کو پتہ نہیں کیا ہوگیا ہے۔ اس کے نوجوانی کے دور میں لڑکیاں مردوں سے بات کرتے ہوئے بھی گھبراتی تھیں۔ وہ شرم سے زمین میں گڑسی جاتی تھیں۔ الفریڈ کی حالت عجیب سی ہورہی تھی۔ اسے شدید گھبراہٹ ہورہی تھی۔ اس سے قبل بھی بیسیوں لڑکیوں نے الفریڈ کی رفاقت چاہی تھی اور ایوا ان سب سے زیادہ حسین اور چاہے جانے کے قابل تھی۔ جدید تراش کے لباس نے اسے اور زیادہ پرکشش بنادیا تھا۔ اس کے دلآویز چہرے پر معصومیت تھی۔ الفریڈ نے قدرے ہچکچا کر کہا "آپ ۔۔۔ آپ تو مجھ سے اچھی طرح واقف بھی نہیں"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے" ایوا نے جذباتی انداز میں کہا "میں تو پہلی ہی نظر میں گھائل ہوگئی تھی۔ گذشتہ رات تقریب میں میری نظر تم پر پڑی تھی اور پھر چند لمحوں کے لیے بھی تم سے غافل نہ رہ سکی تھی۔ اس وقت سے میرے ذہن میں بس تمہارا ہی خیال جم کر رہ گیا ہے۔ میں کسی اور فرد کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکی ہوں۔ میرے تصورات میں تم ہی تم ہو ساری رات میں بستر پر کروٹیں بدلتی رہی ہوں تمہاری ۔۔۔ یاد نے مجھے سونے ہی نہیں دیا۔ میری نیند، میرا سکون چھن گیا ہے۔" یہ بات صحیح بھی تھی وہ اسے تسخیر کیے بغیر چین سے رہ بھی نہیں سکتی تھی۔

"میں ۔۔۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ایوا۔ میں شادی شدہ ہوں اور ۔۔۔۔" آواز الفریڈ کے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔

ایوا پھر جذباتی ہوگئی۔ وہ پیار و محبت کی رجھانے والی باتیں کرنے لگی۔ الفریڈ دھیرے دھیرے موم کی طرح پگھلنے لگا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ ایوا نے دباؤ بڑھا دیا۔ اب اس کی باتیں جارحانہ ہوگئی تھیں۔ وہ الفریڈ کی کمزوریوں کو سمجھ چکی تھی اور اپنے ترکش کے تیر ایک ایک کرکے آزما رہی تھی۔ الفریڈ نے بھرپور مزاحمت کی مگر اس کی ایک نہیں چلی۔ ایوا اس کے دل و دماغ پر چھاتی چلی گئی۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جیسے سلب ہوگئی تھی۔

بیس منٹ بعد وہ ایک چھوٹے سے غیر معروف ہوٹل میں کمرہ بک کرا رہے تھے۔

ایوا دو گھنٹے بعد ہوٹل سے رخصت ہوئی تو فتح کے جوش سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس کی گردن اکڑی ہوئی تھی اور ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ الفریڈ تھکے تھکے قدموں سے اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ اس کی زندگی کا سب سے بڑا طوفان آکر گزر چکا تھا۔ اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ آئندہ کبھی بھول کر بھی اس عورت سے نہیں ملے گا۔ وہ ایوا کو معصوم بچی سمجھا تھا اور وہ اس کے قطعی برعکس ثابت ہوئی تھی۔ اس کی بیباکی نے الفریڈ کو خوفزدہ کردیا تھا۔

یہ معاملہ اسی ہوٹل میں ختم ہوجاتا، اگر مسز جیک ان دونوں کو اکٹھا ہوٹل سے نکلتے نہ دیکھ لیتی۔ یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ وہ ادھر سے گزر رہی تھی، مسز جیک نے پچھلے برس ایک فلاحی کمیٹی میں ایوا کی دادی کے ساتھ کام کیا تھا۔ وہ فطرتاً لالچی اور موقع پرست تھی اور قدرت نے

موقع دے کر گویا خوشحالی کے دروازے کھول دیئے تھے۔ ان دنوں اس کی مالی حالات بہت خراب تھے اور پیسہ کمانے کا یہ سنہری موقع تھا۔ اخبارات میں وہ الفریڈ اور اس کی خوبصورت بیوی کی تصاویر بارہا دیکھ چکی تھی۔ اسی طرح کیٹ کی جڑواں اور ہمشکل پوتیوں کی تصویریں بھی اس کی نظر سے گزر چکی تھیں۔ یہ لڑکی ایوا تھی یا ماریا، وہ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی لیکن اس سے فرق بھی کیا پڑتا تھا؟ اس نے جلدی سے پرس کھول کر اپنی خاص چھوٹی سی فون بک نکالی اور تیز تیز قدموں سے ایک ٹیلیفون بوتھ کی طرف بڑھنے لگی۔

مسز جیک نے رابطہ قائم ہونے پر کیٹ کو نمک مرچ لگا کے صورتحال سے مطلع کر دیا۔ کیٹ خاموشی سے اس کی داستان سنتی رہی، پھر سرد لہجے میں بولی "مجھے تو یقین نہیں آتا کہ ایسا ہوا ہوگا۔ بہرحال تم بتا سکتی ہو کہ الفریڈ کے ساتھ میری کون سی پوتی تھی؟"

مسز جیک اس سوال پر گڑبڑا گئی اور ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولی "مجھے ... نہیں معلوم کہ وہ ایوا تھی یا ماریا۔ مجھے تو ان بہنوں میں کوئی فرق ہی محسوس نہیں ہوتا"

کیٹ نے اس کا شکریہ ادا کر کے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ انھیں اس خبر کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ گذشتہ پندرہ برس سے الفریڈ کو جانتی تھیں۔ اس عرصے میں انھوں نے ایک بھی افواہ اس سے متعلق نہیں سنی تھی۔ ممکن ہے ماریا نے اُسے اپنی بیوی سے بے وفائی پر مجبور کر دیا ہو، اس معاملے میں مردوں کی عقل خبط ہوتے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔

کیٹ نے ریسیور اٹھایا اور آپریٹر کو بچیوں کے سابقہ اسکول کی پرنسپل سے رابطہ ملانے کی ہدایت کی۔

شام کو ایوا گھر پہنچی تو خوشی سے اس کے پیر زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ ایک مقبول رومانی گیت گنگنا رہی تھی۔ الفریڈ ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا اور وہ اسے باآسانی شکست دے چکی تھی۔ اب اس کا یہ خیال اور بھی پختہ ہو چکا تھا کہ وہ کسی بھی مرد کو پاگل بنا سکتی ہے۔

ایوا کتب خانے میں داخل ہوئی اور ٹھٹھک گئی، دادی جان کرسی پر باوقار انداز میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے پر گمبھیرتا چھائی ہوئی تھی۔ ایوا کے سلام کا انھوں نے سر کی خفیف جنبش سے جواب دیا اور سرد آواز میں بولیں "دروازہ بند کر دو ایوا" اور یہاں میرے قریب آ کر بیٹھ جاؤ"۔

دادی جان کی آواز میں کوئی ایسی بات تھی کہ چھٹی حس نے اسے خطرے کا احساس دلا دیا اور اس کا جسم اکڑ سا گیا۔ اس نے لکڑی کا بھاری دروازہ بند کیا اور دادی جان کے قریب جا کر بیٹھ گئی اور دھیمی آواز میں بولی "کیا بات ہے دادی جان، آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہیں؟"

"بات ہی کچھ ایسی ہے۔ میں کاؤنٹ الفریڈ کو یہاں بلانا چاہتی تھی۔ میں اہلِ پیرس کو دکھا دینا چاہتی تھی کہ وہ آدمی کے روپ میں بھیڑیا ہے۔ میں پورے فرانس میں اسے رسوا کرنا چاہتی تھی لیکن اس میں ہماری اپنی بھی بدنامی تھی لہٰذا میں نے مناسب یہی سمجھا کہ تم ہی سے دو دو ہاتھ کر لیے جائیں۔"

ایوا کا دماغ گھوم گیا۔ اس کا سر بری طرح چکرانے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے بھاری بھرکم ہتھوڑا اس کے سر پر دے مارا ہو۔ یہ ناممکن ہے! اس نے سوچا، مجھے تو ایک فرد بھی ایسا دکھائی نہیں دیا تھا جو مجھے اور الفریڈ کو جانتا ہو، وہ گھنٹہ بھر پہلے تو مجھ سے جدا ہوا ہے۔ ایوا نے بمشکل تمام اپنے آپ پر قابو پایا اور پُرسکون آواز میں بولی "میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا دادی جان۔ آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟"

دادی جان نے ننگے لفظوں میں حقیقت ایوا کے گوش گزار کر دی۔

ایوا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "اس نے مجھے لوٹ لیا ہے دادی جان! مجھے برباد کر دیا ہے۔ آپ کے اس سے بہترین تعلقات کے پیش نظر میں یہ بات آپ سے چھپانا چاہتی تھی" ایوا اپنی آواز پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی مگر دادی جان کے جاہ و جلال نے اسے دہشت زدہ کر دیا اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس نے دو تین گہرے گہرے سانس لیے اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی "میرے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔ کاؤنٹ نے مجھے فون کر کے دوپہر کا کھانا کھانے کی دعوت دی اور مجھے زبردستی شراب کے دو پیگ پلا دیئے۔ میرا خیال ہے شراب میں کوئی نشہ آور چیز ملائی گئی تھی، میں مدہوش ہو گئی تھی اور پھر اس نے..."

"بکواس بند کرو!" دادی جان زہریلی ناگن کی طرح پھنکاریں "تم پرلے درجے کی جھوٹی اور مکار لڑکی ہو، تم نے بے غیرتی اور ڈھٹائی کی حد کر دی ہے"۔

کیٹ کی حالت غم و غصے کی شدت سے غیر ہو رہی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک خزاں رسیدہ پتے کی مانند کپکپا رہی تھیں۔ ان کے دل پر چھریاں سی چل رہی تھیں، پرنسپل نے ایوا کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، وہ بہت ہی شرمناک تھا۔ ان کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایوا اس حد تک بگڑ چکی ہے۔ اس ذہین لڑکی سے متعلق انھوں نے سپنوں کے جو محل تعمیر کیے تھے۔ وہ آن واحد میں زمین بوس ہو چکے تھے۔ ایوا ان کے حسین اور رنگین خوابوں کی انتہائی بھیانک تعبیر کی صورت میں ان کے سامنے بیٹھی تھی۔ ان کے تصور کے پردے پر گزرے ہوئے واقعات کی فلم سی چل رہی تھی۔ بچپن میں ماریا جل کر مرتے مرتے بچی تھی اور پھر اس معصوم کو پے در پے کئی حادثے پیش آئے تھے۔ کبھی ایوا نے اپنے انگریزی ادب کے استاد کو بھی

نہیں بخشتا تھا۔ اسے گناہوں کے گڑھے میں دھکیل کر اس پر آبرو لوٹنے کا الزام لگایا تھا اور وہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ایوا پر اسکول کی لڑکیوں کو چرس سپلائی کرنے کا الزام بھی عاید کیا گیا تھا اور اس نے بڑی ڈھٹائی سے فرشتہ سیرت ماریا کو ذمے دار ٹھہرایا تھا۔ یہی تو اس ذلیل کا طریق کار تھا۔ وہ ولن کا کردار ادا کرتی تھی اور بڑی چالاکی سے ہیروئن بن جاتی تھی۔

کیٹ معصوم صورت اور شیطان سیرت ایوا کا بنظر غائر جائزہ لے رہی تھیں۔ "تم دنیا کی سب سے بدنصیب لڑکی ہو" انھوں نے سوچا "میں نے تمہارے متعلق کیا کچھ نہیں سوچا تھا۔ میں تمہیں کروگر کمپنی کا بنیادی ستون بنانا چاہتی تھی مگر تم تو کھوکھلی ثابت ہوئی ہو، اتنی بڑی عمارت کا بوجھ کیسے سہار سکو گی، ان کے جسم میں نفرت کی ایک لہر اٹھی اور وہ خشک لہجے میں بولیں "میں چاہتی ہوں تم یہاں سے جلد از جلد رخصت ہو جاؤ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ آج کے بعد میں تمہاری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی"۔

ایوا کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی دادی کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اس حد تک بے رحم بھی ہو سکتی ہیں۔

"تم ایک سستی اور گھٹیا طوائف سے کسی طور بھی کم نہیں ہو۔ بات یہیں تک محدود رہتی تو میں شاید تمہیں گوارا کر لیتی مگر تم حد سے زیادہ چالاک اور عیار بھی ہو اور میں جھوٹ اور فریب کو کسی صورت بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے افسوس ہے۔ اب اس گھر میں تمہارا گزارا نہیں ہو سکتا"۔

کیٹ تیزی سے ایوا پر بے رحمانہ حملے کر رہی تھیں اور اسے سنبھلنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ وہ اپنے دفاع میں کوئی بات بھی نہیں سوچ پا رہی تھی، وہ کپکپاتی آواز میں بولی "دادی جان اگر ماریا آپ سے یہ سارے جھوٹ بولتی رہی ہے۔۔۔"

"تم پھر بکواس کرنے لگی ہو۔ ماریا کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے اسے ایک بات بھی نہیں بتائی۔ تمہارے آنے سے آدھ گھنٹے قبل تمہاری سابقہ پرنسپل سے میری تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے"۔

"بس اتنی سی بات ہے؟" ایوا نے قدرے اطمینان محسوس کیا "پرنسپل مجھ سے اس لیے نفرت کرتی تھی کہ۔۔۔۔"

کیٹ نے ہاتھ اٹھا کر کہا "بس کرو ایوا بہت ہو چکا۔ اب تمہارا کوئی جھوٹ نہیں چلے گا۔ میں کوئی عذر، کوئی بہانہ تسلیم نہیں کروں گی۔ تمہاری ہر بات میرے لیے ناقابل اعتبار ہے۔ اب تم سچ بھی بولو گی تو میں جھوٹ سمجھوں گی۔ میں نے اپنے خاندانی وکیل کو بلایا ہے۔ میں تمہیں اپنی وصیت سے خارج کر رہی ہوں"۔

ایوا کی دنیا پر اندھیرا چھا گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے بلندی سے نیچے گہری کھائی میں پھینک دیا ہو۔ وہ پژمردہ لہجے میں بولی "آپ۔۔۔۔۔ آپ ایسا نہیں کر سکتیں، میرا گزارا کیسے ہو گا؟"

"تمہیں ماہانہ گزارا الاؤنس دیا جائے گا۔ آج سے تمہیں اپنی زندگی خود گزارنا ہو گی۔ اپنا اچھا برا تمہی کو سوچنا ہو گا۔ تم اپنے معاملات میں خود مختار ہو گی، کیٹ کی آواز میں دفعتاً درشتی آ گئی "لیکن میں نے تمہارے بارے میں کوئی اسکینڈل پڑھا یا سنا اور تم نے اپنے خاندان کے ناموس کو بٹہ لگایا تو تمہارا الاؤنس ہمیشہ کے لیے بند کر دیا جائے گا۔" تم کوئی بات پوچھنا چاہو تو پوچھ سکتی ہو"۔

ایوا نے اپنی دادی جان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور جان گئی کہ اس مرتبہ اس کا کوئی بھی بہانہ نہیں چلے گا۔ درجنوں عذر اس کے ہونٹوں پر مچلے تھے اور وہیں دم توڑ گئے تھے۔

کیٹ اپنی نشست سے اٹھیں اور سپاٹ لہجے میں بولیں "میں جانتی ہوں کہ اس فیصلے سے تم پر کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن۔۔۔۔ لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ یہ میری زندگی کا مشکل ترین فیصلہ تھا"۔

کیٹ باوقار انداز میں چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔ ایوا حسرت بھری نظروں سے انھیں جاتے دیکھتی رہی۔

کیٹ اپنی تاریک خوابگاہ میں بستر پر نیم دراز سوچ رہی تھیں۔ اگر ڈیوڈ ہلاک نہ ہوتا تو صورت حال یقیناً مختلف ہوتی۔ کاش ٹونی پر مصوری کا جنون سوار نہ ہوتا۔ اگر مریم زندہ ہوتی، تب بھی وہ خود کو تنہا اور بے یار و مددگار محسوس نہ کرتیں۔ انھیں مستقبل کی زیادہ فکر نہیں تھی، ماضی کی تکلیف دہ یادوں نے انھیں مار دیا تھا۔ جس ہستی سے بھی انہوں نے پیار کیا، اسی کے ہاتھوں ان کا سینہ چھلنی ہوا تھا۔ ٹونی، مریم اور ایوا ان تینوں نے ان کے دل پر کاری وار کیے تھے۔

اُدھر ایوا زخمی شیرنی کی طرح بپھری ہوئی تھی۔ وہ بار بار دانت کچکچا رہی تھی، مٹھیاں بھینچ رہی تھی۔ اس نے ایک مرد کی رفاقت میں دو ڈھائی گھنٹے گزارے تھے اور یہ کوئی بڑا اور ناقابل معافی جرم نہیں تھا۔ بڑی بی نے اسے بہت بڑی اور سنگین سزا دی تھی۔ پرانی فیشن کی اس بڑھیا کا دماغ چل گیا تھا وہ سٹھیا گئی تھی۔ اسے اپنی وصیت سے خارج کر کے اس نے پاگل پن کا ثبوت دیا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ بہترین وکیل کی خدمات حاصل کرے گی اور عدالت میں بڑھیا کی نئی وصیت کی دھجیاں بکھر جائیں گی۔ اس کا باپ پہلے پاگل تھا اور دادی کو پاگل

ثابت کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے خاندان کی بے پناہ دولت سے محروم نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کروگر کمپنی کی واحد مالک اور وارث تھی۔ بڑھیا بارہا کہہ چکی تھی کہ کمپنی کا سربراہ اسی کو بنایا جائے گا مگر اب اس کا تختہ الٹا جا چکا تھا۔ ماریا چھپی رستم نکلی۔ اُس نے اندر ہی اندر اس کی جڑیں کاٹ دیں تھیں۔ وہ چپکے چپکے اپنی دادی کے کانوں میں اس کے خلاف زہر گھولتی رہی تھی۔ بظاہر اس نے کبھی کمپنی کے معاملات میں دلچسپی نہیں لی تھی مگر وہ کمپنی کا سربراہ بننے کے لیے درونِ خانہ اس کے خلاف سازشیں کرتی رہی تھی اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی تھی۔

ماریا کو منہ کی کھانی ہو گی، ایوا نے سوچا، میں خاندان کی دولت اسے اتنی آسانی سے ہضم کرنے نہیں دوں گی۔ میں کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لوں گی۔

ایوا نے اپنی بہن کو باغیچے میں جا لیا اور اس سے چکنی چپڑی باتیں کرنے لگی۔ اس نے ماریا کو بتایا کہ وہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہے، وہ نیویارک میں اپنا فلیٹ لے رہی ہے تاکہ آزاد اور خود مختار زندگی گزار سکے۔ ماریا اسے بے یقینی سے دیکھتی رہی اور ایوا شدید نفرت سے دل ہی دل میں اسے کوستی رہی۔ اس نے ماریا کو برباد کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اس پروگرام کا پہلا مرحلہ مالی اعتبار سے خود کو مستحکم بنانا تھا۔ طویل قید کے بعد وہ آزاد ہو رہی تھی اور جی بھر کے اس نعمت سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اپنے فلیٹ کی آرائش کے لیے کسی ماہر کی خدمات حاصل کرے گی اور اسے ایک شاندار عشرت کدہ بنا دے گی۔

ایوا نے اپنی بہن سے الوداعی رسمی کلمات کہے۔ ماریا افسردگی سے ایوا کو دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنی بہن کے جانے کا دکھ ہو رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ جدا ہو رہی تھیں۔ اس نے ایوا کو گرمجوشی سے گلے لگایا اور جذبات سے بوجھل لہجے میں بولی "ہم اکثر و بیشتر ملا کریں گے نا؟"

"کیسی احمقانہ بات کہی ہے تم نے۔ میں تم سب سے روٹھ کے یا ملک چھوڑ کے تھوڑی جا رہی ہوں۔ میں یکسانی سے اکتا چکی ہوں۔ آزادی چاہتی ہوں، میں بڑی بی کی بے جا روک ٹوک سے اکتا چکی ہوں۔"

تیسرے روز ہدایت کے مطابق ایوا نیویارک پہنچ کے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں منتقل ہو گئی۔ ایک گھنٹے بعد ہی کیٹ کے دست راست راجر کا فون آ گیا۔ وہ چھوٹتے ہی بولا "تمہاری دادی جان کا پیرس سے فون آیا تھا۔ لگتا ہے تم دونوں میں کوئی تنازعہ ہو گیا ہے؟"

"ایسی تو کوئی بات نہیں" ایوا ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولی "بس چھوٹا سا خاندانی...... "ایوا نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا تھا اب اُسے ہر قدم سوچ سمجھ کے اٹھانا تھا۔ پیسوں کے بارے میں اُسے کبھی سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی مگر اب اس کی تمام سوچوں کا مرکز پیسہ تھا۔ اُسے الاؤنس کی رقم کا ذرہ برابر بھی اندازہ نہیں تھا۔ وہ زندگی میں پہلی بار خوف محسوس کر رہی تھی۔ ہوش سنبھالنے سے اب تک پہلی بار اسے اپنی بے بسی اور بے چارگی کا احساس بڑی شدت سے ہوا۔

"آپ کی دادی نے آپ کو بتایا تو ہو گا کہ وہ نئی وصیت مرتب کر رہی ہیں؟" راجر نے پوچھا۔

"ہاں۔ انھوں نے اس بارے میں کچھ کہا تو تھا۔"

"میرا خیال ہے آپ اس بارے میں مجھ سے بالمشافہ گفتگو کر لیں تو بہتر ہو گا۔ پیر کی سہ پہر تین بجے آپ دفتر تشریف لا سکتی ہیں؟"

"ٹھیک ہے میں پہنچ جاؤں گی۔"

پیر کی سہ پہر تین بجنے میں پانچ منٹ قبل کروگر بریٹ کمپنی کی عظیم الشان عمارت میں ایوا داخل ہوئی تو عمارت کے محافظ نے سرد مہری سے اس کا استقبال کیا۔ لفٹ چلانے والے نے بھی اُسے لفٹ نہیں کرائی۔ چند اونی ملازمین بھی وہاں سے گذرے اور کسی نے بھی اُسے سلام کرنے کی زحمت تک نہ کی۔ ایوا کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اس کا احساسِ محرومی بڑھ گیا تھا غصے کی شدت سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ منٹ بعد وہ راجر کے عظیم الشان دفتر میں اس کی لمبی چوڑی میز کے سامنے ڈری سہمی بیٹھی تھی۔

کیٹ نے راجر کو فون کر کے بتایا تھا کہ وہ بعض وجوہ کی بنا پر ایوا کو اپنے وصیت نامے سے خارج کر رہی ہے تو اسے بڑی حیرت ہوئی تھی وہ بری طرح چکرا یا تھا۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ کیٹ اپنی اس چہیتی پوتی پر خصوصی توجہ دیتی ہیں اور اسے کمپنی کا سربراہ بنانے کی فکر میں ہیں۔ وہ اس تبدیلی، اس انقلاب کا سبب سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ ہمیشہ کیٹ سے ایک فرمانبردار اور کام سے کام رکھنے والے ملازم کی حیثیت سے گفتگو کرتا تھا۔ اُس نے آج تک کوئی غیر ضروری اور نجی قسم کا سوال نہیں کیا تھا۔ کیٹ ضروری سمجھتیں تو اُس سے خاندانی معاملات پر صلاح مشورہ کر لیتی تھیں۔ سہمی ہوئی ایوا کو افسردہ اور دل گرفتہ دیکھ کر اسے بہت دکھ ہو رہا تھا مگر وہ اس سے ہمدردی کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا پہلی بار اس کی ملاقات کیٹ سے ہوئی تھی تو اس کی عمر زیادہ نہیں تھی، وہ بھی کیٹ سے ایک آدھ برس ہی چھوٹا تھا اور اب بڑھاپا ان پر خاصی حد تک حاوی ہو چکا تھا۔ ان کے تقریباً تمام بال سفید ہو چکے تھے لیکن اب بھی یہ احساس راجر کے دل کے ایک گوشے میں موجود تھا کہ وہ کسی نہ کسی روز اسے اپنا لے گی۔ وہ اسی دیرینہ آرزو کی تکمیل کے انتظار میں جیئے جا رہا تھا۔

راجر نے ایوا سے نرم لہجے میں کہا "میں آپ سے چند کاغذات پر دستخط کرانا چاہتا ہوں۔ آپ ان کاغذات کو پڑھ لیں اور پھر......"
"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے" ایوا نے تلخ لہجے میں بوڑھے راجر کی بات کاٹ کر کہا "کاغذات لائیے، میں ان پر دستخط کیے دیتی ہوں"
"ایوا بہتر یہ ہی ہوگا کہ تم کاغذات کو اچھی طرح پڑھ لو اور سمجھ لو"۔ راجر نے بدستور نرم لہجے میں کہا "تمہاری دادی اماں کی وصیت کے مطابق تم ایک کروڑ ڈالر کے ٹرسٹ کی واحد حق دار ہو۔ ٹرسٹ کی سربراہ تمہاری دادی جان ہیں ان کی تحریری اجازت کے بغیر تم ٹرسٹ سے ایک ڈالر بھی نہیں لے سکتیں۔ اکیس سے پینتیس برس کی عمر تک اپنی دادی کی تحریری اجازت سے جتنی رقم چاہے لے سکتی ہو" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بجھی ہوئی آواز میں بولا "تمہاری دادی نے ایک حکم نامہ دستخط کر کے ہمیں ارسال کر دیا ہے۔ اس حکم نامے کی رو سے تم پینتیس برس کی عمر میں ٹرسٹ کا پیسہ استعمال کرنے کی مجاز ہوگی۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ اس سے پہلے تم ٹرسٹ سے ایک ڈالر بھی نہیں لے سکو گی"۔
ایوا کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے رخسار پر زناٹے کا تھپڑ رسید کر دیا ہو۔
"آج سے تمہیں ڈھائی سو ڈالر فی ہفتہ گزارہ الاؤنس ملا کرے گا"
یہ دوسرا تھپڑ تھا جو ایوا کے منہ پر پڑا تھا۔ اس تھپڑ کی تکلیف پہلے تھپڑ سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ غیر یقینی سے بوڑھے راجر کو دیکھ رہی تھی اس کا کوئی بھی لباس پانچ سو ڈالر سے کم مالیت کا نہیں تھا اور اب اُسے صرف ڈھائی سو ڈالر میں پورا ہفتہ گزارنا تھا۔ اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ بڑی بی اس کے لیے اتنی چھوٹی اور حقیر رقم کا تعین کریں گی۔ اس معمولی رقم میں وہ کسی طور بھی ایک ہفتہ نہیں گزار سکتی تھی۔ یہ رقم اس کی تذلیل کے خیال سے دی جا رہی تھی۔ ایوا کو یقین تھا کہ یہ کمینہ اور خبیث بڈھا اس کی دادی کے اس فیصلے میں برابر کا شریک تھا۔ وہ ہزاروں ڈالر کی مالیت کی شاندار میز پر بیٹھا اس کی بے بسی سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ایوا کا جی چاہ رہا تھا کہ میز پر پڑا بھاری بھرکم پیپر ویٹ اٹھا کے اس بڈھے کھوسٹ کے سر پر دے مارے بمشکل تمام اس نے اپنی اس خواہش پر قابو پایا اور پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیلنے لگی۔
راجر نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا "تم کسی بینک میں بھی چارج اکاؤنٹ نہیں رکھو گی اور اس طرح تم کہیں بھی ادھار خریداری نہیں کر سکو گی۔ خریداری کے سلسلے میں تم کسی بھی اسٹور میں اپنے خاندان کا نام استعمال نہیں کر سکو گی۔ تم جو بھی چیز خریدو گی بل کی ادائیگی تمہیں اپنی جیب سے نقد کرنی ہوگی"
ایوا کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہو۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تو یہ خواب اور بھیانک ہو رہا تھا۔
"دوسری بات یہ کہ کسی غیر اخلاقی معاملہ میں تمہارا نام کسی بھی ملکی یا غیر ملکی اخبار یا رسالے میں آیا تو تمہارا ہفتہ وار الاؤنس بند کر دیا جائے گا۔ جو کچھ میں نے کہا، وہ تم سمجھ چکی ہونا؟"
"جی ہاں۔ اچھی طرح سمجھ چکی ہوں" وہ سرگوشی میں بولی
"تم دونوں بہنوں کے لیے تمہاری دادی جان کی زندگی کے بیمہ کی دو کروڑ ڈالر کی دو پالیسیاں لی گئی تھیں۔ تمہارے نام کی پالیسی آج صبح منسوخ کر دی گئی ہے۔ ایک سال بعد اگر تمہاری دادی اماں تمہارے طرزِ عمل سے مطمئن رہیں تو تمہارا ہفتہ وار الاؤنس دگنا کر دیا جائے گا" راجر ایک لمحے کو ہچکچایا پھر سر جھکا کر بولا "اب میں ایک آخری بات تم سے کہنا چاہتا ہوں"
اب کہنے کو رہ ہی کیا گیا ہے، ایوا نے سوچا اور کپکپاتی آواز میں بولی "سب ہی کچھ تو آپ کہہ چکے ہیں۔ وہ بات بھی بتا دیجئے"
راجر نے بے چینی سے پہلو بدلا اور سر پر ہاتھ پھیر کے بولا "تمہاری دادی جان تم سے آئندہ کبھی ملنا بھی نہیں چاہتیں"
"کوئی بات نہیں بڑی بی، ایوا نے سوچا اور میں بھی تمہاری منحوس صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔ لیکن میں تمہیں شدید تکلیف اور اذیت سے مرتے دیکھنا ضرور چاہوں گی"
راجر کی آواز اسے دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا "اگر تمہیں کوئی بڑا مسئلہ یا بڑی مصیبت پیش آئے تو مجھ سے فون پر بات کر لینا۔ تمہاری دادی چاہتی ہیں کہ تم دوبارہ اس عمارت میں قدم نہ رکھو۔ تم خاندان کی دیگر جائیدادوں اور جاگیروں پر بھی نہیں جا سکو گی"۔ یہ کہہ کر راجر نے میز کی دراز سے کاغذات نکالے اور اس کے سامنے رکھ دیئے۔ ایوا نے ایک گہرا سانس لیا اور خاموشی سے کاغذات پر دستخط کرنے لگی۔
دس منٹ بعد ایوا عمارت کے باہر فٹ پاتھ پر ایک عام سے شہری کی حیثیت میں کھڑی تھی۔ ڈھائی سو ڈالر کا چیک

ہی کے پرس میں موجود تھا۔ پرس کو اس نے بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

دوسرے دن صبح سے ایوا نے اپنے لیے ایک فلیٹ کی تلاش شروع کر دی اور شام کو وہ واپس اپنے ہوٹل پہنچی تو تھک کے چور ہو چکی تھی۔ دن بھر میں اُسے متعدد تلخ تجربات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ زندگی کی ٹھوس اور بے رحم حقیقتوں نے اس کی آنکھیں کھول دیں زندگی اس کے لیے جتنی سہل اور آرام دہ رہی تھی، اب اتنی ہی کٹھن اور دشوار محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے جدید ترین فرنیچر سے آراستہ کئی کمروں کے خوبصورت وسیع و عریض فلیٹ دیکھے تھے اور ان کے کرائے اس کے دو ماہ کے مجموعی الاؤنس سے بھی زیادہ تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ توں توں اس کا معیار زندگی گرتا چلا گیا اور آخر میں اُس نے جو فلیٹ دیکھا تھا وہ اس کی موجودہ حیثیت کے عین مطابق تھا۔ ایک کمرے کے اس تنگ و تاریک فلیٹ کو دیکھ کے ایوا کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔ فرنیچر ناکافی، بوسیدہ اور بہت گندا تھا۔ ایوا نے اپنے گھر یلو ملازمین کے کوارٹر دیکھے تھے جو اس ڈربہ نما فلیٹ سے ہزار درجہ بہتر تھے۔ کمرے کے ایک گوشے میں دو کوٹھریاں تھیں جنھیں باورچی خانے اور غسلخانے کا نام دیا گیا تھا۔ ایوا برا سا منہ بنائے فلیٹ دیکھتی رہی، پھر تلخ لہجے میں مکانوں کے بروکر سے بولی "آپ۔۔ آپ کے پاس اس سے اچھی رہائش گاہ نہیں ہے؟

"کیوں نہیں ہے" بروکر زہر خند سے بولا "کل ہی ایک بہترین مکان خالی ہوا ہے۔ ساحل سمندر پر واقع بیس کمروں کے اس شاندار مکان کا کرایہ صرف بیس ہزار ڈالر ماہانہ ہے۔ کیا آپ دیکھنا پسند فرمائیں گی؟"

ذلیل، کمینہ، ایوا دل ہی دل میں اسے گالیاں دیتی رہ گئی تھی۔

دوسرے روز ایوا فلیٹ میں منتقل ہوئی تو اسے بڑی شدت سے احساس ہوا کہ یہ کسی قید خانے سے کم نہیں ہے۔ اس سے بڑا تو ایوا کا ڈریسنگ روم تھا جہاں وہ دن میں دو تین مرتبہ محض لباس تبدیل کرنے اور بناؤ سنگھار کرنے جاتی تھی۔ اُسے ماریا کا خیال آیا جو پانچویں شاہراہ پر محل نما مکان میں ٹھاٹ سے رہ رہی تھی جبکہ اُسے جیتے جی اس جہنم کدے میں رہنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ کاش ماریا بچپن ہی میں جل کر مر گئی ہوتی۔ ایوا نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر سوچا، پھر میں تمام جائداد کی اکلوتی وارث ہوتی اور بڑی بی مجھے اس بے دردی سے نکال پھینکتیں، خیر کوئی بات نہیں۔ یہ وقت بھی گزر ہی جائے گا۔ بڑی بی اگر یہ سمجھتی ہیں کہ اس طرح دباؤ میں آ کر میں اپنے حق سے دست بردار ہو جاؤں گی تو یہ ان کی بہت بڑی بھول ہے۔ میں انگلی ٹیڑھی کر کے گھی نکالنا خوب اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں ڈھائی سو ڈالر میں پورا ہفتہ سسک سسک کر نہیں گزار سکتی۔ بینک میں میرے نام ایک کروڑ ڈالر کی خطیر رقم موجود ہے اور بڑی بی نے اس تک پہنچنے کا راستہ مسدود کر دیا ہے۔ ٹرسٹ کی رقم تک پہنچنے کا کوئی دوسرا راستہ ضرور ہوگا اور میں بہت جلد وہ راستہ ڈھونڈ لوں گی۔

ایوا رات گئے تک ٹرسٹ کی رقم سے فائدہ اٹھانے کا معقول طریقہ سوچتی رہی اور صبح جب وہ بیدار ہوئی تو اس مسئلے کا حل اس کے ذہن میں آ چکا تھا۔

گیارہ بجے وہ سٹی بینک کے منیجر کے کمرے میں اس کے سامنے تمکنت سے بیٹھی تھی۔ ایوا نے اپنا تعارف کرایا تھا اور چند لمحوں کے لیے۔۔۔ اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری رہی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی بڑی ہستی اس کے دفتر میں آ سکتی ہے۔ قسمت کی دیوی اس پر مہربان ہو گئی تھی اور وہ زبردست ترقی کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ بے پناہ خوشی اور جوش سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

ایوا نے منیجر کو بتایا کہ اس کے نام سے ایک ٹرسٹ قائم کیا گیا تھا۔ ٹرسٹ کے اکاؤنٹ میں ایک کروڑ ڈالر موجود ہیں۔ ٹرسٹ کے قواعد و ضوابط کی رو سے وہ پینتیس برس کی عمر سے پہلے اس رقم کو استعمال نہیں کر سکتی۔ لہٰذا ٹرسٹ کے فنڈ پر وہ اس کے بینک سے کچھ رقم قرض لینا چاہتی ہے۔ منیجر کے خوابوں کا سلسلہ نہیں ٹوٹا تھا۔ یہ لڑکی اس کی کامیابی کی کلید بن کے آئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر اس نے لڑکی کی بھرپور تسلی بخش خدمت کی تو وہ اپنے خاندان کے دیگر افراد کے کھاتے بھی اس کے بینک میں لے آئے گی اور وہ ترقی کے زینے پر تیزی سے چڑھتا چلا جائے گا۔

منیجر نے پر جوش لہجے میں ایوا کو بتایا کہ وہ اسے فوری طور پر پانچ لاکھ ڈالر بطور قرض دے سکتا ہے۔ اس نے ایوا سے ٹرسٹ کی تفصیلات معلوم کیں۔ ایوا نے کروگر کمپنی میں راجر سے رابطہ قائم کرنے کی ہدایت دی اور کہا کہ وہ اسے ٹرسٹ سے متعلق ہر قسم کی معلومات فراہم کر سکتا ہے۔ منیجر نے ایوا سے دو روز کی بڑی عاجزی سے مہلت مانگی۔ ایوا نے رسمی کلمات کہے اور رخصت ہو گئی۔ ایوا کے جاتے ہی منیجر نے ریسیور اٹھایا اور آپریٹر کو کروگر کمپنی میں راجر سے بات کروانے کی ہدایت کی۔ اس نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور ترقی کے دل خوش کن تصورات میں کھو گیا۔

دو روز بعد ایوا منیجر کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ چھوٹتے ہی سرد لہجے میں بولا "مجھے افسوس ہے مس، میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

ایوا بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی "یہ آپ۔۔۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ تو کہہ رہے تھے کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے"

"مجھے افسوس ہے مس، میں آپ کو دس ڈالر بھی نہیں دے سکتا۔ اس روز مجھے حقائق کا علم نہیں تھا"
بینجر کو راجر کی باتیں یاد آ گئیں۔ اس نے واضح الفاظ میں کہا تھا "جی ہاں ٹرسٹ کے فنڈ میں ایوا کے نام ایک کروڑ ڈالر موجود ہیں ٹرسٹ کے نام پر آپ مس ایوا کو جتنی رقم چاہیں دے سکتے ہیں لیکن ایک بات ضرور یاد رکھیے گا۔ اگر آپ نے مس ایوا کو دس ڈالر بھی قرض کے طور پر دیئے تو کروگر کمپنی کی سربراہ کیٹ آپ کو دوست نہیں دشمن سمجھیں گی۔"

"مجھے افسوس ہے مس ایوا" بینجر نے اپنی بات دہرا دی "میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

ایوا غصے سے پھر کے کھڑی ہو گئی اور لاپروائی کے انداز میں شانے اچکا کے بولی "آپ نے میرے لیے جو زحمت اٹھائی ہے۔ اس کے لیے میں آپ کی بے حد ممنون ہوں۔ نیویارک میں کئی بینک ہیں جہاں میں قرض لے سکتی ہوں خدا حافظ"

"مجھے افسوس ہے مس" بینجر نے کہا "دنیا کا کوئی بھی بینک آپ کو اس ٹرسٹ کی بنیاد پر قرض نہیں دے سکتا۔"

ایوا کے جانے کے بعد بینجر نے رومال سے پسینہ پوچھا تھا۔ اس نے ایوا کو تر نوالہ سمجھا تھا اور وہ نوالہ اس کے حلق میں پھنستے پھنستے رہ گیا تھا۔

اُدھر ماریا کی مت ماری گئی تھی۔ ایوا سے متعلق دادی جان کے رویے کو وہ سمجھنے سے قاصر رہی تھی۔ اس سے پہلے تو دادی نے ایوا سے ایسا برتاؤ نہیں کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ایوا سے کوئی بہت بڑی خطا ہو گئی تھی جس کی پاداش میں اسے گھر سے نکال دیا گیا تھا لیکن وہ خطا کیا تھی۔ اس کا اندازہ ماریا نہیں لگا سکی تھی۔ ماریا نے دادی جان کو بہت کریدا تھا اور وہ ہر بار اسے ٹال گئی تھیں۔ ایوا کی باتوں سے بھی وہ کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکی تھی۔

کیٹ اب زیادہ تر وقت ماریا کے ساتھ گزارنے لگی تھیں۔ وہ سائے کی طرح ماریا کے ساتھ رہنے لگی تھیں اور یہ ایک عظیم تبدیلی تھی جو اس نے دادی جان میں محسوس کی تھی اس سے پہلے تو وہ اس کی پرواہ بھی نہیں کرتی تھیں۔ ایوا نے کیٹ کو بہت زیادہ مایوس کیا تھا اور اب وہ اپنی دوسری پوتی سے فریب کھانا نہیں چاہتی تھیں۔ انھوں نے اپنی کاروباری سرگرمیاں انتہائی محدود کر دی تھیں تاکہ زیادہ سے زیادہ وقت ماریا کے ساتھ گزار سکیں۔ ماریا کو جاننا اور پرکھنا آسان نہیں تھا۔ اس کی شخصیت تیز وطرار ایوا سے قطعی مختلف تھی۔ خاموش طبیعت ماریا چہرے پر سنجیدگی کی نقاب اوڑھے رہتی تھی اس نے کبھی کوئی غیر ضروری بات نہیں کی تھی۔ وہ ایوا سے کم ذہین نہیں تھی۔ وہ کیٹ کے حلقۂ احباب میں بے حد مقبول تھی اور اسے مختلف تقریبات کے لاتعداد دعوت نامے موصول ہوتے تھے اور وہ تقریباً ہر تقریب میں شریک ہوتی تھی مگر اب کیٹ نے اس پر پابندی عائد کر دی تھی وہ کیٹ کی مرضی اور اجازت کے بغیر اب کسی تقریب میں شریک نہیں ہو سکتی تھی۔ کیٹ ان دنوں سنجیدگی سے ماریا کے لیے ایک ذہین اور ذمے دار نوجوان کو تلاش کر رہی تھیں وہ ایوا کے ہاتھ سے نکلنے کے بعد اپنی دوسری پوتی کی کچھ زیادہ ہی فکر کرنے لگی تھیں۔ ماریا سے یہ توقع وابستہ کرنا عبث تھا کہ وہ مستقبل میں کروگر کمپنی کا بھاری بوجھ اپنے ناتواں کاندھوں پر اٹھا سکے گی۔ اس میں کمپنی کا سربراہ بننے کی صلاحیت نہیں تھی وہ خوابوں میں رہنے والی معصوم سی لڑکی تھی اور ہر کسی کی باتوں میں آ جاتی تھی کوئی بھی ذہین فرد ... چکنی چپڑی باتوں سے ماریا کو بے وقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کر سکتا تھا۔

اُدھر ایوا نے اپنی زندگی کے بدترین حالات سے مفاہمت کر لی تھی۔ اس کی بے اعتدالیوں نے اسے آسمان سے پاتال میں پھینک دیا تھا اور وہ اس ٹھوس اور بے رحم حقیقت کو تسلیم کر چکی تھی۔ اس کا ذہن شب و روز حالات کے بھنور سے نکلنے کی تدابیر سوچتا رہتا تھا لیکن مسئلہ بہت گھمبیر تھا اور وہ بغیر سوچے سمجھے عجلت میں کوئی قدم اٹھا کر حالات کو اپنے حق میں مزید خراب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے عیارہ ماغ نے اسے کئی منصوبے دیئے تھے اور وہ ٹھنڈے دل سے اُن منصوبوں کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے انھیں مسترد کر چکی تھی۔ دادی کے ظالمانہ برتاؤ نے ایوا کے دل کو شدید ٹھیس پہنچائی تھی اور اس ابتلا میں ایک اہم ترین بات فراموش کر چکی تھی۔ وہ بھول گئی تھی کہ مردوں کے لیے وہ بے پناہ کشش رکھتی ہے۔ فلیٹ میں منتقل ہونے کے بعد اس نے جس پہلی پارٹی میں شرکت کی اُسی میں وہ چھ مردوں کو رجھانے میں کامیاب ہو گئی۔ ان چھ مردوں میں چار شادی شدہ تھے۔ ایوا نے ان سب کو اپنے فلیٹ کا ٹیلی فون نمبر دے دیا اور چوبیس گھنٹوں کے اندر چھ کے چھ مردوں نے فون پر اس سے رابطہ قائم کر لیا۔ اس روز کے بعد سے ایوا کی مالی پریشانی ختم ہو گئی۔ اس کے چھ نئے دوستوں نے چند ہی دنوں میں اسے بیش قیمت تحائف سے لاد دیا۔ ان قیمتی تحائف میں، قیمتی زیورات، دیدہ زیب ملبوسات، آرائش جمال کی مصنوعات، پینٹنگز اور نقد رقومات شامل تھیں۔ وہ مختلف حیلوں اور بہانوں سے اپنے شیدائیوں سے چیزیں بٹور رہی تھی۔ وہ انہیں دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی تھی اور وہ احمق بڑی خوشی سے لٹ رہے تھے۔ ان کی تو دلی مرادیں بر آئی تھیں۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ انہیں ایک نوجوان اور حسین وجمیل لڑکی کی رفاقت حاصل ہو جائے گی۔ ایوا کے تمام دوست لکھ پتی تھے اور ہفتے میں ہزار دو ہزار ڈالر با آسانی ایوا پر قربان کر سکتے

تھی۔ ایوا نے اس معاملے میں ہر ممکن احتیاط برتی تھی۔ وہ کسی بھی شادی شدہ مرد کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے نہیں گئی تھی۔ اُس نے اس امر کا بطور خاص خیال رکھا تھا کہ اخبارات اور جرائد میں اُس کے بارے میں افواہیں نہ چھپنے پائیں۔ اسے اپنے ہفتہ وار الاؤنس کے بند ہونے کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں تھی۔ اُس کی اپنی آمدنی الاؤنس سے دس گناہ زیادہ تھی۔ وہ یہ سب کچھ اپنی دادی کو متاثر کرنے کے لیے کر رہی تھی۔ کامیاب اور خوش گوار مستقبل کے لیے یہ اس کی پیش بندی تھی۔ اسے یقین تھا کہ کسی نہ کسی روز بڑی بی پچھلی باتوں کو فراموش کر کے اسے گلے لگا لیں گی۔ ایوا کو یقین تھا کہ مستقبل میں کروگر کمپنی کی قیادت کے لیے دادی اماں کو اس کی ضرورت پڑے گی کیونکہ اس کی بہن ماریا کسی طور بھی اس عظیم منصب کی اہل نہیں تھی۔ احمق اور غبی بیوی بننا ماریا کا مقدر تھا۔ وہ سیدھی سادی گھریلو عورت بننے اور بچے پیدا کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

ایک شام ایوا شہر کے ایک فیشن میگزین کا مطالعہ کر رہی تھی کہ اس کی نظر ماریا کی رنگین تصویر پر پڑی۔ تصویر میں ماریا کو ایک وجیہہ نوجوان کے ساتھ رقص کرتے دکھایا گیا تھا۔ ایوا نے اپنی بہن کے نوجوان ساتھی پر خصوصی توجہ دی تھی اگر ماریا کی شادی اس نوجوان سے ہوتی ہے اور وہ ایک بیٹا جنم دیتی ہے تو ایوا کے لیے اس سے زیادہ تباہ کن بات اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ گزشتہ ایک برس میں ماریا نے بارہا اسے دوپہر اور رات کے کھانے کی دعوت دی تھی اور ایوا نے ہر بار کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اسے ٹال دیا تھا۔ ماریا کی دعوت قبول کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔

دوسرے روز ایوا نے فون کر کے ماریا کو اپنے فلیٹ پر بلوا لیا۔ ماریا مقررہ وقت سے پانچ منٹ پہلے ہی پہنچ گئی۔ وہ بہت خوش اور پُرجوش دکھائی دے رہی تھی اس نے فلیٹ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور دفعتاً افسردہ ہو گئی۔ اُس نے اپنی بہن کی حالتِ زار پر افسوس کا اظہار کیا۔ ایوا نے ہنس کر اس کی بات ٹال دی اسے یقین دلایا کہ وہ اس حال میں بھی بہت خوش ہے۔ ماریا نے اُس سے دادی اماں کی خفگی کا سبب دریافت کیا اور اس نے۔۔۔۔ فوراً ہی ایک کہانی گھڑ کر سنا دی۔ اس نے ماریا کو بتایا کہ وہ ایک نوجوان اور غریب ڈاکٹر سے محبت کرنے لگی تھی اور اس سے شادی کرنا چاہتی تھی لیکن دادی نے اس کی پسند کو ٹھکرا دیا تھا اور وہ دل برداشتہ ہو کر ان سے علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ ماریا نے اُس پر بہت زور دیا کہ دادی جان سے صلح کر لے اور اس ڈربے نما فلیٹ سے اپنے محل نما مکان میں منتقل ہو جائے۔ ایوا نے اپنی انا کا سہارا لیا اور ماریا کی تجویز رد کر دی۔ اُس نے ماریا کو اپنے سینے سے لگا لیا اور بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگی۔ ماریا اس کی محبت سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔ آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔ ایوا نے اپنی بہن کے آنسو پونچھے اور بڑے پیار سے بولی "تم میری فکر مت کرو۔ وہ محل میرے لیے کسی قید خانے سے کم نہیں تھا۔ یہ جگہ چھوٹی اور تنگ ہے مگر یہاں مجھے آزادی کی دولت میسر ہے۔ یقین جانو میری جان، میں یہاں بہت خوش ہوں۔ خیر چھوڑو اس ذکر کو۔ تم اپنی سناؤ مستقبل کے لیے تمہارا کیا پروگرام ہے؟ تمہیں اپنے خوابوں کا شہزادہ ملا یا نہیں؟ میں شرط لگا کر کہہ سکتی ہوں کہ تم نے کسی وجیہہ نوجوان کا انتخاب کر لیا ہے اور اب سنجیدگی سے اسے اپنا جیون ساتھی بنانے پر غور کر رہی ہو"

ماریا کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا اور وہ سر جھکا کر بولی "ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ فی الحال میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ دادی جان کی تو سب سے بڑی خواہش ہی یہ ہے کہ میں اپنا گھر بسا لوں لیکن میں نے انہیں بمشکل قائل کر لیا ہے کہ عملی تجربے کے بغیر میری شادی سودمند نہیں رہے گی۔ میں نے طے کیا ہے کہ سال دو سال کسی کمپنی میں ملازمت کروں گی میں نے اس بارے میں دادی جان سے بات کر لی ہے۔ اگلے ہفتے میں ملازمت کے سلسلے میں شہر کی ایک بڑی اشتہاری ایجنسی کے سربراہ سے ملاقات کروں گی"

دونوں بہنوں نے ایک قریبی درمیانی درجے کے ریستوران میں کھانا کھایا اور ایوا نے اپنی بہن کے منع کرنے کے باوجود بل کی ادائیگی کی۔ وہ ماریا کا کوئی بھی احسان لینا نہیں چاہتی تھی۔ کھانے کے بعد ماریا نے سو سو ڈالر کے پندرہ بیس نوٹ ایوا کو دینے کی کوشش کی۔ ایوا نے اسے بھیک جانتے ہوئے لینے سے انکار کر دیا۔ ایوا کو پیسوں کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ان دنوں اس کا بڑا سا پرس بڑے نوٹوں سے بھرا رہتا تھا۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چلا۔ ایوا اپنی بہن کے معصوم چہرے کو غور سے دیکھتی رہی۔ ماریا کا چہرہ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے کے مترادف تھا اور وہ یہ چہرہ بگاڑ دینا چاہتی تھی۔ اُس کی ہستی کو ہمیشہ کیلئے فنا کر دینا چاہتی تھی اور اس کے لیے اُسے مناسب وقت کا انتظار تھا۔ ماریا سے ملاقات کر کے اُس کی وہ پریشانی ختم ہو گئی تھی جو فیشن میگزین میں ماریا کی تصویر دیکھ کر ہوئی تھی، بہن سے اس کی ملاقات کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ فی الحال خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ ماریا نے واضح الفاظ میں جتا دیا تھا کہ وہ آئندہ دو برسوں میں شادی کا ارادہ نہیں رکھتی اور یہ مدت کوئی مناسب منصوبہ مرتب کرنے اور اُس پر عمل پیرا ہونے کے لیے کافی تھی۔

تین روز بعد ایوا کی اسکول کی ساتھی نیتا نے اسے فون کیا اور سنیچر اتوار کی چھٹیاں سرسبز و شاداب جزیرے ناسو میں گزارنے کی دعوت دی۔ اس نے ایوا کو بتایا کہ ناسو میں اس کے پندرہ بیس لکھ پتی دوست سیر و تفریح کے لیے جا رہے ہیں اور وہ بھی ساتھ چلے تو اُس کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔ ایوا اپنے دوستوں کی موجودہ کھیپ سے اکتا چکی تھی اور وہ سب بھی اُس سے کترانے لگے تھے۔ وہ ایوا کے آئے دن کے مطالبات

سے عاجز آ چکے تھے۔ ایوا کو یقین تھا کہ ناسو میں دو تین لکھ پتی اس کے قابو میں آجائیں گے اور یوں اس کا وقت بہت اچھا گزرے گا۔ ایوا نے اپنی سہیلی کی دعوت قبول کرلی۔ اس نے اپنا قیمتی ہار گروی رکھ دیا اور ناسو جانے کے لیے شاپنگ کرنے لگی۔ یہ ہار گزشتہ ہفتے ہی اس کے ایک شادی شدہ دوست نے دیا تھا۔ ایوا نے ناسو جانے اور وہاں سے واپسی کا ہوائی جہاز کا ٹکٹ خریدا۔ اس نے دو تین جوڑے اور میک اپ کا سامان بھی خریدا تھا۔ وہ تمام اوزاروں اور ہتھیاروں سے لیس ہو کر ناسو جا رہی تھی۔

اگلے روز شام کو وہ نیتا کے ہمراہ ناسو پہنچ گئی۔ ان کے کروڑپتی میزبان نے بیس کمروں کا عالیشان مکان خوبصورتی سے آراستہ کیا تھا۔ ایوا یہاں آکر خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ نیتا نے تمام مہمانوں سے فرداً فرداً اس کا تعارف کرایا تھا۔ کل سولہ مہمان تھے۔ ان سب میں ایک بات مشترک تھی اور وہ یہ کہ سب کے سب دولت مند تھے۔ ایوا نے مردوں کا بنظر غائر جائزہ لیا تھا۔ اس نے تین کروڑپتی ادھیڑ عمر مردوں کا انتخاب کیا تھا جو نیویارک ہی میں رہائش پذیر تھے۔ ایوا واپس نیویارک پہنچ کے انھیں پھانسنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ تمام مہمان اعلیٰ تعلیم یافتہ اور شائستہ اطوار کے مالک تھے اور زور وشور سے عالمی سیاست، موسم، نجی بحری جہازوں، طیاروں اور ٹیکس سے متعلق مسائل پر گفتگو کر رہے تھے۔ ایوا جن تین آسامیوں کو پھانس چکی تھی۔ ان میں سے ایک گنجے، موٹے اور بھدے کروڑپتی نے بتایا کہ وہ اس کی دادی کیٹ کا دوست ہے۔ ایوا نے یہ حقیقت بروقت معلوم ہونے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کی پیش قدمی سے سارا معاملہ چوپٹ ہو سکتا تھا۔

موٹے اور گنجے نے کبل ہونے کی بہت کوشش کی مگر ایوا کا رویہ انتہائی سرد اور معاندانہ رہا۔ چند ہی گھنٹوں میں وہ سمجھ گیا کہ اس کی دال نہیں گلے گی۔

دوپہر کے کھانے پر بھی ایوا نے اُسے نظرانداز کیے رکھا۔ کافی پی کر اس نے بیش قیمت نئے ماڈل کی ایک شاندار کار کی چابی لی اور سیر کو چل دی۔ وہ پہلے بھی کئی مرتبہ سیر و تفریح کی غرض سے اس ہرے بھرے خوشبوؤں سے مہکتے جزیرے پر آ چکی تھی یہاں اس کا حویلی نما شاندار مکان بھی تھا لیکن دادی کے عتاب کے باعث وہ اس خوبصورت مکان میں گھس بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنے عظیم الشان مکان کے سامنے سے گزری جس کے در و دیوار مکینوں کو ترس رہے تھے۔ اس نے ایک سرد آہ بھری اور آگے بڑھتی چلی گئی۔ ناسو میں بھانت بھانت کے سیاحوں کا ہجوم تھا۔ دکانیں خریداروں سے بھری ہوئی تھیں۔ خواتین عجیب و غریب مقامی طرز کے ملبوسات پہنے گھوم رہی تھیں۔

ایوا نے چھوٹی سی بندرگاہ پر کار روک دی اور مچھیروں کی کشتیوں سے سامان اترتے دیکھنے لگی۔ مچھیرے عجیب و غریب مچھلیاں، چھوٹے بڑے جھینگے اور خوش رنگ گھونگھے لائے تھے۔ اور پھر ایوا نے ایک تیز رفتار موٹر بوٹ کو جیٹی کی طرف بڑھتے دیکھا۔ جیٹی کے قریب پہنچ کے موٹر بوٹ کی رفتار کم ہو گئی اور پھر دھیرے دھیرے وہ ساحل سے آ لگی۔ ایوا نے چند لمحوں بعد ہی ایک وجیہہ اور دلکش نوجوان کو بوٹ سے کودتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں موٹر بوٹ کا رسّہ تھا جو اس نے ساحل پر ایک کھمبے سے باندھ دیا۔ اس اسمارٹ نوجوان نے ایوا کے دل میں ہلچل پیدا کر دی۔ وہ مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔ ایوا نے اس سے دوستی کا فیصلہ کیا اور پلٹ کر کار کی طرف چل دی۔

چار گھنٹے بعد وہ وجیہہ و شکیل نوجوان جدید فرنیچر سے آراستہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ ایوا ایک گوشے میں بیٹھی بے تابی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ دراز قد اور پُرکشش نوجوان ضرور مکان پر پہنچے گا۔ ایوا کی طرح وہ بھی مہمان کی حیثیت سے یہاں مقیم تھا۔ وہ قریب پہنچا تو ایوا سحر زدہ سی آنکھیں جھپکائے بغیر سپنوں کے اس شہزادے کو دیکھ رہی تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، چوڑے اور مضبوط شانے اور ٹینس کے کسی ماہر کھلاڑی ایسے جسم نے ایوا کو بہت متاثر کیا تھا۔ اس کا قد چھ فٹ تین انچ کے لگ بھگ تھا۔ وہ بڑے ہی دلفریب انداز میں مسکرایا اور اس کے سفید موتیوں جیسے دانت چمکنے لگے۔

نیتا نے نوجوان کا تعارف ایوا سے کرایا۔ اس نے ایک ادائے خاص سے سر کو قدرے خم کیا اور ایوا کا نرم و نازک ہاتھ، اپنے مضبوط ہاتھ میں تھام لیا۔ نوجوان کا نام جارج ملز تھا اور وہ یونان کے ایک کروڑپتی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ ایوا کو تعریفی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور وہ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ بے پناہ خوشی سے اس کا دل بلیّوں اچھل رہا تھا۔ جارج اُسے پسندیدگی سے دیکھ رہا تھا اور اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔

نیتا نے جارج سے دوسرے مہمانوں سے تعارف کی پیش کش کی تو وہ مسکرا کے بولا "یس نیتا۔ اب کسی سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے ابھی آپ نے ایک عالم سے میری ملاقات کرائی ہے۔"

نیتا نے مسکرا کے دونوں کو باری باری دیکھا اور لاپروائی کے انداز میں شانے اچکا کر بولی "ٹھیک ہے، تم دونوں مزے کرو میں چلتی ہوں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلاتکلف مجھے بلوا لینا۔"

نیتا کے جاتے ہی ایوا نے مسکرا کے پوچھا "تم نے نیتا سے بدتمیزی کیوں کی؟"

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے"۔ وہ دلکش مسکراہٹ لبوں پر بکھیر کے دھیمی آواز میں بولا "اگر مجھ سے ایسی کوئی حرکت سرزد ہوئی بھی ہے تو اس میں میرا قصور نہیں ہے۔ یہ تمہاری سحرانگیز شخصیت کا فسوں ہے کہ میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہوں"
ایوا نے مذاق اڑانے والے انداز میں قہقہہ لگایا اور جارج قدرے خفگی سے بولا "میں سچ کہہ رہا ہوں ایوا تم میری زندگی کی پہلی لڑکی ہو جس سے میں چند ہی لمحوں میں گھائل ہوا ہوں۔ تمہیں یہ بات عجیب تو لگے گی مگر میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے"۔
"عجیب بات تو یہ ہے کہ میں بھی تمہیں پسند کرنے لگی ہوں"
اب تک ایوا نے جن ادھیڑ عمر اور شادی شدہ مردوں سے دوستی کی تھی ان کی بنیاد پیسہ تھا۔ وہ اپنے بدترین حالات سنوارنا چاہتی تھی لیکن جارج کا معاملہ اس کے قطعی برعکس تھا۔ اگر وہ امیر نہیں بھی تھا تو ایوا کو اس کی پروا نہیں تھی۔ جارج اس کے دل کو بھا گیا تھا۔ اس میں کوئی انجانی کشش تھی جو ایوا کو اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔ اس سے پہلے کسی مرد نے اسے اتنا متاثر نہیں کیا تھا جارج کی سحرانگیز شخصیت کے سامنے اس کی تمام تر خودداری اور انا دھری کی دھری رہ گئی۔ وہ اس کے سامنے خود کو ایک بے بس بچی محسوس کر رہی تھی۔
ایوا کے استفسار پر جارج نے بتایا کہ والدین کے پیہم اصرار کے باوجود اس نے شادی نہیں کی اور نہ مستقبل قریب میں کرنے کا ارادہ ہے۔ ایوا کو اس کے جواب سے بے انتہا مسرت ہوئی اگر وہ شادی شدہ ہوتا تو اسے بہت مایوسی ہوتی۔ جارج نے بتایا کہ یونان میں اس کے بھائی اور باپ کا اشیائے خورد و نوش کا بہت بڑا بزنس ہے۔ ان کی کمپنی کی بنائی ہوئی ڈبوں میں بند چیزیں دنیا بھر میں بے حد مقبول ہیں۔
رات آٹھ بجے تک جارج حسین و جمیل ایوا کی ناز برداریاں کرتا رہا۔ اس نے دوسرے کسی مرد کو ایوا کے قریب آنے کا موقع نہیں دیا۔ اس نے دو تین مرتبہ مشروب کے گلاس لا کر ایوا کو پیش کیے۔ اپنے لائٹر سے اس کے سگریٹ سلگائے اور سرگوشیوں میں پیار و محبت کی باتیں کرتا رہا۔ ایوا کو یہ سب ایک حسین اور رنگین سپنا لگ رہا تھا۔ طویل عرصے کے بعد اسے اپنے پسندیدہ مرد کی رفاقت حاصل ہوئی تھی۔
نصف شب ہوئی تو مہمان آرام کی خاطر اپنے اپنے کمرے میں جانے لگے۔ جارج نے دھیمی آواز میں پوچھا "تمہارا کمرہ کون سا ہے؟"
"شمالی ہال کا آخری کمرہ میرا ہے۔ کیا تم وہاں آنا چاہتے ہو؟" ایوا نے مسکرا کے کہا۔
جارج نے اثبات میں سر ہلا دیا اور اس کا ہاتھ دبا کر اوپری منزل کو جانے والے زینے کی طرف بڑھ گیا۔
ایوا نے غسل کر کے شب خوابی کا ریشمی لباس تبدیل کیا اور سنگھار میز کے سامنے بیٹھ کے بال سنوارنے لگی۔ وہ جارج کا انتظار کر رہی تھی۔ رات ڈیڑھ بجے کے قریب دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور ایوا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے جلدی سے اٹھ کے دروازہ کھولا اور جارج کے اندر آتے ہی اسے دوبارہ مقفل کر دیا۔ پھر وہ پلٹ کر جارج کو دیکھنے لگی۔ وہ اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ایوا کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ اس کی چھٹی حس... رہ رہ کے اسے آنے والے نامعلوم خطرے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔
جارج کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ اس کی شخصیت یکسر تبدیل ہو کر رہ گئی تھی۔ ایوا مسکراتی ہوئی جارج کی طرف بڑھی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ جارج کی سانسیں اعتدال پر نہیں رہی تھیں۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا جیسے میلوں سے دوڑ کے آیا ہو۔ پھر اچانک ہی اس پر جنون سوار ہو گیا۔ اس نے پوری قوت سے تھپڑ ایوا کے رخسار پر رسید کر دیا۔ ایوا کا دماغ گھوم کے رہ گیا۔ وہ سہم کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گئی، جارج بھوکے بھیڑیے کی طرح لپکا اور بے رحمی سے ایوا کو گھونسے اور لاتیں مارنے لگا۔ ایوا بری طرح چیخنے چلانے لگی۔ پہلے تو اس نے جارج کو خوب گالیاں دیں اور بھرپور مزاحمت کی۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی قوت مدافعت کم ہوتی گئی اور وہ رونے اور گڑگڑانے لگی۔ ایوا کے گڑگڑانے اور گھگھیانے کا جارج پر رتی برابر بھی اثر نہیں ہوا۔ وہ وحشیانہ قہقہے لگاتا رہا اور ایوا کو لاتیں، گھونسے اور ٹھڈے مارتا رہا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ پیروں میں سکت نہیں رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ بہہ رہے تھے۔ وہ ہچکیوں اور سسکیوں سے رو رہی تھی۔ ایوا کو روتے اور چیختے چلاتے دیکھ کر جارج کی وحشت دوچند ہو گئی اور وہ تیزی سے ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ ایوا نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا اور تیورا کر فرش پر گر پڑی۔ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔
ایوا کو ہوش آیا تو جارج کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے کش پر کش لگا رہا تھا۔ ایوا اب بستر پر دراز تھی۔ جارج نے اسے بے ہوشی کی حالت میں اٹھا کر بستر پر لٹا دیا تھا۔ اس کا پھول سا جسم پکے ہوئے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ جوڑ جوڑ فریاد کر رہا تھا۔ جارج نے اسے روئی کی طرح دھنک دیا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور کراہ کے دوبارہ دراز ہو گئی۔ درد کی ایک ناقابل برداشت لہر اس کے وجود میں اٹھی تھی۔ جارج اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا دھیرے دھیرے وہ ایوا کے قریب پہنچا اور اس کے ماتھے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ایوا سہم کر اس سے دور ہو گئی اور پھٹی پھٹی

آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔
"کیوں جانِ من، کیسا محسوس کر رہی ہو؟" جارج نے زہر خند سے پوچھا۔
ایوا کی آنکھوں میں تکلیف کی شدت سے آنسو آ گئے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "تم انسان نہیں، وحشی درندے ہو تم ......"
آواز ایوا کے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔
"شکر کرو، میں نے تمہارے ساتھ زیادہ بُرا سلوک نہیں کیا۔" جارج نے مسکرا کے کہا۔
ایوا اس کی طرف غیر یقینی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ درشتی سے بولی "اس سے زیادہ برا سلوک اور کیا ہو سکتا ہے۔ تم نے تاریک افریقہ کے غیر مہذب اور وحشی آدمی کی طرح مجھ پر تشدد کیا ہے۔"
"تمہیں ابھی اندازہ نہیں ہے کہ تشدد کیا ہوتا ہے" جارج سرد لہجے میں بولا "مجھے حسین لڑکیوں کی کھال ادھیڑنے اور انھیں لہولہان کرنے میں بے حد لطف آتا ہے۔ ان کی چیخیں، آہیں، اور کراہیں سن کر مجھ پر نشے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ میرا محبوب مشغلہ ہے" جارج نے دھیرے سے ایوا کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا "میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں ایوا، یہی وجہ ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ نرمی برتی ہے۔ تمہاری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اسے صحت یاب ہونے میں کم از کم دو ماہ لگتے۔ تم حیران تو ضرور ہو گی کہ یہ کیسی محبت ہے ہاں میری جان۔ یہ بھی محبت کا ایک انداز ہے۔ جو لڑکی مجھے پسند آتی ہے۔ جس سے میں محبت کرتا ہوں۔ اس کی بری طرح مرمت ضرور کرتا ہوں، میرے ہاتھ بے قابو ہو جاتے ہیں۔ خیر تمہیں آج تکلیف تو ضرور ہوئی ہو گی مگر تم بہت جلد اس مار کی عادی ہو جاؤ گی۔"
غصے سے ایوا کا خون کھول رہا تھا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار ہوتا تو وہ بغیر کسی جھجک کے اس وحشی کو جان سے مار دیتی۔ ایوا نے نفرت سے فرش پر تھوک دیا اور بولی "تم ...... تم ایک پاگل انسان ہو۔ تمہارا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔"
ایوا نے دیکھا کہ ایک عجیب سی چمک اس کی سیاہ آنکھوں میں اتر آئی تھی اور اس نے سیدھے ہاتھ کی مٹھیاں بھینچ کر گھونسا بنا لیا تھا۔ ایوا اسے بہت کچھ سنانا چاہ رہی تھی لیکن اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ جارج سے متعلق اس کا خیال درست تھا۔ اس کا ذہنی توازن واقعی درست نہیں تھا۔ اس شخص کو اس کے باپ ٹونی کی طرح کسی پاگل خانے میں ہونا چاہیے تھا مگر وہ صحیح الدماغ، مہذب اور شائستہ لوگوں میں بغیر کسی روک ٹوک اور آزادی سے گھوم رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ جارج کا پارہ چڑھ جاتا اور ہاتھ پاؤں چلنے لگتے، ایوا نے جلدی سے کہا "معاف کرنا جارج۔ میں غصے میں نہ جانے کیا کچھ کہہ گئی۔ میں دراصل یہ کہنا چاہتی تھی کہ تمہاری محبت کا یہ جارحانہ انداز مناسب نہیں ہے۔ اور پھر میرا پہلا تجربہ تھا۔ میں آئندہ اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہوں گی۔ پلیز، اب مجھے تنہا چھوڑ دو۔ میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔ میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔"
جارج چند لمحے ایوا کو بغور دیکھتا رہا، اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اس کا تنا ہوا جسم ڈھیلا پڑنے لگا۔ وہ آہستگی سے چلتا ہوا سنگھار میز کے قریب پہنچا جہاں ایوا نے کپڑے تبدیل کرنے سے پہلے اپنے زیورات رکھے تھے۔ جارج نے ہیروں کا قیمتی نیکلس اٹھا کر دیکھا اور بولا "نیکلس میں نے تمہاری محبت کی نشانی کے طور پر رکھ لیا ہے۔"
ایوا دہشت سے سر تا پا کپکپا رہی تھی۔ اس نے جارج کی گھٹیا اور نیچ حرکت پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ اس کی ناراضی کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ اب اس میں مار کھانے کا حوصلہ نہیں رہا تھا۔
جارج کے رخصت ہوتے ہی ایوا کراہتے ہوئے بستر سے اتری اور آہستگی سے غسل خانے کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور پورے جسم میں آگ لگی ہوئی تھی ٹانگیں اکڑ سی گئی تھیں۔ وہ بری طرح ڈول رہی تھی۔ لڑکھڑا رہی تھی، پہلے تو وہ جیسے تیسے صدر دروازے پر پہنچی، اسے مقفل کیا اور پھر بمشکل تمام قدم اٹھاتی غسل خانے کی طرف بڑھنے لگی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ بغیر گرے غسل خانے تک پہنچ جائے گی۔ اس کے جسم کی اذیت اور تکلیف اچانک ہی بڑھ گئی تھی۔ اس نے غسل خانے میں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور واپس بستر پر آکر دراز ہو گئی۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ وہ اپنے دل میں وحشی جارج کے لیے بے انتہا غصہ اور نفرت محسوس کر رہی تھی۔ اس ذلیل انسان نے بربریت کی انتہا کر دی تھی۔
آدھے گھنٹے بعد ایوا گرتی پڑتی غسل خانے میں پہنچ گئی۔ اس نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ جارج نے واقعی اس کا حشر نشر کر دیا تھا۔ اس کے چہرے پر دو نیل کے نشانات نمایاں تھے اور کھرونچے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ایک آنکھ تقریباً سوج رہی تھی جن عورتوں سے جارج نے نرمی نہیں برتی تھی خدا جانے ان کا کیا حال ہوا ہو گا۔ ممکن ہے ان میں سے دو تین مر چکی ہوں۔ ایوا نے نیم گرم پانی سے غسل کیا۔ شب خوابی کا لباس پہن کے وہ بستر پر دراز ہو گئی۔ نہانے سے اس کے جسم کی تکلیف کم ہو گئی تھی پھر وہ رات بھر خوف اور دہشت سے کپکپاتی رہی۔ رہ رہ کے یہی خدشہ اس کے دل میں سر اٹھا رہا تھا

وہ وحشی واپس نہ آجائے اور اسی ڈر سے وہ رات بھر سو نہیں سکی۔ بے چینی اور تکلیف سے کروٹیں بدلتی رہی۔

صبح کا اجالا پھیلنا شروع ہوا تو ایوا بستر سے اتری۔ اس نے مشرقی رخ کے دریچوں کے پردے ہٹائے اور واپس بستر کے پاس پہنچ گئی۔ بستر کی سفید چادروں پر کہیں کہیں خون کے دھبے دکھائی دے رہے تھے۔ خون کے ان دھبوں کو دیکھ کر ایوا کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وقت آنے پر وہ جارج کو اس کے وحشیانہ سلوک کا جواب ضرور دے گی۔ اس نے قسم کھائی کہ وہ ایک نہ ایک دن جارج کو لہولہان کر دے گی۔ اس کے دل میں جو آگ دہک رہی تھی وہ جارج کو اُس کے اپنے خون میں نہایا دیکھ کر بجھ سکتی تھی۔ وہ آہستگی سے چلتی ہوئی غسل خانے میں پہنچی اور نیم گرم پانی سے دوسری مرتبہ غسل کیا۔ اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا جو اب بھی سُوجا ہوا تھا۔ چہرے پر پڑی ہوئی خراشیں بھی خاصی واضح تھیں۔ اُس نے صفائی کرنے کا چوکور کپڑے کا ٹکڑا لیا، اسے ٹھنڈے پانی میں بھگویا اور اپنے سوجے ہوئے رخسار اور آنکھ پر پھیرنے لگی۔ اس عمل کے دوران میں مسلسل جارج کے بارے میں سوچتی رہی تو اس کے طرزِ عمل سے متعلق کوئی عجیب بات سی تھی جس نے اس کے ذہن کو پریشان کر رکھا تھا اور اس بات کا تعلق اس کی تشدد پسندی سے نہیں تھا۔ وہ سوچتی رہی اور پھر اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ وہ عجیب بات اس کی سمجھ میں آچکی تھی۔ جارج جاتے ہوئے اس کا ہیروں کا قیمتی نیکلس لے گیا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟

دو گھنٹے بعد ایوا نچلی منزل پر مہمانوں میں شامل ہوگئی جو ناشتے کے لیے ایک لمبی سی میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایوا کو بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی پھر بھی وہ نیچے آگئی تھی، وہ نینا سے تنہائی میں جارج کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی۔ نینا نے اس کے تازہ زخموں کو دیکھا تو چیخ پڑی۔ اس نے ان زخموں کا سبب دریافت کیا۔ ایوا نے فوراً ہی ایک حادثے کا عذر پیش کر دیا پھر وہ گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے بولی "تمہارا وہ یونانی دیوتا کہاں ہے؟"

"وہ باہر لان میں ٹینس کھیل رہا ہے۔ ناشتے سے پہلے وہ روزانہ ایک گھنٹہ ورزش کے خیال سے ٹینس ضرور کھیلتا ہے۔ اس نے تمہارے لیے ایک پیغام دیا ہے۔ وہ تم سے دوپہر کے کھانے پر ملاقات کرے گا۔ میرا خیال ہے وہ تمھیں پسند کرنے لگا ہے۔"

"مجھے اس کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ" ایوا نے سرسری لہجے میں کہا "میں اُس کا پس منظر جاننا چاہتی ہوں۔"

"جارج کا تعلق یونان کے ایک کروڑ پتی گھرانے سے ہے۔ اس کے باپ ہنری ملز نے تیس سال پہلے صرف دو سو ڈالر سے کاروبار شروع کیا تھا آج کل اُس کا شمار یونان کے چند امیر ترین افراد میں ہوتا ہے۔ جارج اُس کا سب سے بڑا بیٹا ہے اور نیویارک کی ایک بروکر کمپنی میں ملازم ہے۔"

"باپ کا کروڑوں کا بزنس چھوڑ کر وہ ملازمت کیوں کر رہا ہے؟"

"میں اس بارے میں بھلا کیا کہہ سکتی ہوں۔ ویسے بھی ان بڑے آدمیوں کی ہر بات نرالی ہی ہوتی ہے۔ ممکن ہے اسے اپنے باپ کا کاروبار پسند نہ ہو۔ ویسے باپ کے لمبے چوڑے کاروبار کے ہوتے ہوئے اسے کام کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے میرا خیال ہے وہ محض وقت گزاری کے لیے ملازمت کر رہا ہے۔ دن میں اس کا وقت بوریت میں گزرتا ہوگا راتوں کو تو اُسے نائٹ کلبوں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ اس کے تعلقات درجنوں حسین و جمیل لڑکیوں سے ہیں جو شہد کی مکھیوں کی طرح اس کے گرد منڈلاتی رہتی ہیں اور اس بیچارے کی تو جان پر بنی رہتی ہے۔ ان سب کی بس ایک ہی خواہش ہے۔ وہ جارج کو اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتی ہیں اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہیں۔ اگر میرے شوہر میں حسد کا مادہ نہ ہوتا تو میں بلاتکلف جارج سے تعلقات استوار کر لیتی۔ کیا اس کی شخصیت اتنی ہی سحر انگیز نہیں ہے؟"

"بلاشبہ وہ پرکشش شخصیت کا مالک ہے۔ لڑکیاں اس پر بلاوجہ نہیں مرتیں۔ وہ مردانہ وجاہت کا شاہکار ہے۔ میں خود بھی اسے پسند کرنے لگی ہوں۔" ایوا نے سر جھکا لیا تھا اور پاؤں کے انگوٹھے سے قالین کو رگڑ رہی تھی۔

اس سہ پہر کو ایوا کی ملاقات جارج سے ہوئی۔ وہ بڑی گرمجوشی سے ایوا سے ملا۔ رات کے ہولناک واقعے کو وہ یکسر اپنے ذہن سے نکال چکا تھا۔ وہ دل فریب انداز میں مسکراتے ہوئے ایوا سے مختلف موضوعات پر گفتگو کرنے لگا۔ ایوا اس کے وحشیانہ سلوک کے باوجود اس میں زبردست کشش محسوس کر رہی تھی۔ رات وہ اپنی زندگی کے بھیانک ترین تجربے سے گزری تھی۔ کوئی اور شخص ہوتا تو ایوا اس کی صورت دیکھنا بھی پسند نہ کرتی لیکن جارج کی بھرپور اور مضبوط شخصیت نے اسے موم کی طرح پگھلا دیا تھا۔ وہ اس دلکش نوجوان کے ہاتھوں ہپناٹائز ہو چکی تھی۔ تمام تر کوشش کے باوجود وہ جارج سے اپنی نفرت اور شدید غم و غصے کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔

"میں آج رات نیویارک روانہ ہو رہا ہوں" جارج نے مسکرا کے کہا "میں تم سے کہاں رابطہ قائم کر سکتا ہوں، تم مجھے اپنا فون نمبر بتا دو۔"

"بات یہ ہے کہ میں ابھی نئے مکان میں منتقل ہوئی ہوں" ایوا نے جلدی سے کہا "میرے ہاں ابھی فون نہیں لگا ہے۔ تم مجھے اپنا فون نمبر بتا دو۔ میں خود ہی تم سے رابطہ قائم کر لوں گی۔"

جارج نے جیب سے ملاقاتی کارڈ نکال کر ایوا کے ہاتھ میں تھما دیا اور بولا "نیو یارک میں مجھ سے ملاقات ضرور کرنا۔ میں تمہیں بہت سی باتیں سکھانا چاہتا ہوں۔

ایوا نے نیو یارک پہنچتے ہی جین کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔ جین ایک اخبار میں بطور معاون مدیر کام کرتی تھی۔ طبقہ اُمراء کے بارے میں اس کے چٹ پٹے اور سنسنی خیز کالم بے پناہ پسند کیے جاتے تھے۔ وہ ہر بڑے آدمی کی ٹوہ میں رہتی تھی۔ لوگوں نے اُسے افواہوں کا پٹارہ اور بی جمالو قسم کے خطابات دے رکھے تھے۔ اُسے سارے شہر کی خبر رہتی تھی۔

ایوا کھانے کے بعد کافی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی اور پھر اپنے مطلب پر آتے ہوئے بولی "ارے ہاں میں ایک شخص کے بارے میں تم سے معلومات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ کیا تم جارج ملز نامی شخص کو جانتی ہو؟ وہ دراز قد اور وجیہہ و شکیل نوجوان ہے، لڑکیوں میں بے انتہا مقبول ہے۔ کیا تم اُس سے واقف ہو؟"

جین نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ریستوران میں بیٹھے ہوئے لوگ پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ایوا کو بڑی شرمندگی محسوس ہوئی مگر جین نے لوگوں کے دیکھنے کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور ایک گہرا سانس لے کر بولی "اس یونانی دیوتا کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ کم بخت لڑکیوں کو مقناطیس کی طرح کھینچتا ہے۔ اس کے بارے میں جو کچھ میں تمہیں بتاؤں گی، اسے اپنے تک محدود رکھنا۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ جارج کا تعلق یونان کے ایک کروڑ پتی گھرانے سے ہے لیکن ایک بات تمہارے علم میں نہیں ہوگی اور وہ یہ کہ اس کے باپ نے جارج کو اس کے گھناؤنے کرتوتوں کی بنا پر اپنی جائداد سے عاق کر دیا ہے۔ وہ جارج سے متعلق کسی بھی قسم کی ذمے داری لینے کو تیار نہیں ہے۔ اس نے یونان کے اخبارات میں بیٹے کو عاق کرنے کے بارے میں لمبا چوڑا اشتہار بھی شائع کرایا تھا۔ بڑا بیٹا ہونے کے ناطے جارج کو اپنے باپ کا کاروبار سنبھالنا تھا لیکن اپنے غلط کردار کی وجہ سے اس نے یہ سنہرا موقع ہاتھ سے گنوا دیا۔ اس کے بارے میں مسلسل یہ بات سنی جا رہی تھی کہ وہ لڑکوں اور لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر ویران علاقوں میں لے جاتا ہے اور ان پر وحشیانہ انداز میں تشدد کرتا ہے۔ وہ خطرناک حد تک نفسیاتی مریض ہے۔ جارج کا باپ اس سے اس حد تک متنفر ہے کہ وہ اس کی صورت بھی دیکھنے کا روادار نہیں ہے۔ اُس نے اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے ایک عرصہ پہلے جارج کو یونان سے نکلوا دیا تھا۔"

ایوا بڑے غور سے جین کی باتوں کو سن رہی تھی۔ وہ تمام تر توجہ سے ایک ایک لفظ ذہن نشین کر رہی تھی۔

"سچ پوچھو تو مجھے اس خوبصورت لڑکے پر بڑا ترس آتا ہے۔ کروڑوں کا کاروبار ہوتے ہوئے وہ اس شہر کی ایک چھوٹی سی فرم میں ملازمت کرنے پر مجبور ہے۔"

ایوا نے ایک گہرا سانس لیا۔ اب اس کی سمجھ میں آ چکا تھا کہ اُس رات رخصت ہوتے ہوئے جارج نے اس کا ہیروں کا بیش قیمت نیکلس کیوں اٹھا لیا تھا۔

"میرا خیال ہے اب جارج کی مالی پریشانی ختم ہو جائے گی۔" جین نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بہت جلد وہ ایک ارب پتی دوشیزہ سے شادی کرے گا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں؟ کیا تم اُس میں دلچسپی لے رہی ہو؟"

"فی الحال تو وہ مجھ میں دلچسپی لے رہا ہے۔ آئندہ پانچ چھ برس تک میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ مجھے اس کے بارے میں جاننے کا تجسس ہوا تھا اور اسی وجہ سے میں نے تم سے اس کا پس منظر بھی معلوم کر لیا۔ اب تم ہی انصاف کرو کہ میں ایک غلیظ کردار کے ٹٹ پونجیا نوجوان میں کیسے دلچسپی لے سکتی ہوں؟"

ایوا نے یہ بات جین کو مطمئن کرنے کے لیے کہی تھی جبکہ معاملہ اس کے قطعی برعکس تھا۔ وہ اس میں بے انتہا دلچسپی لے رہی تھی۔ دادی کے ہاں سے نکلنے کے بعد وہ ان کے عظیم خزانے کی چابی کی تلاش میں تھی۔ جارج اس کے لیے خزانے کی کلید بن سکتا تھا۔

دوسرے روز صبح سویرے ایوا نے فون پر جارج سے رابطہ قائم کیا۔ وہ ایوا کی آواز فوراً ہی پہچان گیا اور بڑی گرم جوشی سے بولا "شکر ہے تم نے مجھے یاد تو کیا۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ میں کتنی بے چینی سے تمہارے فون کا انتظار کر رہا تھا۔ کیا خیال ہے، آج رات کا کھانا ۔۔۔۔"

"نہیں آج رات تو میں ایک تقریب میں جا رہی ہوں۔" ایوا نے اس کی بات کاٹ کر کہا "البتہ کل دوپہر کے کھانے پر تم سے ملاقات ہو سکتی ہے۔"

جارج ایک لمحے کو ہچکچایا پھر تعجب خیز لہجے میں بولا "اچھی بات ہے۔ جیسے تمہاری مرضی۔ ہم تو حکم کے غلام ہیں۔ جہاں کہو گی اور جب کہو گی، پہنچ جائیں گے۔ کل دوپہر مجھے ایک گاہک کو اہم گفتگو کے لیے کھانے پر لے جانا تھا لیکن تمہاری خاطر اسے ٹال دوں گا۔"

ایوا کو یقین تھا کہ کل دوپہر کسی خوبصورت لڑکی سے اس کی ملاقات طے ہوگی، لیکن جارج نے اُسے خوش کرنے کے لیے گاہک کا عذر پیش کیا

تھا۔ ایوا نے اپنے گھر کا پتہ اُسے لکھوایا اور بولی "مجھے تم سے ایک اہم گفتگو کرنی ہے اور اس کے لیے میرا فلیٹ بہت مناسب رہے گا۔ میں کل دوپہر ساڑھے بارہ بجے تمہاری منتظر رہوں گی۔"

جارج کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کا ایک مبہم سا منصوبہ ایوا کے ذہن میں تھا۔ ریسیور کریڈل پر رکھ کر وہ اس منصوبے کے خدوخال واضح کرنے کے لیے غور و فکر کرنے لگی۔

دوسرے روز دوپہر کو تیس منٹ کی تاخیر سے جارج اس کے فلیٹ پر پہنچ گیا تھا۔ ایوا کو یقین تھا کہ وہ جان بوجھ کر محض اُسے متاثر کرنے کیلئے تاخیر سے پہنچا ہے۔ لڑکیوں کو رجھانے کے لیے وہ اسی قسم کے حربے استعمال کرتا ہوگا مگر وہ ایوا کو بے وقوف نہیں بنا سکتا تھا۔

جارج نے خوبصورت فرنیچر اور دل کش پردوں سے آراستہ ایوا کے چھوٹے سے فلیٹ کا بنظر غائر جائزہ لیا اور توصیفی انداز میں سر ہلا کر بولا "بہت خوب، اس چھوٹے سے فلیٹ کو تم نے بڑی خوبصورتی سے آراستہ کیا ہے۔ میں تمہارے عمدہ ذوق کی داد دیتا ہوں۔" اس نے اپنے ... دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور جذباتی لہجے میں بولا "میرے قریب آ جاؤ ایوا۔ تمہارے فراق میں میں نے ایک ایک پل بڑی مشکل سے گزارا ہے تم نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔"

ایوا نے اس کی حسین پیش کش کو یکسر نظر انداز کر دیا اور سرد لہجے میں بولی "ٹھہرو، میں تم سے ایک اہم بات کرنا چاہتی ہوں، پیار و محبت کا ناٹک بعد میں ہوتا رہے گا۔"

جارج کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ حیرت سے بولا "یہ کس قسم کا مذاق ہے؟"

"یہ مذاق نہیں ہے جارج۔ ... سب سے پہلے تو اپنے ذہن سے یہ خوش فہمی نکال دو کہ تمہاری دل کش شخصیت سے متاثر ہو کے میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔ میں نے تمہیں یہاں پیار و محبت کے لیے نہیں بلایا ہے۔ میں تم سے ایک اہم کاروباری گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔"

جارج کے ماتھے پر بل پڑ چکے تھے۔ ایوا کا پُراسرار رویہ سمجھنے سے وہ قاصر رہا تھا۔ تعجب خیز لہجے میں بولا "کیا واقعی تم نے مجھے یہاں کاروباری بات چیت کے لیے بلوایا ہے؟"

"بالکل۔ تم کو یہاں بلوانے کی بنیادی وجہ کاروبار ہی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم اپنی شان دار مردانہ وجاہت سے ادھیڑ عمر کی ناآسودہ شادی شدہ عورتوں اور بیواؤں کو متاثر کر کے ان سے چھوٹے موٹے تحائف اینٹھتے رہتے ہو اور یہ بات تمہیں کسی طرح بھی زیب نہیں دیتی۔"

جارج کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا وہ درشتی سے بولا "کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟ میرا خاندان ..."

"بکواس بند کرو" ایوا نے غصے سے اس کی بات کاٹ کر کہا "میں تمہیں اور تمہارے خاندان کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ تمہارا خاندان ضرور دولت مند ہے مگر تم خود ایک مفلس اور کنگال شخص ہو۔"

"میں اب بھی سمجھ نہیں سکا کہ تمہارا مطلب کیا ہے۔ جو کچھ کہنا چاہتی ہو صاف صاف کہہ ڈالو۔"

"یوں سمجھو کہ ایک عظیم خزانہ ہم دونوں کا منتظر ہے۔ اور میں چاہوں تو تمہیں اُس خزانے کی کنجی کے طور پر استعمال کر سکتی ہوں۔ مجھے اپنے خاندان کی اربوں ڈالر کی جائیداد اور کاروبار سے عاق کر دیا گیا ہے۔ میری بہن ماریا اُس عظیم دولت کی اکلوتی وارث ہے۔"

"پھر میں اس بارے میں کیا کر سکتا ہوں؟" "تمہاری خاندانی دولت سے میرا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"اگر تم ماریا سے شادی کر لو تو اس تمام دولت کے ... ہم دونوں اس کے مالک بن سکتے ہیں۔"

"مجھے افسوس ہے ایوا۔ میں تمہاری اس پیش کش کو قبول نہیں کر سکتا۔ جو کچھ تمہارے ذہن میں ہے میں اچھی طرح سمجھ چکا ہوں"

"جتنی محنت تم ان مختلف عورتوں کو پھانسنے کے لیے کرتے ہو" ایوا نے نرمی سے کہا "اس سے آدھی محنت میرے منصوبے پر کرو تو عمر بھر کا سکھ چین اور آرام و آسائش حاصل کر سکتے ہو اور جہاں تک ماریا کی موت کا تعلق ہے تو یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ بچپن ہی سے اُسے جان لیوا حادثے پیش آتے رہے ہیں اور خوش قسمتی نے ہمیشہ اس کا ساتھ دیا ہے۔ وہ اس بارے میں بدنصیب بھی ہو سکتی ہے"

جارج کے رخصت ہونے کے بعد ایوا دیر تک اپنی دادی اور بہن کے بارے میں سوچتی رہی۔ جو کچھ ایوا کے ساتھ ہوا تھا، وہ اس کی فطرت کے قطعی برعکس تھا۔ ایسی شکست ایسی ہزیمت اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ دادی نے اُسے گھر سے نکال کر اس کی زبردست توہین کی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ موقع ملتے ہی اپنی تذلیل کا بدلہ ضرور لے گی

ایوا اپنے منصوبے کی جزئیات بڑی احتیاط سے مرتب کرتی رہی۔ وہ ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہتی تھی۔ اس نے جارج سے پے در پے تین چار ملاقاتیں کیں۔ پہلے تو جارج نے پس و پیش سے کام لیا۔ اُس نے ایوا کے منصوبے کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ اُس نے ایوا کے منصوبے کو بہت خطرناک اور سنگین قرار دیا تھا۔ ایوا کو اس کی بزدلی سے قطعی مایوسی نہیں ہوئی تھی۔ اُس نے گھنٹوں جارج کے ساتھ مغز پچی کی اور بالآخر اسے قائل کرنے میں کامیاب ہو گئی کہ اُس کے منصوبے پر سنجیدگی سے عمل کر کے وہ دونوں ساری عمر پرتعیش زندگی گذار سکتے ہیں۔

جارج کی طرف سے مطمئن ہو کر ایوا نے منصوبے پر عمل درآمد شروع کر دیا، ماریا نے اس دوران میں اُسے کئی مرتبہ فون کیا تھا اور دوپہر کے کھانے کی دعوت دی تھی لیکن ایوا نے ہر مرتبہ ایک نیا عذر پیش کر کے اس سے معذرت کر لی تھی۔ ماریا نے ایوا کو اپنے دفتر کا ٹیلی فون نمبر بھی لکھوایا تھا۔ اُس نے دادی جان کی اجازت سے ایک اشتہاری ایجنسی میں ملازمت کر لی تھی۔ ایوا نے ڈائری میں ماریا کے دفتر کا فون نمبر

دیکھا اور اس سے رابطہ قائم کرکے دوسرے روز دوپہر کے کھانے کی دعوت دے ڈالی۔
دوسرے دن ایوانے ایک اطالوی ریستوران کے باہر ماریا کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ ماریا بہن کی اس خوشگوار تبدیلی سے بے حد خوش اور حیرت زدہ تھی۔ ایوانے اپنی بہن کے پسندیدہ کھانوں کا آرڈر دیا
وہ مختلف موضوعات پر باتیں کرتی رہیں۔ ماریا نے اسے اپنے دفتر کے کئی مزیدار واقعات سنائے۔ ایوا سر جھکائے ہنستی رہی۔ چند لمحوں بعد اس نے سر اٹھایا تو سامنے جارج جدید تراش کے خوبصورت سوٹ میں ملبوس کھڑا تھا۔ وہ بڑی حیرت سے دونوں بہنوں کو باری باری دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون ایوا ہے اور کون ماریا۔
"ہیلو جارج" ایوانے صورت حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے کہا۔
"جارج نے سکون کا گہرا سانس لیا اور بولا "ہیلو ایوا کیسی ہو"
"اچھی ہوں۔ تم سناؤ کیسی گذر رہی ہے" ایوانے اپنی بہن کی طرف اشارا کرکے کہا "ان سے ملو۔ یہ میری بہن ماریا ہے، میرا خیال ہے۔ تم ماریا سے پہلی بار مل رہے ہو اور ماریا یہ میرے دوست جارج ملر ہیں۔"
جارج نے ماریا کا سرخ و سفید اور نرم و نازک ہاتھ تھاما اور سر کو قدرے خم کرکے بولا "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ اگر آپ یہاں اکیلی ہوتیں تو یقیناً میں آپ کو ایوا ہی سمجھتا۔
ماریا بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی مردانہ وار وجاہت اور شائستہ اطوار سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔
ایوانے خالی کرسی کی طرف اشارا کرکے کہا "بیٹھو جارج۔ میں تمہارے لیے بھی کھانا منگوا رہی ہوں۔ تم ساتھ دوگے تو کھانے کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔"
"کاش میں آپ کا ساتھ دے سکتا۔ مجھے بے حد افسوس ہے لیکن میں مجبور ہوں۔ میری ملاقات پہلے ہی ایک صاحب سے طے پا چکی ہے۔ اور وہ شیرٹن ہوٹل میں میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مجھے امید ہے کہ بہت جلد ہم تینوں کی ملاقات ہوگی اور میں آپ کی خوبصورت بہن سے تفصیلی ملاقات حاصل کرسکوں گا۔ اجازت چاہتا ہوں۔"
جارج کے رخصت ہوتے ہی ماریا نے پلٹ کر اپنی بہن کو دیکھا اور پرجوش لہجے میں بولی "تمہارا دوست کتنی شاندار شخصیت کا مالک ہے! کون تھا وہ؟"
"تم اُسے یونان کا شہزادہ کہہ سکتی ہو۔ اس کا تعلق وہاں کے ایک کروڑپتی گھرانے سے ہے۔ میری اس سے ملاقات نینا کے توسط سے ہوئی تھی۔"
"میں پاگل ہوگئی ہوں یا وہ واقعی سحر انگیز شخصیت کا مالک ہے؟" ماریا نے کہا۔
ایوانے قہقہہ لگایا اور بولی "بلاشبہ اس کی شخصیت اتنی ہی سحر انگیز ہے۔ میں نے تقریب میں لڑکیوں کو اُس کے پیچھے خوار ہوتے دیکھا ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اُس نے کسی بھی لڑکی میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ زیادہ تر وقت وہ مردوں سے باتیں کرتا رہا تھا۔ اور لڑکیاں شہد کی مکھیوں کی طرح اُس کے اردگرد منڈلاتی رہی تھیں اور ان لڑکیوں میں، میں شامل نہیں تھی، کیونکہ وہ میرے ٹائپ کا مرد نہیں ہے۔"
"اُن بے چاری لڑکیوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ظالم کی شخصیت ہی ایسی ہے کہ دل کھینچا چلا جاتا ہے۔ کیا وہ شادی شدہ ہے؟"
"نہیں ابھی تو اس کی منگنی بھی نہیں ہوئی۔ درجنوں حسین و جمیل اور دولت مند لڑکیاں اس سے شادی کرنا چاہتی ہیں اور وہ مسلسل ان کے صبر و ضبط کا امتحان لے رہا ہے۔" اور پھر ایوانے بڑی مشاقی سے موضوع تبدیل کردیا۔ اب وہ نئے فیشن کے ملبوسات پر گفتگو کر رہی تھی
اُس رات ماریا کو رات گئے تک نیند نہیں آئی۔ دراز قد اور وجیہہ جارج اس کے خیالات کا محور تھا۔ وہ مسلسل اس کی سحر انگیز اور دلکش شخصیت پر غور کر رہی تھی۔ وہ نرم اور ریشمی بستر پہ بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی۔ پھر نیند کی مہربان دیوی نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا
پیر کی دوپہر ایوانے ماریا کو فون کیا اور چھوٹتے ہی بولی "لگتا ہے تم نے اس یونانی کا طلسم توڑ دیا ہے۔ تمہارا جادو سر چڑھ کے بول رہا ہے۔ وہ تم سے بہت متاثر ہے ماریا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے مجھے فون کیا تھا۔ وہ مجھ سے تمہارا فون نمبر مانگ رہا تھا۔
ماریا کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اتنا وجیہہ و شکیل شخص اس کی رفاقت کا طلب گار ہو سکتا ہے۔ چند لمحوں کو وہ جارج سے متعلق سہانے سپنوں میں کھو گئی تھی۔ لیکن پچھلے تجربات کے پیش نظر وہ بہت جلد حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئی تھی۔
ماریا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ وہ گڑبڑا کے کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی "کیا۔۔۔۔۔ کیا تمہیں۔۔۔۔۔ واقعی تمہیں جارج سے دلچسپی نہیں ہے؟ میں تمہاری حق تلفی کرنا نہیں چاہتی۔"
"ارے نہیں۔ میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔ میری جان۔ وہ میرے ٹائپ کا نہیں ہے۔ تم بڑے شوق سے اس سے مل سکتی ہو۔"
"اگر یہ بات ہے تو تم اسے میرا فون نمبر دے سکتی ہو۔"
دونوں بہنیں چند منٹ ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔ پھر ایوانے رابطہ منقطع کردیا۔ اس نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور پلٹ کر جارج کو دیکھتی ہوئی بولی "میں نے دانہ ڈال دیا۔ شکار بہت جلد تمہارے دام میں ہوگا۔"
"میری اس سے ملاقات کب ہوگی؟"

"جب میں تم سے کہوں گی۔ میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ تمہیں میری ہدایات پر لفظ بلفظ عمل کرنا ہوگا۔

دوسری طرف ماریا کا برا حال ہو رہا تھا۔ جارج اس کے دل و دماغ پر چھا گیا تھا۔ اس نے کئی بار چاہا کہ اس یونانی شہزادے کا خیال دل سے نکال دے لیکن وہ اپنی اس کوشش میں چند منٹ کے لئے بھی کامیاب نہیں ہو سکی۔

آخر وہی ہوا جس کا ماریا کو ڈر تھا۔ پورا ہفتہ تجسس، انتظار اور امید و بیم کی کیفیت میں گزر گیا۔ فون خاموش رہا، گیٹ کی گھنٹی بے سوت رہی۔ ماریا کو یوں محسوس ہوا جیسے اس شہر میں کوئی رہتا ہی نہیں۔ ماریا کی بیتابی اور بے قراری پہلے بوریت اور جھلاہٹ میں اور اب غصے اور نفرت میں بدل چکی تھی۔

ہفتے کے آخر میں فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ماریا نے بے دلی سے فون اٹھایا اور جارج کی شیریں آواز سنتے ہی جیسے اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ اس کے کانوں میں رس گھول رہا تھا۔

"میں جارج لمز بول رہا ہوں" وہ دھیمی آواز میں بولا "آپ سے مختصر سی ملاقات ایک ریستوران میں ہوئی تھی۔ آپ کی بہن ایوا نے آپ سے میرا تعارف کرایا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ایوا سے آپ کا فون نمبر مانگا تھا۔ شکر ہے آپ نے میری اس جسارت کا برا نہیں مانا۔"

"مجھے یاد پڑتا ہے۔ اس نے کہا تو تھا کہ آپ مجھے فون کریں گے۔" ماریا نے سرسری انداز میں کہا "اور ہاں۔ اس روز دوپہر کے کھانے کا بہت بہت شکریہ۔"

"اس میں شکریہ کی کیا بات ہے۔" وہ ہنس کر بولا "سچی بات تو یہ ہے کہ اس روز کی ملاقات بے حد تشنہ رہی۔ کیا آپ ایک شام میرے لیے وقف کر سکیں گی؟"

"جی ... میں ... جی ہاں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"مس ماریا، عزت افزائی کے لیے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولا "اگر آپ انکار کر دیتیں تو یقین مانیے میرا دل ٹوٹ جاتا۔ بات یہ ہے کہ بیری اسٹریٹ میں میرا پسندیدہ ریستوران ہلیوموں ہے۔ وہاں کے کھانے ...."

"ہلیوموں تو میرا بھی پسندیدہ ریستوران ہے۔" ماریا نے اس کی بات کاٹ کر کہا "میں رات کا کھانا اکثر وہیں کھاتی ہوں۔"

جارج ماریا سے چند منٹ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر الوداعی رسمی کلمات کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ وہ مسکراتے ہوئے ایوا کو دیکھنے لگا۔ وہ اس حسین لڑکی کی ذہانت کا قائل ہو گیا تھا۔ اس نے غضب کا ذہن پایا تھا۔ گذشتہ تین چار روز میں اس نے جارج کو اپنی بہن ماریا کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ چیزوں اور عادات و اطوار کی پوری تفصیل بتا دی تھی۔

کھیل کا آغاز ہو چکا تھا۔ ایوا کی زیر ہدایت جارج بہترین اداکاری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

✡

وہ شام ماریا کی زندگی کی حسین ترین شام تھی۔ دراز قامت اور وجیہہ جارج کو دیکھتے ہی اس کا دل سینے میں بری طرح دھڑ دھڑا رہا تھا۔ پہلے تو انہوں نے مشروب کا ایک ایک گلاس پیا اور پھر جارج نے کھانوں کی فہرست ماریا کی طرف بڑھا دی۔ ماریا ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔ اس نے کھانوں کی فہرست جارج کی طرف بڑھا دی اور اسے آرڈر دینے کی استدعا کی۔ جارج نے ماریا کی پسندیدہ ڈشوں کا آرڈر دیا تو وہ حیران ہی رہ گئی۔ ان کی پسند ایک دوسرے سے کتنی ملتی تھی!

جارج کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ تھی۔ اس دلکش مسکراہٹ نے ماریا کا دل موہ لیا تھا۔

ماریا نے سر جھکا لیا۔ اور قدرے ہچکچاتے ہوئے پوچھا "تم شادی شدہ ہو؟"

"نہیں۔ البتہ میں نے عرصہ پہلے ایک لڑکی سے منگنی ضرور کی تھی لیکن پھر مجھے لڑکی کی کئی ناقابل برداشت خامیوں کا علم ہوا تو میں نے منگنی توڑ دی۔" جارج آگے جھکا اور سرگوشی کے سے انداز میں بولا "ماریا۔ تم مجھے پرانے خیالات کا اور قدامت پرست تو کہو گی۔ لیکن میں تم سے یہ ضرور کہوں گا کہ جب بھی کسی لڑکی سے میری شادی ہوگی۔ وہ انتہائی پائیدار اور مستقل نوعیت کی ہوگی۔ ایک عورت میرے لیے بہت کافی ہے لیکن وہ عورت بالکل صحیح اور سمجھ دار ہونی چاہیے۔"

"تمہارے خیالات تو بہت اچھے اور پاکیزہ ہیں۔" ماریا نے کہا۔

"تم اپنے بارے میں کیا کہتی ہو" جارج نے بے باکی سے پوچھا "کیا تم نے کبھی کسی سے پیار کیا ہے؟"

شرم سے ماریا کا چہرہ گلنار ہو گیا اور وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی "نہیں .... آج تک کوئی بھی مرد میری زندگی میں نہیں آ سکا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ میں اپنی بہن کی طرح فطری طور پر بے باک اور خوش گفتار نہیں ہوں۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" وہ ماریا کا کپکپاتا ہاتھ تھام کے بولا "مجھے شرمیلی اور کم گو لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔"

ویٹر کے آنے سے جارج کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ وہ ان کے لیے سویٹ ڈش لایا تھا۔ ماریا کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ جارج سے اپنی بات مکمل کرنے کی استدعا کرنا چاہتی تھی۔ مگر اس میں اتنا حوصلہ ہی کہاں تھا کہ مدعا زبان پر لا سکتی۔ ماریا نے آج تک کسی مرد سے اتنی بے تکلفی سے گفتگو نہیں کی تھی۔ جارج نے اس میں بھرپور دلچسپی لی تھی۔ اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ اس کی نرم اور شیریں گفتگو

نے ماریا کا کھویا ہوا اعتماد خاصی حد تک بحال کر دیا تھا۔ وہ اب جارج سے کھل کے باتیں کر رہی تھی۔ اسے اپنے بچپن اور نوعمری کے دلچسپ تجربات بتا رہی تھی۔ جارج تمام تر توجہ اور دلچسپی سے اس کی بیزار کن باتیں سن رہا تھا اور دل ہی دل میں الوا کو صلواتیں سنا رہا تھا۔

ماریا اب تک یہ سمجھنے سے قاصر رہی تھی کہ الوا نے اس وجیہہ اور ذہین نوجوان کو کیوں نظر انداز کر دیا تھا؟ وہ اپنی بہن کی احسان مند تھی کہ اس نے انتہائی فراخدلی سے اس یونانی دیوتا سے اس کا تعارف کرایا تھا۔ کھانے کے دوران میں ماریا نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ ہال میں بیٹھی ہوئی تمام عورتیں حسرت بھری نظروں سے جارج کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان کے چہروں پر اپنے لیے رشک و حسد کے تاثرات صاف طور پر پڑھ سکتی تھی۔ ماریا کا سر فخر سے تنا ہوا تھا اور اس کے لیے سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ تھی کہ جارج نے چند لمحوں کے لیے بھی اپنی توجہ کسی دوسری عورت پر مبذول نہیں کی تھی۔ وہ مسلسل اس کے حسین چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

کافی کے دوران جارج نے اسے مشہور کھیل "بارش اور لڑکی" دکھانے کی دعوت دی اور وہ حیران ہی تو رہ گئی۔ یہ اس کا پسندیدہ کھیل تھا۔ یہ خوبصورت رومانی ڈراما وہ پانچ مرتبہ دیکھ چکی تھی اور چھٹی بار دیکھنے کی خواہشمند تھی۔ اس نے جھٹ یہ دعوت منظور کر لی اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ ہال میں سب سے اونچی کلاس میں بیٹھے کھیل سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

کھیل کے اختتام پر جارج اسے "پناہ گاہ" نامی شبینہ کلب میں لے گیا۔ یہ جگہ بھی ماریا کی پسندیدہ تھی۔ وہ یہاں کئی بار اپنی سہیلیوں کے ساتھ آچکی تھی۔ لیکن اتنی رات گئے کسی مرد کے ساتھ "پناہ گاہ" میں آنے کا یہ اس کا پہلا اتفاق تھا۔ انہوں نے خوش ذائقہ اور فرحت بخش مشروبات کے تین چار گلاس پیئے اور اپنی پسند کے مختلف کھیل مشینوں پر کھیلتے رہے۔

وہ "پناہ گاہ" سے رخصت ہوئے تو رات کے دو بج رہے تھے۔ ماریا کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اتنا وقت گزر چکا ہے۔ جدائی کے لمحات قریب آرہے تھے اور ماریا کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ یہ تصور ہی جان لیوا تھا کہ اب سے تھوڑی دیر بعد وہ اس سے رخصت ہو جائے گا۔ جارج کی کرائے کی رولز رائس میں گھر جاتے ہوئے ماریا عجیب سی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ باوردی ڈرائیور باوقار انداز میں کار چلا رہا تھا۔ اور وہ جارج کے برابر خاموش اور اداس بیٹھی تھی۔ جارج بھی خاموش تھا اور ان دونوں بہنوں کے بارے سوچ رہا تھا۔ ان کی حیرت انگیز مشابہت پر غور کر رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" ماریا نے اس کا بازو پکڑ کے پوچھا۔

جارج نے بہ دقت تمام اپنی وحشت پر قابو پایا اور مسکرا کے بولا "تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ تم نے کسی اور کے بارے میں سوچنے سمجھنے کے قابل ہی کہاں چھوڑا ہے..... میں سچ کہہ رہا ہوں ماریا۔ بیسیوں لڑکیاں میری دوست ہیں۔ وہ مجھ سے ملاقات کو، میری رفاقت کو ترس رہی ہیں۔ میں اپنے حلقے میں "پلے بوائے" کے نام سے پہچانا جاتا ہوں۔ لیکن لگتا ہے اب یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا اور میں صرف اور صرف تمہاری زلفوں کا اسیر ہو کے رہ جاؤں گا۔ لگتا ہے تم مجھے یکسر تبدیل کر دو گی۔"

یہ سب ناقابل یقین تھا۔ خواب و خیال کی باتیں تھیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس یونانی دیوتا کے دل و دماغ پر چھاتی جا رہی تھی۔ وہ پہلی ہی تفصیلی ملاقات میں اس کے نام کی مالا جپنے لگا تھا۔ ماریا سرتاپا خزاں رسیدہ پتے کی مانند کپکپا رہی تھی۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس کا دل بھی بے قابو ہو رہا تھا۔ اس طرح دھڑ دھڑ دھڑ رہا تھا جیسے ابھی سینہ توڑ کر باہر آجائے گا۔ بڑی مشکلوں سے اس نے اپنی وحشت پر قابو پایا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولی "میری ..... میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے..... پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میرے سوچنے سمجھنے اور بولنے کی صلاحیتیں سلب سی ہو گئی ہیں۔"

"پلیز۔ کچھ نہ کہو۔ میں تمہاری کیفیت کو سمجھتا ہوں۔ میرا اپنا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔" جارج نے جذباتی انداز میں اس کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا۔ وہ اس ڈری سہمی جذباتی لڑکی کو اپنے مضبوط بازوؤں میں سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ لیکن باوجود کوشش کے وہ ایسا نہ کر سکا۔ وہ اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گیا تھا اور ماریا کے جملے اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ جو اس نے اپنی بہن کے بارے میں اسے خبردار کرتے ہوئے کہے تھے۔ "ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو جارج۔ میں اپنی بہن کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اس کی رگ رگ کو جانتی ہوں۔ تمہیں اپنے آپ کو قابو میں رکھنا ہو گا۔ اس بارے میں تم نے ذرا بھی عجلت برتی تو ہمارا سارا منصوبہ خاک میں مل جائے گا۔ میری بہن بہت ہی حساس اور جذباتی ہے۔ اگر پہلی ہی ملاقات میں تم نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو وہ بدک جائے گی اور تم فوراً ہی اس کی نظروں سے گر جاؤ گے۔ اگر تم اسے اور اس کی بے پناہ دولت کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو تمہیں اپنے سرکش جذبات پہ قابو رکھنا ہو گا۔ ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہو گا۔"

جارج نے الوا کی ان ہدایات کے پیش نظر ماریا کا ہاتھ تھامے رہنے پر ہی اکتفا کیا۔ وہ اس کی پیش قدمی کے لیے بالکل تیار تھی۔ لیکن جارج نے اسے مایوس ہی کیا۔ کار ماریا کی شاندار رہائش گاہ کے سامنے رک گئی۔ جارج اسے صدر دروازے تک رخصت کرنے گیا..... دروازے کے قریب پہنچ کر ماریا نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور دھیمی آواز میں بولی "بہت بہت شکریہ جارج۔ آج کی شام میری زندگی کی حسین ترین شام تھی۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ میں کس قدر لطف اندوز ہوئی ہوں۔"

"آج کی شام کے بارے میں میرے جذبات اور احساسات بھی کم و بیش اسی قسم کے ہیں۔ میں نے سینکڑوں خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ ہزاروں شامیں گزاری ہیں۔ لیکن آج کی یہ حسین ترین شام میں اپنی آخری سانسوں تک نہیں بھلا سکوں گا۔"

ماریا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی "تم سے جدا ہونے کو دل تو نہیں چاہ رہا۔ لیکن دادی جان کے ڈر سے مجبوراً رخصت ہو رہی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم میری رفاقت میں بور نہیں ہوئے ہوگے۔ اچھا خدا حافظ۔ شب بخیر"

پندرہ منٹ بعد وہ اپنے فلیٹ پر موجود تھا۔ وہ کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے فارغ ہی ہوا تھا کہ ایک خیال بجلی کی طرح اُس کے ذہن میں کوندگیا۔ وہ ماریا پر قابو پانے کے لیے ایک اور حربہ آزمانا چاہ رہا تھا۔ اُس نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیا۔ چند ہی لمحوں بعد وہ ماریا سے مخاطب تھا۔ "تمہیں معلوم ہے گھر پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلا کام کیا کیا تھا؟ میں نے اپنے گھر ٹیلیفون کیا تھا۔ میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ آج رات دنیا کی حسین ترین لڑکی سے میری ملاقات ہوئی تھی اور میں نے اپنی زندگی کی سب سے اچھی شام اُس لڑکی کے ساتھ گزاری ہے۔ میں اب تمہیں زیادہ زحمت دینا نہیں چاہتا۔ یقیناً آج کی ہنگامہ خیز شام نے تمہیں تھکا دیا ہوگا۔ اب تم آرام سے سو جاؤ۔ شب بخیر" اس نے ریسیور آہستگی سے کریڈل پر رکھ دیا

ماریا کی پھر۔ ۔ ۔ جارج سے ملاقات نہ ہوسکی۔ دوسرے روز وہ صبح سے رات گئے تک ٹیلیفون کے پاس جمی رہی مگر اس کی گھنٹی بے صوت رہی۔ اس کی بھوک پیاس اڑ گئی تھی۔ وہ گھنٹوں حسرت بھری نظروں سے فون کو دیکھتی رہی اور پھر اس بے قراری اور کرب کے عالم میں دوسرا روز بھی گزر گیا۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ دوسرے روز کا سورج غروب ہوا تو ماریا کی امیدیں دم توڑنے لگیں۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ ان دوسرے تمام مردوں کی طرح جارج بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا ہے۔

ان دو دنوں میں جب بھی ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تھی۔ ماریا نے جھپٹ کے ریسیور اٹھایا تھا اور ہر مرتبہ اسے مایوسی ہوئی تھی۔ کئی بار اس کی آنکھیں بھیگی تھیں اور لاتعداد مرتبہ اس نے سرد آہیں بھری تھیں۔ وہ مسلسل اپنے آپ کو تسلیاں دے رہی تھی۔ اس کے نہ آنے کی مختلف وجوہ اور تاویلیں پیش کر رہی تھی پورا ہفتہ انتظار کی گھڑیاں گنتے ہوئے کرب کے عالم میں گزر گیا اور پھر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور الوا کا نمبر ڈائل کر دیا۔ وہ اپنی بہن سے چند منٹ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی اور پھر مطلب پر آتی ہوئی بولی "ارے ہاں۔ وہ حضرت جارج ملز کہاں ہیں؟ کیا ان دنوں تمہاری ان سے ملاقات ہوئی ہے؟"

"نہیں تو..... میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ وہ میرے ٹائپ کا نہیں ہے۔ وہ تم سے ملنے کے لیے بیتاب تھا۔ تمہیں رات کے کھانے پر مدعو کرنا چاہتا تھا۔ پھر کیا ہوا؟"

"پچھلے ہفتے اس نے مجھے رات کے کھانے پر بلایا تو تھا۔ ہم نے "بارش اور لڑکی" ڈراما بھی دیکھا تھا۔ اس کے بعد تو وہ غائب ہی ہوگیا۔ نہ اس نے ملاقات کی اور نہ ہی اس کا فون آیا ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ خدانخواستہ اسے کوئی حادثہ تو پیش نہیں آگیا"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کے اسکینڈل اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں۔ اگر اسے کوئی حادثہ پیش آیا ہوتا تو یہ خبر اخبارات میں ضرور شائع ہوتی۔ خیر، تم جارج ملز کو بھول جاؤ۔ مجھے تو وہ شخص ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ میں تمہاری ملاقات وجیہہ اور ذہین نوجوان سے کراؤں گی۔ وہ ایک جہازراں کمپنی کا مالک ہے اور......"

الوا اسے نوجوان کے بارے میں بتاتی رہی اور ماریا بے دلی سے سنتی رہی۔ اسے اب جارج کے سوا دنیا کے کسی بھی مرد سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ الوا نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور ایک گہرا سانس لے کر پشت صوفے سے ٹکا دی۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔ مگر جارج نے اب تک ماریا سے رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ دو ہفتے ہوگئے تھے مگر اُس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی تھی اور اب تو وہ مایوس ہوگئی تھی۔ دفتر میں بھی کسی کام میں اُس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ چڑچڑی ہوگئی تھی۔ اور بات بے بات دفتر کے چھوٹے ملازمین کو بُری طرح لتاڑنے لگی تھی۔ غصہ اُس کی ناک پہ دھرا رہتا تھا اور وہ قصوروار جارج کو نہیں اپنے آپ کو ٹھہراتی تھی کہ وہ اب تک باوجود کوشش کے اُسے فراموش نہیں کرسکی تھی۔ اُس نے جارج کو اپنے دل و دماغ سے نکالنے کی کئی مرتبہ کوشش کی تھی مگر بُری طرح ناکام رہی تھی۔ .... وہ رات گئے تک بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہتی تھی اور جب نیند آجاتی تھی۔ تو جارج اُس کے سپنوں میں اُسے پریشان کرنے آجاتا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ الوا کو دل ہی دل میں کوسنے دیے تھے کہ فساد کی جڑ وہی تھی۔ اسی نے جارج کا تعارف اُس سے کرایا تھا اور اب وہ وجیہہ نوجوان ایک روگ کی طرح اُس سے چمٹ گیا تھا۔

دفتر میں ماریا کے میز پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجی تو وہ حیرت سے اُسے دیکھنے لگی۔ ڈرتے ڈرتے اُس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا اور پھر جارج کی آواز سن کر اُس کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آگیا۔ اُس کے مُنہ سے کوئی آواز نہیں نکل سکی۔ زبان جیسے گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔

"ماریا؟ تم موجود ہو نا؟ میں تمہارا دوست جارج ملز بول رہا ہوں"

"ہاں جارج۔ کہو کیا بات ہے" ماریا بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔ اس وقت اُس کے تاثرات عجیب سے تھے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ قہقہے لگائے یا آنسو بہائے۔ وہ دو متضاد کیفیتوں کا شکار تھی۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ جارج نے اُسے یاد تو کیا تھا۔

"سب سے پہلے تو میں اتنی تاخیر سے فون کرنے پر تم سے معذرت چاہتا ہوں" جارج نے نرم لہجے میں کہا۔ "اگر میں نیویارک میں ہوتا تو میں تم سے ضرور رابطہ قائم کرتا لیکن مجھے اچانک ہی یونان جانا پڑ گیا تھا۔ میں نے ایتھنز سے دو تین مرتبہ تمہیں فون کرنا چاہا

لیکن موسم کی خرابی کے باعث سلسلہ قائم نہ ہو سکا۔ میں چند منٹ قبل ہی ایتھنز سے نیویارک پہنچا ہوں۔"

ماریا کا دل موم کی طرح پگھل گیا۔ اس کا تمام تر غصّہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور وہ تعجب خیز لہجے میں بولی۔ "کیا واقعی تم ایتھنز گئے تھے؟ کہیں تم مجھے ستا تو نہیں رہے تھے؟"

"نہیں میری جان۔ اس شہر میں رہتے ہوئے تم سے ملے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔ ہمارے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ حائل ہو گیا تھا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ وہاں تمہارے بغیر دو ہفتے کتنے بے کیف اور پھیکے گزرے تھے۔ مجھے ہر لمحے تمہاری یاد ستاتی تھی۔"

"تمہاری باتیں ناقابلِ یقین ہیں جارج۔ کیا واقعی میرے بغیر تمہارا دل نہیں لگا تھا؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں ماریا۔ اگر مجبوری نہ ہوتی تو میں نیویارک کبھی نہ چھوڑتا۔ میرے بھائی کا فون آیا تھا۔ ابّو پر دل کا دورہ پڑا تھا۔"

"اوہ جارج!" ماریا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "مجھے یہ سن کر بے حد افسوس ہوا ہے۔ اب ان کی طبیعت کیسی ہے؟"

"شکر ہے خدا کا! بروقت طبّی امداد سے ان کی جان بچا لی گئی۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ میں نیویارک آ رہا تھا تو وہ رو رہے تھے۔ گڑگڑا رہے تھے۔ مجھ سے کاروبار سنبھالنے کی التجائیں کر رہے تھے۔"

ماریا کو اپنا سانس اٹکتا محسوس ہوا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے پوچھ ہی لیا "تو کیا تم واپس چلے جاؤ گے؟"

"نہیں ماریا" جارج نے ایک سرد آہ بھر کے جواب دیا "تم سے ملاقات نہ ہوتی تو میں شاید چلا بھی جاتا۔"

جارج نے ماریا کو کھانے کی دعوت دی جسے اس نے فوراً قبول کر لیا۔ دفتر کی چھٹی میں ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ مگر اب وہ ایک لمحہ بھی یہاں رک نہیں سکتی تھی۔ اسے بناؤ سنگار کے لیے بیوٹی سیلون جانا تھا۔ لباس کا انتخاب کرنا تھا۔ وہ جارج کو متاثر کرنے کے لیے تمام نسوانی حربے آزمانا چاہتی تھی۔ جارج نے اس کے پسندیدہ ریستوران میں اُسے مدعو کیا تھا۔

اُدھر جارج نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور دل ہی دل میں الوا کے شاندار منصوبے کی داد دینے لگا۔ آج پہلی بار اسے یقین ہوا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے اور یہ سب الوا کی ہدایت کاری کا کمال تھا۔ وہ قدم قدم پر اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔ بڑی محنت سے اس کی تربیت کر رہی تھی۔

پروگرام کے مطابق جارج آدھ گھنٹہ تاخیر سے سات بجے مضافات کے ایک خوبصورت اور پُرسکون ریستوران میں پہنچا تو ماریا ایک گوشے میں اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ اس کی نظریں صدر دروازے پر مرکوز تھیں اور وہ بار بار اپنی ہیروں والی مہنگی کلائی گھڑی دیکھ رہی تھی۔۔۔ پچھلی ملاقات پر بھی جارج کا دل اس قیمتی گھڑی پر للچایا تھا۔ وہ گھڑی کو مانگ لینا چاہتا تھا مگر الوا کے حکم نے اس کی زبان پر تالا ڈال دیا تھا۔

جارج نے ماریا کو اپنے فلیٹ پر چلنے کی دعوت دی جو اس نے قدرے ہچکچاہٹ سے منظور کر لی۔ وہ خود بھی چند گھنٹے تنہائی میں اس وجیہہ شخص کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔

ماریا نے جارج کے چھوٹے سے خوبصورت فلیٹ میں اس کی رفاقت میں جو وقت گزارا وہ اُسے عمر بھر فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ وہ آج تک کسی مرد سے اس قدر قریب نہیں ہوئی تھی۔ جارج نے اس دوران میں اپنے وحشیانہ اور سرکش جذبات پر الوا کی ہدایت کے پیشِ نظر قابو رکھا تھا۔ الوا کے کہے ہوئے الفاظ مستقل اس کے کانوں میں گونجتے رہے تھے "اپنے اُوپر قابو رکھنا اگر تم اپنی اصلیت پر اتر آئے تو سارا معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔ اگر اُسے معلوم ہو گیا کہ تم تشدد پسند ہو تو وہ تم سے سخت نفرت کرنے لگے گی اور تم پھر اُسے کبھی نہیں دیکھ پاؤ گے۔ اپنی وحشت اور بربریت کسی اور کے لیے محفوظ رکھنا۔ میں ایک مرتبہ پھر تمہیں خبردار کر رہی ہوں۔ میری بہن بہت حساس ہے اور آج تک کسی مرد سے اس نے زیادہ بے تکلفی اور بے باکی سے بات چیت بھی نہیں کی۔ امید ہے کہ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔"

جارج نے الوا کی ہدایت پر حرف بہ حرف عمل کیا تھا۔ اس نے ماریا کے جذبات کو ذرا سی بھی ٹھیس نہیں لگنے دی تھی۔ کئی مرتبہ اس کا جی مچلا تھا۔ تڑپا تھا۔ وہ بُری طریقے سے حسین اور نرم و نازک ماریا کی پٹائی کرنا چاہتا تھا مگر اس نے یہ سوچ کر خود کو باز رکھا تھا کہ وہ پھر کبھی موقع ملنے پر ساری کسر نکال لے گا۔

پیار و محبت کے معاملے میں غلط فہمیاں ضرور جنم لیتی ہیں۔ رشک و حسد کے جذبات ابھرتے ہیں۔ انا کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ لیکن جارج اور ماریا کی محبت کا معاملہ یکسر مختلف تھا۔ جارج کو الوا کی مکمل رہنمائی حاصل تھی اور وہ بڑی ذہانت اور مشاقی سے ماریا کے جذبات سے کھیل رہا تھا اور اب تو وہ اس کے پور پور سے واقف ہو چکا تھا۔ اُسے اندازہ رہتا تھا کہ ماریا کب ہنسے گی۔ کب روئے گی اور کب پُرجوش ہو جائے گی۔ اس نے ماریا کی زندگی کے خلا کو بھرپور انداز میں پُر کر دیا تھا۔ وہ محبت کی پیاسی تھی، پیار کی بھوکی تھی۔ جارج کی رفاقت حاصل ہونے کے بعد وہ اپنے آپ کو دنیا کی سب سے خوش نصیب لڑکی سمجھنے لگی تھی۔ جارج کو پیار و محبت کے اس ناٹک سے بوریت محسوس ہوتی تھی۔ مگر اس کی عظیم الشان دولت کا تصور اُسے ماریا سے پیچھا چھڑانے سے باز رکھتا تھا۔ دن بدن اس کی بے زاری بڑھتی جا رہی تھی اور ادھر ماریا اس کے بغیر سخت بے چین اور مضطرب رہتی تھی۔ وہ گھنٹوں رات کو اپنے کمرے میں بند فون پر جارج سے گفتگو کرتی تھی یا پھر اس کی تصویر کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی تھی۔ جارج اپنے جذبات کی تسکین کے لیے رات گئے تک گھٹیا شراب خانوں اور کلبوں میں چکر لگاتا رہتا تھا۔ اس دوران میں وہ کئی ادھیڑ عمر عورتوں کو شہر سے باہر سنسان مقامات پر لے گیا تھا اور جی بھر

کے اُن کی مرمت کی تھی۔ اس نے کئی ایک طوائفوں کو سستے ہوٹلوں میں لے جا کر بھی زدوکوب کیا تھا۔
الوا نے اس پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا تھا اور یہ بات اس کی فطرت کے قطعی منافی تھی۔ اگر اُسے الوا کے خاندان کی دولت کا خیال نہ ہوتا تو وہ الوا کی ہڈی پسلی ایک کر دیتا۔ اُس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ ماریا سے شادی کے بعد وہ الوا سے اپنی تذلیل کا جی بھر کے بدلہ لے گا۔ وہ الوا کی اتنی مرمت کرے گا کہ وہ اُس سے موت کی بھیک مانگے گی۔

ماریا شب و روز جارج کے حسین تصورات میں کھوئی رہتی تھی۔ وہ اس کا بے پناہ خیال رکھتا تھا۔ اُس کی پسند کے پھول، گراما فون ریکارڈ اور کتابیں آئے دن بھجواتا تھا وہ اُسے عجائب گھروں کی سیر کراتا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ آرٹ کے معاملے میں بھی دونوں کی پسند یکساں تھی۔ وہ الوا کی پسندیدہ پینٹنگز کو جنون کی حد تک چاہتا تھا اور ماریا یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ خدا نے جارج کو اسی کے لیے تخلیق کیا ہے۔ وہ باوجود کوشش کے جارج میں ذرا سی بھی خامی تلاش نہیں کر پائی تھی۔ وہ ہر اعتبار سے ایک مکمل مرد تھا۔ اُسے جارج سے اچھا جیون ساتھی نہیں مل سکتا تھا۔ ماریا نے اس کی شریک حیات بننے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اُس کی بے تابی بڑھتی جا رہی تھی۔ جارج کو وہ جلد از جلد اپنی دادی اماں سے ملانا چاہتی تھی۔ شادی کے لیے اُن کی رضا اور منظوری ازحد ضروری تھی۔ لیکن جارج کیٹ سے ملاقات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اب تک وہ حیلوں بہانوں سے ماریا کو ٹالتا رہا تھا۔

بالآخر ایک روز ماریا مُصر ہو گئی اُس نے جارج کے شانے پر ہاتھ رکھا اور پیار بھرے لہجے میں بولی "میری سمجھ میں نہیں آتا تم دادی اماں سے ملنے سے کیوں کتراتے ہو۔ وہ بہت اچھی ہیں۔ مجھ سے بے پناہ محبت کرتی ہیں۔ اُن سے مل کر تم بہت خوش ہو گے تم سمجھتے کیوں نہیں میں اُن کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی۔ میری شادی کا فیصلہ وہ ہی کر سکتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں بہت پسند کریں گی۔"

"مجھے بھی یقین ہے کہ میں انہیں بھی متاثر کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔" جارج نے سولہ سترہ سالہ لڑکے کی طرح شرماتے ہوئے کہا۔ "پتہ نہیں کیوں مجھے اُن سے ملتے ہوئے خوف سا ہوتا ہے۔ خدشات میرے دل کو گھیر لیتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں، پتہ نہیں میں ان کے معیار پر پورا بھی اتروں گا یا نہیں۔ ممکن ہے تمہارے شوہر کی حیثیت سے وہ مجھے پسند نہ کریں۔ اگر ایسا ہوا تو میں زندہ نہیں رہ سکوں گا۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو جارج۔" ماریا نے اُس کی پشت پر تھپکی دیتے ہوئے کہا "میں دادی اماں کو جانتی ہوں۔ اُن کی طبیعت کو سمجھتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں بہت پسند کریں گی۔"

"اچھی بات ہے۔" جارج نے ایک گہرا سانس لے کر کہا "میں بہت جلد ہمت کر کے اُن سے مل لونگا۔"

اسی رات جارج نے الوا سے اس بارے میں ملاقات کی۔ وہ چند لمحے کچھ سوچتی رہی، پھر بولی "ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے اب وقت آگیا ہے کہ تم بڑی بی سے مل ہی لو۔ جلد یا بدیر یہ مرحلہ آنا ہی تھا۔ لیکن ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ اُن کے سامنے تمہاری وہی حیثیت ہو گی جو ایک ہرن کی شیر کے سامنے ہوتی ہے۔ وہ بہت چالاک ہیں۔ قیافہ شناسی میں اُن کا جواب نہیں ہے وہ انسانی نفسیات کی بہت بڑی ماہر ہیں۔ چند ہی منٹ میں وہ تمہارے جسم میں گھس جائیں گی اور تمہارے بارے میں بہت کچھ معلوم کر لیں گی۔ ایک لمحے کے لیے بھی اُن سے غافل نہ ہونا۔ ملاقات کے دوران تمہیں جاندار اداکاری کا مظاہرہ کرنا ہو گا۔ ہمارے منصوبے کا مشکل ترین مرحلہ یہ ہی ہے۔ اگر تم اپنے آپ کو منوانے میں کامیاب ہو گئے تو سمجھ لو کہ یہ بازی ہم جیت لیں گے۔"

✲

ماریا اپنی زندگی میں اتنی پریشان اور خوفزدہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ آج رات فیصلے کی رات تھی۔ دادی اماں جارج سے رات کے کھانے پر ملاقات کر رہی تھیں۔ ماریا صبح ہی سے دعائیں مانگ رہی تھی۔ آج کی ملاقات پر اس کے مستقبل کا دارومدار تھا۔ وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی۔ یہ اُس کی زندگی کا نازک ترین اور انتہائی سنگین مرحلہ تھا۔ اس وقت اُس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہی تھی کہ دادی اماں اور جارج ایک دوسرے کو پسند کر لیں۔ اُسے جارج کی صلاحیتوں پر پورا بھروسہ تھا۔ مگر وہ کیٹ کے بارے میں کوئی بات حتمی طور پر نہیں کہہ سکتی تھی۔

اُدھر کیٹ مسلسل اپنی پوتی پر نظریں جمائے ہوئے تھیں۔ اس سے پہلے انہوں نے کبھی ماریا کو اتنا خوش اور پرجوش نہیں دیکھا تھا۔ اس سے پہلے ماریا کی ملاقات لاتعداد ذہین اور وجیہہ نوجوانوں سے ہوئی تھی اور وہ کسی سے بھی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ وہ اُس نوجوان کو دیکھنے اور اُسے پرکھنے کو بے تاب تھی۔ جو ان کی پوتی کے دل و دماغ پر حاوی ہو چکا تھا۔ کیٹ کو دولت کے پجاریوں کا طویل تجربہ تھا اور وہ کسی صورت میں بھی ماریا کو ان لالچی کتوں میں پھنستے دیکھنا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ ماریا کے لیے ایسا جیون ساتھی منتخب کرنا چاہتی تھیں جسے دولت سے زیادہ اُن کی پوتی کی ضرورت ہو۔

کیٹ صبح ہی سے اس خوش نصیب نوجوان سے ملنے کی تیاری کر رہی تھیں جو ان کی پوتی کا مالک و مختار بننے کا اعزاز حاصل کرنا چاہتا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ اب تک ان سے ملنے سے کتراتا رہا تھا اور اس کا سبب وہ سمجھنے سے قاصر رہی تھیں۔

کیٹ نے اطلاعی گھنٹی کی آواز سنی اور چہرے پر گمبھیرتا طاری کر لی۔ وہ اس نوجوان کے استقبال کے لیے پوری طرح تیار تھیں۔

چند ہی لمحوں میں ماریا ایک خوش پوش اور دراز قد شخص کے ساتھ وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ وہ اس وجیہہ نوجوان کا بازو تھامے ہوئے تھی۔ قریب آکر وہ مترنم آواز میں بولی "دادی اماں ان سے ملیے۔ یہ میرے دوست جارج ملز ہیں۔"

کیٹ نے چھوٹتے ہی وقار اور تمکنت سے کہا "مسٹر جارج، کیا وجہ ہے۔ آپ مجھ سے ملنے سے کتراتے رہے ہیں؟"

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے" جارج نے پُرسکون آواز میں بڑے اعتماد سے کہا "بلکہ میں تو اس مرحلے کا بیتابی سے انتظار کر رہا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کی رضا اور منظوری کے بغیر میں ماریا کو نہیں اپنا سکوں گا۔"

جارج دادی اماں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دینا چاہتا تھا۔ مگر اس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پالیا۔ ایوا نے اس کی فطرت کے بارے میں اسے ایک طویل لیکچر دیا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا "سنبھل کے بیٹا گرم گرم کھیر کھانے کی کوشش مت کرو ورنہ منہ جل جائے گا۔ بڑھیا بڑی کائیاں ہے۔ چکنی چپڑی باتوں سے متاثر ہونے والی نہیں ہے۔ اس سے بات کرتے ہوئے تمہیں ہر ممکن احتیاط برتنی ہو گی۔"

ایک باوردی مہذب اور شائستہ بٹلر آیا اور مشروبات سلیقے سے میز پر رکھ کے چپکے سے رخصت ہو گیا۔

ماریا کوچ پر جارج کے برابر بیٹھی تھی۔ وہ اپنی دادی کے رُوبرُو تھی اور قدرے ڈری سہمی دکھائی دے رہی تھی۔

"ماریا کئی بار تمہارا تذکرہ کر چکی ہے۔ تم میری اس پوتی سے اکثر ملتے رہتے ہو۔"

"جی ہاں۔ یہ میری خوش بختی ہے کہ میری ملاقات ماریا سے ہوئی اور ہم ایک دوسرے کو چاہنے لگے ہیں۔"

کیٹ شکرے کی طرح بنظرِ غائر جارج کا جائزہ لے رہی تھی اور وہ پُرسکون اور مطمئن بیٹھا تھا۔ اس نے بھی سوچ لیا تھا لگ گیا تو تیر ہے، ورنہ فقیر تو ہیں ہی۔ اب اسے دولت کی بھی زیادہ پروا نہیں رہی تھی۔ وہ اس کھیل سے بیزار ہو چکا تھا

کیٹ نے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کیے ہوئے سرد لہجے میں کہا "ماریا نے مجھے بتایا تھا کہ آپ ایک بروکر کے ہاں ملازم ہیں۔ یہ امر میرے لیے تعجب خیز ہے مسٹر جارج۔ آپ کے خاندان کی بے پناہ دولت اور لمبے چوڑے کاروبار کے باوجود آپ ایک معمولی نوکری کر رہے ہیں۔ کیا یہ بات تعجب خیز نہیں ہے؟"

"بڑی بی کے سامنے ادب آداب کو ضرور ملحوظ رکھنا" جارج کے کانوں میں ایوا کے جملے گونجے۔ "شائستگی کا دامن ہاتھ سے مت چھوڑنا۔ خیال رکھنا، تمہاری کوئی بات انہیں بری محسوس نہ ہو اگر تم نے ذرا بھی کمزوری ظاہر کی تو وہ بڑھیا تمہارے بخیے ادھیڑ دے گی۔"

"بات یہ ہے محترم خاتون کہ میں اپنے نجی معاملات زیرِ بحث لانے کا عادی نہیں ہوں۔" وہ چند لمحوں کو ہچکچایا، پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا "بہرحال سب سے پہلے تو میں آپ کو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں ایک خود مختار شخص ہوں، میں خیرات قبول کرنا نہیں چاہتا۔ اگر میں ملز کمپنی کا بانی ہوتا تو معاملہ اس کے برعکس ہوتا لیکن اُس کمپنی کے بانی میرے دادا جان تھے اور میرے ابو نے اسے بہت زیادہ وسعت دی۔ میں سمجھتا ہوں کمپنی کو میری ضرورت نہیں ہے۔ میرے تین بھائی اس کمپنی کو بڑی خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں۔ میں اپنا کاروبار خود کرنا چاہتا ہوں اور جب تک حالات اس کے لیے سازگار نہیں ہوتے ہیں ملازمت کو ترجیح دوں گا۔ میں اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔ باپ دادا کی دولت پر گزارہ کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

کیٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ انہوں نے جارج سے جو توقعات وابستہ کی تھیں، وہ اس سے یکسر مختلف نکلا تھا۔ انہیں تو ایک غیر ذمے دار پلے بوائے ٹائپ کے لاابالی لڑکے سے ملنے کی توقع تھی۔ جو ہاتھ پاؤں چلانے کے بغیر اربوں کی جائیداد کا مالک بننا چاہتا تھا۔ وہ اسے دولت کا لالچی سمجھتی تھیں مگر یہاں تو معاملہ اس کے قطعی برعکس تھا۔ اس نوجوان نے کروڑوں کے بزنس کو لات مار دی تھی۔ اس کے باوجود جارج کے بارے میں ضرور ایسی کوئی بات تھی جو ان کو کھٹک رہی تھی اور وہ اب تک اس بات کو سمجھ نہیں پائی تھیں۔ وہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی مناسب دکھائی دے رہا تھا۔

"مسٹر جارج، مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کا تعلق ایک امیر گھرانے سے ہے۔"

"زندگی کے لیے دولت بلاشبہ بہت ضروری ہے" جارج نے کہا "لیکن میرا خیال ہے دولت سے زیادہ اہم اور بھی بہت سی چیزیں ہیں۔"

کیٹ نے جارج ملز کے خاندان کے اثاثوں کی پہلے ہی تفتیش کروالی تھی۔ اس ضمن میں ایک ایجنسی کی خدمات حاصل کی گئی تھیں اور اس نے رپورٹ دی تھی کہ ملز خاندان کے اثاثوں کی مالیت تیس کروڑ ڈالر سے زائد ہے۔

"اپنے خاندان سے آپ کے تعلقات کیسے ہیں مسٹر جارج؟" کیٹ نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

جارج اس سوال کے لیے بالکل تیار تھا۔ اس نے پُرسکون آواز میں کہا "خاندان سے میرے تعلقات بہت ہی اچھے ہیں۔ ہمارے بزرگ کہتے ہیں کہ خاندان کے کسی بھی فرد کو چوٹ لگ جائے تو درد سبھی کو ہوتا ہے۔ ہمارا خاندان ایک جسم کی..... مانند ہے"

کیٹ نے تعریفی انداز میں سر کو جنبش دی اور بولی "میں بھی اتفاق اور اتحاد پر یقین رکھتی ہوں۔ درخت سے کوئی شاخ کاٹ دی جائے تو مرجاتی ہے۔ اس پر کوئی پھل یا پھول نہیں آسکتا۔" پھر کیٹ نے بغور اپنی پوتی کا جائزہ لیا۔ وہ بڑے پیار سے جارج کو

دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی چمک تھی۔ اس کے دادا اور باپ کی آنکھوں میں بھی ایسی ہی محبت در آتی تھی۔ اسی لمحے ملازمہ نے آکر اطلاع دی کہ کھانا میز پر لگا دیا گیا ہے۔

کھانے کے دوران مختلف موضوعات پر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور پھر کیٹ نے سب سے اہم سوال کر ہی دیا۔ جارج اسی سوال کا منتظر تھا۔ کیٹ نے پوچھا "مسٹر جارج، کیا آپ کو بچے پسند ہیں؟"

"بڑھیا پڑپوتوں کے لیے مری جا رہی ہے۔ جارج نے سوچا، اس کی سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ اس کے خاندان میں کوئی لڑکا ہو جو کھربوں کے کاروبار اور جائیداد کا انتظام سنبھال سکے۔"

جارج نے ایک گہرا سانس لیا اور تعجب خیز لہجے میں بولا "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں خاتون؟ بچوں کے بغیر زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟ بچوں ہی سے تو ساری رونق ہے۔ انسان اتنی تگ و دو بچوں ہی کے لیے کرتا ہے۔

لگتا۔۔ تو بہت ذہین ہے، کیٹ نے سوچا پھر بھی سوچ سمجھ کے ہر قدم اٹھانا ہوگا۔ میں کل ہی راجر کو اس کی ذاتی مالی پوزیشن کی تحقیق پر لگا دوں گی۔

اُس رات سونے سے پہلے ماریا نے الوا کو فون کر کے جارج کی دادی اماں سے ملاقات کا احوال بتا دیا۔ الوا اُس سے کرید کرید کر تمام تفصیل معلوم کرتی رہی۔ الوا نے خدا کا شکر ادا کیا کہ جارج نے صورتِ حال کو بگاڑ نہیں دیا تھا۔ الوا کو اس کی طرف سے یہی خدشہ تھا کہ کہیں وہ غصے میں آکر سارا بنا بنایا کھیل ہی نہ بگاڑ دے۔ ماریا کے بات ختم کرتے پر الوا نے پُرجوش لہجے میں کہا "بہت خوب! گویا تم دونوں شادی کر رہے ہو؟ مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔ تم دونوں کی جوڑی خوب سجے گی۔"

"ابھی تو۔۔۔۔۔ ابھی تو اس نے شادی کی باضابطہ درخواست دادی اماں سے نہیں کی ہے۔ لیکن اس کی خواہش یہی ہے۔ دادی اماں نے بھی اسے پسند کر لیا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے الوا، پتہ نہیں دادی اماں اس رشتے کو پسند بھی کریں گی یا نہیں؟"

"پسند کیوں نہیں کریں گی، تمہاری پسند بھلا بُری ہو سکتی ہے؟"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔ فی الحال تو وہ جارج کی ذاتی مالی پوزیشن کی تحقیقات کروا رہی ہیں، اور ظاہر ہے یہ بات ہماری شادی میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ جارج کا تعلق چھوٹے موٹے خاندان سے تو ہے نہیں۔"

الوا کا دل جیسے اچھل کے حلق میں آگیا۔ وہ سناٹے میں رہ گئی۔ اس رُخ سے تو اُس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ دوسری طرف ماریا جارج کی تعریفوں کے پل باندھ رہی تھی مگر الوا کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ جو بیڑا اس نے بہ دقت تمام تیار کیا تھا، وہ طوفان کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ اسے اپنا منصوبہ خاک میں ملتا نظر آرہا تھا۔

الوا نے چند منٹ اپنی بہن سے گفتگو کی اور پھر رسمی الوداعی کلمات کے بعد ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ چند لمحے وہ کچھ سوچتی رہی پھر ریسیور اٹھایا اور جارج کا نمبر ڈائل کر دیا۔ گھنٹی بج رہی تھی اور کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے وہ ابھی گھر نہیں پہنچا تھا۔ وہ اگلے ایک گھنٹے ہر دس منٹ بعد اس کا نمبر ملاتی رہی، خدا خدا کر کے جارج نے ریسیور اٹھایا اور الوا نے چھوٹتے ہی کہا "کیا تم فوری طور پر کہیں سے پانچ لاکھ ڈالر کا انتظام کر سکتے ہو؟"

"یہ تم کیا بکواس کر رہی ہو؟"

"کیٹ نے ہمیں آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ وہ تمہاری مالی پوزیشن کی جانچ پڑتال کروا رہی ہے۔"

"وہ جانتی ہے میرا تعلق ایک کروڑ پتی گھرانے سے ہے اور میں۔۔۔۔۔"

"میں تمہارے خاندان کی بات نہیں کر رہی ہوں" الوا نے اس کی بات کاٹ کر کہا "تمہارے باپ کے پاس اربوں ڈالر بھی ہوں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فی الوقت تو مسئلہ تمہارے مالی حالات کا ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ بڑی بی کائیاں ہیں انہیں بیوقوف بنانا آسان نہیں ہے۔ اب خیریت چاہتے ہو تو پانچ لاکھ ڈالر کا انتظام کر لو۔ تمہاری موجودہ پوزیشن کو دیکھتے ہوئے میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ تمہیں مسترد کر دیں گی۔"

"مگر میں اتنی بڑی رقم کا انتظام کیسے کروں گا؟" جارج نے پوچھا۔

"میرے ذہن میں ابھی ایک تجویز آئی ہے۔" الوا نے جواب دیا

✿

دوسرے روز کیٹ نے دفتر پہنچتے ہی اپنے اسسٹنٹ سے کہا "مسٹر راجر سے کہو کہ میں جارج ملز نامی شخص کے مالی حالات جاننا چاہتی ہوں۔ وہ وال اسٹریٹ پر فنلے اینڈ کمپنی میں ملازم ہے۔"

"مسٹر راجر ایک ضروری کام سے میامی جا چکے ہیں۔ ان کی واپسی کل ہوگی۔ کیا آپ کل تک انتظار کر سکتی ہیں؟"

"ٹھیک ہے۔ کل وہ جیسے ہی آئے، اُسے میرا پیغام دے دینا۔"

✿

جارج ملز، فنلے اینڈ کمپنی کے دفتر میں اپنی چھوٹی سی میز پر پریشان اور آزردہ بیٹھا تھا۔ اسٹاک ایکس چینج کھلا ہوا تھا۔ لوگ چیخ رہے تھے، چلا رہے تھے۔ حصص کا کاروبار زور شور سے ہو رہا تھا۔ فنلے اینڈ کمپنی میں سوا دو سو ملازمین تھے اور وہ سب کے سب اپنے اپنے شعبوں میں انتہائی مستعدی سے کام کر رہے تھے۔ انہیں سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ صرف جارج ہی وہ واحد شخص تھا جو بیکار بیٹھا سوچ رہا تھا۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں اپنی نشست پر ساکت و صامت بیٹھا تھا۔ اس کا ارادہ ایک بہت ہی خطرناک کام کرنے کا تھا۔ ناکامی کی صورت میں اس کی گرفتاری یقینی تھی اور اسے طویل مدت کی سزا بھی ہو سکتی تھی اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو فنلے کمپنی اس کی جیب کے ایک کونے میں آسکتی تھی۔ یہ لاکھوں، کروڑوں کا نہیں اربوں اور کھربوں کا معاملہ تھا۔ وہ صبح سے حصص کی خرید و فروخت میں لگا ہوا تھا۔ لیکن اس کا ذہن مستقل الوا کے بتائے ہوئے منصوبے میں لگا ہوا تھا۔ الوا نے اسے پانچ لاکھ ڈالر چرانے کا منصوبہ بتایا تھا۔ اور وہ اس کی ذہانت پر عش عش کر اٹھا تھا۔ اس کے کہے ہوئے الفاظ اب بھی جارج کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ "منصوبہ نہایت آسان ہے جارج۔ اگر تم ہمت سے کام لو تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ تمہیں صرف ایک رات کے لیے اپنی فرم سے حصص کے سرٹیفکیٹ چرانے ہوں گے بلکہ تم وہ سرٹیفکیٹ ایک رات کے لیے کمپنی سے ادھار لو گے۔ سرٹیفکیٹ تم صبح واپس رکھ سکتے ہو۔ کسی کو تمہاری اس حرکت کا علم بھی نہیں ہو سکے گا۔"

فرم سے سرٹیفکیٹ اڑانا آسان کام نہیں تھا۔ جارج نے اس ضمن میں دفتر کی ایک ادھیڑ عمر بیوہ کو استعمال کیا جو شب و روز اس سے شادی کے خواب دیکھتی تھی۔ جارج نے اسے بڑی صفائی سے بیوقوف بنایا اور پانچ لاکھ ڈالر کے سرٹیفکیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سرٹیفکیٹ کے لیے اسے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔

اسی روز شام سات بجے وہ ماریا کے عظیم الشان محل نما مکان پر پہنچ گیا۔ اُسے ہاتھوں ہاتھ کتب خانے میں پہنچا دیا گیا جہاں ماریا اور کیٹ اس کی منتظر تھیں۔

"شام بخیر ہو" جارج نے نرم اور آرام دہ صوفے میں بیٹھتے ہی کہا۔ "بغیر اطلاع کے بے وقت آنے پر میں آپ سے معذرت خواہ ہوں لیکن میں ایک بے حد ضروری بات کرنا چاہتا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ جو طریقہ کار میں نے اپنایا ہے، وہ مناسب نہیں ہے مگر آپ کی ذہنی وسعت اور کشادہ دلی کو دیکھتے ہوئے میں اس جسارت پر مجبور ہوا ہوں۔ خاتون۔ میں آپ کی پوتی ماریا سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے آپ کی اجازت کا طالب ہوں۔ مجھے ماریا سے بے پناہ محبت ہے اور میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہماری زندگی سنور جائے گی۔" جارج نے کوٹ کی اندرونی جیب سے پانچ لاکھ ڈالر کے سرٹیفکیٹ نکالے اور کیٹ کے سامنے میز پر پٹخ دیئے۔ "میں آپ کی پوتی کو پانچ لاکھ ڈالر کے سرٹیفکیٹ شادی کے تحفے کے طور پر دے رہا ہوں۔ ماریا کو آپ کی دولت کی ضرورت نہیں رہے گی۔ ہمیں بس آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

کیٹ نے میز پر بکھرے ہوئے سرٹیفکیٹ دیکھے جو جارج نے بڑی لاپروائی سے پھینک دیئے تھے۔ وہ ان تمام کمپنیوں سے واقف تھیں۔ ماریا بے تابی سے جارج کی طرف بڑھی اور بڑے جذباتی انداز میں اس کے ہاتھ تھام لیے پھر وہ اپنی دادی کی طرف مڑی اور التجا آمیز لہجے میں بولی "خدارا! دادی جان! اجازت دے دیجیے نا۔"

کیٹ نے اس خوش و خرم جوڑے کو بغور دیکھا، وہ چند لمحے کچھ سوچتی رہیں پھر مسکرا کے بولیں: "اجازت ہے۔ خدا کرے تم دونوں سدا خوش و خرم رہو، دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔"

وہ دونوں مسلسل تین گھنٹے پُرجوش انداز میں شادی کے انتظامات طے کرتے رہے، منصوبے بناتے رہے۔ دونوں کی متفقہ رائے یہ تھی کہ شادی دھوم دھام سے نہیں ہو گی۔ ایک سادہ سی تقریب میں قریبی دوستوں کو مدعو کیا جائے گا اور وہ عمر بھر کے لیے ازدواجی بندھن میں بندھ جائیں گے۔

"تمہارے والد شادی میں شریک ہوں گے؟" کیٹ نے پوچھا۔

جارج نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ "اپنے چہیتے بیٹے کی شادی میں شرکت سے انہیں کون باز رکھ سکتا ہے؟ میرے والد، میرے تین بھائی اور دو بہنیں شادی کے روز یہاں موجود ہوں گے۔ آپ ان سے مل کر ضرور خوش ہوں گی۔"

کیٹ کا مارے خوشی کے بُرا حال ہو رہا تھا۔ ان کے لیے اس سے بڑی اطمینان کی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ ماریا کو اس کی پسند کا شوہر مل گیا تھا۔ جو اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ انہوں نے سوچا، ایک اہم بات مجھے یاد رکھنی ہے اور وہ یہ کہ میں راجر کو منع کر دوں گی کہ وہ جارج کے مالی حالات کی چھان بین نہ کرے، اس طرح معاملہ غتربود بھی ہو سکتا ہے۔

کیٹ کے جاتے ہی جارج نے کہا "میرا خیال ہے پانچ لاکھ ڈالر کے سرٹیفکیٹ گھر میں رکھنا مناسب نہیں ہو گا۔ میں فی الحال انہیں اپنے حفاظتی لاکر میں رکھوائے دیتا ہوں، جب تمہیں ضرورت ہو گی، منگوا دوں گا۔"

"مجھے صرف اور صرف تمہاری ضرورت ہے جارج۔ ان کاغذات کی میری نظروں میں کوئی وقعت نہیں ہے۔" ماریا نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

دوسرے روز صبح جارج نے اسی ترکیب سے سرٹیفکیٹ واپس رکھ دیئے۔ جس سے اس نے نکالے تھے۔

شادی سے تین دن قبل جارج پریشان اور گھبرایا ہوا ماریا کے گھر پہنچ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ پہنچتے ہی کیٹ سے بولا ”مجھے ایک بہت ہی بری خبر ملی ہے۔ میرے والد پر دل کا دوسرا دورہ پڑا ہے۔ خدا خیر کرے۔“

”اوہ۔ مجھے بے حد افسوس ہے“ کیٹ نے کہا ”وہ ٹھیک تو ہو جائیں گے نا؟“

”خاندان بھر کے افراد سے رات بھر ٹیلیفون پر میرا رابطہ رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر بھی پرامید ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ دل کا دورہ انہیں ایسے موقع پر پڑا ہے کہ میری شادی میں صرف تین دن باقی رہ گئے ہیں۔ وہ اپنے بیٹے کی خوشیوں میں شریک نہیں ہو سکیں گے۔“

تین روز بعد شادی کی تقریب ماریا کی شاندار رہائش گاہ کے وسیع و عریض لان میں منعقد ہوئی۔ گنے چنے افراد تقریب میں مدعو کیے گئے تھے۔ ماریا نے اپنے دفتر کے تین چار افراد کو بھی شادی میں مدعو کیا تھا۔ اس نے ایوا کو بلوانے کے لیے کیٹ سے التجائیں کی تھیں۔ مگر وہ مان کر نہیں دی تھیں۔ وہ ایوا کا نام بھی سننا نہیں چاہتی تھیں۔ اس کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں تھیں۔ ماریا نے بہن کے لیے بہت ضد کی مگر کیٹ اپنی بات پر اڑی رہی۔ انہوں نے واضح لفظوں میں جتا دیا کہ اس کی بہن ماریا کو خاندان کی کسی بھی تقریب میں مدعو نہیں کیا جائے گا۔

کیک کاٹنے کی رسم کی ادائیگی کے فوراً ہی بعد جارج نے دفتر کے ایک ضروری کام کے بہانے ماریا سے ایک گھنٹے کی اجازت لی اور ایوا کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ اس نے تقریب کا سارا حال ایوا سے کہہ سنایا اور ایوا نے الماری سے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کے جارج کے حوالے کر دی۔ ایوا نے ہنی مون شاندار انداز میں منانے کے لیے اپنے چند زیورات آج صبح ہی فروخت کیے تھے۔ وہ اپنے منصوبے میں کوئی سقم رہنے دینا نہیں چاہتی تھی۔ جارج نے جانے کی اجازت چاہی اور ایوا نے شرارت سے مسکراتے ہوئے جارج کو روک لیا۔ اسے ماریا کے ساتھ ہنی مون پر رات آٹھ بجے کی فلائٹ سے روانہ ہونا تھا اور ابھی چار گھنٹے باقی تھے۔ وہ آسانی سے اپنی بہن کے شوہر کو جانے دینا نہیں چاہتی تھی۔

جارج ایوا کے فلیٹ سے نکلا تو چھ بج چکے تھے۔ وہ چکی کے دو پاٹوں میں پھنس چکا تھا۔

✿

انہوں نے ہنی مون حسین ترین تفریحی مقام جمیکا میں منایا۔ سمندر کے کنارے جدید طرز کے ہوٹل میں سمندر کے رخ پر ان کا خوبصورت اور وسیع کمرہ تھا۔ وہ دن بھر ساحل سمندر پر خرمستیاں کرتے، کشتی رانی پیراکی اور مچھلی کے شکار سے لطف اندوز ہوتے اور رات گئے تک ایک دوسرے میں کھوئے رہتے۔ ماریا نے یہ دن کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔

ادھر فنلے اینڈ کمپنی کے مالکان جو جارج کے رویئے سے تنگ آ کر اسے نکالنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ اب ایک میٹنگ میں اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر رہے تھے۔ دو گھنٹے کی بحث کے بعد انہوں نے جارج کو ملازمت پر برقرار رکھنے کا فیصلہ کر لیا اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اب وہ ایک ارب پتی گھرانے میں شادی کر چکا تھا۔ انہیں امید تھی کہ کیٹ کی پوتی کا شوہر ہونے کے ناتے وہ مستقبل میں کمپنی کے لیے یقینی طور پر فائدے مند ثابت ہوگا۔

✿

جارج اور ماریا ہنی مون سے واپس آئے تو کیٹ نے انہیں کمرے میں طلب کیا اور بولی ”میں چاہتی ہوں تم اپنا سامان لے کر یہیں آ جاؤ۔ بیسیوں کمروں کے اس مکان کے ہوتے ہوئے تمہیں فلیٹ میں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس طرح ......“

”آپ کی فراخدلانہ پیش کش کا بہت بہت شکریہ“ جارج نے اس کی بات کاٹ کر کہا ”لیکن میں اور ماریا اپنے الگ گھر میں رہنا پسند کریں گے۔ اپنے گھر کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ ویسے ہم روزانہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔“

جارج کسی صورت میں بھی اس چالاک عورت کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کی عقابی نظروں سے بچنا چاہتا تھا

”اچھی بات ہے“ کیٹ نے کہا ”جیسی تمہاری مرضی۔ ایسی صورت میں تم دونوں کو ایک مکان لے دوں گی۔ یہ میری طرف سے شادی کا تحفہ ہوگا۔“

جارج گرمجوشی سے کیٹ سے لپٹ گیا اور پرجوش لہجے میں بولا ”آپ کتنی اچھی ہیں دادی جان۔ ہمیں آپ کا تحفہ قبول کر کے بڑی خوشی ہوگی۔“

اور ایک ہفتے میں کیٹ کی رہائش گاہ سے نصف فرلانگ کے فاصلے پر ایک تین منزلہ خوبصورت مکان خرید لیا گیا۔ ماریا مکان کو دیکھتے ہی خوشی سے نہال ہو گئی تھی۔ جارج بھی سحر زدہ سا ایک ایک چیز کو دیکھ رہا تھا اسے یہ سب ایک خواب سا محسوس ہو رہا تھا۔

”مکان کی سجاوٹ تو تقریباً ہو ہی چکی ہے“ جارج نے اپنی بیوی سے کہا ”تھوڑا بہت جو کام رہ گیا ہے۔ وہ تم کر لینا۔ اس طرح تمہارا دل بھی لگا رہا کرے گا۔ میں تمہارا ہاتھ نہیں بٹا سکوں گا۔ دفتر میں ان دنوں کام کچھ زیادہ ہی ہے۔“

سچی بات تو یہ تھی کہ وہ دفتر میں برائے نام وقت گزارتا تھا۔ گنتی کے چند گاہکوں سے وہ بمشکل معاملت کر پاتا تھا۔ فرم کے مالکان

کو اس سے ہمیشہ شکایت ہی رہی تھی۔ جارج کے مشاغل کچھ اور تھے۔ دلچسپیاں کچھ اور تھیں۔ جن کی بنا پر وہ اکثر دفتر سے غائب رہتا تھا اور رات گئے تک گھٹیا شراب خانوں اور بدنام علاقوں میں پھرتا رہتا تھا۔ ان دنوں پولیس تشدد کی بڑھتی ہوئی وارداتوں سے پریشان تھی۔ کئی طوائفیں ویران علاقوں میں لہولہان پائی گئی تھیں اور ان میں سے تین چار کی حالت تو بہت نازک تھی۔ ان تمام کارناموں کا سہرا جارج کے سر بندھتا تھا۔ ان زخمی عورتوں نے پولیس کو بتایا تھا کہ حملہ آور نوجوان اور وجیہہ ہے اور اس کا لب و لہجہ غیر ملکیوں کا سا ہے

✡

جارج اور الوا کی ملاقات دوپہر کو ایک دور افتادہ اور گمنام ریستوران میں ہوئی۔ جہاں ان کے پہچانے جانے کا امکان نہیں تھا۔ الوا نے احتیاطاً اپنا حلیہ قدرے تبدیل کر لیا تھا۔

کھانے کے بعد کافی کے دوران الوا نے کہا "اب تمہارا اگلا قدم یہ ہوگا کہ تم ماریا کو نئی وصیت مرتب کرنے پر مجبور کر دگے اور خبردار، اس بات کا پتا کسی بھی صورت میں بڑی بی کو نہیں چلنا چاہیے۔"

"یہ بہت مشکل کام ہے الوا، مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں بھلا ماریا کو کس طرح مجبور کر سکتا ہوں؟"

"تم فکر مت کرو ڈارلنگ میں تمہیں ترکیب بتاؤں گی۔" الوا نے مسکرا کے کہا۔

دوسرے روز شام کو جارج اور ماریا نے نیویارک کے سب سے خوبصورت فرانسیسی ریستوران میں رات کا کھانا کھایا۔ جارج نے فون پر وقت مقرر کر کے ماریا کو ریستوران پہنچنے کی ہدایت کی تھی اور اب وہ آدھے گھنٹے کی تاخیر سے پہنچا تھا۔ اس نے آتے ہی ماریا سے معذرت چاہی۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی جارج نے سگریٹ سلگایا اور ایک طویل کش لگا کر بولا "مجھے یہاں پہنچنے میں دیر یوں ہوئی کہ میرے وکیل نے وصیت کے معاملے کو خواہ مخواہ الجھا دیا تھا۔ خدا ان وکیلوں سے بچائے بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔"

"تم کس وصیت کی بات کر رہے ہو؟" ماریا نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں!" جارج نے ماریا کا نرم و نازک ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام کے کہا "میں نے اپنی وصیت تبدیل کر دی ہے جان۔ اب اگر مجھے کچھ ہوا تو میرے تمام اثاثوں کی مالک تم ہو گی۔ جو چیز بھی میری ملکیت ہے میری موت کے بعد تمہاری ہو جائے گی۔ میں جانتا ہوں میری جائداد کا مقابلہ تمہارے خاندان کی عظیم الشان جائیداد اور اثاثوں سے نہیں کیا جا سکتا لیکن میرے مرنے کے بعد تمہیں اتنی دولت ضرور ملے گی کہ تم ساری عمر عزت اور آبرو سے گزار اکر سکو۔"

"خدا نہ کرے تمہیں کچھ ہو۔ تم ایسی باتیں کیوں سوچتے ہو جارج؟ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔ میرے نزدیک تمہاری اہمیت دنیا کی ہر چیز سے زیادہ ہے۔ تم مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہو" ماریا کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے

"یہ تمہاری محبت اور عظمت ہے ماریا۔ میں حقیقت پسند ہوں۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کل کیا ہوگا میں پیش بندی کا قائل ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری موت کے بعد لوگ میرے بارے میں باتیں بنائیں کہ بیوی کے لیے کچھ نہیں کیا۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے خاندان کی دولت اتنی ہے کہ ہماری کئی نسلیں عیش و آرام سے گزارہ کر سکتی ہیں۔ لیکن میرا اس دولت سے کوئی تعلق نہیں ہے

ماریا نے چند لمحے کچھ سوچا اور بولی "پھر تو مجھے بھی اپنی وصیت تبدیل کر دینی چاہیے۔ واقعی، زندگی کا کوئی بھروسہ بھی نہیں ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تمہیں بھلا وصیت تبدیل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" جارج نے تعجب خیز لہجے میں پوچھا۔

"تم میرے شوہر ہو۔ میرے پیسوں پر تمہارا اتنا ہی حق ہے جتنا میرا ہے۔"

جارج نے جلدی سے اپنے ہاتھ پیچھے ہٹا لیے اور سخت لہجے میں بولا "نہیں ماریا۔ مجھے تمہارے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

"مجھے معلوم ہے جارج لیکن میں تمہاری بات دہرا رہی ہوں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کل کیا ہوگا۔ ہمیں پیش بندی کر لینی چاہیے۔ میں بہت بیوقوف ہوں۔ جارج لیکن میں اپنی ازدواجی زندگی سے اتنی خوش اور مطمئن ہوں کہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتی کہ ہم دونوں میں سے کسی کو کچھ ہو بھی سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں کا ساتھ بہت طویل ہوگا اور ہم کیٹ کی طرح اپنے پوتوں اور پڑپوتوں کو کھلائیں گے۔"

"ایسا ہی ہوگا ماریا۔" جارج نے اپنی بیوی کا ہاتھ محبت سے دبا کر کہا۔

ماریا نے ایک گہرا سانس لیا اور بولی "میں کل ہی وصیت کی تبدیلی کے لیے راجر سے بات کروں گی۔"

جارج نے لاپروائی کے انداز میں شانے اچکائے اور بولا "اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو یہی سہی۔ میرا تو خیال ہے کہ کوئی وکیل تمہاری وصیت تبدیل کر دے تو بہتر ہوگا۔ میں اپنے وکیل سے بات کروں گا۔ وہ اس قسم کے امور کا ماہر ہے۔

"جو تمہارا جی چاہے کرو۔ اس قسم کے معاملات سے ویسے بھی مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے۔ ویسے دادی جان تو۔۔۔"

جارج نے جلدی سے ماریا کا ہاتھ تھپتھپا کر کہا "دادی جان کو اس معاملے سے دور رکھو میری جان۔ ہم دونوں ان سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ لیکن کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ ہم اپنے نجی معاملات اپنے تک محدود رکھیں؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو ڈارلنگ۔ میں دادی جان سے اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہوں گی۔"

جارج نے اس گفتگو کے ایک ہفتے بعد الوا سے اس کے فلیٹ پر ملاقات کی۔ الوا نے چھوٹتے ہی پوچھا "کیا ماریا نے نئی وصیت پر دستخط کر دیئے؟"

"تمہاری ترکیب کارگر رہی الوا" جارج نے مسکرا کے جواب دیا۔ "آج تمہاری بہن نے نئے وصیت نامے پر دستخط کر دیئے اگلے ہفتے اس کی سالگرہ ہے۔

اور اہم بات یہ ہے کہ اسی روز کمپنی میں اس کے حصص اس کے نام کر دیئے جائیں گے۔ وہ قانونی طور پر کمپنی میں اپنے حصص کی مالک بن جائے گی۔"

جارج کا کہنا درست ثابت ہوا۔ اگلے ہفتے کروگر بریٹ کمپنی کے انچاس فی صد حصص ماریا کے نام کر دیئے گئے۔ اب وہ تقریباً نصف کمپنی کی مالک تھی۔ جارج نے یہ خبر الوا کو فون پر سنائی۔ چند لمحے خاموشی رہی، پھر وہ پُرجوش لہجے میں بولی "بہت خوب۔ یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔ تم آج رات میرے فلیٹ پر آجاؤ۔ ہم اپنی کامیابی کا جشن منائیں گے۔"

"میں نہیں آسکتا الوا۔ کیٹ نے آج رات ماریا کے اعزاز میں ضیافت کا اہتمام کیا ہے۔"

چند لمحے خاموشی رہی، پھر الوا نے کہا "ٹھیک ہے۔ تم یہ معلوم کرو کہ ضیافت میں کون کون سے کھانوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ مجھ سے کوئی سوال مت کرنا۔ جو میں کہہ رہی ہوں، خاموشی سے اسی پر عمل کرو۔"

جارج نے دل ہی دل میں اسے دو چار گالیاں دیں اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ ایک گھنٹے بعد اس نے دوبارہ الوا سے رابطہ قائم کیا اور اسے کھانوں کی فہرست سنا دی۔ الوا نے اسے رات فلیٹ پر آنے کی ہدایت کی جارج نے پیچھا چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر الوا اپنی ضد پر اڑی رہی۔ سلسلہ منقطع کر کے جارج نے اُسے دو تین موٹی گالیاں دیں اور اپنی کلائی گھڑی پر نظر ڈالی۔ اسے اپنی فرم کے ایک اہم ترین گاہک سے ملنا تھا۔ جسے وہ پہلے ہی دو مرتبہ جُل دے چکا تھا اور اب مقررہ وقت سے تیس منٹ اوپر ہو چکے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ فرم کے مالکان اسے محض اس لیے برداشت کر رہے ہیں کہ اس کی شادی کروگر بریٹ کمپنی کی سربراہ کیٹ کی لاڈلی پوتی سے ہو چکی ہے ورنہ وہ اب تک اسے لات مار کے فرم سے نکال چکے ہوتے۔ جارج اب بے حد محتاط ہو گیا تھا۔ ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانے لگا تھا۔ وہ اپنی شاندار حیثیت کو خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اپنا وقار خاک میں ملانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بڑی مشکلوں سے کیٹ اور ماریا کی نظروں میں اپنا ایک مقام بنایا تھا اور اب وہ اُس مقام سے گرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو شادی کا دعوت نامہ بھیجا تھا اور اس ظالم بڈھے نے اسے جواب دینے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

٭

ماریا کی تیئسویں سالگرہ دھوم دھام سے منائی گئی۔ تقریب میں ملک کے اہم ترین چالیس افراد مدعو کیے گئے تھے۔ ماریا نے جارج سے اپنے چند دوستوں کو مدعو کرنے کے لیے کہا تھا اور وہ بڑی خوبصورتی سے ٹال گیا تھا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ جارج کا کوئی دوست ہی نہیں تھا۔ خاندان سے علیحدگی کے بعد اس نے الگ تھلگ زندگی گزاری تھی۔ وہ دوستی کا قائل ہی نہیں تھا۔ اسے اپنی ذات کا زعم تھا۔ وہ کسی بھی دوسرے فرد پر بھروسہ اور انحصار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ماریا نے جدید طرز کا سادہ اور دیدہ زیب لباس پہن رکھا تھا اور ہال میں چہکتی پھر رہی تھی۔ وہ خوشی سے بے حال ہو رہی تھی۔ کیٹ نے اُسے ہیروں کا بے حد قیمتی سیٹ تحفے میں دیا تھا۔ سیٹ کی جگمگاہٹ قابلِ دید تھی۔ مہمان رشک و حسد سے اس بیش قیمت تحفے کو دیکھ رہے تھے۔

ماریا کی حسین و جمیل سہیلیاں شرارت سے مسکراتی جارج کو دیکھ رہی تھیں اور جارج اپنے وجود میں طوفان اٹھتا محسوس کر رہا تھا۔

تقریب جاری تھی کہ جارج ماریا کو ایک گوشے میں لے گیا اور بتایا کہ اسے فرم کے ایک پارٹنر نے دفتر سے چند کاغذات لے کر فوری طور پر ایئرپورٹ پہنچنے کا حکم دیا ہے۔ وہ ایک اہم کاروباری دورے پر سنگاپور جا رہا ہے اور ہوائی جہاز کے روانہ ہونے سے پہلے اسے کاغذات لے کر ایئرپورٹ پہنچنا ہے۔ ماریا نے بادلِ نخواستہ اُسے جانے کی اجازت دے دی۔

بیس منٹ بعد جارج الوا کے فلیٹ کی اطلاعی گھنٹی بجا رہا تھا۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ الوا سولہ سنگھار کیے، نیا قیمتی لباس پہنے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ پُرجوش انداز میں جارج کا ہاتھ تھام کے اسے کھانے کے کمرے میں لے گئی۔ میز پر کھانا چُنا ہوا تھا۔ وسط میں بڑا سا کیک رکھا تھا۔ جارج کو حیرت زدہ دیکھ کر الوا نے اسے یاد دلایا کہ ماریا اس کی جڑواں بہن ہے اور اس لحاظ سے آج اس کی بھی سالگرہ ہے۔ جارج نے تحفہ نہ لانے پر افسوس کا اظہار کیا اور الوا نے اسے کھانے کی دعوت دی۔ جارج اپنی بیوی کی سالگرہ کی تقریب میں پیٹ بھر کے کھا چکا تھا۔ لہٰذا اس نے الوا سے معذرت چاہ لی لیکن الوا نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور اسے زبردستی کھانے کی میز پر بٹھا دیا اور پھر جارج کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ الوا نے ان تمام کھانوں کا اہتمام کیا تھا جو اس کی بہن کی سالگرہ کی ضیافت میں مہمانوں کو پیش کیے گئے تھے۔ الوا اسکے سامنے تمکنت سے بیٹھ گئی اور بولی "بچپن ہی سے ہم دونوں بہنیں ہر چیز میں برابر کی حصے دار بنتی آئی ہیں۔ آج میں اس کی سالگرہ کی تقریب میں حصے دار بن رہی ہوں لیکن اگلے سال میں اس کی سالگرہ خود ہی مناؤں گی۔ وقت آگیا ہے ڈارلنگ۔ میری بہن کو کوئی سنگین حادثہ پیش آجانا چاہیے تاکہ اس ناٹک کا خاتمہ ہو سکے۔ ماریا کی موت کا صدمہ بیچاری دادی اماں برداشت نہیں کر پائیں گی اور زیادہ تعداد میں خواب آور گولیاں کھا لینے سے ان کی موت بھی واقع ہو جائے گی۔

جارج کو الوا کی یہ باتیں زہر معلوم ہو رہی تھیں۔ اسے الوا کا وجود بری طرح کھٹکنے لگا تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ماریا قطعی بے ضرر اور احمق لڑکی تھی۔ شوہر کی خوشنودی کے لیے وہ ہر کام کر سکتی تھی۔ جبکہ الوا ٹیڑھی کھیر تھی۔ مستقبل میں وہ اس کے لیے

خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ خصوصاً آج الوا نے اسے جس طرح حکم دے کر بلایا تھا۔ یہ بات جارج کو جبی طرح کھلی تھی۔ وہ مرد تھا۔ الوا عورت تھی۔ مرد کو عورت پر برتری حاصل ہوتی ہے۔ مگر یہاں تو معاملہ اس کے قطعی برعکس تھا۔ الوا اس کی شخصیت پر حاوی ہو چکی تھی۔ وہ خود کو اس کی آقا سمجھنے لگی تھی۔ جارج کی حیثیت اس کی نظر میں ایک زرخرید غلام کی سی ہو گئی تھی

الوا باتوں ہی باتوں میں جارج کو اپنی خواب گاہ میں لے گئی اور اُسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ جارج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی "تم اس رات کو بھولے تو نہیں ہو گے۔ جب جنزیرہ ناسو میں تم نے ظالمانہ انداز میں مجھ پر تشدد کیا تھا۔ میں بھی اس ہولناک رات کو نہیں بھول سکی ہوں مگر اب تم کبھی مجھ پر تشدد نہیں کر سکو گے کیونکہ تمہیں بھی دولت کی اتنی ہی ضرورت ہے، جتنی مجھے ہے۔ اگر تم نے مجھے ذرا بھی نقصان پہنچایا تو ایک تفصیلی خط پولیس کے پاس پہنچ جائے گا جو میں نے اپنے ایک دوست کو دے رکھا ہے میں نے اسے ہدایت کر رکھی ہے کہ میں ہلاک یا زخمی ہو جاؤں تو وہ خط فوراً پولیس کے حوالے کر دے۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو" جارج نے غیر یقینی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"صرف ایک ترکیب ہے جس پر عمل کر کے تم میرے سچ اور جھوٹ کو پرکھ سکتے ہو اور مجھے یقین ہے کہ تم اس ترکیب پر عمل نہیں کرو گے۔" الوا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

جارج کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ یہ ذلیل اور کمینی عورت اس کے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی۔ وہ جان گیا تھا کہ یہ حرف بحرف سچ کہہ رہی تھی۔ وہ اس کے لیے عمر بھر کا روگ بن چکی تھی۔ وہ اس سے کسی بھی صورت میں پیچھا نہیں چھڑا سکتا تھا۔ وہ مرتے دم تک اس کے سر پر سوار رہے گی۔ جارج نے عمر بھر کی غلامی الوا کے نام لکھ دی تھی۔ وہ اس ذلیل عورت کے رحم و کرم پر ساری عمر نہیں رہ سکتا تھا اور پھر اس کے وجود میں دھماکے سے ہونے لگے۔ چاروں سمت چنگاریاں سی اڑنے لگیں۔ اس کا دماغ بری طرح گھوم گیا۔ وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا اور الوا پر پل پڑا۔ اس لمحے وہ بھول گیا تھا کہ الوا کو مارنا کس قدر خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے آپے میں نہیں رہا تھا۔ اس کے جسم میں کوئی بدروح حلول کر گئی تھی۔ وہ انتہائی بے رحمی سے الوا کو مارتا رہا۔ وہ جتنا الوا کو مار پیٹ رہا تھا اسے اتنا ہی سکون مل رہا تھا۔ اُسے دور کہیں سے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ اس کے اعصاب پرسکون ہونے لگے۔ ذہن پر چھائی ہوئی دھند چھٹنے لگی اور پھر وہ ہوش میں آگیا۔ الوا اپنے ہی خون میں لت پت فرش پر پڑی کراہ رہی تھی۔ وہ بالکل ہی بدل کر رہ گئی تھی۔ اس کی ناک پھٹ گئی تھی۔ رخسار بری طرح ادھڑے ہوئے تھے۔ اس کا سارا وجود زخموں سے بھرا پڑا تھا جبڑا ٹوٹ چکا تھا اور وہ خزاں رسیدہ پتے کی مانند کپکپا رہی تھی۔ رو رہی تھی، کراہ رہی تھی، وہ مسلسل ایک ہی بات کہہ رہی تھی "بس کرو......
بس کرو...... خدا کے لیے بس کرو......"

جارج نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ رہی سہی دھند بھی غائب ہو گئی تھی اب وہ پوری طرح ہوش میں آچکا تھا اور الوا کو لہولہان دیکھ کے اسے صورتحال کی سنگینی کا احساس ہوا تھا۔ وہ خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا سنہرا اور تابناک مستقبل داؤ پر لگا دیا تھا۔ وہ الوا پر جھک گیا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا "الوا، کیا ہوا تمہیں؟"

الوا نے ایک سوجی ہوئی آنکھ کھولی اور بمشکل ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بولی "ڈاکٹر...... جلدی...... ڈاکٹر کو
...... بلاؤ...... ڈاکٹر...... ڈاکٹر ہارلے......"

جارج نے فوراً ڈاکٹر ہارلے کو فون کر کے اطلاع دی کہ الوا کو حادثہ پیش آگیا ہے۔

پندرہ منٹ بعد ڈاکٹر ہارلے بھاگم بھاگ الوا کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ اس نے خون میں لت پت بے ہوش الوا کو دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے الوا کی نبض دیکھی جو ڈوبتی جا رہی تھی۔ اس نے جارج کو پولیس کو فون کرنے اور...... ایمبولینس منگوانے کی ہدایت کی الوا نے بمشکل تمام آنکھیں کھولیں، ڈاکٹر ہارلے کا ہاتھ تھاما اور گھگھیانے لگی کہ پولیس کو نہ بلایا جائے

ڈاکٹر ہارلے نے الوا کے ٹوٹے ہوئے جبڑے کو دیکھا اور پھر اس کے سگریٹ سے داغے گئے وجود کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے الوا کو بات چیت کے لیے سختی سے منع کر دیا۔ اُسے ناقابل برداشت درد ہو رہا تھا۔ پورا جسم پکے ہوئے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اس کے وجود کے ہر ہر حصے سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس کی قوتِ ارادی بہت مضبوط تھی اور وہ بڑی بے جگری سے موت سے لڑ رہی تھی۔

"پلیز......" الوا نے جسم و جاں کی تمام توانائی صرف کرتے ہوئے کہا"...... نجی ہسپتال...... دادی اماں
...... مجھے...... کبھی...... معاف نہیں...... کریں گی...... نہیں...... پولیس...... نہیں...... کار کا
...... حادثہ...... نامعلوم کار......"

یہ وقت بحث و مباحثے کا نہیں تھا۔ ڈاکٹر ہارلے نے ریسیور اٹھا کر ایک نمبر ڈائل کیا اور سلسلہ ملنے پر بولا "میں ڈاکٹر ہارلے بول رہا ہوں۔ فوراً ایک ایمبولینس ضروری ادویات اور آکسیجن کے ساتھ اٹھارہ کوئنز روڈ پر بھیج دو اور ڈاکٹر ایرک کو تلاش کر کے کہو کہ وہ مجھے ہسپتال میں ملے۔ اس سے کہنا کہ ایمرجنسی کیس ہے۔ سرجری کے لیے آپریشن کے کمرے کو تیار کر دے"

جارج نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا۔ اب اس کی جان میں جان آئی تھی۔ ورنہ اب سے تھوڑی دیر پہلے اسے یقین تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے جیل جانے سے نہیں بچا سکتی۔

ڈاکٹر ہارلے نے ماریا کے شوہر کی طرف نفرت اور حقارت سے دیکھا۔ اس خبیث انسان کے حلیے نے ساری کہانی ڈاکٹر ہارلے کو بتادی تھی۔ اس کے ہاتھ اور کپڑے مظلوم الیوا کے خون سے آلودہ تھے۔ اس کے چہرے پر وحشت اور گھبراہٹ تھی۔ وہ اپنے گھناؤنے جرم سے شرمندہ نہیں تھا بلکہ اپنی گرفتاری سے خوفزدہ تھا۔ ڈاکٹر ہارلے نے سخت لہجے میں کہا "میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے کیٹ سے دوستی کے ناتے کیا ہے۔ لیکن رازداری کی ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ تمہیں میرے ساتھ ماہر نفسیات کے پاس چلنا پڑے گا۔"

"مجھے کسی ماہرِ نفسیات کی ضرورت نہیں ......"

"بکواس بند کرو" ڈاکٹر ہارلے نے اس کی بات کاٹ کر کہا "اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میں پولیس کو تمہاری درندگی سے آگاہ کر دوں گا۔ وہ لوگ تم سے مل کر بے حد خوش ہوں گے۔ تم انسان نہیں وحشی درندے ہو۔ تمہارا آزادی سے گھومنا پھرنا کسی طرح جائز نہیں ہے مکمل علاج تک تمہیں کسی کمرے میں بند رکھنا چاہیے۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر ہارلے نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ٹھہرو ڈاکٹر" جارج نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔ وہ سنجیدگی سے صورتحال پر غور کر رہا تھا۔ وہ پہلے ہی خود کو ہارا ہوا جواری سمجھ رہا تھا۔ ڈاکٹر ہارلے اسے نئی زندگی کی پیشکش کر رہا تھا۔ وہ چند لمحے غور کرتا رہا، پھر ایک طویل سانس لے کر بولا "ٹھیک ہے جناب۔ مجھے منظور ہے۔ میں آپ کے ساتھ ضرور چلوں گا۔"

دور سے سائرن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ایمبولنس آچکی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد الیوا زخموں سے چور جدید ترین ہسپتال کے وسیع و عریض آپریشن کے کمرے میں میز پر ساکت و صامت لیٹی ہوئی تھی اور تین ڈاکٹر اور نصف درجن نرسیں انتہائی مستعدی سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ دس منٹ میں الیوا کو پے در پے پانچ انجکشن لگائے گئے تھے اور اب درد کی شدت کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی اکھڑی ہوئی سانسیں بھی اعتدال پر آچکی تھیں۔ اس کا جسم ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو حرکت دی مگر وہ کسی کی گرفت میں تھے۔ الیوا نے آنکھیں کھول دیں ایک نوجوان اور وجیہہ ڈاکٹر اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ الیوا کو ہوش میں آتے دیکھ کر وہ مسکرا کے بولا "میرا نام ایرک ہے اور میں آپ کا آپریشن کرنے والا ہوں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گی۔"

"میں بدصورت ہونا نہیں چاہتی ڈاکٹر" الیوا نے سرگوشی میں کہا "خدا کے لیے مجھے بدصورت ہونے سے بچالیں۔"

"آپ بالکل فکر نہ کریں" ڈاکٹر ایرک نے نرمی سے کہا "میں ہر ممکن کوشش کروں گا۔ میں آپ کو بے ہوش کر رہا ہوں۔ از راہ کرم اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیں۔"

ڈاکٹر ایرک نے نرسوں کو اشارہ کیا اور بے ہوش کرنے کا ماسک الیوا کے منہ پر ڈھانپ دیا گیا۔

✿

جارج نے الیوا کے فلیٹ میں بند رہنے میں عافیت جانی تھی۔ وہ خاصی دیر بستر پر دراز رہا۔ پھر وہ غسل خانے میں گھس گیا اور خون کے دھبے کپڑوں سے صاف کرتا رہا۔ تمام نشانات مٹا کر وہ فارغ ہوا اور کلائی گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آگیا۔ صبح کے تین بج رہے تھے۔ اسے امید تھی کہ ماریا اب تک سو چکی ہوگی مگر وہ صدر دروازہ کھول کر دبے پاؤں ہال میں داخل ہوا تو وہ اس کی منتظر تھی۔ شوہر پر نظر پڑتے ہی وہ اچھلی اور دوڑ کر اس سے لپٹ گئی اور گلے شکوے کرنے لگی جارج نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ سنگاپور جانے والا ہوائی جہاز لیٹ ہو گیا تھا اور فرم کے مالک نے اسے بوریت دور کرنے کے لیے روک لیا تھا۔

جارج رات بھر بے چینی سے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور الیوا کے بارے میں سوچتا رہا۔ اُسے بُری طرح مارنے پیٹنے کے بعد وہ اس کے لیے ہمدردی کے جذبات دل میں ابھرتے محسوس کر رہا تھا۔

✿

یہ الیوا کی خوش قسمتی تھی کہ ڈاکٹر ہارلے نے اس کے لیے ملک کے نامور سرجن ایرک کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ طبی دنیا میں اڑتیس سالہ ڈاکٹر ایرک جادوگر تسلیم کیا جاتا تھا۔ وہ پلاسٹک سرجری کا ماہر تھا اور اس حیثیت سے اس کی شہرت عالمگیر تھی دنیا میں پلاسٹک سرجری میں اس کے مقابلے کے دو تین ہی ڈاکٹر تھے اور امریکہ میں تو اس کا ہم پلہ ایک بھی ڈاکٹر نہیں تھا.... مضافات میں اس کا خوبصورت سا نجی ہسپتال تھا۔

ڈاکٹر ایرک نے پہلی بار الیوا کو دیکھا تو اس کے ذہن کو شدید دھچکا پہنچا تھا۔ وہ حسین و جمیل الیوا کی رنگین تصاویر کئی رسالوں میں دیکھ چکا تھا اور اب جو اس کا حشر ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر غصے اور نفرت کی ایک لہر اس کے وجود میں اٹھی تھی۔ پتہ نہیں کس وحشی درندے نے پھول سی نازک الیوا کو اس حال تک پہنچایا تھا۔ اس نے ڈاکٹر ہارلے سے اس بربریت کے ذمے دار کا نام معلوم کیا اور اسے ڈاکٹر ہارلے کے جواب سے بڑی حیرت ہوئی۔ ہارلے نے بتایا کہ الیوا کی یہ حالت ایک حادثے سے ہوئی ہے۔ اس نے زہرخند سے ڈاکٹر ہارلے سے کہا تھا "کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کسی گاڑی نے الیوا کو ٹکر ماری اور پھر ڈرائیور نے اتر کے سگریٹ سے اس کا جسم داغ دیا۔ ہٹلر کیا ہے ڈاکٹر ہارلے؟ کون شخص ہے وہ؟"

"مجھے افسوس ہے۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم اس کا چہرہ درست کر سکتے ہو نا؟" ڈاکٹر ہارلے نے کہا تھا۔
ڈاکٹر ایرک نے آمادگی ظاہر کی تھی اور اب الوا کا آپریشن ہو رہا تھا۔ سہ پہر کے قریب ڈاکٹر ایرک نے اپنے ایک نائب سے کہا "آپریشن مکمل ہو چکا ہے۔ مریضہ کو انتہائی نگہداشت کے کمرے میں پہنچا دو۔ ذرا سی بھی گڑبڑ ہو تو مجھے بلوا لینا۔"

الوا کا آپریشن نو گھنٹے جاری رہا تھا۔
اڑتالیس گھنٹے بعد الوا کو انتہائی نگہداشت کے کمرے سے نکال لیا گیا۔ اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ جارج اس سے ملاقات کے لیے ہسپتال پہنچا اور خود کو الوا کا وکیل ظاہر کر کے اس کے کمرے میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے الوا کو تاسف سے دیکھا جو چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا پورا جسم پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ کئی ٹیوبیں بھی اس کے جسم کے مختلف حصوں میں لگی ہوئی تھیں۔ چہرہ بھی پٹیوں سے لپٹا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں اور ہونٹ دکھائی دے رہے تھے۔ جارج الوا سے بات کرنے کے لیے بے قرار تھا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ الوا کے مزاج کیسے ہیں۔ کہیں وہ غصے اور نفرت کی شدت سے اس کے خلاف انتقامی کارروائی کے لیے تو نہیں سوچ رہی۔۔۔ لیکن اس کا یہ خدشہ بے بنیاد ثابت ہوا۔ جارج نے اس سے اپنے کیے کی معافی مانگی اور الوا نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ وہ اس سے ناراض نہیں ہے اور وہ اپنے منصوبے پر عمل جاری رکھیں گے۔ الوا نے اسے ہدایت کی کہ ماریا کو اس کے زخمی ہونے کے بارے میں نہ بتایا جائے اور اسے یہ کہہ دیا جائے کہ اس کی بہن چند ہفتوں کے لیے یورپ گئی ہے اور آتے ہی اس سے رابطہ قائم کرے گی۔
جارج ہسپتال سے رخصت ہوا تو اس کے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر چکا تھا۔ وہ خود کو ہلکا پھلکا، مطمئن اور پرسکون محسوس کر رہا تھا۔

جارج کے جاتے ہی الوا کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ تھوڑی ہی دیر میں گہری نیند سو رہی تھی۔
الوا کی آنکھ کھلی تو اس نے اسمارٹ اور ہینڈسم ڈاکٹر ایرک کو بستر کے قریب کھڑے پایا۔ اس نے الوا کی مزاج پرسی کی اور اس کے استفسار پر تفصیل سے اس کے زخموں اور ان کے علاج کے بارے میں بتانے لگا۔ الوا نے آئینے میں اپنی صورت دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور ڈاکٹر ایرک نے معذرت چاہی کہ فی الوقت اسے آئینہ نہیں دیا جا سکتا۔
الوا نے پوچھا "میں۔۔۔۔ میں ان پٹیوں کے اترنے کے بعد کیسی لگوں گی؟"
"آپ ویسی ہی خوبصورت دکھائی دیں گی جیسی حادثے سے پہلے تھیں۔" ڈاکٹر ایرک نے مسکرا کے جواب دیا۔
"مجھے یقین نہیں آتا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ بگڑی ہوئی شکل دوبارہ ویسی ہی کیسے بن سکتی ہے؟"
"تم خود ہی دیکھ لو گی۔۔۔۔۔۔۔ اور اب یہ بتاؤ کہ تمہارا یہ حشر کس ظالم نے کیا تھا؟ وہ وحشی کون تھا؟ مجھے پولیس کو رپورٹ لکھ کر دینی ہوگی۔"
الوا چند لمحے خاموش رہی، پھر بولی "ایک ٹرک نے مجھے ٹکر مار دی تھی۔"
ڈاکٹر ایرک سناٹے میں رہ گیا۔ ڈاکٹر ہارلے اور الوا کی خاموشی عجیب تھی وہ دونوں ہی اس وحشی کا نام بتانا نہیں چاہتے تھے اس نے الوا پر بہت زور دیا مگر اس نے مجرم کا نام نہیں بتایا۔ الوا نے ڈاکٹر ایرک کا ہاتھ تھام لیا اور التجا آمیز لہجے میں بولی "پلیز۔۔۔۔ اگر میری دادی جان اور بہن کو پتہ چل گیا۔۔۔۔۔ تو انہیں بہت صدمہ ہوگا۔ اگر آپ نے پولیس کو بتایا۔۔۔۔۔ تو یہ بات اخبارات میں بھی آ جائے گی۔۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔ پولیس کو حادثے کی رپورٹ لکھ کر دے دیں۔"
ڈاکٹر ایرک چند لمحے کچھ سوچتا رہا، پھر طویل سانس لے کر بولا "اچھی بات ہے۔ میں اپنی رپورٹ میں یہی لکھوں گا کہ آپ اپنی قیام گاہ پر سیڑھی سے پھسل گئی تھیں۔"
اس ملاقات کے بعد ڈاکٹر ایرک روزانہ شام کو الوا سے ملنے کے لیے آنے لگا۔ اب وہ دیر تک اس کے پاس بیٹھا مختلف موضوعات پر باتیں کرتا رہتا تھا۔ وہ اس کے لیے پھول اور ہسپتال کی گفٹ شاپ سے چھوٹے موٹے تحفے بھی لانے لگا تھا۔ روزانہ الوا اس سے اپنے چہرے کے بارے میں پوچھتی تھی اور وہ اسے مطمئن کر دیا کرتا تھا۔ الوا اس سے آئینہ طلب کرتی اور وہ یہی جواب دیتا کہ ابھی وقت نہیں آیا۔ الوا کے استفسار پر ڈاکٹر ایرک نے بتایا کہ ابھی اس نے شادی نہیں کی ہے اور نہ سنجیدگی سے اس نے کسی لڑکی سے دوستی کی ہے۔ اس نے بتایا کہ پیشہ ورانہ مصروفیات نے اسے اتنا موقع ہی نہیں دیا کہ وہ اس طرف توجہ دے سکے۔
پندرہ روز بعد الوا کو ہسپتال سے ڈاکٹر ایرک کے نجی کلینک میں منتقل کر دیا گیا۔ ڈاکٹر ایرک نے اسے یقین دلایا تھا کہ اسے کلینک میں ہسپتال سے زیادہ آرام ملے گا۔ کلینک شہر سے خاصے فاصلے پر تھا۔ لیکن ڈاکٹر ایرک روزانہ اس سے ملنے پہنچ جاتا تھا۔
کلینک میں داخل ہونے کے پانچ ہفتوں بعد ڈاکٹر ایرک نے اس کی پٹیاں کھول دیں اور نرس سے آئینہ منگوایا۔ الوا کو خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اس نازک لمحے کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتی رہی تھی۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہو چکی تھیں اور اب وہ لمحہ آ پہنچا تھا۔ وہ اپنا اصلی چہرہ چاہتی تھی۔ کوئی اجنبی چہرہ اپنے چہرے پر سجانا نہیں چاہتی تھی۔
ڈاکٹر ایرک نے الوا کے ہاتھ میں آئینہ تھمایا تو اس کے ہاتھ بری طرح کپکپا رہے تھے۔ اس نے آہستہ آہستہ آئینے کو اونچا کیا اور پھر اس کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ ذرا سی بھی تو تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

وہ ویسی کی ویسی تھی اور یہ بلاشبہ ایک معجزہ تھا۔ اس کا چہرہ صاف شفاف تھا۔ ہلکی سی خراش تک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ لوگ ڈاکٹر ایرک کو جادوگر کہتے تھے۔ تو غلط نہیں کہتے تھے۔ وہ دیر تک آئینے میں غیر یقینی سے اپنی شکل دیکھتی رہی اور پھر آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ بہنے لگے۔

الوا نے ایرک کی طرف دیکھا اور بولی "بہت بہت شکریہ" پھر الوا نے ایرک کا ہاتھ پکڑ کے چوم لیا۔ ایرک کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ کسی مریض نے اس انداز میں اس کا شکریہ ادا نہیں کیا تھا۔ ایرک نے بمشکل تھوک نگل کے کہا "مجھے..... مجھے خوشی ہے کہ تمہارا چہرہ ٹھیک ہو گیا۔ میری محنت بارآور ثابت ہوئی ہے"۔

✡

جارج الوا کے زخمی ہونے سے بُری طرح خوفزدہ ہوا تھا۔ اس کا مستقبل تاریک ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ الوا کے منصوبے پر عمل سے پہلے اُسے احساس نہیں تھا کہ کرو گر بریٹ کمپنی کی کیا قدر و قیمت ہے۔ مگر اب اسے احساس تھا کہ وہ ماریا کی دولت کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ماریا سے شادی کر کے وہ اپنے باپ اور بھائیوں سے کئی گنا زیادہ طاقتور ہو گیا تھا۔ اب وہ فخر سے سربلند کر کے یونان میں چل سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب وہ یونان گیا تو لوگ اس کا پُرجوش خیر مقدم کریں گے اور یہی وجہ ہے کہ جارج نے خود کو ایک مثالی شوہر ثابت کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ماریا کا بے حد خیال رکھتا تھا۔ اسے اپنی محبت کا یقین دلاتا رہتا تھا۔ اس نے کیٹ پر بھی خاص توجہ دی تھی۔ وہ اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا رہتا تھا۔ کیٹ کی عمر اکیاسی برس کی ہو چکی تھی اور پیرانہ سالی کے باوجود اس کی صحت مثالی تھی اور وہ شب و روز انتہائی مستعدی سے کمپنی کے معاملات سلجھاتی رہتی تھیں۔ کرو گر بریٹ کمپنی کی چیئرمین کی حیثیت سے ان کی کارکردگی نقید المثال تھی۔ جارج نے ان کی نظروں میں بڑا اچھا تاثر قائم کر رکھا تھا۔

ڈاکٹر ہارپے نے ایک روز جارج کو فون کیا اور اس کا خوشگوار موڈ غارت ہو کر رہ گیا۔ ہارپے کا رویہ انتہائی جارحانہ تھا۔ اس نے سخت لہجے میں کہا "میں نے ملک کے نامور ماہرِ نفسیات پیٹر شین سے بات کی ہے۔ تمہیں اس سے ہر حال میں ملنا ہوگا اور میں تمہارا کوئی عذر نہیں سنوں گا۔ ہمارے درمیان معاہدہ ہو چکا ہے اور خلاف ورزی کی صورت میں میں مجبوراً پولیس سے رابطہ قائم کر لوں گا"۔

"نہیں نہیں" جارج نے جلدی سے کہا "میں بالکل تیار ہوں، خلاف ورزی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"۔

جارج نے ڈاکٹر پیٹر شین کا پتہ نوٹ کر لیا اور دل ہی دل میں عذابِ جاں ڈاکٹر ہارپے کی سات پشتوں کو کوستا رہا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ دو تین بار ماہرِ نفسیات سے ملے گا اور اسے بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

جارج ڈاکٹر ہارپے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ دوسری مصیبت نازل ہو گئی۔ الوا نے اسے فون کر کے اطلاع دی کہ وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو کے گھر آ گئی اور رات آٹھ بجے ہر صورت میں اس سے ملنا چاہتی ہے۔

جارج طوہاً و کرہاً رات ٹھیک آٹھ بجے الوا کے فلیٹ پہنچ گیا۔ وہ اسے دیکھ کر حیران ہی تو رہ گیا۔ پلکیں جھپکائے بغیر وہ دیر تک غیر یقینی سے الوا کی شکل دیکھتا رہا۔ اسے بعید ترین توقع بھی نہیں تھی کہ الوا اپنے اصلی روپ کو دوبارہ حاصل کر سکے گی۔ وہ ویسی ہی خوبصورت تھی۔ اب بھی اس میں اور ماریا میں بال برابر بھی فرق نہیں تھا۔ اس کے سامنے ماریا ہی کھڑی تھی۔ مگر نہیں، یہ تو الوا تھی۔ الوا فاتحانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے اُسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس جانور کا بغور جائزہ لے رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اس وحشی کا کیا علاج کرنا چاہیئے۔ اس درندے نے جو حشر اس کا کیا تھا، اس کے بعد اُسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ لیکن ابھی اس کا موقع نہیں تھا۔ اس کا یہ غلیظ وجود الوا کے لیے بے حد ضروری تھا۔ جارج نے پھر اپنی سفاکی اور بربریت کی معافی چاہی اور الوا نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور بولی "جو ہوا اُسے بھول جاؤ۔ اب یہ سوچو آگے کیا کرنا ہے۔ یوں سمجھ لو صورتحال ویسی ہی ہے"۔

جارج کو یاد آ گیا کہ ایک تبدیلی ضرور آئی ہے۔ اس نے کمزور آواز میں کہا "تمہارے فون سے پہلے ہارپے نے فون کیا تھا اس نے میرے بارے میں کسی ماہرِ نفسیات سے بات کی ہے اور مجھے اس سے ملنے کا حکم دیا ہے"

"اس سے کہہ دو کہ تمہارے پاس وقت نہیں ہے"۔ الوا نے کہا

"میں نے جان چھڑانے کی بہت کوشش کی تھی اور اس نے دھمکی دی تھی کہ..... میں نے اس کا حکم نہیں مانا تو تمہارے زخمی ہونے کا واقعہ پولیس کو بتا دے گا"۔

"لعنت ہے! یہ سالا ہارپے بھی ہاتھ دھو کے پیچھے پڑ گیا ہے" الوا نے برا سا منہ بنا کے کہا۔ "خیر یہ بتاؤ، وہ ڈاکٹر کون ہے؟"

جارج نے اسے ماہرِ نفسیات کا نام بتایا اور وہ گہری سوچ میں پڑ گئی اس کے ذہن میں ایک شاندار ترکیب جنم لے رہی تھی۔ اس دوران میں جارج اسے مطمئن کرنے کے لیے باتیں کرتا رہا تھا مگر الوا نے اس کی ایک بات بھی نہیں سنی تھی۔ چند منٹ بعد اس نے طویل سانس لیا اور بولی "پانسہ پلٹ چکا ہے۔ ڈاکٹر پیٹر اس ڈرامے میں اہم ترین کردار ادا کرے گا۔

جارج ہونقوں کی طرح منہ کھولے شیطانی ذہن کی مالک الوا کو دیکھ رہا تھا۔

ڈاکٹر پیٹر کی عمر پینتیس چھتیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ ذہین اور وجیہہ تھا اس کی شخصیت سحر انگیز تھی۔ ڈاکٹر سے زیادہ وہ فٹ بال کا چست و چالاک کھلاڑی لگتا تھا۔ طبقۂ امرا میں اس کی بڑی قدر تھی۔ ملک کے بیشتر مالدار لوگ اپنے مسائل لے کر اس کے پاس آتے تھے۔ ڈاکٹر ہارلے نے بہت سوچ سمجھ کے پیٹر سے رابطہ قائم کیا تھا۔ پیٹر کے پاس وقت بالکل نہیں تھا مگر ڈاکٹر ہارلے کے احترام میں اس نے جارج کا کیس لے لیا تھا۔ پیٹر نے مسئلہ معلوم کیا تھا اور ہارلے نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی تھی کہ یہ اس کی مہارت کا امتحان ہے۔ نرس نے جارج کی آمد کی اطلاع دی اور پیٹر نے اسے اندر بھیجنے کی ہدایت کی چند ہی لمحوں بعد جارج اس کے سامنے بڑے اعتماد اور تمکنت سے بیٹھا تھا اور اس کے انداز ہی سے پیٹر سمجھ گیا کہ یہ وجیہہ و شکیل شخص واقعی نفسیاتی مریض ہے۔

"ڈاکٹر ہارلے نے بتایا تھا کہ تمہیں کوئی مسئلہ درپیش ہے؟" پیٹر نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"مجھے ایک نہیں، دو مسئلے درپیش ہیں" جارج نے ایک آہ بھر کے کہا۔ "دراصل ...... مجھے بڑی شرمندگی محسوس ہوتی ہے بات یہ ہے ڈاکٹر کہ مجھ سے ایک ایسی حرکت سرزد ہوئی ہے۔ جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے ایک عورت کی پٹائی کی ہے۔ ہم دونوں کسی بات پر بحث کر رہے تھے کہ میں آپے سے باہر ہو گیا۔ میرا ذہن تاریک ہو گیا اور جب مجھے ہوش آیا تو..... تو وہ فرش پر پڑی کراہ رہی تھی۔"

پیٹر اس کا مسئلہ سمجھ چکا تھا۔ وہ فطری طور پر تشدد پسند تھا اور عورتوں کو مارنے پیٹنے میں اسے بے پناہ لذت محسوس ہوتی تھی۔ جارج نے اس کے پوچھنے پر بتایا کہ اس نے اپنی سالی کی مرمت کی تھی۔ پیٹر نے بارہا اخبارات اور جرائد میں ان خوبصورت اور ہمشکل جڑواں بہنوں کے بارے میں پڑھا تھا اور ان کی تصاویر دیکھی تھیں۔ جارج نے اس کے پوچھنے پر بتایا کہ اس نے اپنی سالی کو ایک آدھ تھپڑ ہی مارا تھا۔ جب کہ معاملہ اس کے قطعی برعکس تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہارلے اسے کبھی اس کے پاس نہ بھیجتا۔ اس نے جارج سے یہ بات پوچھی تو اس نے اعتراف کیا کہ اس نے اپنی سالی کو اچھا خاصا زخمی کر دیا تھا۔ جارج کا یہ کہنا کہ اس نے لاشعوری طور پر اپنی سالی کو مارا پیٹا تھا۔ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بیشتر مریض اپنی خباثتوں کا یہی جواز پیش کرتے تھے۔ جارج نے بتایا کہ گزشتہ کئی ماہ سے وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔ یونان میں اس کے والد علیل ہیں۔ وہ ان سے بہت محبت کرتا ہے اور اسے ان کی فکر میں اکثر نیند نہیں آتی۔

جارج نے بتایا کہ اس کا دوسرا مسئلہ اس کی پیاری بیوی ماریا سے متعلق ہے۔ اس کی ذہنی حالت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ وہ بے حد جذباتی ہے زود رنج اور حد درجہ حساس ہے۔ وہ اکثر خودکشی کی باتیں کرتی ہے جارج نے یہ بھی بتایا کہ اس نے اپنی بیوی کو کسی اچھے ڈاکٹر سے ملنے کا مشورہ دیا تھا اور ماریا نے صاف انکار کر دیا تھا۔

"میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اس بارے میں ڈاکٹر ہارلے سے بات کریں۔" پیٹر نے نرم لہجے میں کہا۔ "وہ ماریا کے فیملی ڈاکٹر ہیں۔"

جارج نے گھبرا کے کہا۔ "نہیں، میں نہیں چاہتا کہ ماریا یہ محسوس کرے کہ میں اس کی عدم موجودگی میں اس کے بارے میں لوگوں سے باتیں کرتا پھرتا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ ڈاکٹر ہارلے ......"

"آپ فکر مت کریں۔" پیٹر نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "میں خود ہی ان سے بات کر لوں گا۔"

اس رات جارج نے ڈاکٹر پیٹر سے ملاقات کی ساری تفصیل ایوا کو بتا دی اور ایوا نے جب یہ بات سنی کہ پیٹر ماریا کے معاملے میں ڈاکٹر ہارلے سے بات کرنے والا ہے تو اس کی جان ہی نکل گئی۔ وہ دھپ سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ پیشانی پر بل ڈالے کچھ سوچتی رہی، پھر ایک گہرا سانس لے کر بولی۔ "تم ڈاکٹر پیٹر سے ملتے رہو، میں اس مسئلے کا کوئی حل نکالتی ہوں۔"

دوسرے روز ایوا ڈاکٹر ہارلے سے ملنے اس کے دفتر پہنچ گئی۔ ہارلے کے تعلقات ایوا کے خاندان سے بہت اچھے تھے۔

ڈاکٹر ہارلے کو ایوا کو دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ایرک نے واقعی کمال کر دکھایا تھا۔ پہلے کی اور اب کی ایوا میں ذرا سا فرق تھا۔ اس کے ماتھے پر ہلکی سی سرخ لکیر دکھائی دے رہی تھی اور ایوا نے بتایا کہ ڈاکٹر ایرک کے کہنے کے مطابق ماتھے کی یہ سرخ لکیر بھی دو تین ماہ میں غائب ہو جائے گی۔

ڈاکٹر ہارلے نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "اور سناؤ کیسے آنا ہوا؟ جارج نے دوبارہ تو کمینگی نہیں کی؟"

"نہیں ڈاکٹر۔" ایوا نے دھیمی آواز میں کہا۔ "میں آپ سے ماریا کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ اس کا رویہ عجیب سا ہو گیا ہے۔ وہ بہت زیادہ فکر مند رہنے لگی ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ماریا کتنی جذباتی لڑکی ہے اس کے ذہن پر زبردست دباؤ ہے۔ وہ ان دنوں سنجیدگی سے خودکشی کے بارے میں سوچ رہی ہے۔"

ڈاکٹر ہارلے نے غیر یقینی سے ایوا کی طرف دیکھا اور سپاٹ لہجے میں بولا۔ "مجھے یقین نہیں آتا۔ وہ جذباتی ضرور ہے مگر اس حد تک نہیں کہ خودکشی کے بارے میں سوچنے لگے۔"

"پہلے مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا اور میں نے اس سے ملاقات کی تو اس کی حالت دیکھ کر میرے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھی اور خود کلامی کے سے انداز میں مرنے کی باتیں کرتی تھی۔ میں بہت پریشان ہوں اور اس بارے میں دادی جان سے بات بھی نہیں کر سکتی۔ انہیں تو میں کھو ہی چکی ہوں مگر میں اپنی پیاری بہن ایوا کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔"

ڈاکٹر ہارلے نے ایوا کو تسلی دی، اسے بتایا کہ ایسی دوائیں ایجاد ہو چکی ہیں جو معجزہ دکھاتی ہیں۔ اس نے ایوا کو ہدایت دی کہ کل

صبح ماریا کو اس کے پاس بھیج دے اور بے فکر ہو جائے، ڈاکٹر ہارلے نے رسمی الوداعی کلمات کے بعد ایوا کو رخصت کر دیا۔

ایوا نے فلیٹ پر پہنچتے ہی دروازہ اندر سے مقفل کیا اور سنگھار میز کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس نے بڑی مشاقی سے کریم اور رومال کی مدد سے پیشانی سے ہلکی سی سرخ لکیر صاف کر دی۔ اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

دوسرے روز صبح دس بجے ڈاکٹر ہارلے کی سیکرٹری نے مسز جارج کی آمد کی اطلاع دی اور ہارلے نے اسے فوراً ہی اپنے کمرے میں بلوا لیا۔ وہ دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ڈاکٹر ہارلے نے اس کی حالت دیکھ کر تاسف سے سر ہلایا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ہارلے نے اُسے کرسی پر بٹھایا اور اس کی پریشانی کا سبب دریافت کیا۔

ماریا نے شرم سے سر جھکا لیا اور دھیمی آواز میں اپنی کیفیت بتانے لگی۔ اس نے بتایا کہ وہ جسمانی لحاظ سے پوری طرح صحت مند ہے لیکن اس کا ذہن ہر لمحے الجھا رہتا ہے۔ وہ اپنے سر پر بہت بڑا بوجھ محسوس کرتی ہے اور اسی سبب سے وہ سو بھی نہیں پاتی۔ وہ رات بھر بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔ کسی کام اور کسی چیز میں اس کا دل نہیں لگتا اور اس کی زندگی بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔

ڈاکٹر ہارلے نے تمام تر توجہ سے ماریا کی کیفیت سنی اور اسے تسلی دی۔ اس نے کئی جدید ترین ادویات کے نام گنوا دیے جن کے استعمال سے وہ نارمل ہو سکتی تھی۔ یہ ادویات زود اثر تھیں اور ان کے ذیلی اثرات نہیں تھے۔

ڈاکٹر ہارلے نے اس کا تفصیلی معائنہ کیا اور چند دواؤں کے نام لکھ دیے اس نے ماریا کو مکمل آرام کی ہدایت کی اور ایک ہفتے بعد آنے کی تاکید کی۔ ماریا نے تشکر آمیز نظروں سے ہارلے کو دیکھا اور بولی "امید ہے ان دواؤں کے استعمال سے وہ ہولناک خواب دکھائی نہیں دے گا۔"

"تم کس خواب کی بات کر رہی ہو؟"

"ارے! میں نے آپ کو بتایا نہیں؟ مجھے گزشتہ دو ماہ سے ایک ہی خواب دکھائی دے رہا ہے۔ میں ایک ڈولتی ہوئی شکستہ کشتی میں سوار ہوتی ہوں اور طوفانی ہواؤں کی ہولناک آوازوں سے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے سے محسوس ہوتے ہیں۔ میری وحشت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی رہتی ہے اور میں ایک تیز چیخ مار کر سمندر میں چھلانگ لگا دیتی ہوں اور پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔۔۔۔"

ڈاکٹر ہارلے نے مسکرا کے کہا "یہ سب تمہارے ذہنی انتشار کا نتیجہ ہے۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے جو دوائیں تمہیں لکھ کر دی ہیں ان کے استعمال سے تم گہری اور پرسکون نیند سوؤ گی اور کسی قسم کا کوئی خواب تمہیں دکھائی نہیں دے گا۔"

وہ ڈاکٹر ہارلے کے دفتر سے رخصت ہوئی اور باہر فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی ہو گئی۔ ٹیکسی کی تلاش میں گردو پیش میں نظریں دوڑاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی "چلو ایوا جانی یہ قصہ بھی تمام ہوا۔ ڈاکٹر ہارلے کو بھی تم نے قابو کر لیا۔"

ایوا نے ڈاکٹر ہارلے کے لکھے ہوئے نسخے کو زہریلی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیر کر دیکھا اور فضا میں اچھال دیا۔ سکون پہنچانے والی ادویات کا نسخہ ہوا کے دوش پر اُڑ رہا تھا اور وہ بے پناہ سکون محسوس کر رہی تھی۔

★★

کیٹ تھک چکی تھیں ان کی عمر اب بیاسی برس کی ہو چکی تھی۔ قویٰ مضمحل ہو رہے تھے اور کاروباری میٹنگوں میں وہ اکثر ذہنی طور پر غیر حاضر رہنے لگی تھیں اس وقت بھی کمپنی کے چوٹی کے عہدیداروں کا اہم ترین اجلاس ہو رہا تھا اور وہ خیالات میں گم تھیں "آج کا اجلاس کتنا طویل معلوم ہو رہا ہے جب کہ ابھی بمشکل دو گھنٹے ہوئے ہیں۔ شاید میری عمر کچھ زیادہ ہی طویل ہو گئی ہے۔ میں اپنی عمر کی بیاسی بہاریں دیکھ چکی ہوں اور طویل کاروباری میٹنگوں میں شرکت کرنا میرے بس کی بات نہیں رہی ہے۔"

ادھر جارج پروگرام کے مطابق ڈاکٹر پیٹر کے کلینک میں کوچ پر لیٹا اس کے بیزار کن سوالات کا جواب دے رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ ماضی میں اس نے کبھی کسی پر تشدد نہیں کیا۔ اسے والدین نے کبھی جسمانی اذیت نہیں دی تھی۔ اس نے شاذونادر ہی والدین کی نافرمانی کی ہو گی۔

پیٹر اس کے جوابات سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جارج جھوٹ بول رہا ہے مگر کیوں؟ یہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ ڈاکٹر ہارلے نے اس خبیث کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، وہ بہت ہی ہولناک تھا۔ اس نے وحشت اور بربریت کی انتہا کر دی تھی۔ ہارلے نے یہ بھی بتایا تھا کہ جارج کسی ماہر نفسیات کے پاس جانے کے لیے تیار ہی نہ تھا، مجبوراً اسے پولیس کو اس کی درندگی کی رپورٹ دینے کی دھمکی دینا پڑی تھی۔ پیٹر نے اس کے جوابات سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ جھوٹ بولنے کا ماہر ہے اور عام آدمی کو باآسانی بیوقوف بنا سکتا ہے مگر وہ ملک کے نامور ماہر نفسیات پیٹر شین کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ ڈاکٹر ہارلے نے یہ بھی بتایا تھا کہ چند روز قبل ماریا بھی اس کے پاس آئی تھی۔ اس کی حالت واقعی خراب ہو رہی تھی۔ اس نے ماریا کو سکون بخش ادویات لکھ دی تھیں۔

ڈاکٹر ایرک نے ایوا کو ذہن سے جھٹکنے کی بہت کوشش کی تھی اور اسے ناکامی ہوئی تھی۔ وہ حسین و جمیل لڑکی اس کے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی اس کا خوبصورت چہرہ اس کی نظروں میں گھومتا رہتا تھا۔ اس نے ایوا کو فون کیا اور اس کی خیریت دریافت کی۔ ایوا نے گرمجوشی ظاہر نہیں کی اور لیے دیئے انداز میں اس سے باتیں کرتی رہی۔ ایرک نے ہمت کر کے اسے دوپہر کے کھانے کی دعوت دے ڈالی اور ایوا نے قدرے ہچکچاہٹ سے اس کی دعوت قبول کر لی۔ ایرک نے ریستوران اور وقت کا تعین کیا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

دوسرے روز دوپہر کو ایرک نے نیویارک کے سب سے خوبصورت اور مہنگے ریستوران میں ایوا کے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے کے

دوران میں گفتگو جاری رہی۔ ایرک اس کی سحر انگیز شخصیت سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ابتدا میں وہ نروس رہا تھا۔ اس کی کیفیت اٹھارہ سالہ لڑکے کی سی تھی۔ جو پہلی بار کسی لڑکی سے تنہائی میں مل رہا ہو۔ ایوا اس کی بوکھلاہٹ سے خوب محظوظ ہوئی تھی...... پھر ایرک نے دل کڑا کر کے ایوا سے کہا "کیا...... کیا تم دوبارہ مجھ سے ملو گی؟"

ایوا نے سنجیدگی سے کہا "بہتر یہی ہو گا کہ ہم آئندہ نہ ملیں۔ یہ ہم دونوں کے حق میں بہت اچھا ہو گا۔ مجھے ڈر ہے کہ میں تمہاری محبت میں گرفتار ہو جاؤں گی۔"

ایرک کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا اور اس نے فوراً ہی سر جھکا لیا۔

ایوا کو الوداع کہہ کر ڈاکٹر ایرک ہسپتال پہنچ گیا۔ استقبالیہ کلرک نے بتایا کہ ڈاکٹر ہارلے ہسپتال کے کیفے ٹیریا میں کھانا کھانے گئے ہیں۔ ایرک انتظار کرنے کی بجائے کیفے ٹیریا پہنچ گیا اور رسمی علیک سلیک کے بعد بولا "ڈاکٹر، میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ جو بات بتائیں گے، وہ میرے سینے میں دفن رہے گی۔ خدا کے لیے مجھے سچ سچ بتا دیں کہ ایوا کو زخمی کس نے کیا تھا؟ میں کوئی عذر نہیں سنوں گا۔"

ہارلے چند لمحوں کے لیے ہچکچایا، پھر شانے لاپروائی کے انداز میں اچکا کر بولا "ٹھیک ہے۔ وہ وحشی ایوا کا اپنا بہنوئی جارج تھا۔"

ڈاکٹر ایرک ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے ایوا کی خفیہ دنیا کے ایک گوشے کو دریافت کر لیا تھا۔ ہارلے نے یہ راز فاش کر کے اس پر بڑا کرم کیا تھا۔ اب وہ بڑے اعتماد کے ساتھ ایوا سے بات کر سکتا تھا۔

☆

جارج کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ اس ڈرامے کا ڈراپ سین چاہتا تھا۔ وہ تیز آواز میں ایوا سے بولا "وہاں دولت کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ وصیت تبدیل ہو چکی ہے، خزانے کی کنجی ہمارے ہاتھ میں ہے، پھر انتظار کس بات کا ہے؟"

ایوا نے دھیمی آواز میں کہا "مجھے تم سے اتفاق ہے۔ وقت آ چکا ہے کہ ہم آگے بڑھیں اور خزانے پر قابض ہو جائیں۔ ہم اگلے ہفتے اپنے منصوبے کے آخری حصے پر عمل شروع کر دیں گے۔"

تین روز بعد جارج پھر ڈاکٹر پیٹر کے کلینک میں سوالات کے عذاب ناک مرحلے سے گزر رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر پیٹر کو بتایا کہ اس کی بیوی کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی ہے اور وہ اس کے بارے میں بہت فکرمند ہے۔ وہ مستقل ڈوبتے کی باتیں کر رہی ہے۔

پیٹر نے جارج کو اطمینان دلایا کہ اس کی بیوی ڈاکٹر ہارلے کے زیرِ علاج ہے اور وہ بہت جلد نارمل ہو جائے گی۔ پیٹر کو اس خطرناک شخص سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ یہ وحشی شخص ضرورت سے زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ پیٹر کے کانوں میں ڈاکٹر ہارلے کے کہے ہوئے جملے گونج رہے تھے۔ جو اس نے جارج کے بارے میں کہے تھے "اس وحشی نے سفاکی اور بربریت کی انتہا کر دی تھی۔ پیٹر۔ اس نے بے چاری ایوا کو بری طرح کچل کر رکھ دیا تھا۔"

پیٹر نے اس سے تشدد سے متعلق کئی سوالات کیے اور جارج نے ان سب کے الٹے سیدھے جواب دے دیئے۔

پیٹر نے چند لمحے کچھ سوچا اور بولا "تشدد سے بعض لوگوں کے اعصاب کو بڑا سکون محسوس ہوتا ہے۔ وہ اپنے شکار کو مارتے پیٹتے ہیں اور اس سے انہیں بڑی تسکین ملتی ہے۔"

"میں آپ کا مطلب سمجھ چکا ہوں ۔۔۔ میرا ایک دوست طوائفوں کو بری طرح مارتا پیٹتا تھا۔"

"بہت خوب اب اس کا دوست بھی پیدا ہو گیا۔ پیٹر نے سوچا اور بولا "مجھے اپنے اس دوست کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔"

"وہ طوائفوں سے شدید نفرت کرتا تھا اور موقع ملنے پر ان کی زبردست ٹھکائی کرتا تھا۔ وہ ان خراب عورتوں کو سبق سکھانا چاہتا تھا۔ ایک بار ہم سیر و تفریح کے لیے جمیکا گئے تھے۔ وہاں اس نے ایک طوائف سے دوستی کی اور اسے شہر سے باہر لے گیا۔ وہ مجھے بھی زبردستی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ طوائف نے معمول سے زیادہ معاوضہ طے کیا تھا۔ وہ اس بدصورت عورت کو مارنے پیٹنے لگا تھا۔ میں نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی۔ مگر اس پر جیسے جنون سوار تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے طوائف کو لہولہان کر دیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے بعد اس طوائف نے کبھی کسی گاہک سے زیادہ رقم طلب نہیں کی ہو گی۔"

پیٹر اپنے مریض کو پورے طور پر سمجھ چکا تھا۔ اس کے دوست کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس نے اپنا ہی واقعہ فرضی دوست سے منسوب کر کے اسے سنا دیا تھا۔ پیٹر نے طے کر لیا تھا کہ وہ جلد از جلد ڈاکٹر ہارلے سے کھل کر بات کرے گا۔

پیٹر نے دوسرے ہی روز کلب میں ڈاکٹر ہارلے سے ملاقات کی۔ وہ عجیب مشکل سے دوچار تھا۔ ڈاکٹر اور مریض کے مابین رازداری کے معاہدے کو مجروح کیے بغیر وہ جارج کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پیٹر کے استفسار پر ہارلے نے بتایا کہ ملڈیا بہت ہی اچھی لڑکی ہے۔ وہ ماریا اور اس کی بہن ایوا کو بچپن سے جانتا ہے۔ دونوں جڑواں بہنوں کے قد و قامت اور شکل و صورت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں ہے۔ انہیں ایک سا لباس پہنا کر کھڑا کر دیا جائے تو کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکے گا کہ کون سی ایوا ہے اور کون سی

ماریا۔ اس بنیاد پر دونوں بہنیں بچپن میں لوگوں کو بے وقوف بھی بنایا کرتی تھیں۔ پیٹر غیر یقینی سے ہارلے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے چند لمحے کچھ سوچا اور بولا "آپ نے بتایا تھا کہ ماریا اپنی ذہنی پریشانی کے سلسلے میں آپ سے ملنے آئی تھی۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ ماریا ہی تھی؟"

"ہاں مجھے یقین ہے۔" ڈاکٹر ہارلے نے کہا "تم نے اس کی جو پلاسٹک سرجری کی تھی، اس کے نتیجے میں اس کے ماتھے پر ایک ہلکی سی سرخ لکیر رہ گئی تھی۔ بس اسی نشان نے ان میں امتیاز پیدا کر دیا ہے۔ وہ نشان نہ ہوتا تو میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ماریا ہی تھی۔"

پیٹر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ معمہ حل ہو چکا تھا۔ الوا نے جو بازی جمائی تھی، وہ ڈاکٹر پیٹر کی سمجھ میں آ چکی تھی۔ اچانک پیٹر کے ذہن میں ایک خیال آیا اور اس نے ہارلے سے پوچھا "کروگر برینٹ کمپنی کی وارث دونوں بہنیں ہیں نا؟"

ہارلے چند لمحے تو ہچکچایا پھر بولا "یہ ان کا نجی معاملہ ہے۔ لیکن میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ تمہارے سوال کا جواب نفی میں ہے ان کی دادی اماں نے الوا کو عاق کر دیا ہے۔ اب تمام اثاثوں جائیداد کی واحد وارث ماریا ہے۔"

گرہیں کھلتی جا رہی تھیں۔ بات پیٹر کی سمجھ میں آ چکی تھی۔ یہ قتل کا بڑا شاندار منصوبہ تھا اور بڑی ذہانت سے مرتب کیا گیا تھا۔ لیکن ایک بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ماریا کا شوہر ہونے کے ناطے جارج اس کی تمام دولت کا مالک تھا۔ پھر اسے دولت کی خاطر کسی کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی، تم ضرورت سے زیادہ ہی سوچنے لگے ہو، پیٹر نے اپنے آپ سے کہا۔

پیٹر کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا اور اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا۔

صبح اٹھتے ہی اس نے نیویارک پولیس کے چیف نک پاپاس کو فون کر دیا۔

نک ارنا بھینسے کی طرح مضبوط اور بھاری جسم کا شخص تھا۔ اس کا وزن تین سو پونڈ کے لگ بھگ تھا اور محکمۂ پولیس میں اپنی سخت گیری کے باعث مشہور تھا۔ بڑے بڑے مجرم اس کے نام سے کانپتے تھے۔ ماہر نفسیات کی حیثیت سے پیٹر نے کئی مرتبہ قتل کے مقدمات میں استغاثہ کی مدد کی تھی اور نک سے اس کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی۔ پیٹر نے اسے فون کیا اور دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ پیٹر نے یونان میں اس کے پرانے واقف کاروں کے بارے میں معلوم کیا اور اس نے بتایا کہ اب بھی وہاں اس کے لاتعداد دوست اور رشتے دار موجود ہیں۔

"اچھا یہ بتاؤ، تم یونانی کروڑ پتی خاندان کے لڑکے جارج ملز کے بارے میں جانتے ہو؟" پیٹر نے پوچھا۔

"اس کے خاندان کو تو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ویسے تم جارج ملز کے باپ سے پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہو تو تمہیں احتیاط سے کام لینا ہو گا۔ بڑے میاں کو دل کے دو تین دورے پڑ چکے ہیں۔"

"میں جارج کے بارے میں معلومات چاہتا ہوں۔ پتہ کرو کہ جارج کے پاس دولت ہے نہیں، اس کے خاندان میں تو دولت کی کمی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں اس کے بارے میں معلومات کر لوں گا لیکن تمہیں میری دعوت کرنی ہو گی۔ کہو کیا کہتے ہو؟"

"مجھے منظور ہے۔" پیٹر نے کہا اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

٭

کیٹ کی طبیعت ان دنوں ناساز رہنے لگی تھی۔ وہ ایک روز دفتر میں کسی سے فون پر بات کر رہی تھیں کہ اچانک ان کی طبیعت بگڑ گئی۔ انہیں اپنے سینے میں درد کی لہریں ابھرتی محسوس ہو رہی تھیں۔ کمرہ گھومنے لگا تھا۔ انہوں نے ریسیور کریڈل پر رکھ کے میز کو سختی سے تھام لیا اور تکلیف کی شدت سے آنکھیں بند کر لیں۔ اسی لمحے راجر کمرے میں داخل ہوا اس نے کیٹ کے چہرے کی اڑی ہوئی رنگت اور پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملاتے دیکھے تو جلدی سے پوچھا "کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"بس ذرا چکر آ گیا تھا . . . . میں بالکل ٹھیک ہوں"

"تم ٹھیک نہیں ہو۔ میں ابھی تمہاری سیکرٹری کو ہدایت کرتا ہوں کہ وہ تمہارے تفصیلی طبی معائنے کے لیے ڈاکٹر ہارلے سے وقت طے کر لے۔"

٭

دوسرے روز صبح ڈاکٹر پیٹر ایک مریض کی فائل دیکھ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ پیٹر نے فائل بند کر کے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف پولیس چیف نک اس سے مخاطب تھا "پیٹر! جارج کی رپورٹ میرے پاس آ گئی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم اس بارے میں بالمشافہ بات چیت کر لیں۔"

پیٹر یہ سن کر بے چین ہو گیا اور بولا "بتاؤ یار اس کے بارے میں کیا رپورٹ موصول ہوئی ہے؟"

"میں نے جارج کے باپ سے بات کی تھی۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ کبھی اس پر دل کا دورہ نہیں پڑا۔ دوسری بات بہت اہم ہے جارج کو اس کے باپ نے جائیداد سے عاق کر دیا ہے اور اب وہ اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس نے چند برس قبل اپنے بیٹے کو تین کپڑوں سے نکال باہر کیا تھا۔ میں نے وجہ پوچھی تو بڈھا مجھ پر راشن پانی لے کر چڑھ دوڑا تھا۔ میں نے یونان کی پولیس سے اس کا پس منظر معلوم کیا تھا اور اس کے بارے میں عجیب و غریب انکشاف ہوا ہے۔ پولیس سے اس کی پرانی یاری ہے۔ وہ ذہنی مریض ہے۔ لڑکوں

اور لڑکیوں پر تشدد کر کے لذت حاصل کرتا ہے۔ یونان سے رخصت ہونے سے قبل اس کا آخری شکار ایک پندرہ سال لڑکا تھا۔ جسے اس وحشی نے بری طرح مارا پیٹا تھا۔ لڑکا کئی روز تک موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا رہا تھا۔ جارج کے خلاف بہت مضبوط کیس بنا تھا لیکن اس کے باپ نے اعلیٰ حکام سے رابطہ قائم کر کے معاملہ ختم کرا دیا تھا اور جارج کو لات مار کے یونان سے نکال دیا تھا۔ اب بتاؤ بات بن رہی ہے؟"

"بہت بہت شکریہ نک۔ تم دعوت کے بجا طور پر مستحق ہو" پیٹر نے کہا۔

"خیر یہ تو بعد کی بات ہے۔ اس سلسلے میں میری مدد کی ضرورت ہو تو فوراً رابطہ قائم کر لینا۔" نک نے کہا۔

پیٹر نے ریسیور رکھ دیا اور جارج کے بارے میں سوچنے لگا۔ جو دوپہر میں آنے والا تھا۔

ڈاکٹر ہارلے ایک مریض کا معائنہ کر رہا تھا کہ استقبالیہ کلرک نے فون پر مسز جارج کی آمد کی اطلاع دی۔ ہارلے نے جلدی سے مریض کو فارغ کیا اور ماریا کو اپنے کمرے میں بلوا لیا۔ اس کی حالت پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور گہرے ہو گئے تھے۔ وہ سوتے جاگتے کی سی کیفیت میں تھی۔ اس نے ڈاکٹر ہارلے کے استفسار پر بتایا کہ وہ ان کی لکھی ہوئی ادویات باقاعدگی سے استعمال کر رہی ہے اور اس سے ذرا بھی افاقہ نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی ذہنی حالت اور بھی بگڑ گئی ہے۔ خودکشی کی طرف اس کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے اور اسے خدشہ ہے کہ تنگ آ کر وہ اس خواہش پر عمل کر گزرے گی۔

ڈاکٹر ہارلے نے نرمی سے کہا "تم فکر مت کرو، میں ضرور اس مسئلے کا کوئی حل نکال لوں گا۔ تم جسمانی لحاظ سے صحت مند ہو۔ میں تمہیں دوسری دوا لکھ دیتا ہوں، امید ہے اس سے فرق پڑے گا۔" ہارلے نے نسخہ لکھ کے ماریا کو تھما دیا اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "اگر جمعے تک افاقہ نہ ہو تو مجھ سے مل لینا، میں تمہیں کسی اچھے ماہر نفسیات کے پاس بھیج دوں گا۔"

تیس منٹ بعد ایلا اپنے فلیٹ پہنچ چکی تھی اس نے پھر کریم سے ماتھے کا ہلکا سرخ نشان مٹا دیا تھا۔ بات اب بننے لگی تھی ہر کام اس کی مرضی اور توقع کے مطابق ہو رہا تھا۔

جارج بڑے اطمینان اور سکون سے ڈاکٹر پیٹر کے سامنے بیٹھا تھا اس کے چہرے پر گھبراہٹ یا خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔ پیٹر نے مسکرا کے پوچھا "کہیے، کیسے مزاج ہیں آپ کے؟"

"میں بالکل نارمل ہوں ڈاکٹر۔ آپ سے گزشتہ دو ملاقاتوں کا بہت فائدہ ہوا ہے۔" جارج نے مستحکم آواز میں کہا۔

"مجھے یہ سن کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔ یہ بتائیے، آپ کی بیوی کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"اس کی ذہنی حالت تو اور بھی خراب ہو گئی ہے۔ اس نے ڈاکٹر ہارلے سے پھر ملاقات کی تھی۔ خودکشی کی وہ زیادہ ہی باتیں کرنے لگی ہے۔ میں اسے یورپ لے جانے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ ممکن ہے آب وہوا اور ماحول کی تبدیلی سے اس کے ذہن کو سکون مل سکے۔"

اور اسی لمحے پیٹر کو یقین ہو گیا کہ ماریا سخت خطرے میں ہے، وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

جارج کے جانے کے بعد پیٹر دیر تک گھومنے والی کرسی سے پشت ٹکائے آنکھیں بند کئے سوچتا رہا۔ پھر اس نے جارج کی فائل نکالی اور وہ نوٹس پڑھنے لگا جو پچھلی دو ملاقاتوں میں اس نے تحریر کئے تھے۔ پھر اس نے ڈاکٹر ہارلے سے رابطہ قائم کیا اور بولا "میں جارج سے متعلق ایک بات جاننا چاہتا ہوں، کیا تم پتہ لگا سکتے ہو کہ وہ اپنی بیوی کو ہنی مون کے لئے کس مقام پر لے گیا تھا؟"

"یہ بات تو میں تمہیں ابھی بتا سکتا ہوں، رخصت ہونے سے پہلے میں نے انہیں ٹیکے لگائے تھے۔ ہنی مون انہوں نے جمیکا میں منایا تھا۔"

پیٹر نے اس کا شکریہ ادا کیا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ جارج کے کہے ہوئے جملے اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

"میرا ایک دوست ہے جو تشدد پسند ہے وہ طوائفوں کو بری طرح مارتا پیٹتا ہے۔ ایک بار ہم دونوں جمیکا سیر وتفریح کے لیے گئے تھے۔ وہاں اس نے ایک طوائف سے دوستی کی تھی اور پھر اس کے زیادہ پیسے مانگنے پر مشتعل ہو گیا تھا اور اس نے مار مار کر طوائف کا بھرکس نکال دیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ طوائف اب کسی سے زیادہ پیسے نہیں مانگے گی۔"

پیٹر کو ماریا کے سر پر موت منڈلاتی نظر آ رہی تھی لیکن اس کے پاس کوئی ایسا ثبوت نہیں تھا جس سے وہ کہہ سکتا کہ جارج واقعی اپنی بیوی کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ مصیبت تو یہ تھی کہ ڈاکٹر ہارلے نے بھی تصدیق کی تھی کہ ماریا کی ذہنی حالت اچھی نہیں ہے اور خودکشی کی طرف اس کا رجحان مسلسل بڑھ رہا ہے۔

پیٹر کو ماریا سے ہمدردی تھی۔ وہ اسے محض مریضہ نہیں سمجھتا تھا وہ اس کے ذہن پر بری طرح چھا چکی تھی۔ وہ اس معمے کی گم شدہ کڑی تھی۔ وہ اس سے بالمشافہ بات کرنا چاہتا تھا۔ ممکن ہے اس سے گفتگو کے بعد یہ گتھی سلجھ ہی جائے۔ اس نے جارج کی فائل سے اس کے گھر کا ٹیلیفون نمبر لیا اور رابطہ قائم کیا۔ فون ماریا نے ہی اٹھایا۔ پیٹر نے اپنا تعارف کرایا اور اس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ ماریا نے قدرے پس وپیش کے بعد آمادگی ظاہر کر دی۔ پیٹر نے دوپہر ایک بجے سلور سیون ریستوران میں دوسرے روز [illegible] سے ملاقات طے کر لی۔

دوسرے دن دوپہر پونے ایک بجے پیٹر ریستوران کے ایک گوشے میں ماریا کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے کہ ماریا ریستوران میں داخل ہوئی۔ پیٹر نے اس پر نظریں مرکوز کر دیں۔ وہ سادہ اور شریفانہ لباس میں بے پناہ دلکش اور باوقار لگ رہی تھی۔ وہ بڑے اعتماد سے نپے تلے قدم اٹھا رہی تھی۔ پیٹر غیر یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ذہنی دباؤ اور پریشانی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ بے حد مطمئن اور پرسکون دکھائی دے رہی تھی۔ ماریا نے بیٹھتے ہی اپنے شوہر کی خیریت دریافت کی اور پیٹر نے بتایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔

کھانے کا آرڈر دے کر پیٹر نے پوچھا "کیا آپ جانتی ہیں کہ آپ کے شوہر مجھ سے کیوں مل رہے ہیں؟"

"ہاں! انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ذہنی دباؤ کا شکار ہیں۔ وہ جس فرم کے پارٹنر ہیں وہاں کام بہت زیادہ ہے اور دوسرے حصے داروں نے ان کے کاندھوں پر زیادہ بوجھ ڈال دیا ہے۔"

کتنی عجیب بات تھی کہ وہ اپنی بہن پر ہونے والی بربریت سے ناواقف تھی۔ اُسے اپنے شوہر کی وحشت اور خباثت کا علم نہیں تھا اور یہ بات حیرت انگیز تھی کہ کسی نے اُسے بتایا نہیں تھا۔

ماریا شوہر کے حوالے سے پیٹر کی تعریف کرتی رہی۔ اور وہ اس کے معصوم چہرے پر نظریں جمائے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اُسے اپنے شوہر سے بے پناہ محبت تھی اور پیٹر حقائق سے پردہ اٹھاتا تو اس کی شخصیت مسخ ہو سکتی تھی۔ وہ ماریا کو اس کے وحشی شوہر کی حقیقت کیسے بتاتا کہ اس نے ایک پندرہ سالہ لڑکے کو مار مار کر موت کے قریب پہنچا دیا تھا اور اسکی بہن کا بھی یہی حشر کر دیا تھا۔

وہ خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ کافی پینے کے دوران میں وہ مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ پھر ماریا نے اس ملاقات کا مقصد معلوم کیا۔ پیٹر نے جارج کی اصلیت بتلانے کے لیے منہ کھولا اور آواز اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ پیٹر نے سوچا تھا کہ وہ ماریا کو اپنے خدشات اور شبہات بتا کر جارج کو دماغی اسپتال میں داخل کرانے کا مشورہ دے گا۔ مگر اب یہ معاملہ اتنا آسان نہیں لگ رہا تھا۔ ماریا سو فیصد نارمل تھی۔ کہیں یہ ان دواؤں کا اثر تو نہیں جو ڈاکٹر ہارپے نے اُسے لکھ کر دی تھیں۔ وہ یہ بات ماریا سے پوچھنا ہی چاہ رہا تھا کہ جارج نازل ہو گیا اور یوں موقع پیٹر کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ماریا کی خادمہ نے جارج کو یہ بتا دیا تھا کہ وہ سلور اسپون ریستوران گئی ہے اور وہ بڑے نازک مرحلے پر پہنچ گیا تھا۔

اس روز شام کو جارج نے ایوا کو پیٹر اور ماریا کی ملاقات کے بارے میں اُسے بتا دیا تھا۔ ملازمہ نے جارج کو بتایا تھا کہ ماریا دوپہر کے کھانے پر پیٹر سے ملنے سلور اسپون گئی ہے۔ یہ سنتے ہی جارج کے ہوش اڑ گئے تھے اور وہ آندھی اور طوفان کی طرح وہاں پہنچ گیا تھا۔ ایوا کے ماتھے پر بل پڑ چکے تھے۔ اس نے تشویش کا اظہار کیا تو جارج نے کہا "صورتِ حال ہمارے قابو میں ہے۔ میں نے بعد میں ماریا سے پوچھا اور اس نے بتایا تھا کہ ان کے درمیان کسی خاص معاملے پر گفتگو نہیں ہوئی تھی۔"

ایوا چند لمحے کچھ سوچتی رہی، پھر بولی "صورتِ حال بگڑتی جا رہی ہے ہمیں اپنے منصوبے پر فوری عمل کرنا ہو گا۔"

⁂

غنودگی کے دورے اب کیٹ پر تواتر سے پڑنے لگے تھے۔ وہ غائب دماغ رہنے لگی تھیں اور یادداشت خاصی کمزور ہو گئی تھی۔ کمپنی کے عہدے دار مستعد نوجوان اور ذہین چیئرمین کا مطالبہ کر رہے تھے اور وہ اس بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔ پہلے ان کا خیال تھا کہ وہ دس برس مزید اس گاڑی کو کھینچ لیں گی مگر اب یہ ممکن نہیں رہا تھا وہ خوفزدہ ہو گئی تھیں۔ بہت سوچ بچار کے بعد انہوں نے طے کیا کہ وہ راجر کے ساتھ ڈاکٹر ہارپے سے مشورہ لیں گی۔

پروگرام کے مطابق کیٹ مقررہ وقت پر راجر کے ہمراہ ڈاکٹر ہارپے کے کلینک پہنچ گئی۔ ہارپے نے کیٹ کا تفصیلی معائنہ کیا اور بتایا کہ بڑھاپے نے اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا ہے۔ ہارپے نے کیٹ سے پوچھا کہ ریٹائر ہونے کا کیا ارادہ ہے تو کیٹ نے مغموم لہجے میں کہا کہ وہ اپنے پڑپوتے کے جوان ہونے کے بعد ہی ریٹائر ہوں گی۔ انہوں نے ایوا کے بگڑنے پر سخت تاسف کا اظہار کیا۔ انہیں ایوا کی صلاحیتوں پر پورا بھروسہ تھا اور وہ شیطانی ذہن کی مالک ثابت ہوئی تھی۔

ہارپے نے ایوا کی زبردست حمایت کی اور انہیں حال ہی میں پیش آنے والے سنگین حادثے کے بارے میں بتا دیا۔ کیٹ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں انہیں اس خبر سے سخت صدمہ پہنچا تھا انہوں نے ہارپے سے نسخہ لکھوایا اور ایوا کے فلیٹ پہنچ گئیں۔

ایوا دادی اماں کو غیر یقینی سے دیکھ رہی تھی وہ سنبھلی اور انہیں ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ خوشی سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ کیٹ نے ایوا کو بتایا کہ انہیں حادثے کی اطلاع ڈاکٹر ہارپے سے مل چکی ہے۔ کیٹ نے اپنی پوتی کو گلے لگا لیا۔ ایوا اپنی دادی جان سے بری طرح لپٹ گئی اور ہچکیوں اور سسکیوں سے رونے لگی۔ کیٹ بڑی محبت سے ایوا کی پشت پر ہاتھ پھیرتی رہیں۔ وہ ایوا کو دل سے معاف کر چکی تھیں اور اسے واپس گھر لے جانا چاہتی تھیں

کیٹ کے جاتے ہی ایوا نے شراب کے دو تین گلاس چڑھائے اور دیوانہ وار رقص کرنے لگی۔ وہ خوشی سے نہال ہو گئی تھی۔ اب وہ اپنی بہن ماریا کی طرح کمپنی کے نصف حصے کی مالک تھی۔ اس نے طے کیا تھا کہ بہت جلد وہ ماریا کو ٹھکانے لگا دے گی۔ اب جارج اس کی نظروں میں کھٹکنے لگا۔ جس شخص کو اس نے اپنا مسئلہ حل کرنے کے لیے مقرر کیا تھا وہ خود اس کے لیے بہت بڑا مسئلہ بن گیا تھا۔

ایوا نے جارج کو نئی صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ فی الحال اس نے اپنا منصوبہ مؤخر کر دیا ہے۔ اس نے تجویز پیش کی کہ وہ اس کی بہن کو طلاق دے دے اور جیسے ہی دولت اس کے قبضے میں آئے گی وہ اسے دس لاکھ ڈالر پیش کر دے گی۔ مگر جارج نے یہ تجویز حقارت سے ٹھکرا دی اور بتایا کہ وہ ماریا کے ساتھ ڈارک ہاربر جزیرے پر جا رہا ہے اور فی الحال اس کا ماریا سے علیحدگی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

جارج کے جانے کے بعد ایوا دیر تک بیٹھی صورتِ حال کا تجزیہ کرتی رہی وہ ابھی کوئی لائحہ عمل بنا بھی نہیں پائی تھی کہ ڈاکٹر ایرک کا فون آگیا۔ وہ اس شخص سے عاجز آچکی تھی وہ ہفتے میں دو تین مرتبہ اسے بور ضرور کرتا۔ ہر بار وہ کھانے یا فلم کی دعوت دیتا تھا اور ایوا ٹال جاتی تھی۔ اس وقت بھی ایرک نے اُسے رات کے کھانے کی دعوت دی اور ایوا نے حسبِ معمول طبیعت کی خرابی کا عذر کر کے اُسے ٹال دیا۔ وہ آج کی شام وجیہہ و شکیل بروری کے نام لکھ چکی تھی۔ بروری اس سے پانچ سال چھوٹا تھا وہ بروری کو دیکھتے ہی اس پر مر مٹی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ آج کی شام انتہائی سنسنی خیز اور پُر لطف رہے گی۔

☙

جارج نے گھر جاتے ہوئے ماریا کے لیے خوب صورت گلدستہ خرید لیا۔ اس کا موڈ بے حد خوشگوار تھا۔ بڑھیا نے ایوا کو معاف کر دیا تھا اور اپنا وصیت نامہ بھی تبدیل کر دیا تھا۔ اب ایوا نصف اثاثوں کی وارث تھی لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ماریا کے حادثے کے بعد وہ ایوا سے بھی چھٹکارا حاصل کر سکتا تھا۔ تمام انتظامات ہو چکے تھے۔ جمعے کو ماریا ڈارک ہاربر کے وسیع و عریض مکان میں اس کا انتظار کرے گی۔ جارج نے ماریا کو ہدایت کر دی تھی کہ تمام نوکروں کی چھٹی کر دے۔

ادھر ڈاکٹر پیٹر ماریا کو ذہن سے نہیں نکال سکا تھا اُسے جارج کی بات بھی یاد تھی کہ ماریا کو تبدیلی آب و ہوا کے لیے اُسے یورپ لے جائے گا۔ رہ رہ کر اُسے ماریا کا خیال آ رہا تھا جو خطرے میں گھری ہوئی تھی مگر وہ اس کے لیے کر بھی کیا سکتا تھا۔ بغیر کسی ثبوت کے وہ پولیس چیف ... کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔

کروگر برینٹ کمپنی کے شاندار دفتر میں کیٹ اپنی نئی وصیت پر دستخط کر رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی تمام جائیداد اور اثاثے دونوں پوتیوں میں مساوی تقسیم کر دیئے تھے۔

☙

جمعے کا روز تھا۔ دس بج کر اٹھاون منٹ ہوئے تھے۔ واشنگٹن کے لاگارڈیا ائیرپورٹ کے سامنے ایک ٹیکسی رکی اور ایوا اتر پڑی اس نے سو ڈالر کا نوٹ ڈرائیور کو تھما دیا۔ ڈرائیور کے پاس سو کا کھلا نہیں تھا۔ ایوا نے سو کا نوٹ اسے بخش دیا۔ وہ ڈیپارچر لاؤنج میں پہنچی تو کاؤنٹر کلرک نے بتایا کہ ہوائی جہاز روانہ ہو رہا ہے۔ وہ دو منٹ تاخیر سے پہنچی تھی۔ ایوا کا منہ لٹک گیا۔ کلرک نے تسلی دی کہ دوسرا طیارہ ایک گھنٹے بعد روانہ ہو گا۔ ایوا نے برا سا منہ بنایا اور چل دی۔ کلرک مبہوت سا حسین و جمیل ایوا کو دیکھ رہا تھا۔

☙

جمعے ہی کے روز دوپہر کے دو بجے ماریا اپنے شوہر جارج سے ملنے ڈارک ہاربر روانہ ہو رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ یہ اسے اپنا دوسرا ہنی مون محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے ملازمہ کو بتا دیا تھا کہ وہ پیر کی صبح واپس آئے گی۔ وہ جیسے ہی صدر دروازے کے قریب پہنچی، فون کی گھنٹی بج اٹھی مگر وہ نہیں رکی اور دروازہ کھول کے باہر نکل گئی۔

☙

یہ جمعے کے روز شام سات بجے کی بات ہے۔ جارج نے متعدد بار ایوا کے منصوبے پر غور کیا تھا اور اسے کوئی سقم دکھائی نہیں دیا تھا۔ "فل بروک پر تمہیں کشتی تیار ملے گی، اسے ڈارک ہاربر لے جانا اور اس طرح کہ کسی کی نظر تم پر نہ پڑے۔ تم چاندنی رات کا لطف اٹھانے ماریا کو سمندر کی سیر کو لے جاؤ گے، گہرے سمندر میں جا کر جو تمہارا جی چاہے کرنا۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ ماریا کے خون کے دھبے نہ رہنے پائیں۔ لاش کو ٹھکانے لگا کر تم واپس فل بروک پہنچو گے اور وہاں سے بجرے کے ذریعے ڈارک ہاربر پہنچ جاؤ گے اور گوشہ عافیت پہنچنے کے ٹیکسی لو گے اور بڑی احتیاط سے ماریا کی گمشدگی کا اعلان کر دو گے۔ پولیس کو اطلاع دو گے مگر پولیس کو ماریا کی لاش نہیں مل سکے گی، مدوجزر اسے بہا کر کہیں کا کہیں لے جائے گا اور یوں ہم ثابت کر دیں گے کہ ماریا نے خودکشی کی ہے۔"

جارج نے منصوبے کے مطابق کام شروع کر دیا۔ وہ گھر میں داخل ہوا تو اس کی بیوی ٹیلیفون پر کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ جارج کو دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر اپنے شوہر سے بولی "ایوا کا فون ہے" پھر اس نے ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹا کے کہا "اچھا ایوا، میں چلتی ہوں۔ میرے پیارے شوہر تشریف لا چکے ہیں۔ اگلے ہفتے تم سے ملاقات ہو گی۔"

جارج نے ماریا کا ہاتھ بڑی محبت سے تھام لیا اور اپنے مخصوص انداز میں دل موہ لینے والی باتیں کرتا رہا۔ اس نے سمندر کی سیر کی تجویز پیش کی اور ماریا نے آمادگی ظاہر کر دی۔ اس نے جھٹ پٹ لباس تبدیل کیا اور پُرجوش انداز میں جارج کا بازو تھام لیا۔
ایک گھنٹے بعد وہ کھلے سمندر میں پہنچ چکے تھے۔ ماریا خوشی سے نہال ہو رہی تھی۔ تیز و تند ہوا سے اس کے خوبصورت ریشمی بال

اڑ رہے تھے۔ جارج نے کشتی میں نصب خودکار نظام کا بٹن دبا دیا اب کشتی اس کے بغیر ایک محدود دائرے میں چل رہی تھی۔ وہ وسیع و عریض کشتی کے ریلنگ کے پاس پہنچا اور سر جھکائے یخ بستہ سیاہ پانی کو دیکھنے لگا پھر اس نے پرجوش انداز میں ماریا کو بلایا...

وہ قریب پہنچی تو جارج نے اظہارِ محبت کے طور پر اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ وہ کھلکھلا رہی تھی۔ جارج کے لیے بڑے اطمینان کی بات تھی کہ وہ خوشی کے عالم میں رہی تھی۔ جارج نے اسے اور اونچا اٹھایا اور وہ بری طرح مدافعت کرنے لگی۔ ماریا کو خطرے کا احساس ہو گیا تھا اور وہ چیختے چلاتے ہوئے بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ اب وہ ریلنگ سے اوپر اٹھی ہوئی تھی اور پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ جارج نے دفعتہً سینے میں درد کی لہر کو ابھرتے محسوس کیا اور اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ اس کے سینے میں کسی نے جیسے پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا تھا۔ یہ شدت کا درد جارج کی سمجھ سے باہر تھا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اور خون اس کے منہ سے ابلنے لگا۔ اس نے اپنے بازو گرا دیئے اور غیر یقینی سے سینے کو دیکھنے لگا۔ اس کے سینے میں ٹوٹا سا کھلا ہوا تھا اور خون بھل بھل اس کے زخم سے بہہ رہا تھا۔ جارج نے سر اٹھایا، وہ ایک کونے میں خون آلود بڑا سا چاقو لیے کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پہ زہریلی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

آخری بات جو جارج کے ذہن میں آئی۔ وہ یہ تھی۔ "یہ تم نے کیا کیا الوا؟"

ماریا جب گوشۂ عافیت پہنچی تو رات کے دس بج رہے تھے اس نے جارج کو ٹیلیفون کرنے کی کوشش کی تھی لیکن رابطہ قائم نہ ہو سکا تھا۔ بہرحال اُسے امید تھی کہ اتنی دیر سے یہاں پہنچنے پر جارج اس سے ناراض نہیں ہوگا اس تاخیر میں اس کا اپنا کوئی دخل بھی تو نہیں تھا۔ وہ تو پروگرام کے مطابق سہ پہر ہی کو یہاں آنے کے لیے تیار ہو گئی تھی اور نکلنے ہی والی تھی کہ ایوا کا فون آ گیا تھا وہ کسی مصیبت میں پھنس گئی تھی ماریا نے اسے لاکھ سمجھایا لیکن وہ نہیں مانی اور اُسے فوراً واشنگٹن پہنچنے کی ہدایت کی ایوا کے لہجے سے اس کی پریشانی عیاں تھی۔ اس نے آخر وعدہ کر ہی لیا وہ سیدھی دوسرے طیارے سے واشنگٹن روانہ ہو گئی لیکن وہاں ایئرپورٹ پر ایوا وعدے کے مطابق اُسے نہ ملی۔ وہ دو گھنٹے تک ایئرپورٹ پر اس کا انتظار کرتی رہی تھی اور پھر مایوس ہو کر اس جزیرے کو آنے والے طیارے میں سوار ہو گئی اور اب وہ گوشۂ عافیت میں تھی۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ لیکن جارج یہاں موجود نہیں تھا۔ وسیع و عریض محل نما مکان بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ماریا اُسے آوازیں دیتی رہی، ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتی رہی۔ ہر کمرہ روشن کرتی رہی لیکن جارج کہیں بھی موجود نہیں تھا۔ اس نے اپنے گھر فون کیا۔ وہاں سے خادمہ نے جواب دیا کہ جارج وہاں بھی نہ تھا اس نے خادمہ کو یہی بتایا تھا کہ وہ ماریا کے ساتھ کہیں چھٹیاں منانے جا رہا ہے ماریا کی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر جارج یوں کہاں غائب ہو گیا ہے پھر اس نے ایوا کے نمبر ڈائل کیے، دوسری طرف سے فون اسی نے اٹھایا تھا۔ "ایوا! آخر تم تھیں کہاں، میں لاگارڈیا ایئرپورٹ پر دو گھنٹے تمہارا انتظار کرتی رہی۔"

ایوا نے حیرت کا اظہار کیا اور بولی کہ اس نے واشنگٹن کے دوسرے ایئرپورٹ پر پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ سخت مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ اس کے تعلقات واشنگٹن کی ایک بااثر شخصیت سے ہو گئے ہیں اور اس نے اس کی زندگی جہنم بنا دی ہے اس نے کہا کہ وہ ملاقات پر ساری تفصیل اُسے بتا دے گی۔

ماریا بہن کی طرف سے مطمئن ہو گئی۔ ایک بوجھ اس کے ذہن سے ہٹ گیا تھا اور اب اُسے اپنے شوہر کی طرف سے تشویش لاحق تھی جو اچانک ہی غائب ہو گیا تھا۔ ایوا نے جارج کے بارے میں پوچھا تھا اور اس نے پرسکون آواز میں بتایا تھا کہ وہ یہاں نہیں ہے۔ شاید کسی کام میں الجھ گیا ہے۔

وقت گزرتا رہا۔ ماریا کی پریشانی بڑھتی رہی جارج نہ یہاں آیا تھا نہ اس نے کہیں سے فون کیا تھا۔ آخر رات دو بجے اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ اس نے پولیس کو فون کیا۔ جونہی اس نے اپنا نام بتایا دوسری طرف پولیس افسر چونک گیا۔ "جی فرمایئے، کیا کام ہے۔" اور جب اس نے تمام بات بتائی تو پولیس افسر نے کہا تھا۔ "پریشان نہ ہوں۔ بعض اوقات آدمی اس طرح کاموں میں الجھ جاتا ہے کہ وہ فون بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ مسٹر جارج صبح کی پہلی لانچ سے جزیرے پر پہنچ جائیں گے۔"

پولیس افسر نے یہ بات اس انداز میں کہی تھی کہ خود ماریا نے اپنے آپ کو احمق سا تصور کیا تھا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔

مگر جارج اگلے روز نہ صبح سات والی لانچ سے وہاں پہنچا نہ اس سے اگلی لانچ سے، ماریا نے ایک مرتبہ پھر اپنے گھر فون کیا۔ لیکن جارج وہاں بھی نہ تھا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ عجیب عجیب خیالات آنے لگے۔ شاید وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی جارج کے شدید زخمی ہونے، بے ہوش ہونے اور مر جانے تک تمام اندیشے اس کے ذہن میں سانپوں کی طرح پھن کاڑھ کر ابھر آئے۔ سہم کر اس نے پھر پولیس کو فون کیا۔

تھوڑی دیر بعد کیپٹن اکرام گوشۂ عافیت میں بیٹھا ماریا سے اس کی تمام کہانی سن رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے گوشۂ عافیت کا ایک ایک کمرہ دیکھا۔ ڈاک کا معائنہ کیا۔ پھر اس نے لانچ سروس کے دفتر سے رابطہ قائم کیا جہاں سے اسے معلوم ہوا کہ جارج نے گذشتہ ۲۴ گھنٹے کے دوران لانچ سروس سے سفر نہیں کیا ہے۔ یہ سن کر اس نے ماریا سے کہا۔ "مسٹر جارج نے اس جزیرے پر

قدم رکھا ہی نہیں، اب یہی ہے کہ ہم اسپتال وغیرہ چیک کریں گے۔“
ماریا کیلئے یہ اطلاع بہت پریشان کن تھی اس کی آنکھیں نم ہو گئیں لیکن اس نے بدقت تمام خود پر قابو پایا۔۔۔ جب کیپٹن وہاں سے چلا گیا تو وہ بے اختیار بلک پڑی۔

کیپٹن انگرام نے جارج کو تلاش کرنے کے لیے تمام اسپتالوں، مردہ گھروں اور تھانوں کو فون کیا لیکن کہیں سے جارج کے بارے میں کوئی اطلاع نہ مل سکی۔ اور شام کے اخبارات نے جارج کی گمشدگی کی چیختی چنگھاڑتی سرخیاں لگائیں۔ ظاہر ہے جارج کوئی معمولی شخص نہ تھا۔

ڈاکٹر پیٹر کو جارج کی گمشدگی کی اطلاع پولیس چیف نک سے ملی تھی اور اس نے فوراً ہی ماریا کو فون کیا تھا۔ اس بیچاری کی حالت بہت خراب تھی وہ ہچکیوں کے درمیان ڈاکٹر پیٹر کو تمام واقعات بتاتی رہی۔ پیٹر اسے دلاسے دیتا رہا لیکن وہ جانتا تھا کہ ان تسلیوں سے اس کی پریشانیاں کم نہیں ہو سکتیں۔ اور پھر کیٹ نے بھی اپنی پوتی کو فون کیا تھا اسے دلاسے دیئے تھے۔ اور کہا تھا۔ ”تم فوراً یہاں میرے پاس نیویارک آجاؤ۔“

ماریا خود بھی یہ فیصلہ کر چکی تھی اسے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

دوسری طرف ایوا نے جارج کی گمشدگی کی خبر ٹیلیویژن پر سنی تھی۔ انہوں نے خبر کے ساتھ ساتھ جارج کی تصویر اور گوشۂ عافیت کی تصاویر بھی دکھائی تھیں۔ ٹی وی کے ہیڈ کا کہنا تھا۔ ”ابھی تک ایسے کوئی شواہد نہیں ملے جس سے کسی جرم کے ارتکاب کی بو آتی ہو۔ نہ ہی کسی قسم کا تاوان طلب کیا گیا ہے۔ پولیس کا خیال ہے کہ شاید جارج کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہے اور کسی اسپتال میں بے ہوش پڑا ہے۔“ ایوا نے ٹی وی پر جارج کی گمشدگی سے متعلق یہ تمام خبر سنی اور اس کے ہونٹوں پر ایک سفاکانہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ پولیس کو جارج کی لاش نہیں مل سکے گی۔ مدوجزر اُسے ساحل سے دور سمندر میں لے گیا ہوگا۔ اس کی لاش مچھلیوں کی غذا بن چکی ہوگی۔ بے چارہ جارج۔ اس نے نہایت فرمانبرداری سے ایک ایک بات پر عمل کیا تھا لیکن خود ایوا نے منصوبے میں تبدیلی کر لی تھی۔ وہ طیارے سے مین پہنچی تھی اور وہاں سے ایک موٹر بوٹ کرائے پر لے کر فل پروک پہنچی تھی اور وہاں سے دوسری موٹر بوٹ کرائے پر لے کر اس جزیرے پہ پہنچ گئی تھی جہاں اس کا محل نما خاندانی مکان گوشۂ عافیت تھا۔ یہاں وہ جارج کا انتظار کر رہی تھی اس کی گھات میں تھی اور اُس بے چارے کو تو یہ گمان بھی نہ تھا کہ موت اس کے پہلو میں ہے پھر ایوا نے اور بھی احتیاطیں کی تھیں۔ جارج کو ٹھکانے لگانے کے بعد اس نے عرشے سے خون کے دھبوں کو اچھی طرح صاف کر دیا تھا اور پھر وہ موٹر بوٹ واپس کر کے وہاں سے واپس ہو گئی تھی اور طیارے سے پھر نیویارک آگئی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ ماریا اسے فون کرے گی اور ایسا ہی ہوا تھا۔

اگلے روز صبح چھ بجے جارج کی لاش خلیج سے برآمد ہوئی۔ پہلے تو یہی سمجھا گیا کہ جارج ڈوب کر ہلاک ہوا ہے۔ اس کی لاش پر گہرے گھاؤ تھے جن کے بارے میں عام خیال یہی تھا کہ وہ گھاؤ شارک مچھلیوں کے کاٹنے سے آئے ہوں گے لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے کچھ اور ہی کہانی سنائی۔ یہ گھاؤ حقیقتاً چاقو کے زخم تھے۔ شام کے اخبارات نے جارج کے قتل کی خبریں نہایت سنسنی خیز انداز میں شائع کیں۔ جارج کی گمشدگی اور پھر اس کا پُراسرار قتل کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ پولیس فورس حرکت میں آگئی۔ پولیس چیف نک اس واردات کی تحقیقات کے لیے نیویارک سے موقع پر روانہ ہو گیا۔

★★

پولیس کی تفتیش جاری تھی۔ لانچ سروس سے جو باتیں معلوم ہوئیں وہ یہ تھیں کہ جارج اور ماریا دونوں میں سے کسی نے بھی جمعہ کی سہ پہر کو لانچ سے سفر نہیں کیا تھا۔ نہ ہی کوئی اجنبی شخص اس دن لانچ سے جزیرے پر آیا تھا۔ یہاں سے مایوس ہو کر کیپٹن انگرام نے جزیرے کے ایئرپورٹ پر معلومات حاصل کیں، وہاں سے بھی مایوس کن جواب ملا۔ کیپٹن کی مزید پوچھ گچھ پر ایئرپورٹ منیجر نے بتایا کہ رات دس بجے میڈم ماریا طیارے سے یہاں آئی تھیں، ان کا موڈ بہت ہی خراب تھا اور وہ بہت عجلت میں دکھائی دے رہی تھیں۔

ادھر سے مایوس ہو کر پولیس نے پھر اپنی توجہ کیٹ کے شاندار بجرے پر مرکوز کر دی ماہرین کی ایک جماعت نے بجرے کا بغور معائنہ کیا ان کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں۔ عرشے کے جنگلے پر ایک جگہ نیچے کی جانب خون کے دھبے موجود پائے گئے۔ چند گھنٹوں بعد لیبارٹری کی رپورٹ سے اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ خون کے دھبوں کا گروپ وہی ہے جو جارج کے خون کا تھا۔

اسی روز پولیس چیف نک کے کہنے پر ڈاکٹر پیٹر نے اس سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات نک کے دفتر میں ہوئی تھی اور پیٹر نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔ ”ہاں اب بتاؤ۔ کیا معاملہ ہے؟“

”سنو پیٹر! میں جانتا ہوں کہ جارج تمہارا مریض رہ چکا ہے اور مجھے یقین [illegible] ہی گفتگو

"کہنا کیا چاہتے ہو؟" پیٹر نے پوچھا۔

"ہماری تحقیقات سے یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ جارج قتل کے دن گوشۂ عافیت گیا تھا اور وہاں اس نے اپنا عام لباس تبدیل کر کے ملاحوں کا لباس پہنا تھا۔ اسی لباس میں اس کی لاش ملی تھی۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ جارج اس دن نہ تو طیارے سے جزیرے پر گیا تھا نہ لانچ کے ذریعے۔"

"کیا مطلب، کیا اُسے جزیرے کے مکان گوشۂ عافیت میں قتل کیا گیا تھا؟" پیٹر نے پوچھا۔

"نہیں، اُسے کیٹ کے بجرے پر قتل کیا گیا تھا۔ قاتل کا خیال تھا کہ مد و جزر اس کی لاش کو بہا کر سمندر میں لے جائے گا لیکن اس کی لاش مل گئی۔ میرا خیال ہے کہ ماریا نے ہی جارج کو قتل کیا ہے۔" نک خاموش ہو گیا۔

"کیا! تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟" پیٹر چیخ پڑا۔

"نہیں۔ میں اپنے ہوش و حواس میں ہوں۔ ماریا کے سوا کوئی اور اس کا قاتل ہو ہی نہیں سکتا۔ اسبابِ قتل ہمارے سامنے ہیں۔ حالات ہمارے سامنے ہیں۔ وہ اس دن مقررہ وقت سے بہت دیر میں وہاں پہنچی تھی۔ بہانہ یہ تھا کہ وہ واشنگٹن میں غلط ایئرپورٹ پر اپنی بہن کا انتظار کرتی رہی پھر......؟"

"اس کی بہن کیا کہتی ہے؟" پیٹر نے دریافت کیا۔

"وہ کیا کہے گی، اپنی بہن ہی کی حمایت میں بولے گی نا۔ نیز اب اور سنو۔ اس دن گھر کے تمام ملازموں کی چھٹی کر دی گئی تھی۔ ماریا کا کہنا ہے کہ چھٹی اس کے شوہر نے دی تھی۔ بہرحال، خود تم نے ہی مجھے بتایا تھا کہ جارج ایک نفسیاتی کیس تھا۔ تشدد پسند تھا۔ اس نے ایک مرتبہ ماریا کو سخت زد و کوب بھی کیا تھا۔ اس کے بعد یقیناً اس نے جارج سے علیحدگی کی کوشش کی ہو گی لیکن جارج اتنی موٹی مرغی کو یوں طلاق نہیں دے سکتا تھا۔ تنگ آ کر ماریا نے اسے قتل کر کے اس سے نجات حاصل کر لی۔" نک خاموش ہو گیا۔

"ٹھیک ہے، یہ تمہارے اندازے ہی ہیں نا۔ اب یہ بتاؤ آخر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"معلومات، ایسی معلومات جو تم مجھے دے سکو۔"

"میں تمہیں کوئی معلومات فراہم نہیں کر سکتا اور تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ تمہارے تمام اندازے غلط ہیں۔ ماریا یہ قتل نہیں کر سکتی۔" یہ کہہ کر پیٹر اٹھ کھڑا ہوا۔

ڈاکٹر ہارلے نے نک کے جاتے ہی اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اس نے ماریا سے متعلق اس انداز میں سوالات کیے تھے جیسے...... اسے ماریا کے قاتل ہونے کا یقین ہو۔ ڈاکٹر ہارلے نے نک کے ہر سوال کا جواب دیا تھا لیکن اپنی طرف سے کوئی اطلاع فراہم نہیں کی تھی۔ یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ جارج نے ایک مرتبہ کس بری طرح ایوا کو مارا پیٹا تھا اور اس کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر کو اس واقعہ کی اطلاع اسی وقت پولیس کو دینی چاہیے تھی جب یہ واقعہ ہوا تھا لیکن اس سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ کیٹ کے خاندان کو بدنامی سے بچانا چاہتا تھا پھر بھی اس کے ذہن میں ایک کرید سی تھی اس کا دل کہہ رہا تھا کہ جارج کو اگر کوئی قتل کر سکتا ہے تو وہ ایوا ہو سکتی ہے ماریا نہیں۔

ابھی وہ انہی خیالات میں غلطاں تھا کہ ڈاکٹر ایرک اس سے ملاقات کے لیے آ گیا۔ اس کی آمد کا تعلق بھی جارج کے قتل سے تھا اور وہ بھی اسی واقعہ پر گفتگو کرنے آیا تھا جو ڈاکٹر ہارلے نے پولیس سے چھپایا تھا۔ "اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ پولیس کو ابھی یہ بات بتا دوں کہ جارج نے ایک مرتبہ ایوا کو اس طرح زد و کوب کیا تھا کہ وہ موت کے دہانے پر پہنچ گئی تھی۔" ڈاکٹر ایرک نے الجھے الجھے انداز میں کہا۔

"آخر تم ایسا کیوں کرنا چاہتے ہو؟" ڈاکٹر ہارلے نے پوچھا۔

"اس لیے کہ اگر میں نے اس مرحلے پر زبان بند رکھی اور پولیس کو بعد میں یہ تمام واقعات معلوم ہوئے تو میری ساکھ ختم ہو جائے گی۔" ڈاکٹر ایرک کے لہجے سے پریشانی عیاں تھی۔

"ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں،" ڈاکٹر ہارلے نے سوچا اور کہا۔ "اس بات کا امکان نہیں کہ پولیس کو یہ تمام باتیں معلوم ہوں۔ ایوا اس کا کبھی تذکرہ نہیں کرے گی۔ ویسے بھی تم نے اس کی پلاسٹک سرجری میں کمال دکھایا ہے کہ کوئی بھی انگلی نہیں رکھ سکتا۔ بس ایک چھوٹا سا نشان رہ گیا ہے ورنہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کبھی اس کا چہرہ بری طرح مسخ ہو گیا تھا۔"

"کون سا نشان؟" ڈاکٹر ایرک نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔

"وہ سرخ نشان جو اس کی پیشانی پر ہے میں اب اسی نشان کی بنا پر دونوں بہنوں کو شناخت کر سکتا ہوں۔"

"ہم...... مگر مجھے تو معلوم نہیں۔" ڈاکٹر ایرک نے کہا۔

ڈاکٹر ایرک وہاں سے نکلا تو اس کے ذہن میں مختلف خیالات کی چمگادڑیں پھڑپھڑا رہی تھیں۔ ایوا کی پیشانی کا سرخ نشان اس کی زندگی میں انقلاب کا نقیب ہو سکتا تھا۔

اس نے گھر جاتے ہی ایوا کو فون کیا۔ دوسری طرف سے فون اٹھاتے ہی ایوا کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو جانی! کیسے ہو، میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔"

"میں ڈاکٹر ایرک بول رہا ہوں، تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"تمہیں معلوم نہیں، میرے بہنوئی کا انتقال ہو گیا ہے اور میں کسی سے نہیں ملنا چاہتی۔" ایوا نے سخت لہجے میں کہا۔

"میں..... تم سے تمہارے مستقبل کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ اس کا تعلق تمہارے بہنوئی کی موت سے ہی ہے۔"

"کیا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" ایوا نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں یہاں سے پولیس اسٹیشن بھی جا سکتا ہوں۔" ڈاکٹر ایرک نے کہا۔

"ٹھیک ہے، آجاؤ، میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ ایوا کے فلیٹ میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ ایرک کے چند ہی جملوں نے اسے مدافعت پر مجبور کر دیا تھا اس نے کہا تھا۔ "میں پولیس کو یہ بتانے پر مجبور ہوں کہ جارج نے ایک مرتبہ تمہیں اس بری طرح پیٹا تھا کہ تمہارا چہرہ بگڑ گیا تھا اور تم موت کے دہانے پر پہنچ گئی تھیں۔"

یہ پہلا موقع تھا کہ ایوا کو اپنا انجام سامنے نظر آنے لگا تھا۔ اس ڈاکٹر کو اگرچہ اصل حقائق معلوم نہیں تھے لیکن اگر وہ یہ بیان بھی دے دیتا تو پولیس بہرحال اس سے پوچھ گچھ ضرور کرتی اور اس کے نتیجے میں نہ معلوم کیا کیا باتیں سامنے آ سکتی تھیں۔ وہ سہم کر رہ گئی۔ وہ ہر قیمت پر اس ڈاکٹر کی زبان بند کرنا چاہتی تھی اس نے کہا۔ "پھر تم کیا چاہتے ہو؟ دولت کی ضرورت ہے؟"

"نہیں۔" ڈاکٹر ایرک نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟ کیا چاہتے ہو تم؟"

"میں مجبور ہوں ایوا! مجھے یہ بیان دینا ہی ہوگا یہ میری قانونی ذمہ داری ہے اس سے بچنے کا بس ایک طریقہ ہے اور وہ طریقہ قانونی بھی ہے۔" ایرک کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"اور وہ طریقہ کیا ہے؟" ایوا نے ماتھے پر بل ڈال کے پوچھا۔

"قانون کے تحت ایک شوہر کو اپنی بیوی کے خلاف گواہی دینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔" ایرک نے آخری وار کیا۔

ایوا حیرت سے اُسے دیکھتی رہ گئی۔ اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایرک اس حد تک اس کی جان کو آجائے گا۔ کارونر کے سامنے قتل کے کیس کی ابتدائی پیشی سے دو دن پہلے ان کی شادی ہو گئی۔ ایوا مجبور تھی۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ ڈاکٹر ایرک اتنا چالاک اور عیار بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن دل ہی دل میں وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ حالات جوں ہی معمول پر آئیں گے۔ وہ علیحدگی اختیار کر لے گی۔

☆

نک کو معلوم ہو گیا تھا کہ جارج کا قاتل کون تھا۔ لیکن اس کے پاس اس کے ثبوت نہیں تھے۔ اعلیٰ افسران نے اس کی داستان سن کر کہا تھا۔ "بہتر ہے نک اسے بھول جاؤ۔ یہ سب تمہارے توہمات ہیں۔" مگر نک اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد آسانی سے ہار ماننے والوں میں سے نہ تھا۔ اُس نے کیپٹن ہیرالڈ سے اجازت لے کر اس سلسلے میں کیٹ سے ملنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

کارونر کے سامنے قتل کی ابتدائی سماعت سے ایک دن پہلے اُس نے کیٹ سے اس کے دفتر میں ملاقات کی تھی۔

"فرمائیے، کس سلسلے میں ملنا تھا؟" کیٹ نے سرد لہجے میں معلوم کیا۔

"کل کارونر کے سامنے جارج کے قتل کا کیس پیش ہو رہا ہے۔"

"پھر؟ میرا اس سے کیا تعلق ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ آپ کی پوتی اس قتل میں ملوث ہے۔"

"میں ایسی احمقانہ باتیں سننے کی عادی نہیں ہوں۔"

"میری بات تو سنئے مادام! یہ بات میں حقائق کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔ قتل کے دن ایک عورت نے گلکی ہاربر پر ایک موٹر بوٹ یہ کہہ کر کرایے پر لی تھی کہ اس کا ایک دوست بعد میں یہ موٹر بوٹ لے جائے گا۔ اس نے کرایے کی رقم دی تھی اور اپنا جو نام لکھوایا تھا۔ وہ وہی تھا۔ جو آپ کی پوتیوں کی گورنس کا تھا اور ....."

"اس سے کیا ہوتا ہے، ایک نام کی دو عورتیں ہو سکتی ہیں۔" کیٹ نے سرد لہجے میں کہا۔

"جی ہاں، میری پوری بات تو سنیے۔ بعد میں اس عورت نے تین گھنٹے بعد ایک اور موٹر بوٹ دوسری جگہ سے کرایے پر لی۔ وہاں بھی وہی نام استعمال کیا۔ میں نے دونوں جگہ متعلقہ لوگوں کو آپ کی نواسی ماریا کی تصویر دکھائی۔ دونوں جگہ لوگوں نے کہا کہ یہ وہی عورت تھی لیکن ساتھ ہی ان کا کہنا تھا کہ جس عورت نے موٹر بوٹ کرایے پر لی تھی۔ اس کے بال سیاہ تھے جب کہ ماریا کے بال سرخ ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے وگ لگا رکھی تھی۔" نک خاموش ہو گیا۔

کیٹ صبر سے یہ بیان سنتی رہی، اس نے نہایت سخت اور سرد انداز میں کہا "مجھے یقین ہے ماریا یہ حرکت نہیں کر سکتی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ وہ عورت ماریا نہیں اس کی بہن ایوا تھی۔" نک نے فیصلہ سنا دیا۔

کیٹ اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گئی

"یہ میں اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس دن ماریا کی نقل و حرکت کی . . . اس کے بیان کی روشنی میں تصدیق کر لی ہے اس کا بیان قطعی درست ہے۔ جس کا مطلب یہی ہے کہ قتل ماریا نے نہیں کیا۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کہ قاتل اس کی ہم شکل بہن الوا ہے۔ میں نے جو تحقیقات کی ہیں اس سے بھی یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے۔ جارج کم و بیش روزانہ ہی اس سے ملا کرتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ جارج نے ایک مرتبہ مار مار کر الوا کا حلیہ ہی بگاڑ دیا تھا۔ وہ اسی قماش کا آدمی تھا۔ الوا نے اسی کا بدلہ لینے کے لیے یہ سب ڈرامہ کھیلا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ قتل کے وقت وہ واشنگٹن میں تھی۔ لیکن وہاں اس کی موجودگی کی گواہی دینے والا کوئی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ وگ لگا کر ماریا بن گئی تھی، وہاں اسی نے دو موٹر بوٹ کرائے پر حاصل کیں۔ اس نے جارج کو قتل کیا اور اس کی لاش سمندر میں پھینک دی۔" نک نے تمام تفصیلات کیٹ کو بتا دیں

"ہوں . . . . . تو اس کا مطلب یہ ہے کہ الوا کے خلاف تمہارے پاس صرف واقعاتی شہادتیں ہیں، کیوں؟" کیٹ نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

"جی ہاں۔ اب میں ٹھوس شہادتوں کی تلاش میں ہوں۔ جو میں کارونر کے سامنے پیش کر سکوں۔ اپنی پوتی کے بارے میں ظاہر ہے آپ سے زیادہ کوئی نہیں جان سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس سلسلے میں قانون کی ضرور مدد کریں گی۔" نک نے قطعی لہجے میں کہا۔

کیٹ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور بولی۔ "ٹھیک ہے، میں آپ کو کارونر کے سامنے پیش کرنے کے لیے بعض معلومات فراہم کر سکتی ہوں . . . . ." وہ ایک لمحہ کو خاموش ہو گئی۔ نک کا دل بڑی زور سے دھڑکا کیٹ چند لمحے بغور اس کا جائزہ لیتی رہی پھر بولی "اور وہ معلومات یہ ہیں کہ جس دن جارج قتل ہوا تھا اس دن میں اور میری پوتی دونوں ایک ساتھ واشنگٹن میں تھے۔"

کیٹ کا یہ جملہ نک پر بجلی بن کر گرا۔ اس کی تمام امیدیں دم توڑ گئیں۔ کیٹ اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کو بڑے اطمینان سے دیکھتی رہی اور سوچتی رہی "احمق سمجھتا تھا کہ میں اپنی پوتی کو قانون کی بھینٹ چڑھا دوں گی۔ میں اپنے خاندان کو اخبارات کے ذریعہ بدنام کروں گی۔ اس احمق کو کیا معلوم کہ میں نے الوا کو اپنے طور پر سزا دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

اور کارونر کا فیصلہ بھی یہی تھا کہ جارج کو کسی نامعلوم قاتل یا قاتلوں نے قتل کیا تھا۔ کیٹ نے اپنے خاندان کو بچا لیا تھا۔

☆

جارج کے قتل کا معاملہ ختم ہو گیا۔ حالات معمول پر آ گئے۔ ماریا پیٹر کے دل کی دھڑکن بن گئی۔ خود ماریا جو اس صدمے کی شدت سے نڈھال تھی پیٹر کے انداز محبت سے متاثر ہوتی چلی گئی۔ اس کی محبت نے ماریا کو یہ احساس دلا دیا کہ جارج سے اسے فی الواقعی کوئی محبت نہ تھی۔ یہ صرف اس کی مجبوری تھی جسے اس نے محبت کے ڈھکوسلے میں چھپانا چاہا تھا۔

دوسری طرف الوا نے ایرک کے جال سے آزادی حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ مطمئن تھی کہ جارج کے قتل کا معاملہ اب ختم ہو گیا ہے۔ ایرک اب اُسے بلیک میل نہیں کر سکے گا۔ یہی سوچ کر اس نے ایک دن ایرک سے کہا تھا "مسٹر ایرک، تم جانتے ہو کہ مجھے نہ تم سے محبت تھی نہ کبھی محبت ہو سکتی ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ شادی کے اس ناٹک کو ختم کر کے علیحدگی اختیار کر لی جائے۔"

"مگر الوا! مجھے تم سے محبت ہے اور انتہائی شدید محبت! میں کسی قیمت پر اپنی محبت کو گنوانا نہیں چاہتا۔"

"تم مجھے روک نہیں سکتے۔" الوا تڑخ کر بولی۔

"اگر تم نے ایسی کوشش کی تو میں تمام دنیا کو بتا دوں گا کہ جارج کو تم نے قتل کیا ہے۔ قتل کا کیس اس طرح ختم نہیں ہو سکتا میرا بیان تمہیں پھر عدالت کے کٹہرے میں لے جائے گا۔ تم اگر میری نہیں ہو سکتیں تو جان لو کہ اس دنیا میں اب کوئی اور تمہیں نہیں اپنا سکتا۔" ایرک نے سرد اور سفاکانہ لہجے میں جواب دیا۔

"تم اتنے ذلیل ہو سکتے ہو، میں نہیں جانتی تھی۔" الوا رو دینے والے انداز میں بولی۔

"تمہیں اپنا بنائے رکھنے کے لیے میں اس سے بھی زیادہ ذلت برداشت کر سکتا ہوں۔" ایرک نے بڑے اطمینان سے کہا۔

لیکن وہ بھی الوا تھی۔ ضد کی پکی اور ہٹ دھرم۔ اس نے ایرک کو ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ادھر وہ صبح کو گھر سے اسپتال جاتا اور الوا اپنے محبوب روری کے ساتھ کھلے عام رنگ رلیاں مناتی۔ وہ روری سے اپنے تعلقات کو خفیہ رکھنے کی بھی کوشش نہ کرتی۔ روری اس کی کمزوری تھا۔ وہ اس کے نخرے برداشت کرتی۔ اس کے اخراجات پورے کرتی۔ کبھی کبھار نہیں بلکہ اکثر وہ ایرک کے سامنے روری سے اپنے تعلقات کی داستانیں سناتی۔ سب اس لیے کرتی کہ وہ تنگ آ کر، اپنی بدنامی سے مجبور ہو کر اُسے طلاق دینے پر آمادہ ہو جائے لیکن ایرک نے جیسے بے حسی کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔

"تم میرے گھر کو خواہ کوٹھا ہی کیوں نہ بنا دو، میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا۔ میرے لیے یہی احساس طمانیت کا سبب ہے کہ تم مسز ایرک کہلاتی ہو۔" ایرک نے ایک دن کہا تھا۔

"تم نہایت گھٹیا اور بے غیرت آدمی ہو۔" الوا برہم ہو گئی تھی۔

"تم جیسی بیوی کے شوہر کی ذلتوں کے لیے ابھی کوئی لفظ انسان نے نہیں تراشا ہے۔" ایرک کا جواب تھا۔

دوسری طرف الوا کی ہم شکل بہن ماریا اور پیٹر بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ کیٹ اس رومانس سے اچھی طرح واقف تھی۔ خود اسے ڈاکٹر پیٹر بہت پسند تھا۔ وہ کروگر بریٹ کمپنی کے لیے ایک مرد وارث چاہتی تھی۔ یہ وارث اُسے اس کی پوتی ہی دے سکتی تھی اور اُسے اس سلسلے میں الوا سے زیادہ ماریا پر بھروسہ تھا۔

جارج کے قتل کے دو سال بعد الوا اور پیٹر کی شادی ہو گئی۔ دو ماہ بعد اس کا پیر بھاری ہو گیا۔ یہ کیٹ کے لیے بہت بڑی خوش خبری تھی۔ اسے یقین تھا کہ الوا کے بطن سے لڑکا ہی پیدا ہو گا۔

٭

الوا کی زندگی کا وہ دن بہت تاریک تھا اُسے اپنے حسن اور اپنی دولت پر بہت مان تھا۔ لیکن اس دن روری نے اس کی انا کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ روری وہ شخص تھا۔ جس پر اس نے اپنی دولت کے بل پر حاوی آنا چاہا تھا۔ وہ اس کی تمام ضرورتیں پوری کرتی تھی اور اس کے بدلے اپنے وجود میں پلنے والے شعلوں کو سرد کرتی تھی۔ روری کے لیے الوا ضروریاتِ زندگی کے حصول کا وسیلہ تھی اور روری الوا کے لیے اس کے پندار کی تسکین کا سامان تھا۔

مگر اُس دن۔ اُس دن تو روری نے اس کے وجود کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اُس دن روری نے الوا کی آنکھوں کے نیچے انگلی پھیر کر کہا تھا۔ "جانم اب تم بڑھیا ہوتی جا رہی ہو۔ یہ جھریاں دیکھی ہیں تم نے۔"

روری نے گویا اُسے یہ احساس دلایا تھا کہ وہ اس سے عمر میں ۲۵ برس چھوٹا ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا، کیا نہیں، الوا کو کچھ احساس نہ تھا۔ وہ تو بس اس جملے کی نشتریت سے زخم زخم ہو کر رہ گئی تھی۔

اس رات الوا نے اپنے شوہر ایرک سے کہا "سنو ایرک، تمہیں مجھ سے محبت ہے؟"

"اپنے دل سے پوچھو۔" ایرک نے جواب دیا۔

"اگر واقعی یہ بات ہے تو تم اپنی پلاسٹک سرجری کی مہارت سے میری ان جھریوں کو ختم کر دو۔"

"یہ جھریاں نہیں ہیں الوا۔ یہ تو وہ لکیریں ہیں جو ہنسنے کی وجہ سے پڑتی ہیں۔" ایرک نے سمجھایا۔ "مجھے بہت پسند ہیں یہ لکیریں۔"

"مگر مجھے نفرت ہے ان سے۔ خدا کے لیے ان جھریوں کو ختم کر دو۔ لوگ مجھے بڑھیا کہنے لگے ہیں۔ ان کی وجہ سے وہ بوڑھی لگتی ہو گئی۔"

"ٹھیک ہے، اگر تم کہتی ہو، اگر اس طرح تم خوش ہو سکتی ہو تو میں یہ بھی کر دوں گا۔" ایرک نے جواب دیا۔

"واقعی؟" الوا کے چہرے پر رونق آ گئی۔

"ہاں واقعی۔ یہ بتاؤ کیا روری نے بھی تمہیں بڑھیا کہا تھا؟" ایرک نے پوچھا

"ہاں۔" الوا نے سر جھکا کے کہا۔

"آئندہ وہ نہیں کہہ سکے گا۔" ایرک نے بڑے یقین سے کہا۔ "وہ کبھی تمہیں بڑھیا کہنے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔

اگلے دن ایرک نے الوا کے چہرے کی پلاسٹک سرجری کی۔ یہ کام اُس نے گھر پر ہی کیا تھا۔ اس کام میں اُس نے کسی نرس تک کی مدد نہیں لی تھی۔ الوا نے پوچھا بھی تھا تو ایرک نے جواب دیا تھا۔ "یہ بہت معمولی سا کام ہے، اس کے لیے میں کسی کو زحمت نہیں دینا چاہتا پھر میں یہ بھی پسند نہیں کروں گا کہ اس کام میں، جو قطعی طور پر میرا ذاتی کام ہے۔ جس میں مجھے ذاتی تسکین مل سکتی ہے، جو ذاتی طور پر مجھے خوشی بخش سکتا ہے وہ میں کلی طور پر خود ہی کرنا چاہتا ہوں۔ اس خوشی میں، میں کسی اور کو شریک نہیں کرنا چاہتا۔"

اگلے روز جب الوا خواب آور دواؤں کے اثر سے بیدار ہوئی تو اس نے ایرک کو اپنے پاس ہی پایا۔ "کیا رہا؟" اس نے کمزور لہجے میں پوچھا۔

"نہایت شاندار۔ تم اب بالکل ٹھیک ہو گئی ہو۔" ایرک نے کہا۔

وہ پھر سو گئی۔ اس کے بعد روزانہ ایرک اس کے چہرے کا معائنہ کرتا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی۔ اس مسکراہٹ میں آسودگی ہوتی۔ وہ الوا کو برابر تسلی دے رہا تھا کہ اس کے چہرے کی جھریاں جاتی رہیں گی۔

"میں اپنا چہرہ کب تک دیکھ سکوں گی؟" الوا نے پوچھا۔

"ابھی آٹھ دن اور پٹیاں بندھی رہیں گی۔ جمعے تک تمام زخم مندمل ہو جائیں گے اور تمہارا چہرہ ہر اعتبار سے ٹھیک ہو جائے گا۔" ایرک نے جواب دیا۔

اس دن الوا بہت خوش تھی۔ اس نے روری کو فون کیا اور اسے بتایا کہ وہ اگلے ہفتے تک بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔

اور پھر جمعہ کا دن آ گیا۔ الوا ایرک کی منتظر تھی، وہ جلد از جلد اپنے چہرے کو دیکھنے کیلئے بے تاب تھی لیکن ایرک اس دن سہ پہر کو گھر آیا۔ "مجھے افسوس ہے ڈارلنگ! دراصل آج مجھے دو تین کیس نمٹانے پڑے۔" ایرک نے وضاحت کی۔

"دیکھو اس بند کرو اور جلدی سے مجھے ان پٹیوں سے نجات دلاؤ۔ میں اپنا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں۔" الوا نے بے زاری

سے کہا۔ وہ بہت غصے میں تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں ایرک اس کے چہرے سے پٹیاں الگ کر چکا تھا۔ اس نے خوشی سے ایک نعرہ لگا کے کہا "خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ میری کوششیں بار آور ثابت ہوئیں۔"

"کیا واقعی، مجھے جلدی سے آئینہ لا دو۔" الوا نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

ایرک نے آئینہ لا کر الوا کے ہاتھ میں دے دیا۔ الوا نے نہایت بے قرار ہو کر آئینے میں اپنی شکل دیکھی اور پھر اس کے منہ سے بے تحاشا چیخیں ابل پڑیں۔ وہ اس طرح چلا رہی تھی، جیسے اُسے ذبح کیا جا رہا ہو مگر اس کے چیخنے اور شور مچانے کا ایرک پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اس کے بستر کے پاس کھڑا بڑی آسودگی سے مسکرا رہا تھا۔

☆

کیٹ محسوس کر رہی تھیں کہ وقت کا پہیہ ان کے اپنے معاملے میں بہت تیزی سے گھوم رہا تھا۔ موسم آ رہے تھے اور جا رہے تھے۔ بعض اوقات تو وہ اپنی عمر بھی بھول جاتی تھیں اور اس کے باوجود وہ روزانہ دفتر ضرور جاتی تھیں۔ ہر کاروباری میٹنگ میں شریک ہوتی تھیں۔ مگر اب پہلے جیسی بات نہیں رہی تھی۔ وہ جلد ہی تھک جاتی تھیں اور اونگھنے لگتی تھیں۔ سب سے تکلیف دہ بات یہ تھی کہ ان کا دماغ قلابازیاں کھانے لگتا ماضی اور حال گڈمڈ ہو جاتے تھے۔ ان کی دنیا محدود ہوتی جا رہی تھی۔

کیٹ میں ایک جذبہ تھا جو انہیں زندہ رکھے ہوئے تھا اور وہ یہ تھا کہ کمپنی کا سربراہ خاندان ہی کا کوئی فرد ہونا چاہیئے۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اتنی محنت سے بنائی گئی کمپنی غیروں کے ہاتھوں میں چلی جائے۔

☆

الوا نے جس دن آئینے میں اپنی شکل دیکھی تھی۔ اسی دن اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ اس نے خواب آور گولیوں کی پوری بوتل نگل لی تھی۔ لیکن ایرک نے بروقت طبی امداد دے کر الوا کی جان بچالی تھی۔ وہ کئی روز ہسپتال میں رہی تھی اور مسلسل بڑبڑاتی اور چیختی رہتی تھی۔ وہ مر جانا چاہتی تھی۔ اب زندگی میں رکھا ہی کیا تھا۔ موجودہ صورت میں وہ زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ایرک بہت خوش تھا۔ الوا اب اس کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔ ماریا نے کئی مرتبہ فون کیا مگر الوا نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ کسی سے ملنا نہیں چاہتی تھی اور نہ کسی کو اپنی شکل دکھانے کی روادار تھی۔ صرف ایرک ہی ایک ایسا فرد تھا جس سے وہ ملتی جلتی تھی۔ اس کے ذریعے دُنیا سے اس کا رابطہ قائم تھا۔ وہ ہر لمحہ خوفزدہ اور سہمی سہمی رہتی تھی۔ اُسے یہی خدشہ رہتا تھا کہ ایرک اسے چھوڑ کر چلا جائے گا اور وہ عمر بھر یونہی۔۔۔ بدصورت رہ جائے گی۔ الوا نے دوبارہ آئینہ دیکھنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ اپنی کریہہ شکل کو بھلا وہ کیسے بھول سکتی تھی۔ بدصورتی کا وہ شاہکار اس کے ذہن پر نقش ہو کے رہ گیا تھا۔ ایرک صبح پانچ بجے ہسپتال جانے کے لیے بیدار ہو جاتا تھا اور الوا ساڑھے چار بجے ہی اس کے لیے ناشتہ کرنے باورچی خانے میں پہنچ جاتی تھی۔ وہ ایرک کے لیے رات کا کھانا بھی اپنے ہاتھوں سے تیار کرتی تھی اور ایرک کو آنے میں دیر ہو جاتی تو طرح طرح کے خدشے اور وسوسے اسے گھیر لیتے تھے۔ وہ بڑے کرب سے سوچتی تھی، کسی اور عورت نے ایرک کو پھانس لیا تو کیا ہوگا؟ اگر وہ لوٹ کر نہ آیا تو میرا کیا بنے گا؟

الوا چابی دروازے کے قفل میں گھومنے کی آواز سنتی تھی تو دوڑ پڑتی تھی اور ہال میں ایرک کے قدم رکھتے ہی بری طرح اس سے لپٹ جاتی تھی۔ وہ ایرک کو سختی سے تھام لیتی تھی۔

ایک مرتبہ الوا نے بڑے پیار سے کہا تھا "ایرک ڈارلنگ" میری سزا خاصی طویل ہو گئی ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ ہمیشہ تمہاری رہوں گی۔ کیا تم میرے چہرے کی مرمت نہیں کر سکتے؟"

ایرک نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے فخریہ لہجے میں کہا تھا "تم میری پلاسٹک سرجری کا شاہکار ہو۔ تمہارا چہرہ کبھی درست نہیں ہو سکتا۔ دنیا بھر کے لیے یہ ایک کریہہ چہرہ ہے مگر میں اسے حسین ترین چہرہ سمجھتا ہوں۔"

ماریا نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا۔ لڑکا بہت خوبصورت اور گول مٹول تھا۔ کیٹ کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ اپنے پڑپوتے رابرٹ کی پرورش پر خاص توجہ دے رہی تھیں۔ رابرٹ انہیں اپنے بیٹے ٹونی کا دوسرا روپ لگتا تھا۔ بچپن میں ٹونی ہو بہو ایسا ہی تو لگتا تھا۔ کمپنی کے معاملات انہوں نے زیادہ تر راجر کے ہاتھ میں دے دیئے تھے اور وہ اپنا بیشتر وقت رابرٹ کی ناز برداریوں میں صرف کرتی تھیں۔ آٹھ سالہ خوبصورت اور ذہین رابرٹ ان کے دل کا سکون اور آنکھوں کی ٹھنڈک تھا۔ کبھی کبھار وہ اپنے ناکارہ بیٹے سے ملنے بھی چلی جاتی تھیں۔ وہ ہر قسم کے جذبات اور احساسات سے عاری ٹونی کو دیکھتی تھیں تو ان کے دل پر چھریاں سی چلنے لگتی تھیں۔

کیٹ اب عمر کے اُس حصے میں تھیں۔ جب کسی بھی لمحے ان کی حرکتِ قلب بند ہو سکتی تھی۔ وہ اب نوّے برس کی ہو چکی تھیں۔ چوبیس ستمبر ۱۹۸۲ء کو ان کی سالگرہ ڈارک ہاربر کے محل نما مکان میں بڑی دھوم دھام سے منائی جا رہی تھی۔ دعوت نامے تقسیم کیے جا چکے تھے۔

دعوت نامہ ایرک کو اس کے کلینک میں ملا تھا اور رات گھر پہنچتے ہی اس نے اسے الوا کے حوالے کر دیا۔ ایرک نے الوا کو بغور دیکھتے ہوئے کہا "ہم تمہاری دادی جان کی سالگرہ میں ضرور شریک ہوں گے۔ اب وہ سنچری کی طرف بڑھ رہی ہیں"

"نہیں ایرک! میں نہیں جاؤں گی! میں یہیں اپنے گھر میں رہوں گی۔" الوا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"بکواس بند کرو، سالگرہ میں ہم دونوں ضرور شریک ہوں گے۔" ایرک نے سرد اور سخت لہجے میں فیصلہ سنا دیا۔

ڈاکٹر پیٹر نے دعوت نامہ پڑھا اور بولا "کمال ہے بھئی۔ مجھے تو یقین نہیں آتا بڑی بی نوے برس کی ہو چکی ہیں۔ اگر انہوں نے سنچری پوری کر لی اور آؤٹ نہیں ہوئیں تو ہم ان کا سو سالہ جشن بڑے تزک و احتشام سے منائیں گے۔"

"ایک مزے کی بات بتاؤں" ماریا نے مسکرا کے کہا "ہمارے بیٹے رابرٹ کے نام الگ دعوت نامہ آیا ہے۔ لفافے پر رابرٹ پیٹر لکھا ہوا ہے۔"

☆

سالگرہ کی تقریب ختم ہو چکی تھی۔ مہمان رخصت ہو چکے تھے اور خاندان کے تمام افراد گوشۂ عافیت کے وسیع و عریض کتب خانے میں جمع تھے۔ کیٹ ان سب کو باری باری دیکھ رہی تھیں۔ ٹونی حسبِ معمول خاموش اور لاتعلق سا تھا۔ دن بھر اس نے کسی فرد اور کسی چیز میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ یہ ان کا فضول اور ناکارہ بیٹا تھا۔ جس نے انہیں قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے ٹونی کے بارے میں بڑے سہانے اور رنگین سپنے دیکھے تھے اور وہ ان کی بھیانک تعبیر بنا کر کھڑا تھا۔ ایک گوشے میں الوا کھڑی تھی، وہ ذہنی بیمار تھی۔ ایرک نے اس کے سارے کس بل نکال دیئے تھے۔ الوا شیطان کی خالہ تھی۔ اگر اس کا ذہن ابلیس کا سا نہ ہوتا تو آج وہ کروگر برینٹ کمپنی کی سربراہ کی حیثیت سے راج کر رہی ہوتی۔ الوا کے برابر اس کی ہمشکل بہن ماریا کھڑی تھی۔ خوب صورت اور معصوم ماریہ نے اپنی خوشیوں کو ہمیشہ اہمیت دی تھی۔ وہ ایک عام گھریلو عورت کی طرح اپنے شوہر اور بیٹے رابرٹ سے ٹوٹ کے پیار کرتی تھی۔ اُسے کمپنی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اس کا شوہر بھی کاروباری ذہن کا مالک نہیں تھا۔ اس نے کمپنی کی ذمے داریاں سنبھالنے سے صاف انکار کر دیا تھا دونوں بہنیں غدار ثابت ہوئی تھیں۔

آج وہ پورے نوے برس کی ہو چکی تھیں۔ ان کی سالگرہ دھوم دھام سے منائی گئی تھی۔ صدرِ امریکہ نے انہیں مبارکباد کا تار بھیجا تھا۔ گورنر بڑے سے گلدستے کے ساتھ حاضر ہوا تھا۔ دنیا کے کونے کونے سے بیسیوں کروڑپتی تقریب میں شریک ہونے آئے تھے۔ اس کے آٹھ سالہ پڑپوتے رابرٹ نے بڑی مشاقی سے پیانو بجایا تھا اور مہمانوں نے اسے دل کھول کے داد دی تھی۔ کیٹ نے خوبصورت اور ذہین رابرٹ کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچا تھا "میں ماضی ہوں اور رابرٹ مستقبل ہے۔ ایک روز میرا یہ پڑپوتا کروگر برینٹ کمپنی کی قیادت سنبھالے گا!"

رابرٹ نے انہیں سالگرہ کی مبارکباد دی تھی۔ کیٹ نے اسے بڑی گرمجوشی سے لپٹا لیا تھا۔ اسی لمحے گورنر نے اپنی نشست سے کھڑے ہو کر تقریر شروع کر دی تھی۔ اس نے شاندار الفاظ میں کیٹ کو خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔ اس کے لاتعداد خیراتی اور رفاہی منصوبوں کو سراہا تھا۔ گورنر کی تقریر کے بعد میئر نے حاضرین سے خطاب کیا تھا پھر کیٹ کو تقریر کی دعوت دی گئی تھی۔ وہ تقریر کے لیے کھڑی ہوئی تو مہمانوں نے تالیاں بجاتے ہوئے پرجوش انداز میں اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ کیٹ کی تقریر کے اختتام پر دیر تک تالیاں بجتی رہی تھیں کیٹ نے مہمانوں کو کھانے کی دعوت دی تھی۔ کھانے میں بیسیوں لوازمات تھے۔ مہمان پوری طرح لطف اندوز ہوئے تھے۔

اور اب کیٹ اپنے افرادِ خانہ کے ساتھ کتب خانے میں بیٹھی تھیں۔ اور پھر کمرے میں روحیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ سب سے پہلے جمی کی روح آئی تھی۔ اس کے عظیم والد جنہوں نے انتہائی نامساعد حالات کا بے جگری سے مقابلہ کیا تھا اور کروگر برینٹ کمپنی کی بنیاد رکھی تھی۔ پھر مارگریٹ کی روح آئی تھی۔ اس کی والدہ جنہوں نے اپنے شوہر جمی کی موت کے بعد کمپنی کی ترقی کے لیے شب و روز محنت کی تھی۔ پھر بانڈا کی روح مسکراتی نمودار ہوئی تھی۔ اسکے والد کا پرانا رفیق اور جاں نثار بانڈا، اس نے کیٹ کے باپ کی بھرپور مدد کی تھی اور پھر اس کے پیارے شوہر ڈیوڈ کی روح آئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا رکھے تھے۔ وہ کیٹ کو بلا رہا تھا۔ سب کے سب اسے بلا رہے تھے۔ کیٹ نے سر کو جنبش دی۔ ابھی وہ تیار نہیں تھی۔ یہ اس کے جانے کا وقت نہیں تھا۔ بہت جلد میں تم لوگوں میں شامل ہو جاؤں گی۔ کیٹ نے سوچا بہت جلد تم سب سے آملوں گی!

خاندان بھر کے لوگ کمرے میں جمع تھے۔ کیٹ نے ننھے رابرٹ کو دیکھا اور بولی "تقریب بہت شاندار تھی دادی جان"

"شکریہ رابرٹ۔ مجھے خوشی ہے کہ تم تقریب سے محظوظ ہوئے اور بیٹے، تمہاری پڑھائی کیسی ہو رہی ہے؟"

"کلاس میں سب سے زیادہ نمبر میرے ہوتے ہیں۔ میں آپ کے کہنے کے مطابق خوب محنت کر رہا ہوں۔"

کیٹ نے پسندیدگی کے اظہار میں سر ہلایا اور پیٹر سے مخاطب ہوئیں "تمہارا بیٹا بہت ذہین ہے۔ ایک سال بعد تم اسے وارٹن اسکول میں داخل کروا دینا۔"

پیٹر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا "خدا کے لیے بس کیجیے دادی جان۔ کیا آپ اپنی جد و جہد ترک نہیں کریں گی؟ رابرٹ کو اس کی مرضی اور رجحان پر چھوڑ دیجیے۔ اسے جو کچھ بننا ہے بن جائے گا۔ اس کا رجحان موسیقی کی طرف ہے، ایک روز یہ عظیم موسیقار بنے گا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو" کیٹ نے ایک آہ بھر کے کہا "میں بوڑھی ہو چکی ہوں اور مجھے مداخلت کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اگر رابرٹ موسیقار بننا چاہتا ہے تو اسے موسیقار ہی بننا چاہیے۔"